تصریحات

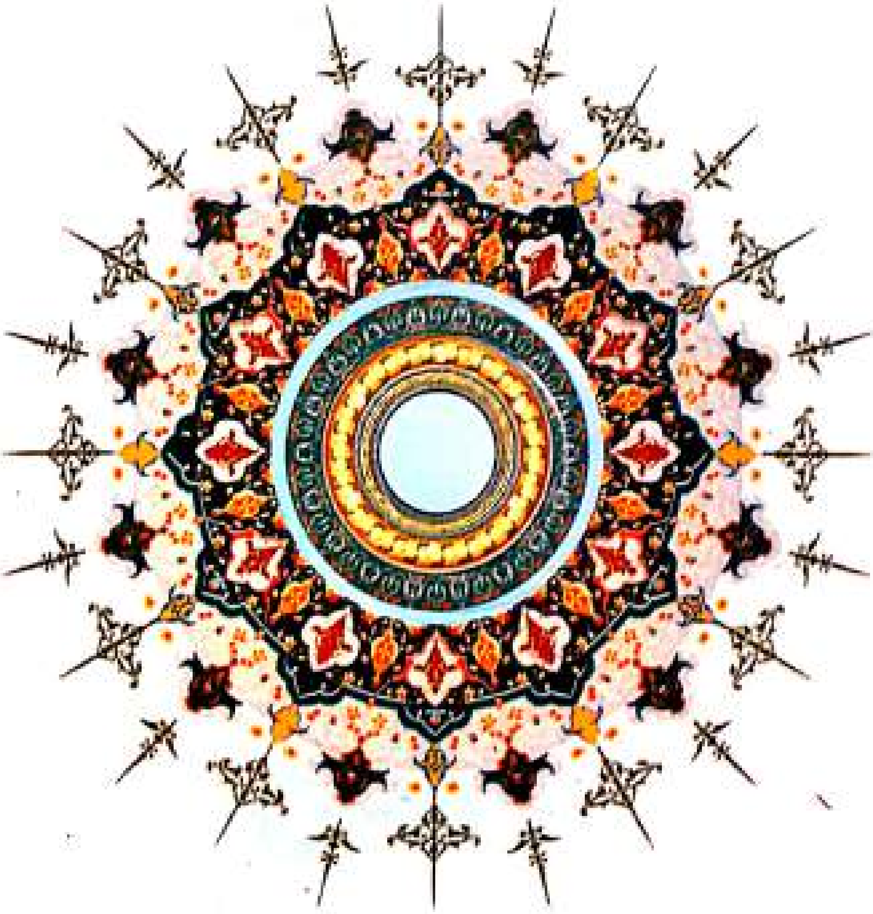

سید ابوالاعلیٰ مودودی

تصریحات

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مرتب

سلیم منصور خالد

البدر پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

کتاب ...... تصریحات
مؤلف ...... سیّد ابوالاعلیٰ مودودی
مرتب ...... سلیم منصور خالد

طبع اوّل	احباب پبلی کیشنز لاہور	پاکستان	جولائی ۱۹۷۹ء — ۳۰۰۰
طبع دوم	مکتبہ ذکریٰ، رام پور	بھارت	اکتوبر ۱۹۸۰ء — ۲۰۰۰
طبع سوم	احباب پبلی کیشنز لاہور	پاکستان	اپریل ۱۹۸۲ء — ۲۰۰۰
طبع چہارم	مکتبہ ذکریٰ، رام پور	بھارت	جون ۱۹۸۲ء — ۱۰۰۰
طبع پنجم	ادارہ مطبوعات طلبہ، لاہور	پاکستان	ستمبر ۱۹۸۲ء — ۱۰۰۰
طبع ششم	البدر پبلی کیشنز لاہور	پاکستان	مئی ۱۹۹۲ء — ۱۰۰۰
طبع ہفتم	البدر پبلی کیشنز لاہور	پاکستان	اکتوبر ۱۹۹۷ء
طبع ہشتم	البدر پبلی کیشنز لاہور	پاکستان	مئی ۲۰۰۳ء
طبع نہم	البدر پبلی کیشنز لاہور	پاکستان	نومبر ۲۰۰۵ء
طبع دہم	البدر پبلی کیشنز لاہور	پاکستان	نومبر ۲۰۰۹ء
طبع یازدہم	البدر پبلی کیشنز لاہور	پاکستان	فروری ۲۰۱۷ء

قیمت 400 روپے

ترتیب

— گزارش ۹
— کچھ اور گزارشات ۱۱
— گزارشات ۱۳
☆ محسن کتاب ۱۸
☆ نوشتۂ دیوار ۱۹
☆ لاہور، ۲۶ نومبر ۱۹۵۰ء - اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سالانہ اجتماع میں ۲۰
☆ کراچی، ۱۴ اگست ۱۹۵۵ء - اسلامی جمعیت طلبہ کے تحت یوم آزادی پر ۲۵
☆ کراچی، یکم نومبر ۱۹۵۵ء - ''اسٹوڈنٹس وائس'' کے لئے انٹرویو ۳۴
☆ کراچی، ۷ نومبر ۱۹۵۷ء ''اسٹوڈنٹس وائس'' کے لئے انٹرویو ۳۸
☆ شکاگو یونیورسٹی، امریکہ، نومبر ۱۹۵۹ء سے ایک طالب علم کے نام ۴۲
☆ الخبر سعودی عرب، ۱۹۶۱ء - عرب طلبہ کی محفل میں ۴۸
☆ لاہور، دسمبر ۱۹۶۱ء - تعلیم پر سوالات کے جواب ۵۱
☆ ادب کے مقصدی اور اخلاقی پہلو پر کچھ خیالات ۵۳
☆ پنجاب یونیورسٹی کے طالب علم سے ۱۸ اپریل ۱۹۶۲ء ۷۸
☆ تحریکی زندگی کے واقعات ستمبر ۱۹۶۳ء ۸۵
☆ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان سے اپنے تعلق پر بیان ۱۹۶۳ء ۸۸

- کراچی، ۱۰ دسمبر ۱۹۶۳ء- ''اسلام عصر حاضر میں'' لیکچر کے بعد ۹۲
- لاہور ہائی کورٹ، ۱۹۶۴ء- اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے بارے میں بیان ۹۹
- لاہور ''سیاہ'' ستمبر ۱۹۶۵ء- میں ذوق مطالعہ پر مکالمہ ۱۰۱
- میرپور، گورنمنٹ کالج، ۲۹ نومبر ۱۹۶۵ء کے اساتذہ اور طلبہ سے ۱۰۷
- لاہور، ۱۹ نومبر ۱۹۶۷ء- اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سولہویں سالانہ اجتماع میں .. ۱۱۳
- ڈھاکہ، فروری ۱۹۶۸ء- اسلامی جمعیت طلبہ کے اجتماع میں ۱۱۶
- کراچی، ۱۷ مارچ ۱۹۶۸ء- اسلامی جمعیت طلبہ کی ایک نشست میں ۱۲۵
- سکھر، ۲۲ مارچ ۱۹۶۸ء- تعمیر نو اسکول ہائی میں اسلامی جمعیت طلبہ کی نشست ۱۳۷
- راولپنڈی، ۱۱ مئی ۱۹۶۸ء- طلبہ اور شہریوں کی ایک نشست ۱۴۴
- لاہور، ۱۲ اگست ۱۹۶۸ء- نوجوانوں کے ہمراہ ۱۵۷
- کراچی، اگست ۱۹۶۸ء- سوال و جواب کی محفل ۱۶۴
- لندن، ستمبر ۱۹۶۸ء- اسلامک مشن برطانیہ کی ایک نشست میں ۱۶۷
- لندن، نومبر ۱۹۶۸ء- عرب طلبہ کے رسالے ''الغربا'' کے لئے انٹرویو ۱۷۴
- لندن، نومبر ۱۹۶۸ء- ایک اور نشست میں شرکت ۱۸۱
- لاہور، ۹ نومبر ۱۹۶۹ء- اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے اٹھارہویں سالانہ اجتماع میں ۱۸۶
- مراکش، نومبر ۱۹۶۹ء- روزنامے کے لئے انٹرویو ۲۰۶
- ڈھاکہ، ۱۷ جنوری ۱۹۷۰ء- اسلامی جمعیت طلبہ کی صوبائی کانفرنس میں ۲۱۰
- کراچی، ۱۲ جون ۱۹۷۰ء- اسلامی جمعیت طلبہ کے زیر اہتمام اجتماع عام میں ۲۱۷
- مشرقی پاکستان سے اسلامی جمعیت طلبہ کے وفد سے ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۱ء ۲۲۹
- ذاتی زندگی کے کچھ واقعات پر استفسار کے جواب میں ۲۳۲
- لاہور، ۲۳ اگست ۱۹۷۲ء- اسلامی جمعیت طلبہ پنجاب ہفت روزہ تربیتی کیمپ سے ۲۳۹
- لاہور، ۲۷ جنوری ۱۹۷۳ء- اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے اجتماع ناظمین سے ۲۴۷
- ''ہم قدم'' لاہور مارچ ۱۹۷۴ء- سے گفت گو ۲۵۵

☆ لاہور' ۲۱ مارچ ۱۹۷۴ء- اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے تربیتی اجتماع سے ۲۶۲

☆ کراچی یونیورسٹی' ۱۹۷۴ء- کالج آف ایجوکیشن کے ایک طالب علم کے نام ۲۶۶

☆ البدر' ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۴ء- کارکنوں کی افطار پارٹی میں شرکت ۲۷۰

☆ لاہور' ۲۳ نومبر ۱۹۷۴ء- اسلامی جمعیت طالبات پاکستان کے وفد سے ۲۷۶

☆ لاہور' ۲۰ مارچ ۱۹۷۵ء- ارکان کے تربیتی کیمپ میں ۲۸۶

☆ قائداعظم یونیورسٹی' اسٹوڈنٹس یونین اسلام آباد سے ۲۰ اپریل ۱۹۷۵ء ۳۱۱

☆ راولپنڈی' ۲۱ اپریل ۱۹۷۵ء- اسلامی جمعیت طالبات کے اجتماع سے ۳۱۴

☆ مالاکنڈ ایجنسی' ۱۱ مئی ۱۹۷۵ء- ڈگری کالج تھانہ (صوبہ سرحد) کے وفد سے ۳۲۱

☆ لاہور' ۲۵ مئی ۱۹۷۵ء- اسلامی جمعیت طلبہ پنجاب کی پانچ روزہ تربیت گاہ میں ۳۲۵

☆ پشاور یونیورسٹی' ۲۸ مئی ۱۹۷۵ء- ادارہ تعلیم وتحقیق سے طلبہ وطالبات کا وفد ۳۳۳

☆ لاہور' ۱۲ اگست ۱۹۷۵ء- اسلامی جمعیت طلبہ پنجاب کے تربیتی کیمپ سے ۳۳۶

☆ پنجاب یونیورسٹی' ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء- ادارہ تعلیم وتحقیق کے وفد سے ۳۴۱

☆ لاہور' ۲۱ جنوری ۱۹۷۶ء- اسلامی جمعیت طالبات پاکستان کی ایک نشست میں ۳۴۸

☆ محمد بن سعود یونیورسٹی ۷ فروری ۱۹۷۶ء- سعودی طلبہ کی لاہور میں ملاقات ۳۵۷

☆ ریاض یونیورسٹی' ۲۹ فروری ۱۹۷۶ء- سعودی عرب کے طلبہ کا وفد لاہور میں ۳۶۴

☆ زرعی یونیورسٹی' فیصل آباد ۴ مارچ ۱۹۷۶ء کے طلبہ سے ۳۶۷

☆ پنجاب یونیورسٹی' ۱۴ جولائی ۱۹۷۶ء- اسلامی جمعیت طلبہ پنجاب کے تربیتی کیمپ میں ۳۷۱

☆ پنجاب یونیورسٹی' ۶ ۱۹۷۶ء- ادارہ تعلیم وتحقیق کے وفد سے ۳۸۰

☆ لاہور' ۲۷ دسمبر ۱۹۷۶ء- اسلامی جمعیت طالبات پاکستان کے سالانہ اجتماع میں ۳۸۲

☆ کراچی یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین' ۱۹۷۷ء مجلّہ "الجامعہ" کے لئے انٹرویو ۳۸۵

☆ پنجاب یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین' ۱۹۷۷ء مجلّہ "محور" کے لئے جوابات ۳۹۳

☆ لاہور' ۷ ستمبر ۱۹۷۷ء- اسلامی جمعیت طلبہ کی افطار پارٹی میں ۳۹۵

☆ ریڈیو پاکستان' مارچ ۱۹۷۸ء کے قومی پروگرام میں ۴۰۲

- پنجاب یونیورسٹی، ۱۲ مئی ۱۹۷۸ء – تنظیم اساتذہ پاکستان اور طلبہ کے وفد سے ۴۲۷
- لاہور، ۱۸ جنوری ۱۹۷۹ء – جمعیت طلبہ عربیہ پاکستان کے وفد سے ۴۳۰
- لاہور، ۲ مئی ۱۹۷۹ء – مسئلہ افغانستان پر جمعیت کی مرکزی مجلس شوریٰ سے ۴۳۵
- امریکہ، مئی ۱۹۷۹ء – مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے لئے خصوصی پیغام ۴۴۲
- رواداری اسیری – ایک مفصل انٹرویو ۴۵۰

گزارش

"تصریحات" کا یہ ایڈیشن دس سال کے طویل عرصے بعد پیش خدمت ہے، جس میں مزید نشستوں کا اضافہ ہے اور پیش کش میں بھی نیا حسن ہے۔

بیسویں صدی عیسوی نے: مغربی استعمار کی پہلی روایت کو فنا کے گھاٹ اترتے اور اس کی جگہ یہود و نصاریٰ کی رفاقت میں، امریکی سامراج کے ریموٹ کنٹرول استعمار کو پروان چڑھتے دیکھا ہے۔ دوسری طرف فسطائیت اور اشتراکیت کی صبح طلوع کو شام غروب میں ڈوبتے دیکھا ہے۔ تیسری جانب مسلمانوں نے خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے اور اپنی ریاستوں میں غالب مسلم قوم پرست قیادتوں میں استعماری آلہ کاروں کی ریشہ دوانیوں کے چرکے بھی سہے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں ممکن ہے، عالمی اشتراکی تحریک اور پاکستان میں سوشلزم اور اسلام کی کشمکش کے حوالے سے مباحث پہلی نظر میں اضافی نظر آئیں، ______ لیکن اشتراکی روس (اکتوبر ۱۹۱۷ء۔ دسمبر ۱۹۹۱ء) کے خاتمے کے بعد بھی اشتراکی کوچہ گردوں کی اپنی فطری حلیف مغربی سرمایہ دار ریاستوں سے رفاقت ایک کھلے اور نئے اتحاد کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ جس کا مشترکہ ہدف احیائے اسلام کی عالمی تحریک ہے۔[☆] قاہرانہ جاگیرداریت، ظالمانہ نواستعماریت، جاہلانہ قومیت پرستی، اور مرعوبانہ

☆ مغرب کا ایک نفسیاتی طریقِ جنگ یہ بھی ہے کہ وہ دشمن کو مارنے سے پہلے برا نام دیتا ہے۔ ماضی میں احیائے اسلام کی انقلابی اور جذبہ جہاد سے سرشار تحریکوں کو وہابی، قدامت پسند، رجعت پسند وغیرہ کا نام دیا گیا اور اب انہیں بنیاد پرست (Fundamentalist) کا نام دیکر وہی تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔

ذہنی شکست خوردگی اپنے اپنے کردار ادا کر رہی ہیں۔ اسلامیت اور لادینیت کے موجودہ منظر نامے کا اس وقت تک شعور حاصل نہیں ہو سکتا، جب تک اس رستاخیز کے مرحلوں، ارتقاء کے زاویوں اور ادوار کے رویوں کو ٹھیک تناظر میں سامنے نہ رکھ دیا جائے۔

جن طلبہ و طالبات نے سیّد مودودی کی مجالسِ علم و فضل سے فیض نہیں پایا، وہ یہ کتاب پڑھ کر اپنے آپ کو سیدی کا شریک محفل پائیں گے۔

۲۹ر فروری ۱۹۹۲ء

مرتب

کچھ اور گزارشات

زیرِ نظر مجموعے کا مسودہ تیار کر لیا گیا تو مرتب ۲۴ مئی ۱۹۷۹ء کو محترم سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا۔ جس میں سیدیؒ نے کتاب چھاپنے کی اجازت دینے کے بعد فرمایا:

’’اس کو شائع کر لیں، پھر ہو سکا تو میں اس پر نظرِ ثانی کر لوں گا۔‘‘

لیکن کتاب چھپنے کے کچھ ہی عرصہ بعد مولانا محترم ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

○ ’’تصریحات‘‘ کے دوسرے ایڈیشن (بھارت) میں کچھ حصوں کا اضافہ کیا گیا تھا، لیکن وہاں کی مخصوص صورتِ حال کے پیشِ نظر پاکستانی ایڈیشن کے کچھ حصوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔

○ ’’تصریحات‘‘ کے تیسرے ایڈیشن (پاکستان) میں مزید نشستوں کی روداد کا اضافہ کیا گیا ہے، جس سے کتاب کی افادیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

○ اسلامی جمعیت طالبات پاکستان سے سوال و جواب کی نشستوں کو بھی شاملِ اشاعت کر دیا ہے، تا کہ نئی نسل تک رہنمائی کا دائرہ زیادہ وسیع ہو سکے۔

○ ’’تصریحات‘‘ کے چند حصے طلبہ و طالبات کے براہِ راست سوالوں پر مشتمل نہیں، لیکن وہ بھی شاملِ اشاعت ہیں اور مرتب کے نزدیک کتاب کے سیاق و سباق میں ان کی موجودگی کا فکری سطح پر ایک افادی پہلو ہے۔ خصوصاً سیّد مودودیؒ کی روداد اسیری جہاں نوجوانوں کے لئے پیامِ عزیمت ہے، وہیں پر تحریک اسلامی کی تاریخ کے اہم مرحلوں کی روداد بھی ہے۔

ستمبر ۱۹۸۲ء

مرتب

گزارشات

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ بیسویں صدی کے عظیم مفکر، مجتہد اور تعلیمات اسلام کے منفرد استاد ہیں۔ جنھوں نے ایک طرف اپنی تحریروں میں پوری قوتِ استدلال اور دل نشین پیرایۂ بیان سے دین اسلام کے کم و بیش تمام پہلوؤں کو عصری تقاضوں سے قریب تر ہو کر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ پھر کسی ذہنی مرعوبیت کا شکار ہوئے بغیر باطل مگر غالب نظریات پر ضرب کاری لگائی ہے، اور دوسری طرف ایک بہترین منتظم کے طور پر خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے تحریک اسلامی کو منظم کیا ہے۔

ایک ایسی تحریک جو الحمدللہ کسی حکومت و سلطنت کی پشت پناہی کے بغیر بین الاقوامی سطح پر نہایت مضبوط بنیادوں پر استوار ہے اور پوری قوت کے ساتھ اس عالمگیر اسلامی انقلاب کے لئے مصروفِ عمل ہے کہ جس کی خوشگوار لہر بیشتر اسلامی ممالک میں محسوس کی جارہی ہے۔ اس کی مدمقابل باطل تحریکات اسے اپنے مقاصد کی راہ میں بڑی رکاوٹ سمجھتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آج سیّد مودودیؒ کے مخالفین بھی انھیں اسلامی اجتماعیات کا امام تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔

تحریک اسلامی کا احیاء سیّد مودودیؒ نے برصغیر جنوبی ایشیا میں کیا، لیکن اسلامی نشاۃ ثانیہ کی یہ تحریک (Islamic Resurgence Movement) دنیا کے کونے کونے میں ایک ہی مقصد، ایک ہی نصب العین، کی خاطر، کلمۂ طیبہ اور نعرۂ تکبیر کے ایک پرچم تلے مصروفِ جہاد ہے۔ جس کے رہبر کارواں ___ سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ ___ ہیں۔

اور پاکستان میں تحریک اسلامی کا فعال ترین دستہ' اسلامی جمعیت طلبہ کے نام سے معروف ہے۔ جس میں شامل اور تحریک اسلامی سے تعلق رکھنے والے دیگر ممالک کے طلبہ کی ایک کثیر تعداد نے انفرادی اور اجتماعی طور پر سیّد محترم سے قدم قدم پر رہنمائی حاصل کی۔ زیرِ نظر تالیف دراصل اسی دانش وبصیرت کی روشنی کا پرتو ہے۔

یہ رہنمائی مختلف خصوصی اور عمومی اجتماعات' مختلف تربیتی اجتماعات' مختلف انٹرویوز اور اجتماعی ملاقاتوں کی صورت میں ریکارڈ ہوتے ہوتے اس مجموعہ کی صورت میں ڈھل گئی ہے۔ ____ چند ایسی نشستوں کو بھی اس تالیف میں محض اس لئے شامل کیا گیا ہے کہ ان کے نتیجے میں معنوی ربط قائم ہو جائے' حالانکہ وہ نشستیں طلبہ کے ساتھ نہیں ہوئیں۔

ایک بڑے انسان کی ہر بیان کردہ یا ہر لکھی ہوئی چیز کا تقابل ان چیزوں سے نہیں کیا جا سکتا' جنھیں وہ خود مستقل نوعیت کا حامل قرار دیا کرتے ہیں' اور اسی طرح وہ اپنی احتیاط پسندی اور معاملات کی نزاکت کے پیشِ نظر عام نوعیت کی اشیاء کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ ____ لیکن تاریخ انسانی گواہ ہے کہ اپنے عہد پر محیط انسانوں کی زبان سے کہا ہوا تقریباً ہر لفظ اور قلم سے نکلا ہوا کم وبیش ہر فقرہ' متلاشیانِ علم ودانش کے لئے قیمتی نکات میں ڈھل گیا۔ جس طرح کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابن تیمیہؒ وغیرہ کے فرمودات واقوال ان کے بعد تاریخی ریکارڈ کے طور پر نوعِ انسانی کی رہنمائی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

یہ مجموعہ ان سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے' جو خاص طور پر پاکستانی طلبہ برادری نے پوچھے۔ جو مسائل کے جہنم اور تشکیک وریب میں سلگتے ہوئے آج کے مضمحل مسلم معاشرے کا پرعزم مستقبل ہیں۔

سوالات کی نوعیت کچھ اس طرح ہے:

○ اخلاقی برائیوں' معاشرتی خرابیوں میں گلی سڑی سوسائٹی کے تعفن سے بچنے اور دامن بچا بچا کر چلنے والے سعید طلبہ کے احساسات کی چبھن ہے کہ وہ کس طرح اس منجدھار سے سرخرو ہو کر نکلیں؟

○ طلبہ غلامانہ ذہنیت سے ترتیب پائے ہوئے نظامِ تعلیم سے گریزاں ہیں' وہ جاننا

چاہتے ہیں کہ اسے کیسے بدلیں اور پھر اس تبدیلی کو سماجی سطح پر کیسے ہمہ گیر بنائیں؟

○ تحریک و تنظیم کی صفوں میں مضبوطی و استحکام کیسے برقرار رکھیں؟

○ بلند اخلاقی اقدار و اوصاف سے کس طرح قوم کے مستقبل کو مزین کر سکیں؟

○ کرب و مصائب کی شکار قوم کو کس طرح ذہنی آسودگی مہیا کریں؟

○ اشتراکیت، جاگیرداری، سرمایہ داری، قومیت پرستی، لادینیت، عریانیت اور فرقہ داریت کے زہر آلود کانٹوں کو کس انداز سے اپنے اور اپنے ہم مکتب ساتھیوں کے ذہن و دماغ کے دریچوں سے نکال سکیں؟

یہ اور اس نوعیت کے بہت سے بنیادی سوالات ہیں کہ جن کا تصور ہی ایک فرد کو چکرا دیتا ہے، کہیں سے شافی جواب نہیں ملتا ______ مگر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایمان افروز دانش کی شکل میں، سید مودودیؒ ان انگارہ انگارہ مسائل پر جوابات کی صورت میں شبنم بن کر تسکین و اطمینان کی کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔

صراط مستقیم کے یہ روشن نقوش سالہا سال گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف رسائل و جرائد اور ذاتی ڈائریوں کے اوراق پر نقش ہوتے رہے، جنہیں ایک جگہ اکٹھا کرنے کا خیال مرتب کو مئی ۱۹۷۷ء میں سوجھا، کچھ غور و فکر کے بعد یہ منصوبہ سید مودودیؒ کی خدمت عالیہ میں پیش کیا تو انھوں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بڑی شفقت سے فرمایا:

''پوری احتیاط کے ساتھ انہیں اکٹھا کرلیں، پھر کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔''

ان منتشر اوراق کو جب ابتدائی ترتیب کے ساتھ سیدیؒ کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے اسے کتابی شکل دینے کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے بہتر طریق پر مرتب کرنے کے سلسلے میں رہنمائی فرمائی، مگر متن کی صحت و درستی کے لئے ہدایات دیتے ہوئے فرمایا:

> ملک غلام علی صاحب (معاون خصوصی، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ) کو ایک نظر دکھا لیا جائے، پھر جہاں کوئی خلا رہ جائے یا کوئی وضاحت چاہیے یا کوئی کمی رہ گئی تو میں خود اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گا، ان شاءاللہ۔

اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے یہ مسودہ محترم ملک صاحب کی خدمت میں پیش کیا، جنہوں نے اس کا کچھ حصہ دیکھا، نشان زد کیا اور اپنی مصروفیات کے سبب تدوین و ترتیب کے ذیل میں بنیادی ہدایات سے نوازا ______ ۱۹۷۸ء کے آغاز میں سیّد محترمؒ کی علالت کی وجہ سے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود اس مسودے پر نظر ثانی فرماتے، اس لئے مرتب نے اپنی حد تک پوری احتیاط کے ساتھ سیّد محترمؒ کی آراء اور ملک غلام علی صاحب کی ہدایات کی روشنی میں اسے ترتیب دینا شروع کیا۔

یہاں پر ایک اور بات واضح کرنا ضروری ہے کہ اس سے قبل محترم سیّد مودودیؒ سے استفسارات پر مبنی "رسائل و مسائل"، "تفہیمات" (اول، دوم کا بیشتر حصہ) اور "سنت کی آئینی حیثیت" نہایت قیمتی مباحث اور معرکہ آراء مسائل و معارف پر مبنی وہ مجموعے ہیں، جنہیں حتمی شکل سیّد محترمؒ نے خود دی۔ لیکن زیر نظر مجموعہ کو مذکورہ بالا کتب کے معیار پر نہیں سمجھنا چاہیے، جو کہ سیّد محترمؒ کی ذاتی تصنیفات ہیں، جب کہ یہ ان کی ایسی گفتگوؤں پر مشتمل ہے، جو سیّد محترمؒ کی نظر سے حتمی طور پر نہیں گزر سکیں (بلاشبہ ان میں سے بیشتر نشستیں وقتاً فوقتاً چھپنے کے بعد سیّد محترمؒ کے مطالعے میں آتی رہی ہیں)۔ اس کا انداز تقریری اور بیانیہ ہے، مستقل تحریر کا نہیں ______ یہ مختلف کیفیات اور حالات میں منعقد ہونے والی نشستوں کا ثمر ہے۔ اس تالیف کا بیشتر حصہ کارکنان کے تنظیمی، تربیتی، اجتماعی اور دعوتی امور و مسائل سے متعلق ہے، جب کہ اوّل الذکر کتب زیادہ تر علمی نوعیت کے مسائل پر مبنی ہیں۔

اس مجموعہ کا نام تجویز کرنے پر ہم محترم نعیم صدیقی صاحبؒ کے شکر گزار ہیں اور محترم مظفر بیگ صاحبؒ ایڈیٹر ہفت روزہ "آئین" لاہور کے ممنون ہیں کہ زیادہ تر ان کے پرچے میں یہ قیمتی ریکارڈ محفوظ ہوتا رہا ______ علاوہ ازیں ہفت روزہ "ایشیا" لاہور، ماہنامہ "سیارہ" لاہور، ماہنامہ "ترجمان القرآن" لاہور، پندرہ روزہ "عزم" لاہور، سالنامہ "محور" (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) ماہنامہ "ہم قدم" ماہنامہ "چراغ راہ" کراچی، مجلّہ "الجامعہ" (کراچی یونیورسٹی)، ہفت روزہ 'Students Voice' کراچی وغیرہ کے

بھی شکر گزار ہیں کہ ان رسائل و جرائد میں طبع شدہ حصوں کو یہاں پر شامل کیا جا رہا ہے۔ اس کام کی تکمیل محترم لیاقت بلوچ کی دلچسپی اور جناب سمیع اللہ بٹ کے مشوروں کی مرہون منت ہے۔

اس مجموعہ میں رہنے والی خامیوں یا کسی قسم کے خلاء کی پوری ذمہ داری مرتب کے سر ہے، سیّد مودودیؒ کی ذات پر ہرگز نہیں۔

۸ جون ۱۹۷۹ء
۱۳۹ قائداعظم ہال، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

مرتب
سلیم منصور خالد

’’میری محسن کتاب‘‘ کے زیر عنوان ایک قلمی مذاکرے کے لئے تحریر

جاہلیت کے زمانے میں میں نے بہت کچھ پڑھا ہے۔ قدیم و جدید فلسفہ، سائنس، معاشیات، سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں۔ مگر جب آنکھ کھول کر قرآن کو پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا، علم کی جڑ اب ہاتھ آئی ہے۔ کانٹ، ہیگل، نطشے، مارکس اور دنیا کے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں۔ بے چاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں الجھتے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں پھر بھی حل نہ کر سکے۔ ان کو اس کتاب نے ایک ایک دو دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا ہے ______ میری اصلی محسن بس یہی کتاب ہے۔ اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا۔ حیوان سے انسان بنا دیا۔ تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی اور ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا کہ زندگی کے جس معاملے کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح برملا دکھائی دیتی ہے کہ گویا اس پر پردہ نہیں ہے۔ انگریزی میں اس کنجی کو Master Key (شاہ کلید) کہتے ہیں جس سے ہر قفل کھل جائے۔ سو میرے لئے یہ قرآن ’’شاہ کلید‘‘ ہے۔ مسائل حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں کھل جاتا ہے۔

جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے، اس کا شکر ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔

ابوالاعلیٰ

اسلامی جمعیت طلبہ، کراچی کے ''نوشتۂ دیوار'' ''سحر'' کے لئے پیغام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی جمعیت طلبہ کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے نوشتۂ دیوار کا نام ''سحر'' رکھے۔ جس نظام تعلیم کی درس گاہوں کو دیکھ کر اکبر چیخ اٹھا کہ

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اس کی کوکھ سے موسیٰؑ صفت نسل جنم لینے لگے، تو یہ واقعی ایک سحر کی علامت ہے۔

لیکن خبردار! آپ کی یہ سحر کہیں صبح کاذب ثابت نہ ہو، اسے صبح صادق بنایئے! سحری کھا کر سو نہ جایئے، پو پھٹتے ہی نماز کی تیاری کیجئے!

دوران تعلیم دین کا چرچا کرنا اور تعلیم سے فارغ ہوتے ہی دنیا کی طلب میں گم ہو جانا، ایسا ہی ہے جیسے کوئی سحری کھا کر سو جائے۔ آپ کی نماز یہ ہے کہ جو تیاری آپ نے زمانۂ طالب علمی میں کی ہے، اسے کالجوں سے نکلنے کے بعد پوری طرح اقامت دین کی سعی میں استعمال کریں۔

اس طرح آپ رات کی تاریکی کو دن کی روشنی میں بدل سکیں گے۔
اس طرح آپ کی صبح، صبح صادق ثابت ہوگی۔

ابوالاعلیٰ

اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان' کے تیسرے سالانہ اجتماع لاہور میں خطاب کے بعد ـــــــ ۲۶ نومبر ۱۹۵۰ء

سوال: دورانِ تعلیم طلبہ کو عملی سیاست میں کس قدر دلچسپی لینی چاہیے؟

جواب: کسی مضمون میں ٹھوس قابلیت اور گہری بصیرت اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی، جب تک طلبہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ تعلیم پر صرف نہ کریں۔ سیاست براہِ راست آپ سے متعلق نہیں ہے، بلکہ اس نسل سے متعلق ہے جو تعلیم حاصل کر کے عملی زندگی کے میدان میں اُتر چکی ہے۔ سیاست سے آپ کا تعلق اس لحاظ سے ہوسکتا ہے کہ ملک کے سیاسی حالات اور قومی معاملات سے آپ باخبر رہیں، آپ سیاست میں عملی حصہ لینے کے بجائے اس کا عملی مطالعہ کریں تاکہ آپ پختہ رائے قائم کرنے کے قابل بن سکیں اور آپ کی معلومات سطحی اور نظر اتھلی نہ ہو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست آپ کے لئے شجر ممنوعہ ہے۔ ایک ملک کے نوجوان اپنے ملک کے معاملات سے بے تعلق نہیں رہ سکتے۔ کبھی ایسا موقع اور وقت آسکتا ہے کہ آپ کو عملی طور پر اس میں حصہ لینا پڑے، لیکن اس کا ہر روز موقع نہیں آتا، اگر کوئی ایسا موقع آئے تو اپنا فرض انجام دینے کے بعد ایمانداری سے پھر اپنی تعلیم کی تکمیل میں لگ جائیے، البتہ سیاست کا چٹخارہ لینے کی عادت نہ ڈالیے۔

سوال: کالجوں میں سٹوڈنٹس یونینز کی سیاست میں ہمارا کردار کیسا ہونا چاہیے؟

جواب: انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے کالجوں کی سیاست ہمارے ملک کی سیاست کا عکس بن کر رہ گئی ہے، میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ Agitator طالب علموں کا ساتھ نہ دیں بلکہ آپ ان لوگوں کا ساتھ دیں جو سب سے زیادہ محنتی معقول اور شریف

آدمی ہوں، بعض اوقات کالجوں میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جو نہ صرف طلباء کو ناگوار گزرتے ہیں بلکہ فی الواقع خراب ہوتے ہیں، میرا خیال ہے کہ اگر معاملہ کو نبٹانے کے لئے سنجیدہ کوشش کی جائے تو کوئی آدمی ایسا نہیں ہو سکتا جو شرافت اور سنجیدگی کا زیادہ دیر تک مقابلہ کر سکے، معاملہ اس وقت بگڑتا ہے، جب خرابی سے خرابی دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ہمیشہ برائی کو بھلائی سے دور کرنے کی کوشش کریں، زندگی کی اصلاح اسی طریق سے ممکن ہے۔

میں اس چیز سے آپ کو منع نہیں کرتا کہ آپ نظام تعلیم کی خرابیوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کریں۔ ان کو دور کرنا آپ کا فرض ہے، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ کے طریقے معقول، سنجیدہ اور شریفانہ ہوں اور اس طرح آپ اپنے ماحول کی ہر برائی کو مٹانے کی کوشش کریں۔

سوال: ملک میں میڈیکل کالجز سے فارغ طلبہ کے لئے جبری ملازمت کے مسئلہ پر آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: اس وقت جو سوال میرے سامنے پیش کیا گیا ہے اس کے متعلق میں ابھی تک کوئی رائے قائم نہیں کر سکا۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ اگر کسی وقت قوم و ملک کو کسی فن کے ماہرین کی ضرورت ہو تو اُن کی خدمات جبری طور پر حاصل کی جا سکتی ہیں، اس وقت ڈاکٹروں کی بے حد کمی ہے اور سینکڑوں دیہات کے احاطہ میں ایک بھی ڈاکٹر موجود نہیں۔ یہ تجویز بالکل معقول ہے کہ ڈاکٹروں کی خدمات جبراً حاصل کر لی جائیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ شہروں میں تو ڈاکٹر کثرت سے موجود ہوں اور دیہات میں لاکھوں بندگانِ خدا طبی امداد کے محتاج رہیں، مگر اس کے ساتھ یہ چیز بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں کی خدمات حاصل کی جائیں اُن کو معقول معاوضہ بھی دیا جائے تا کہ ان کی ضروریات بھی پوری ہوں، یہ ایک برحق اصول ہے۔ معاوضوں میں عظیم تفاوت کسی صورت میں بھی معقول قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سوال: مولانا! شرافت اور معقولیت کی کیا حدود ہیں؟

جواب: میں سمجھتا تھا کہ شرافت اور معقولیت ایسے الفاظ ہیں جن کا مطلب ہر کوئی سمجھتا ہے، اس کی وضاحت کی ضرورت پر مجھے تعجب ہوا ہے۔ میں ایک ایسے معیار کی طرف توجہ دلاؤں گا جس سے آپ فیصلہ کر سکیں گے، کہ غیر شریفانہ کیا ہے اور شریفانہ کیا ــــ وہ معیار یہ ہے کہ۔

آپ دوسرے کے مقابلہ میں وہ طریقہ اختیار کریں جو اگر آپ کے خلاف استعمال کیا جائے تو آپ کے نزدیک قابلِ اعتراض نہ ہو۔

سوال: اطلاقی اقتصادی مسائل میں اسلامی نقطہ نظر کے مطابق کتب کی کمی نہایت پریشان کن ہے اس کے لئے فوری طور پر کیا کیا جا سکتا ہے؟

جواب: اس وقت رونا بھی اسی بات کا ہے کہ اصول تو موجود ہیں لیکن ایسی کتابیں موجود نہیں ہیں جن میں ان اصولوں کو زمانہ کے مسائل پر منطبق کیا گیا ہو، اسی اہم کام کے لئے آپ لوگوں کو تیار ہونا ہے، آپ کو چاہیے کہ ''معاشیات'' میں گہری نظر پیدا کریں اور معاشیات کے مسائل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قرآن و حدیث کا مطالعہ کریں، اور اس طرح ان کتابوں کو مرتب کریں، جن کا ہر طرف سے مطالبہ کیا جا رہا ہے لیکن بہت کم ایسے لوگ ہیں جو پتہ مار کر محنت کرنے کے لئے تیار ہیں، طلب گار تو بہت ہیں لیکن اس کی رسد پیش کرنے کے لئے بہت کم لوگ آگے بڑھنے کے لئے تیار ہیں۔

سوال: طلبِ کے لئے ملکی حالات میں ہنگامی کیفیت کے ادراک کا مناسب طریقہ کیا ہے؟

جواب: ہنگامی حالات کی فہرست مرتب کرنا بہت مشکل ہے لیکن کوئی ایسا آدمی ہونا چاہیے، جس پر اعتماد ہو اور جو آپ کو اس بات کا مشورہ دے کہ آپ کو کس حد تک عملی اور ہنگامی سیاسیات میں حصہ لینا چاہیے، جذباتی آدمی پر اعتماد کرنا بہت افسوسناک ہوگا، طلبہ کو کسی واقعی معقول، سنجیدہ اور صاحب الرائے آدمی پر اعتبار کرنا چاہیے۔

سوال: ملکی انتخابات میں طلبہ کو کیا کردار ادا کرنا چاہیے؟

جواب: میرا خیال ہے کہ ان طلبہ کو جو ووٹر ہوں، یہ سوچنا چاہیے کہ وہ کس کو ووٹ دیں اور کس کو نہ دیں وہ اپنے ووٹ کا حق ضرور استعمال کریں مگر میں ان کو Canvassing (انتخابی مہم چلانے) کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا، زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ اپنے فارغ اوقات میں اپنے قریب کے لوگوں کو انتخابات کی اہمیت سے آگاہ کریں اور جس شخص کو آپ حق پر جانیں اس کی تائید کریں لیکن یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آپ اپنی تعلیم کو ترک کردیں، انتخابات (Polling) کے وقت اگر طلباء ناروا طریقوں کو روکنے کی کوشش کریں، کہ آج تک ہمارے ملک میں انتخابات میں ناجائز طریقے ہی استعمال ہوتے رہے ہیں۔ تو یہ کام بہت مفید ثابت ہوگا۔

سوال: اسلامی حکومت میں بلاسود بینکنگ کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائے گا؟

جواب: اس کے متعلق میں حال ہی میں کتاب ''سود'' لکھ چکا ہوں، اگر آپ اس کو پڑھیں تو آپ کو اس کا مفصل جواب مل جائے گا۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ سود کو قطعی طور پر ممنوع قرار دے دیا جائے۔ لین دین کے معاملات یا تو فیاضی پر مبنی ہوں یا نفع ونقصان کی شرکت پر، بنکنگ کو بھی نفع ونقصان کی شرکت کے اصولوں پر قائم کرنا چاہیے، اس میں شرح منافع کا تعین نہیں ہوگا، اس اصول پر بنک زیادہ اچھی طرح چل سکتے ہیں اور معیشت ترقی کرسکتی ہے۔ لیکن یہ نظام اس وقت تک نہیں چل سکتا جب تک کہ حکومت مرکزی بنکوں کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لے اور وہاں سے سود کو ساقط کردے، سودی اور غیر سودی کاروبار ساتھ ساتھ چلانے میں سود کو قیامت تک ختم نہیں کیا جاسکتا۔

سوال: کیا خلافت راشدہؓ کے بعد اسلامی نظام کا برپا نہ رہنا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ اسلام صرف ۳۰ برس قائم رہ سکا؟ اور اب اس کے قیام کے کوئی امکانات نہیں ہوسکتے؟

جواب: خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی معاشرہ اسلامی اصولوں سے دور ہٹتا گیا ہے' بعض لوگوں نے اس سے استدلال پر یہ عمارت تعمیر کی ہے کہ اسلام ناکام ہو چکا ہے اور جو نظام تیس برس چلنے کے بعد درہم برہم ہو گیا' اب اس کے نفاذ کی کوشش کرنا غیر ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ ''اسلامی نظام صرف ۳۰ برس تک چلا''۔ یہ تاریخ کے اعتبار سے بالکل غلط ہے تیس برس تک اسلام کا نظام اپنی پوری شکل اور روح کے ساتھ نافذ رہا لیکن دنیا کی تاریخ میں کوئی نظام اپنے اصولوں پر ایک دن کے لئے بھی قائم نہیں رہ سکا۔ یہ اسلام کا ہی معجزہ ہے کہ وہ تیس سال کے لئے چلا اور صرف ایک ملک میں ہی نہیں بلکہ اس وقت کی مہذب دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ میں چلا، دنیا میں اور کوئی دوسرا نظام اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔

دوسرے یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ''تیس سال کے بعد یہ نظام درہم برہم ہو گیا''۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ تیس برس کے بعد یہ نظام اس معیار پر نہ چل سکا' جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ نے اسے چلایا تھا، لیکن اس کے بعد یہ ایک تحریک کی صورت میں چلتا رہا۔ لوگوں کی زندگی میں اس کا اثر بہت نمایاں رہا۔ باوجود سب باتوں کے مسلمانوں کے اندر ایک ایسا گروہ موجود رہا ہے جو مسلسل اس امر کی کوشش کرتا رہا کہ پوری انسانی زندگی کو اسلام کے مطابق چلایا جائے، اس کو ناکامی کا مترادف نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسلام ناکام ثابت نہیں ہوا بلکہ لوگ ناکام ہوئے ہیں۔

صحت کے اصولوں کی مثال کو پیشِ نظر رکھیے۔ اگر انسانوں کی عظیم الشان اکثریت ان اصولوں کے خلاف چلتی رہے تو کیا وہ اصول ناکام ہوتے ہیں' یا وہ انسان۔ آپ یہ دیکھیے کہ اسلام کے اصول برحق ہیں یا نہیں۔ اس نظام کو فرشتے نہیں' بلکہ وہ لوگ چلائیں گے جو اس کو برحق سمجھتے ہیں۔ اس دنیا میں نازیت' کمیونزم' سرمایہ دارانہ جمہوریت چل سکتی ہے تو اسلام کیوں نہیں چل سکتا، اسلام دوسرے نظاموں کی نسبت فطرت کے قریب ہے، بلکہ عین فطرت ہے اس لئے آپ اپنے فرض کو پہچانیں اور جس چیز کو آپ حق سمجھتے ہیں اس کو چلانے کی کوشش کریں۔

یوم آزادی پاکستان کے موقع پر اسلامی جمعیت طلبہ، کراچی کے کارکنوں کی نشست میں ـــــــ ۱۴، اگست ۱۹۵۵ء

سوال: آپ مطالعہ کس طرح کرتے ہیں؟

جواب: اس سلسلے میں صرف اتنا کہنا کافی ہو گا کہ میں مطالعہ محض طلب علم کے لئے کرتا ہوں، تفریحاً نہیں کرتا۔ لہٰذا میرا یہ قاعدہ ہے کہ جب کچھ پڑھتا ہوں تو پنسل ساتھ رکھتا ہوں، کام کی چیزوں پر نشان لگاتا ہوں اور حاشیے پر نوٹ کرتا رہتا ہوں۔ علاوہ ازیں میں اس بات کی بھی کوشش کرتا ہوں کہ اہم باتیں میرے حافظے میں رہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص غور اور دلچسپی سے پڑھے تو یاد رکھنا مشکل نہیں ہے۔ آپ لوگ بھی پڑھتے وقت یہ دیکھا کریں کہ اس کتاب میں کونسی چیز کام کی ہے اور جو کام کی چیزیں ملیں انھیں نوٹ کر لیں۔ مطالعہ ہمیشہ نظم کے ساتھ کیجئے اور منتشر مطالعہ نہ کیجئے۔ ایک فن کی معتد بہ چیزیں پڑھیے اور جب تک اس فن کا اچھا خاصا علم حاصل نہ کرلیں، آگے نہ پڑھیں۔

سوال: آپ جمعیت کے کارکنوں سے کیا توقع رکھتے ہیں؟

جواب: توقعات تو میری اتنی لمبی چوڑی ہیں جن کو بیان کرنے کے لئے وقت چاہیے، مختصراً یوں سمجھیے کہ وہ مضبوط کیرکٹر کے مالک ہوں اور کردار کی یہ مضبوطی ان کی اپنی زندگی تک ہی محدود نہ ہو بلکہ ان میں دوسروں کو متاثر کرنے کی بھی بے پناہ صلاحیت ہو۔

سوال: اخلاق کی نشاۃ ثانیہ کے لئے آپ کیا مشورہ دیتے ہیں؟

جواب: یہ بڑا اہم سوال ہے۔ اس سلسلے میں میرا پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ اجتماعی زندگی کو مضبوط کیجئے۔ ہمیشہ یہ ہوتا آیا ہے کہ اجتماعی فساد کا مقابلہ اجتماعی اصلاح سے کیا جاتا

ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اجتماعی فساد کو انفرادی اصلاح سے دبایا جا سکے۔ ایک تنکا کسی سیلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتا بلکہ اس میں تو اتنی قدرت بھی نہیں ہوتی کہ وہ اس سیلاب میں اپنے آپ کو بہہ جانے سے بچا سکے ___ لہٰذا سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ تمام ہم خیال افراد کو اکٹھا کر کے ایک اجتماعی طاقت پیدا کی جائے اور اس اجتماعی طاقت کو منتشر کرنے والی طاقتوں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا جائے۔ نتیجۃً جو معاشرہ قائم ہوگا اس کا ہر فرد ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہوگا۔ ہر فرد دوسرے پر نظر رکھے گا اور اس کی اصلاح میں کوشاں ہوگا ___ یہ سب سے پہلی ضرورت ہے۔ دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ ہر شخص خود اپنی زندگی کا جائزہ لے کہ وہ کس حد تک اجتماعی فساد سے متاثر ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں آپ اپنے آپ کو نہ تو Over-estimate کیجیے اور نہ Under-estimate کیجیے، بلکہ صحیح صحیح اندازہ لگائیے کہ آپ فسادِ ماحول سے کس حد تک متاثر ہو رہے ہیں اور پھر اپنے اندر سے اس کسر کو نکالنے کی پوری پوری کوشش کیجیے۔ اگر آپ کی تنظیم میں ہمدردانہ تنقید کا جذبہ موجود ہوگا (معاندانہ تنقید کا نہیں) تو آپ کے دوست خود آپ کی کوتاہیوں کے بارے میں بتائیں گے اور اس طرح آپ میں سے ہر شخص اپنی اصلاح کر سکے گا۔

تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ آپ کے اندر مضبوط ارادہ موجود ہونا چاہیے۔ مضبوط ارادے سے میری مراد یہ ہے کہ آپ کے اندر جھجک نہ ہو، کمزوری نہ ہو، ایک ایک شخص جس سے آپ کو سابقہ پیش آئے اس پر اثر ڈالنے کی کوشش کیجیے۔ اس طرح اگر آپ میں سے ایک ایک فرد اس کی طرف متوجہ ہوگا۔ تو آپ اجتماعی فرض سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔

سوال: تمام عالم اسلام کی اسلامی تحریکوں کو متحد کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی جاتی؟

جواب: اس وقت بدقسمتی سے تمام مسلمان ملکوں میں قومیت پرستی (Nationalism) کا دور دورہ ہے جس کی وجہ سے یہ بات ممکن نہیں ہے۔ کم و بیش تمام ممالک کے سربراہ اپنے اپنے ملک میں تحریکِ اسلامی کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس صورت میں وہ متحد ہو کر تحریک

کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا فی الوقت اتنا ہی کافی ہے کہ یہ تحریکیں صحیح خطوط پر چلتی رہیں اور ایک دوسرے سے صرف واقفیت اور ہمدردی رکھیں۔

سوال: طلبہ کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں؟

جواب: طلبہ کو سیاست بازی سے پرہیز کرنا چاہیے البتہ اپنے ملک کی سیاست سے دل چسپی لینا چاہیے۔ سیاسی مسائل کے بارے میں اپنی رائے رکھنی چاہیئے اپنے آپ کو آئندہ عملی زندگی میں حصہ لینے کے لئے تیار کرنا چاہیے لیکن عملی سیاست سے علیحدہ رہنا چاہیے۔ البتہ اگر کبھی کوئی خاص حالت درپیش ہو اور جب ساری قومی قوت کو ایک مقصد کے لئے استعمال کرنا ناگزیر ہو جائے تب بہر حال طلبہ کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔

سوال: آپ کو جو دعوتِ مباہلہ دی گئی تھی اس کو آپ نے کیوں منظور نہیں کیا؟

جواب: اصل میں میں کوئی پیشہ ور پہلوان تو ہوں نہیں کہ ہر وقت تیار رہوں جب کوئی دعوتِ مباہلہ دے جھٹ میدان میں کود پڑوں۔ پھر اس مباہلے کے طریقے کو جو اپنایا گیا ہے، کتاب وسنت اور سیرتِ صحابہ وتابعین وتبع تابعین میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی بجز اس ایک واقعہ کے جس کے بارے میں میں آگے بتاؤں گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ برس کی نبوت میں ہزاروں لوگوں کو دعوت اسلام دی مگر بجز ایک خاص صورت کے آپ نے کبھی دعوتِ مباہلہ نہ دی۔ صحابہ کرامؓ نے بھی اس طریقے کو اختیار نہیں کیا حالانکہ ان میں بڑے بڑے اختلافات بھی رونما ہوئے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا اختلاف ہوا۔ حضرت طلحہؓ وزبیرؓ اور حضرت علیؓ کا اختلاف ہوا۔ حضرت عثمانؓ اور ان کے مخالفین میں جھگڑا ہوا۔ مگر ان سارے موقعوں پر بھی اس طریقے کو استعمال نہیں کیا گیا اور آگے چلیے تو تابعین اور تبع تابعین اور آئمہ میں بڑے بڑے اختلاف ہوئے مگر ان کے حل کے لئے کبھی ایسی صورت اختیار نہیں کی گئی کہ مباہلہ کیا گیا ہو۔ بعد میں چل کر کچھ لوگوں نے اس کو پیشہ بنا لیا کہ ہر اختلاف پر کہنے لگے کہ تم اپنے بیوی بچوں کو لے آؤ ہم اپنے بیوی بچوں کو لے آتے ہیں اور اللہ کی لعنت اور غضب کو

دعوت دیتے ہیں۔

اس قسم کی نظیر پوری اسلامی تاریخ میں صرف ایک ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کو یہ علم تھا کہ نجران کا وفد اِس بات کو تسلیم کر رہا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صحیح کہہ رہے ہیں۔ اس موقعہ پر اس بات کی دعوت دی گئی لیکن کبھی صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین نے اس کو نظیر یا سنت نہیں بنایا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلافات کے حل کا یہ طریقہ نہیں بتایا کہ اس طرح ایک دوسرے پر لعنت بھیجی جائے۔

پھر یہ سوچیے کہ اس طریقے سے تصفیہ کس چیز کا ہوگا —؟ ایک فریق یہ کہتا ہے کہ اگر میں غلط ہوں تو مجھ پر لعنت اور دوسرا کہتا ہے کہ اگر میں غلط ہوں تو مجھ پر لعنت۔ آخر تصفیہ کس چیز کا ہوا؟ کیا بات طے ہوئی؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص موقع پر دعوتِ مباہلہ اس لئے دی تھی کہ آپؐ جانتے تھے کہ وہ لوگ اس بات کی جُرات نہیں کر سکتے لیکن اب لوگوں نے اسے اختلافات کے ”حل“ کی ایک صورت قرار دے دیا ہے۔

سوال: موسیقی کی حرمت میں آپ کوئی نص پیش کر سکتے ہیں؟

جواب: ایک حدیث ہے کہ ”میں مزامیر (آلاتِ موسیقی) کو توڑنے کے لئے بھیجا گیا ہوں“۔

گویا آپ کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی تھا اس کے علاوہ اور بھی کئی احادیث ملتی ہیں۔ اکابر صوفیاء نے ہمیشہ اس سلسلہ میں احتیاط برتی ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ دف سے آگے نہیں بڑھے۔ جب کبھی سماع کی محفل ہوتی تھی تو اس کے لئے کچھ شرائط بھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ متبع شریعت لوگ جمع ہوں، توحید وغیرہ کے مضامین گائے جائیں گانے والے سن رسیدہ لوگ ہوں وغیرہ۔

سوال: موسیقی کی حرمت کی کیا وجہ ہے؟ کیا یہ ایک فطری جذبہ نہیں؟

جواب: تاریخ انسانی کے آغاز سے موسیقی، شراب اور زنا ان تین چیزوں کے درمیان

ایک ایسا تعلق رہا ہے گویا یہ سگی بہنیں ہیں۔ جہاں ایک پہنچی ہے وہاں دوسری دو بہنیں بھی پہنچ گئی ہیں۔ اس وجہ سے اسلام نے ان تینوں پر پابندی عائد کی ہے اور انسانی فطرت کے لئے صحیح حدود مقرر کر دی ہیں۔ زنا کو فوجداری جرم قرار دیا ہے۔ شراب کے لئے انسان میں کوئی فطری جذبہ نہیں ہے اس لئے اس کو قطعاً حرام قرار دیا ہے۔ البتہ انسان کے دل میں موسیقی کے لئے اس حد تک فطری جذبہ موجود ہے کہ وہ خوش آوازی کو پسند کرتا ہے مگر اس کو اس حد تک بڑھانا کہ دن بھر اس کے سوا کوئی کام نہیں، اسلام میں جائز نہیں، محض گا لینا ممنوع نہیں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اونٹ چراتے ہوئے گانے والے حدی خوان کہلاتے تھے۔ قرآن پاک کے لئے بھی حکم دیا گیا ہے کہ اس کو خوش الحانی سے پڑھا جائے۔

سوال: داڑھی یہودی بھی رکھتے ہیں اور مسلمان بھی۔ دونوں میں کیا فرق ہے؟

جواب: اس میں آپ ایک اور گروہ[1] کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ دراصل داڑھی یہودیوں میں بھی انبیاء علیہم السلام کی سنت سے آئی ہے۔ ان کے یہاں یہ روایت صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ مسلمانوں اور یہودیوں کی داڑھی میں فرق اتنا ہے کہ یہودی بالکل بے ہنگم طریقے پر داڑھی مونچھ رکھنے کے عادی ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی سنت نہیں ہے۔ اس کے برعکس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کو سلیقہ سے رکھنے کو کہا ہے۔

سوال: ننگے سر پھرنا یا نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب: اسلام نے نہ تو سر ڈھانکنے کا حکم دیا ہے اور نہ سر کھولنے کا۔ لہٰذا اگر کوئی سر ڈھانک کر پھرے تو کوئی مضائقہ نہیں اور اگر سر کھول کر پھرے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ـــــ مگر ہمارے یہاں ایک بہت پرانی قومی تہذیب بھی ہے جو ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم ننگے سر پھریں۔ ۱۹۲۹ء میں جب میں نے دہلی چھوڑا تو اس وقت

---

[1] اشارہ سکھوں کی طرف ہے۔

کوئی مہذب خاندان سے تعلق رکھنے والا فرد ایسا نہ تھا جو ننگے سر پھرتا ہو لیکن ۱۹۳۷ء میں جب دوبارہ دہلی آیا تو تقریباً تمام نوجوانوں میں یہ عادت پڑ چکی تھی۔ یہ تغیر جو پچھلے بیس سالوں میں ہوا ہے ہماری قومی روایات سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔

جہاں تک نماز کا تعلق ہے میری قطعی رائے یہ ہے کہ جان بوجھ کر ننگے سر نماز نہ پڑھی جائے۔ اس لئے کہ یہ آدابِ نماز کے خلاف ہے۔ قرآن میں ہے کہ ''اپنی پوری زینت کے ساتھ نماز پڑھو۔'' اور اس زینت میں سر کا لباس شامل ہے۔

سوال: مغربی لباس کا اختیار کرنا کیسا ہے؟

جواب: اس سوال کا جواب میں تفہیمات حصہ دوم میں ایک مضمون[1] میں دے چکا ہوں۔ اس کے پڑھنے کے بعد کسی شخص کے ذہن میں کوئی شبہ نہیں رہنا چاہیے۔ مختصراً اتنی بات سمجھ لیجیے کہ ایک قوم کا کسی دوسری قوم کے لباس کو اختیار کرنا بہت بڑی نفسیاتی کمزوری ہے کیونکہ یہ محض ایک لباس کو اختیار کرنا نہیں بلکہ تہذیب وتمدن کے اعتبار سے اپنی شکست خوردگی اور مغلوبیت کا اعتراف ہے۔ جہاں تک مغربی ممالک کے لوگوں کا تعلق ہے اگر وہ اسلام لانے کے بعد اپنا ملکی لباس اختیار کرنا چاہیں تو ان کو کوئی نہ کوئی علامت اپنے لباس میں ضرور اختیار کرنی چاہیے جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ یورپ میں جو لوگ نومسلم (Convert) ہوتے ہیں۔ وہ خود اس بات کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو کسی مسلمان ملک میں رہتے ہیں ان کے لئے یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ ایسا لباس پہنیں جس سے معلوم نہ ہو سکے کہ وہ مسلمان ہیں یا نہیں۔

سوال: مغربی لباس کے پہننے میں کیا حرج ہے؟

جواب: ہر شخص یہ جانتا ہے کہ یہ لباس آپ کی قوم کا نہیں بلکہ باہر سے آئی ہوئے ایک قوم کا ہے جسے دیکھ کر آپ نے اختیار کیا ہے۔ کسی قوم کا اپنے لباس کو ترک کر کے کسی دوسری قوم کے لباس کو اختیار کرنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ یہ تصور کرتے ہیں کہ فلاں

---

[1] دیکھیے 'لباس کا مسئلہ' ''تفہیمات'' جلد دوم: از سید مودودیؒ

قوم (ترقی یافتہ) (Developed) ہے اور ہم پسماندہ (Back-ward) اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ کوئی امریکن یا برطانوی ایسا نہیں ہے۔ جس نے سالہا سال تک یہاں رہ کر بھی یہاں کا لباس اختیار کر لیا ہو، اِلا یہ کہ Fancy Dress وغیرہ کے لئے ہو تو ہو، اور یہاں حالت یہ ہے کہ کالجوں میں جو لوگ شیروانی پہن کر جاتے ہیں ان کا مضحکہ اُڑایا جاتا ہے گویا اگر ایک شخص اپنے ہی ملک میں اپنا تمدن اختیار کرتا ہے تو اس کا اس کے ہم قوم مذاق اُڑاتے ہیں۔ بعض سرکاری افسروں کا خیال ہے کہ اگر وہ کوٹ پتلون کے بجائے شیروانی پہن کر جائیں تو ماتحتوں پر رُعب قائم نہیں ہوتا گویا ہم آزاد ہونے کے بعد بھی انگریزوں کے لباس کے غلام رہے۔

سوال: جو لوگ ڈاڑھی رکھے ہوئے ہوں اور وہ فوج کے کمشنڈ آفیسرز کے انٹرویو میں جائیں تو ایسے لوگوں کی ناکامی قریب قریب یقینی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: یہ تو آدمی خود ہی فیصلہ کرے کہ وہ فوج میں کمیشن لینا چاہتا ہے یا ڈاڑھی رکھنا چاہتا ہے ـــــــــ ایک ڈاڑھی پر ہی موقوف نہیں، عام طور پر صورت یہ ہے کہ جہاں انٹرویو سے فیصلہ کیا جاتا ہے وہاں ایسے ایسے سوالات کیے جاتے ہیں۔ جن سے یہ پتہ چلے کہ اس کم بخت کے اندر ایمان کی کوئی رمق تو نہیں پائی جاتی؟ ڈاڑھی تو کھلی علامت ہے کسی کے ”خطرناک آدمی“ ہونے کی! لیکن یہ نہ بھی ہو تو وہ ایسے ایسے سوالات کرتے ہیں جن سے معلوم ہو جائے کہ یہ شخص دین سے کس حد تک لگاؤ رکھتا ہے۔ مثلاً پردے اور شراب وغیرہ کے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ تم اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو، تاکہ اگر اس میں رتی برابر ایمان ہے تو اسے نہ لیا جائے۔ کئی ایسی پابندیاں لگا رکھی ہیں کہ کوئی مسلمان نہ آنے پائے ـــــــــ ڈاڑھی کے متعلق ایسا کوئی حکم خواہ بظاہر نہ ہو لیکن عملاً یہی ہوتا ہے۔ پھر جو لوگ ملازم ہو جانے کے بعد ڈاڑھی رکھتے ہیں انھیں بھی خاصی کشمکش اور مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہ کم از کم ان کی ترقی میں تو مانع ہوتی ہے۔ اور یہ چیز ان لوگوں کے دائرہ اختیار کے اندر ہو رہی ہے جنھوں نے سکھوں کے ماتحت ملازمتیں کی

ہیں!

باقی رہی یہ بات کہ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے تو اس کا جواب یہ ہے کہ صبر کیجئے اور ساتھ ساتھ اِن حالات کو بدلنے کے لئے اپنی طاقت صرف کیجئے ـــــ میرے لئے یہ کہنا تو کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اس مجبوری سے تم احکام شرعیہ کو چھوڑ دو۔ اگر کوئی شخص چھوڑنا چاہے تو اپنی ذمہ داری پر چھوڑے، مجھے اس ذمہ داری میں کیوں شریک کرتا ہے۔ اسے تو عہدہ ملے گا مگر میں تو اللہ تعالیٰ کے ہاں پکڑا جاؤں گا۔ اس لئے میں کسی شخص سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں مصلحت کے تحت تم فلاں حدود شرعی کی خلاف ورزی کرو۔

سوال: کیا کسی ایک امام کی تقلید جائز ہے؟ قرآن اور حدیث کی موجودگی میں فقہ کی کیا ضرورت ہے اور کسی ایک امام کی فقہ کو کیوں اختیار کیا جائے؟

جواب: یہ بیچ کا سوال بہت دلچسپ ہے کہ قرآن و حدیث کی موجودگی میں فقہ کی کیا ضرورت ہے؟ ـــــ اصل میں بات یہ ہے کہ فقہ کہتے ہیں سمجھ بوجھ کو ـــ! اب آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس کی کوئی ضرورت ہے یا نہیں؟ ـــــ

جب آدمی قرآن اور حدیث پر غور کرے اور اس کا مدعا سمجھنے کی کوشش کرے اور اس سے وہ یہ معلوم کرے کہ اللہ اور اُس کا رسول فی الواقع ہم سے کیا چاہتے ہیں اور ہمارے لئے راہِ عمل کیا ہے تو اسی چیز کا نام فقہ ہے ـــــ یہ پوچھنا کہ فقہ کی کیا ضرورت ہے بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص کہے کہ قرآن کو سمجھنے کی کیا ضرورت ہے اور حدیث پر غور کرنے کی کیا حاجت ہے؟

اب دیکھئے کہ اصطلاحاً فقہ کس چیز کو کہتے ہیں۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ عام لوگوں کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص قرآن و حدیث میں اتنی نظر پیدا کر لے کہ وہ خود مسائل کا استنباط کر سکے۔ نہ ہر ایک کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے اور نہ ہر ایک میں اتنی صلاحیت ہے ـــــ اللہ کے کچھ بندوں نے دین کا فہم حاصل کرنے اور پھر اسے ایک مفصل اور مرتب صورت میں پیش کرنے میں عمریں کھپا دیں۔ اُنھوں نے قرآن پر غور کر کے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر اور آپؐ

کے زمانے کے جملہ احوال پر غور کر کے، صحابہؓ کے زمانہ میں جو عمل تھا اسے معلوم کر کے اور تابعین نے جو فتوے دیے تھے ان سب کو جمع کر کے، شریعت کے جملہ احکام و مسائل منقح کر کے نکالے اور انھیں ایک جامع شکل میں پیش کر دیا۔ یہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے جو انھوں نے انجام دیا اور اس طرح انھوں نے محنت کر کے بے شمار لوگوں کے لئے آسانیاں پیدا کر دیں۔ آج بعض لوگ ان کی ان عظیم الشان خدمات کا صلہ یہ دیتے ہیں کہ ان پر تنقید اور اعتراضات کرتے ہیں ـــــ اب ظاہر بات ہے کہ جو شخص خود علم نہ رکھتا ہو، اور اس کے اندر اتنی صلاحیت نہ ہو کہ براہِ راست قرآن و حدیث سے مسائل معلوم کر سکے اسے بہر حال کسی نہ کسی پر اعتماد کرنا ہوگا ـــــ اس کا کام ہے کہ جو شخص علم رکھنے والا ہے، وہ اس سے پوچھے۔ خود قرآن مجید کہتا ہے کہ جو لوگ علم رکھنے والے ہیں ان سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے، اس میں کوئی حرج اور گناہ کی بات نہیں ہے، البتہ ایک آدمی جس کے اندر احکام مستنبط کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور وہ قرآن و حدیث پر غور کر سکتا ہے، اس کے پاس مسائل معلوم کرنے کے ذرائع ہیں، اس کے لئے اس طرح کی تقلید درست نہیں ہے جس طرح کی تقلید عوام کے لئے ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی فقہ کے کسی مسئلے کو ماننے سے پہلے یہ اطمینان کر لے کہ اس کے دلائل کیا وزن رکھتے ہیں اور وہ کہاں تک قرآن و حدیث کے مطابق ہیں۔ اگر دلائل سے اسے یہ محسوس ہو کہ فلاں مسئلہ میں فلاں فقہ کے دلائل کمزور ہیں تو اس کے بعد جان بوجھ کر اگر وہ اسی کی پیروی کرے گا تو غلط کام کرے گا ـــــ آپ دیکھیے کہ جو علماء آج مقلد گروہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ ایک ایک مسئلے میں اپنی تقلید کے دلائل دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس فقہ کا یہ مسئلہ اس بنا پر درست ہے۔ یہ دلیل دینا بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اندھے مقلد نہیں بلکہ تبع ہیں ـــــ پھر کیا فرق پڑتا ہے اس بات سے کہ کوئی شخص امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرے یا مولانا ثناء اللہؒ کی تقلید کرے یا امام بخاریؒ یا ابن تیمیہؒ یا مولانا ابراہیمؒ سیالکوٹی کی تقلید کرے۔ بہر حال جو شخص علم نہیں رکھتا اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ وہ کسی صاحب علم کی بات سنے اور اس پر عمل کرے۔

☆

Student's Voice' اسلامی جمعیت طلبہ کا ترجمان تھا۔

پرچے کے مدیر خورشید احمد صاحب سے گفتگو ______ یکم نمبر ۱۹۵۵ء

وائس: اگلے سال کے اختتام تک ملک میں پہلے عام انتخابات ہونے والے ہیں۔ یہ انتخابات اس اعتبار سے نہایت اہم ہوں گے کہ ان کے ذریعے یہ فیصلہ ہوگا کہ ہمارے ہاں کس قسم کا نظام زندگی غالب رہے گا۔ آپ کی رائے میں اس موقع پر طلبہ کا فرض کیا ہونا چاہیے۔

سیّد مودودیؒ: ایک بات واضح ہے۔ ملک میں سیاسی زندگی جو رخ اختیار کر رہی ہے طلبہ کو چاہیے کہ اُس پر غور کریں، مختلف جماعتوں' ان کے پروگرام اور ماضی میں ان کی کارگزاریوں کا جائزہ لیں اور یہ فیصلہ کریں کہ کون سی جماعت ایسی ہے جو ملک کی بہبود اور بہتری کے لئے کام کر رہی ہے۔

دوسرے یہ کہ جو طلبہ ووٹ دینے کا حق رکھتے ہیں انھیں خوب سوچ سمجھ کر رائے قائم کرنی چاہیے، اپنے ووٹ دینے کے حق کو وہ اسی صورت میں صحیح طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

مزید برآں اگر طلبہ محسوس کریں کہ ملک میں کچھ طاقتیں ایسی ہیں جو ناجائز ذرائع سے اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہیں ہیں اور اقتدار کے یہ بھوکے اگر اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئے تو ہماری قومی زندگی میں ایسی برائیاں داخل ہو جائیں گی جن کا سامنا خود طلبہ ہی کو کرنا پڑے گا، تو انھیں چاہیے کہ وہ ان قوتوں سے لڑنے کے لئے رائے عامہ کو صاف ستھری ووٹنگ کے لئے تیار کریں اور انھیں ناکامی سے دوچار کریں۔

اگرچہ عام حالات میں طلبہ کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے تاہم کبھی کبھار ایسا وقت بھی آپڑتا ہے جب طلبہ کے لئے سیاست میں حصہ لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

وائس: طلبہ کسی قوم کا سب سے زیادہ باشعور، تعلیم یافتہ اور عزم و ہمت کا پیکر طبقہ ہوتے ہیں، کیا آپ کے خیال میں انھیں ملک کی سیاست میں براہ راست حصہ لینا چاہیے؟

سیّد مودودیؒ: ملک کے سیاسی معاملات میں طلبہ کی براہ راست شرکت میں فائدے کے مقابلے میں نقصان اور خطرات بالعموم زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ سیاست میں غرق اور اپنی تعلیم سے لاپروا ہو جاتے ہیں۔ سیاسی سرگرمیوں میں انہماک کی وجہ سے ان کے پاس علم حاصل کرنے کا وقت نہیں رہتا اور اس کا نقصان قوم ہی کو پہنچتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ طلبہ سیاسی طور پر بالغ نہیں ہوتے اور ان کی سیاسی بصیرت خام ہوتی ہے۔ وہ سیاسی معاملات میں کوئی اچھی اور معقول رائے قائم نہیں کر سکتے۔ چونکہ نوجوان ہوتے ہیں اس لئے اقتدار کے بھوکے لوگ انھیں آسانی سے استعمال کر سکتے ہیں طلبہ سیاست میں حصہ لیں تو اس کے نتائج بُرے بھی نکل سکتے ہیں اور اچھے بھی۔

قومی مسائل کو قوم کے بزرگ اور تجربہ کار افراد کے لئے چھوڑ دینا چاہیے اور طلبہ کو تجربے اور علم کی عمر تک پہنچنے کا انتظار کرنا چاہیے جس کے بغیر ایسے معاملات پر صائب رائے دی ہی نہیں جا سکتی۔ اس مرحلے سے پہلے اگر وہ زمامِ قیادت اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کریں گے اور اپنے حق میں فیصلہ کروا بھی لیں تو بھی نتائج قوم کے حق میں مفید نہیں نکلیں گے۔ ماضی میں ہم اس کا اچھا خاصا تجربہ کر چکے ہیں اور ہم اسے دہرانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ صورتِ حال اسی وقت ہوتی ہے جب طلبہ عملی سیاسیات میں مستقل طور پر حصہ لینا شروع کر دیں“۔

وائس: مخلوط تعلیم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

سیّد مودودیؒ: میں اس کا سخت مخالف ہوں۔ میں اسے ملک کی اخلاقی فضا کے لئے تباہ کن، اپنے طلبہ کی ذہنی نشوونما کے لئے رُکاوٹ اور معاشرے کے لئے اہانت آمیز سمجھتا ہوں۔ اس کا تجربہ بہت سے ملکوں میں ہو چکا ہے اور اس کے نتائج آنکھیں کھول دینے والے

ہیں۔ خود ہمارے اپنے ملک میں جہاں بھی مخلوط تعلیم رائج کی گئی اس کے اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے۔

وائس: کہا جاتا ہے کہ مخلوط تعلیم کی بدولت دونوں صنفیں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکیں گی اور یہ چیز ان کے مستقبل کی زندگی میں مددگار ثابت ہو گی۔ آپ کے خیال میں مخلوط تعلیم کا یہ فائدہ کیا کافی نہیں ہے؟

سیّد مودودیؒ: جب مخلوط تعلیم نہیں تھی تو صنفین کو باہمی طور پر سمجھنے میں کون سی کمی تھی؟ دونوں صنفیں اپنی تخلیق کے وقت سے دنیا میں رہتی چلی آتی ہیں اور قدرت انھیں ایک دوسرے کو سمجھنے کی تعلیم ہمیشہ دیتی رہی ہے۔

وائس: موجودہ تعلیمی نظام کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے اور آپ کے خیال میں اس میں کس قسم کی تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟

سیّد مودودیؒ: میرے خیال میں اس سوال کا جواب چند جملوں میں نہیں دیا جا سکتا۔ میں اپنی کتابوں میں اس موضوع پر تفصیل سے قلم اُٹھا چکا ہوں۔

وائس: ہم (طلبہ) بہت سی مشکلات سے دو چار ہیں۔ مثلاً بھاری فیسیں، کتابوں کی ناقابلِ برداشت قیمتیں اور تعلیمی مراعات کا فقدان وغیرہ۔ ان مسائل کو ہم کیسے حل کر سکتے ہیں؟

سیّد مودودیؒ: ان مسائل کو چھان پھٹک کر مرتب کیا جائے اور عوام کے سامنے لایا جائے۔ ہمارے نوجوان جن مسائل سے دوچار ہیں' ان سے ہمارے عوام بالعموم ناواقف ہیں۔ طلبہ کی انجمنوں کو مطالبہ کرنا چاہیے کہ یہ مسائل حل کیے جائیں۔ اس طریقے سے آپ حکام پر دباؤ ڈال کر اپنی شکایات کا ازالہ کروا سکتے ہیں۔

وائس: اگر حکام بات چیت کے ذریعے ہمارے جائز مطالبات تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوں تو کیا ہمیں انھیں منوانے کے لئے ہڑتالیں اور مظاہرے کرنے چاہئیں؟

سیّد مودودیؒ: ہڑتالیں اور مظاہرے آخری چارۂ کار ہوتے ہیں۔ ہمارے برسراقتدار حضرات کی ذہنیت اتنی پست ہے کہ آپ خواہ کسی بھی جائز بنیاد پر کوئی مظاہرہ کریں وہ اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ وہ ہڑتالوں اور مظاہروں کا مقابلہ انھیں خلافِ امن و قانون قرار دے کر کرتے ہیں۔ اس لئے اس قسم کے ذرائع سے مسائل حل ہوتے ہیں یا نہیں البتہ یہ یقینی امر ہے کہ ان سے نئے مسائل جنم لیتے ہیں۔ طلبہ اور حکام کے درمیان تلخیاں پیدا ہوتی ہیں اور پھر تشدد کے واقعات رونما ہو سکتے ہیں۔ ان سے وہ تحریکیں فائدہ اُٹھا سکتی ہیں جو پاکستان کے اتحاد و استحکام کی مخالف ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اپنے مسائل کے لئے الگ الگ لڑنے کے بجائے تمام باشعور افراد جن میں تمام باشعور طبقے شامل ہیں نا اہلِ حکمرانوں کی اس ٹولی کو اقتدار سے محروم کرنے کے لئے متحد ہو جائیں جو نہ تو از خود لوگوں کے مسائل و مشکلات کو سمجھنے اور انھیں دور کرنے کی فکر کرتی ہے اور نہ مطالبے اور دباؤ کے بعد اپنا فرض انجام دیتی ہے۔

وائس: طلبہ نے مشرقی پاکستان کے انتخابات میں وہاں کی حکمران ٹولی کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے حصہ لیا۔ لیکن ان کے جانشین بھی انھیں جیسے نکلے۔

سیّد مودودیؒ: وہاں مشرقی پاکستان میں جو مسئلہ ان کے سامنے رکھا گیا وہ یہ نہیں تھا کہ انھیں دیانتدار لوگوں کو برسراقتدار لانا چاہیے بلکہ وہ یہ تھا کہ انھیں مسلم لیگ کی حکومت کا تختہ الٹنا ہے۔ اُس وقت یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اگر مسلم لیگیوں کو اقتدار سے محروم کر دیا جائے تو جو بھی حکومت قائم ہوگی، دیانت دار ہوگی۔ یہ تجربہ سکھاتا ہے کہ ہمیں دیانتدار اور مخلص لوگوں کو برسراقتدار لانے کی مثبت کوشش کرنی چاہیے۔ جذباتی اور منفی نہیں۔

(ترجمہ: آباد شاہ پوری)

Student's Voice' کراچی کے لئے ایک انٹرویو ____ ۷ نومبر ۱۹۵۷ء

سوال: بین الاقوامی سیاسی مسائل پر گفتگو کرنے سے پہلے کیا آپ یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ آپ کو سب سے زیادہ کس کتاب نے متاثر کیا؟

مولانا مودودیؒ: میں نے بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا ہے ____ ہر قسم اور موضوع کی کتابیں، لیکن جس کتاب نے فی الواقع مجھے متاثر کیا وہ قرآن ہے ____ اور صرف قرآن۔

سوال: لیکن یہ تو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے میں گوشت پوست کے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں؟

مولانا مودودیؒ: تو میں کہوں گا کہ اگرچہ میں نے لاتعداد کتابوں سے استفادہ کیا ہے تاہم کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کہہ سکوں کہ اس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔

سوال: کیا آپ کا خیال ہے کہ تیسری جنگ ہمارے دروازوں پر دستک دے رہی ہے یا آپ اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ جدید ایٹمی ہتھیاروں نے اب جنگ کو ناممکن بنا دیا ہے؟

مولانا مودودیؒ: ہمیں ایک متناقض صورتِ حال درپیش ہے۔ جنگ ناممکن ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا سبب وہ نئی تکنیک اور ایک دوسرے کا خوف ہے جس سے فضا معمور ہے۔ دونوں طاقتیں ایک دوسرے سے خوفزدہ ہیں اور چونکہ ان کی اصل قوت کے بارے میں

ٹھیک ٹھیک کچھ پتہ نہیں۔ اس لئے فوری جنگ بھڑک اٹھنے کا خطرہ بھی نظر نہیں آتا۔ یہ مسلح امن کی حالت ہے، لیکن یہی حالت جنگ سے دوچار کر سکتی ہے۔ اسی خوف کی وجہ سے ہر ملک اپنے آپ کو اسلحہ سے اندھا دھند لیس کر رہا ہے اور جنگ کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔ اور جب جنگ کی تیاری ہو رہی ہو تو کسی بھی چھوٹے سے حادثے پر جنگ چھڑ سکتی ہے۔ اگر فریقین طاقت ور ہوں تو جنگ کسی بین الاقوامی شوشے سے نہیں چھڑتی بلکہ اکثر غیر ارادی یا پہلے سے سوچے سمجھے ہوئے واقعے کا نتیجہ ہوتی ہے۔

سوال: لیکن مولانا، کیا دوسری عالمی جنگ کی تاریخ آپ کے اس نظریے کو تقویت پہنچاتی ہے؟ کیا حقیقت نہیں کہ جرمنی نے پولینڈ پر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت حملہ کیا تھا؟ اور یہی جنگ کا سبب بن گیا؟

مولانا مودودیؒ: جی ہاں ____ میرا مطالعہ کہتا ہے کہ جرمنی ان علاقوں کو محض دھمکی سے اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا۔ اس حکمت عملی کی بدولت اُس نے کئی چھوٹے ملکوں پر قبضہ کر لیا۔ اُس نے ہنگری کو بھی انہی چالوں سے ہڑپ کیا۔ پھر اُس نے سوچا پولینڈ پر بھی اسی طرح قبضہ کیا جا سکتا ہے، لیکن یہاں اُس کا اندازہ غلط نکلا اور انگلستان نے عام جنگ کا اعلان کر دیا۔ جب جرمنی پولیند پر حملہ کرنے چلا تھا تو اس کا یہ خیال نہ تھا کہ دوسری جنگ شروع کر رہا ہے، لیکن عملاً ہوا یہی ____ اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں۔

سوال: آپ کے خیال میں کون سا ملک اگلی جنگ کا میدان بنے گا؟

مولانا مودودیؒ: سائنسی تکنیک ہمیں ایسے مقام پر لے آئی ہے کہ پوری دنیا یا کم سے کم اس کا ایک چوتھائی حصہ جنگ کا میدان بن سکتا ہے، لیکن میرے خیال میں پہلی گولی غالباً جرمنی کی بدنصیب سرزمین میں چلے گی، پھر جنگ بڑی تیزی کے ساتھ دوسرے ملکوں میں پھیل سکتی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ شرقِ اوسط کے خطے میں سب سے زیادہ تباہی آئے گی۔ اگلی جنگ کئی محاذوں پر لڑی جائے گی۔ مغربی یورپ، شرقِ اوسط اور مشرقِ بعید جنگ کے تین اہم میدان ہوں گے۔

سوال: آپ شرقِ اوسط کو اتنی زیادہ اہمیت کیوں دے رہے ہیں؟

مولانا مودودیؒ: میرا احساس ہے کہ اگلی جنگ میں امریکہ، شرقِ اوسط کے اڈوں سے سوویٹ یونین کے مرکزی علاقوں پر حملہ کرے گا۔ اس حملے کے ممکنہ اڈے ترکی و ایران میں ہو سکتے ہیں۔ امریکہ روسی مشرقِ بعید اور یورپی روس کے تعلقات کو بھی تباہ کر سکتا ہے اور یہ بھی خاصا امکان ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ مقامات جارحیت کا محاذ بنیں، رُوس، امریکی منصوبے کو ناکام کرنے کے لئے ان پر حملہ کر دے۔ بہر حال شرقِ اوسط پر جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ [لے]

سوال: حالیہ سربراہی کانفرنس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا یہ امن کے سلسلے میں کوئی حقیقی کام کر سکے گی؟

مولانا مودودیؒ: میرے خیال میں یہ تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔ یہ تہذیب موت کے ہولناک رقص میں مصروف ہے۔ یہ تباہ ہو کر رہے گی۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوگا۔ اس کے متعلق پیشین گوئی کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے اس کی راکھ سے نئی تہذیب اُٹھ کھڑی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یورپ پھر Dark-ages میں جا پڑے، ایک لمبے عرصے کے لئے۔

سوال: کیا نئی تہذیب یورپی افق سے نمودار ہوگی؟

مولانا مودودیؒ: تاریخ بڑی ہی یقینی مثال ظاہر کرتی ہے۔ قدرت کا ایک متعیّن قانون ہے سنت اللہ۔ یہ سنت اللہ بتاتی ہے کہ خدا قوموں کو موقع دیتا ہے، لیکن جب وہ اس موقع سے غلط کام لیتی ہیں اور خدا کی زمین کو بُرائی اور مکر کی سرزمین بنا دیتی ہیں۔ جب ظلم و ستم، جرم اور انکارِ خداوندی کا چلن عام ہو جاتا ہے اور جب بُرائی کو رد کرنے کے مواقع ختم ہو جاتے ہیں تو انھیں سزا دینے کے لئے عذاب کا کوڑا برس پڑتا ہے، اُن کی تہذیب خاک میں ملا دی جاتی ہے اور پھر اسے کوئی مہلت نہیں دی جاتی۔

سوال: کیا یورپ کے لئے ممکن نہیں کہ وہ مذہب کو اپنا لے اور اُسے زندگی کی

نئی بنیاد بنالے؟

مولانا مودودیؒ: کیوں نہیں، لیکن اس کے امکانات بہت کم نظر آتے ہیں۔ مغرب زوال آنے سے پہلے اپنے طور اطوار ٹھیک کرسکتا ہے لیکن یہ ایک موہوم امید ہے۔ مادی خوشحالی اور تعیش کی زندگی نے اُسے ایسا اندھا کر دیا ہے کہ مذہبی احیاء کی توقع مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔

☆

امریکہ میں مقیم ایک پاکستانی طالب علم نے تعلیم سے متعلق سوالات روانہ کئے۔

سیّد مودودیؒ نے یہ جواب دیا ——— نومبر ۱۹۵۹ء

بندہ آج کل امریکہ میں زیرِ تعلیم ہے۔ یہاں ماہرینِ تعلیم سے اکثر تعلیمی موضوعات پر بحث رہتی ہے۔ چنانچہ شکاگو یونیورسٹی کی فرمائش پر بندہ ایک مقالہ قلم بند کرنے کی کوشش کر رہا ہے، جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ ''پاکستان کی تعلیمی ضروریات امریکہ اور دیگر ممالک کی ضروریات سے بہت مختلف ہیں''۔ پاکستانی ضروریات کا حل اسلام کے بنیادی اصول کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ اگر امریکن طرزِ تعلیم بغیر سوچے اختیار کیا گیا تو ناقابل تلافی نقصان ہونے کا خطرہ ہے۔ اس سلسلے میں چند سوالات آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

جن ملکوں میں صنعتی ترقی ہوئی وہاں لازمی طور پر عام اخلاقی تنزل ہوا۔ ملوں، کارخانوں، کی ضروریات پوری کرنے کے لئے عورت، مرد، بچے تک مشینوں کے پُرزے بن گئے۔ ان ملکوں میں نتیجہ کے طور پر کچھ مفکر پیدا ہوئے (مثلاً امریکہ میں جان ڈیوی، Jhon Deavy، جنھوں نے نئی طرز کی زندگی کو نظریاتی سہارا دیا۔ روایات کو غلط قرار دیا اور سوسائٹی کی اقدار ہی کو بدل دیا! پاکستان میں ایک طرف تو صنعتی ترقی ضروری ہے۔ دوسری طرف اسلامی روایات اور اقدار کو قائم رکھنا فرض ہے۔ براہ کرم فرمایئے کہ یہ بظاہر متضاد مقاصد کیسے حاصل ہو سکتے ہیں؟ مشینی فضا میں روح کیسے تازہ ہو سکتی ہے؟

تبدیلیاں لازمی ہیں۔ مگر کس حد تک قابلِ قبول ہیں؟

۲- اسلامی تعلیم کس قسم کی ہو؟ کیا سب کے لئے ہو؟ فری ہو یا نہ ہو؟ وہ نمونے کی شخصیت جو سکول کو پیدا کرنی چاہیے۔ اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ کیا ہمارے دینی مدارس ایسی شخصیتیں پیدا کر رہے ہیں؟

۳- نمونے کی اسلامی گھریلو زندگی کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ کیا موجودہ گھریلو زندگی اسلامی ہے؟ کیا شہر اور گاؤں میں ایک طرز کی گھریلو زندگی ہوگی؟ موجودہ گھریلو زندگی میں پرانی ہندوستانی روایات کا کتنا دخل ہے؟

جواب: یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ آج کل امریکہ میں فنِ تعلیم کی تحصیلِ مزید کر رہے ہیں۔ جن موضوعات کا آپ نے اپنے عنایت نامے میں ذکر کیا ہے وہ فی الواقع بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے متعلق مختصراً اپنے خیالات عرض کیے دیتا ہوں۔

انسانی تمدّن میں مادی تغیرات کی مثال ان تغیرات کی سی ہے جو فردِ انسانی کے جسم میں بچپن سے جوانی، جوانی سے کہولت اور کہولت سے بڑھاپے کی طرف منتقل ہوتے وقت رونما ہوتے ہیں۔ ان کا روح اور نفس سے گہرا تعلق ضرور ہے، مگر ان تغیرات کے نتائج کا کوئی ایسا متعین اور قطعی ٹھپہ نہیں ہے جو تمام انسانوں کے نفس پر ہمیشہ یکسانیت کے ساتھ لگتا ہو بلکہ ان میں فرد فرد کے لحاظ سے بھی، اور انسانی جماعتوں کے لحاظ سے بھی بڑا فرق ہوتا ہے، جس میں بہت سے دوسرے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اگر تعلیم، تربیت اور معاشرتی ڈھانچہ جو کسی فردِ انسانی کو میسر آئے، ایسا صالح ہو کہ فرد کو ارتقاء حیات کی طرف لے جانے کے ساتھ ساتھ وہ ایک عمدہ اور مضبوط سیرت کو بھی اس کے اندر نشوونما دیتا رہے تو بچپن سے جوانی کی عمر میں داخل ہوتے وقت اس کی طبیعت کی جولانی غلط راہوں پر جانے کی بجائے بہترین تعمیری راہیں اختیار کرتی ہے اور یہی ارتقاء بڑھاپے تک صحیح طریقے سے بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن اگر تعلیم کسی صحیح فکر کو نشوونما دینے والے فلسفے پر مبنی نہ ہو، اور تربیت بھی غلط عادات و خصائل پیدا کرنے والی ہو اور پھر معاشرتی ڈھانچہ بھی بگاڑنے والا ہی میسر آئے تو ایک بچہ آغازِ ہوش ہی سے مجرم بننا شروع ہوتا ہے، جوان ہو کر چور اور

ڈاکو بن کر اُٹھتا ہے اور بڑھاپے تک اس کی جرائم پیشگی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح انسانی تمدّن میں جو مادی تغیر مثلاً صنعتی انقلاب سے رونما ہوا، اس میں بجائے خود کوئی خرابی نہ تھی۔ اس میں انسان کی بھلائی ہی کا سامان تھا، جیسا کہ جوانی کا آنا بجائے خود کوئی برائی نہیں بلکہ انسان کے لئے اپنی ذات میں جوانی رحمت ہی ہے۔ لیکن قصور اس فلسفۂ حیات کا تھا جو سولھویں سترھویں صدی سے یورپ میں نشوونما پا رہا تھا۔ اس نے ذہن کو بگاڑا، فکر کو غلط راہ پر ڈالا اور اخلاق خراب کئے اور اخلاق کی خرابی نے معاشرتی ڈھانچے کو، جو دورِ جاگیرداری سے بگڑا ہوا چلا آ رہا تھا اور زیادہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اس حالت میں صنعتی انقلاب کی طاقت میسر آ جانے سے قومیں کی قومیں جرائم پیشہ بن گئیں اور اب ایٹم کی طاقت پا کر تہذیب کی ساری نمائشوں کے باوجود اسفل السافلین کی طرف جا رہی ہیں۔ اس حالت میں جو فلاسفہ لوگوں کو اس بگاڑ پر مطمئن کرنے کے لئے نئے نئے نظریاتی سہارے دیتے ہیں اور بگڑے ہوئے سانچے سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے سوسائٹی کی اقدار بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی مثال اس دشمنِ دوست نما کی سی ہے جو ایک بگڑتے ہوئے بچے کو پہلی مرتبہ جیب کاٹنے پر شاباش کہے اور اسے یقین دلائے کہ یہ جیب تراشی تو ایک بہترین آرٹ ہے جس کی مذمت کرنے والے لوگ محض دقیانوسی ہیں۔

میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ مادی ترقی کے مقاصد اور اسلامی اقدار کے مقاصد میں کوئی حقیقی تضاد ہے۔ نہ میں یہ مانتا ہوں کہ یورپ میں صنعتی ترقی کے ساتھ جس مخصوص تمدّن و تہذیب نے نشوونما پایا ہے۔ یہ صنعتی ترقی سے کوئی جوہری تلازم رکھتا ہے اور لازماً جب اور جہاں بھی یہ ترقی ہوگی وہاں یہی تہذیب ظہور میں آئے گی یا آنی چاہیے۔ اسی طرح یہ مفروضہ بھی میرے لئے قابل قبول نہیں ہے کہ انسانی روح چرخے اور چاک اور چکی کے ساتھ تو تازہ رہ سکتی تھی مگر مشین ہی کی فطرت کچھ ایسی ہے کہ اس سے سابقہ پیش آتے ہی اس روح پر مردنی چھا جائے گی۔ میرے نزدیک ایک صحیح فلسفۂ حیات سے اگر ذہن درست کئے جائیں، ایک صالح نظامِ اخلاق اگر سیرت گری کے لئے استعمال کیا جائے،

اور ایک معتدل و متوازن معاشرتی ڈھانچہ انسانوں کو سنبھالنے کے لئے موجود ہو تو منعتی ارتقاء اور سائنس سے حاصل ہونے والی قوتوں کا استعمال موجودہ مغربی تمدن و تہذیب سے بنیادی طور پر بالکل مختلف ایک دوسرے تمدن و تہذیب کو نشوونما دے سکتا ہے، جو اس سے بدر جہا زیادہ طاقت ور بھی ہو اور پھر انسانیت کے لئے باعث رحمت بھی۔ مجھے یقین ہے کہ اسلام اور صرف اسلام ہی ہمیں اس طرح کا فلسفۂ حیات اور نظامِ اخلاق دے سکتا ہے اور اس کی رہنمائی عملاً قبول کر کے اگر ہم اس کی ہدایات کے مطابق اپنا نظامِ تعلیم و تربیتِ عامہ، اور اپنا معاشرتی ڈھانچہ بنالیں تو ان شرائط کی تکمیل ہو سکتی ہے جو اوپر میں نے مادی ترقی کے ساتھ ایک صالح تہذیب کی تشکیل کے لئے بیان کی ہیں۔ اس معاملے میں یہودیت پہلے ہی مایوس کن تھی، عیسائیت نئے دور کے آغاز ہی میں ناکام ثابت ہو گئی، اور بودھ مت سرے سے اس میدان کا مرد تھا ہی نہیں۔ رہے جدید مذاہب، سوشلزم، فاشزم اور کیپٹلزم، سو وہ اپنے تمام عیوب و محسن کھول کر سامنے لا چکے ہیں اور دنیا خوب دیکھ چکی ہے کہ ان کے محاسن کو ان کے عیوب سے کیا نسبت ہے۔ نیا کوئی فلسفہ بھی اب تک ایسا سامنے نہیں آیا ہے جو ایک تہذیب کی بنیاد بننے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس کو سوچنے والے تمام تر اہلِ مغرب ہیں اور وہ اپنی اس تہذیب کے زہریلے پن سے تنگ آنے کے باوجود اس کی بنیادوں میں تغیر کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے ذہن اس کے حدود سے آزاد ہو کر سوچنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ صرف جزوی ترمیمات سے کام چلانا چاہتے ہیں اور ان میں سے اکثر کی تجویز کردہ ترمیمیں مزید بگاڑ ہی کی طرف لے جانے والی ہیں۔

اس مختصر خط میں میرے لئے وہ وجود بیان کرنا مشکل ہیں جن کی بنا پر میں اس معاملہ میں اسلام کو علیٰ وجہ البصیرت کافی ہی نہیں بلکہ انسانیت کے لئے ایک ہی شعاعِ امید سمجھتا ہوں۔ ان دلائل کے اعادہ کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ میں انھیں اپنی متعدد کتابوں میں بیان کر چکا ہوں، مثلاً اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم'' وغیرہ۔ اس کے علاوہ میرے بہت سے مضامین میں بھی

اس کی طرف اشارات موجود ہیں۔

آپ کے دوسرے سوالات کا جواب یہ ہے کہ اسلامی تعلیم اس دور کے لئے جس طرز پر دی جانی چاہیے اسے میں نے اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ''تعلیمات'' میں بیان کیا ہے۔ آپ اسے ملاحظہ فرمالیں۔ میرے نزدیک یہ تعلیم ہر بچے کو ملنی چاہیے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت' البتہ اس کے مدارج میں صلاحیتوں کے لحاظ سے فرق کیا جانا چاہیے۔ اس کو ابتدائی حد تک جبری اور کم از کم ثانوی حد تک سب کے لئے بالکل مفت ہونا چاہیے' اور آگے کے مدارج میں خاص صلاحیت رکھنے والے نوجوانوں کی کفالت بھی ریاست کو کرنی چاہیے۔ جو نمونے کی شخصیت ایک مدرسے کو پیدا کرنی چاہیے' اس کی خصوصیات صرف چار اسلامی اصطلاحوں میں بیان کی جاسکتی ہیں۔ مومن ہو، مسلم ہو، متقی ہو، اور محسن ہو۔ ان اصطلاحوں کو آپ جتنے زیادہ وسیع معنوں میں لیں گے شخصِ مطلوب اتنا ہی زیادہ جامع کمالات ہوگا۔ تنگ معنوں میں لیں تو صنعتی ترقی کی باتیں ______ اور اس ترقی میں موجودہ تہذیب و تمدّن کے فاسق و فاجر کھلاڑیوں سے مسابقت کا خیال چھوڑ دیں' پھر انشاء اللہ پاکستان و ہندوستان کی ہر مذہبی درس گاہ میں آپ کو نمونے مل جائیں گے۔

ہماری گھریلو زندگی کی بنیادی خصوصیات اسلام کی رو سے چار ہیں: ایک تحفظِ نسب' جس کی خاطر زنا کو حرام اور جرم قابلِ تعزیر قرار دیا گیا ہے، پردے کے حدود قائم کئے گئے ہیں اور زن و مرد کے تعلق کو صرف جائز قانونی صورتوں تک محدود کر دیا گیا ہے، جن سے تجاوز کا اسلام کسی حال میں بھی روادار نہیں ہے۔ دوسرے تحفظ نظامِ عائلہ جس کے لئے مرد کو گھر کا قوام بنایا گیا ہے، بیوی اور اولاد کو اس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ ______ اور اولاد پر خدا کے بعد والدین کا حق سب سے زیادہ رکھا گیا ہے۔ تیسرے حسنِ معاشرت جس کی خاطر زن و مرد کے حقوق معین کر دیئے گئے ہیں' مرد کو طلاق کے اور عورت کو خلع کے اور عدالتوں کو تفریق کے اختیارات دیئے گئے ہیں' اور الگ ہونے والے مرد و زن کے نکاحِ ثانی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے تا کہ زوجین یا

تو حسن سلوک کے ساتھ رہیں، یا اگر باہم نہ نباہ کر سکتے ہوں تو بغیر کسی خرابی کے الگ ہو کر دوسرا بہتر خاندان بنا سکیں۔ چوتھے صلہ رحمی جس سے مقصود رشتہ داروں کو ایک دوسرے کا معاون و مددگار بنانا ہے اور اس غرض کے لئے ہر انسان پر اجنبیوں کی بہ نسبت اس کے رشتہ داروں کے حقوق مقدم رکھے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس بہترین نظامِ عائلہ کی قدر نہ پہچانی اور اس کی خصوصیات سے بہت کچھ دور ہٹ گئے ہیں۔ اس نظامِ عائلہ کے اصولوں میں شہری اور دیہاتی کے لئے کوئی فرق نہیں ہے، رہے طرزِ زندگی کے مظاہر تو وہ ظاہر ہے کہ شہروں میں بھی یکساں نہیں ہو سکتے، کجا کہ شہریوں اور دیہاتیوں کے درمیان کوئی یکسانیت ہو سکے۔ فطری اسباب سے ان میں جو فرق بھی ہو وہ اسلام کے خلاف نہیں ہے بشرطیکہ بنیادی اصولوں میں ردّو بدل نہ ہو۔

☆

الخُبر، سعودی عرب میں قیام کے دوران، مقامی مسجد میں عرب طلبہ نے سیّد صاحب سے سوالات دریافت کئے، جنہیں جناب خلیل احمد حامدی نے مرتب کرلیا۔ یہ گفتگو عربی میں ہوئی تھی، یہاں پر ترجمہ دیا جارہا ہے ______ ۱۹۶۱ء

سوال: کیا انشورنس جائز ہے؟

مولانا: انشورنس دو اجزاء پر مشتمل ہے جوا اور سود۔

سوال: کیا مسواک صرف مخصوص درخت کی لکڑی کا ہونا چاہیے؟

مولانا: دانتوں کی اور منہ کی صفائی مطلوب ہے۔ اس کے لئے جو بھی مناسب طریقہ ہو استعمال کرلیا جائے۔

سوال: اسلام میں غلامی کے مسئلے پر اعتراضات کیے جاتے ہیں؟

مولانا: پہلی جنگِ عظیم میں اور پھر دوسری جنگِ عظیم میں جنگی قیدیوں کو جس طرح باڑھوں میں رکھا گیا اور اُن کے ساتھ جس طرح جانوروں کی طرح سلوک کیا گیا وہ قابلِ تحسین ہے؟ کیا افریقہ سے انسانوں کا شکار کر کے امریکہ جا کر بیچنا انسانیت کی خدمت تھی؟

سوال: اسلام کا مستقبل کیا ہے؟

مولانا: اسلام کا مستقبل روشن ہے مگر مسلمانوں کو اب روایاتی نہیں بلکہ شعوری طور پر اسلام پر چلنا ہوگا۔

سوال: پاکستان میں جماعت اسلامی کا کیا طریق کار ہے؟

مولانا: لوگوں کے ذہن وفکر کو تبدیل کر کے انہیں منظم کرنا، معاشرے کی اصلاح کرنا اور

پھر صالح افراد کے ذریعے نظامِ حکومت کو تبدیل کرنا۔ یہ تینوں کام جماعت اسلامی بیک وقت کر رہی ہے۔

سوال: آج نوجوانوں کو کیسی تعلیم حاصل کرنی چاہیے؟

مولانا: لیڈروں کو سوشل سائنسز کے مضامین پڑھنے چاہئیں اور کارکنوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف رخ کرنا چاہیے، جبکہ دین کی بنیادی تعلیم کا حصول سب پر فرض ہے۔

سوال: منکرات کا ارتکاب کیا جارہا ہو تو کیا کرنا چاہیے؟

مولانا: اُن کے خلاف احتجاج کرنا چاہیے۔ عوام کو تبلیغ کے ذریعے منکرات سے بچایا جائے اور حکمرانوں کو ان کا سدِ باب کرنے کے لئے نصیحت کی جائے۔

سوال: ”حزب التحریر“ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے (یہ عالمِ عرب میں ایک خفیہ جماعت ہے جس کے بانی مرحوم تقی الدین النبہانی تھے۔ اُردن میں ان کا مرکز ہے اور ہر عرب ملک میں اس کی شاخیں ہیں۔ یہ طاقت کے ذریعے تبدیلی لانے کے حق میں ہے اور اسلامی ریاست کے قیام کو تمام احکام و فرائض پر ترجیح دیتی ہے)؟

مولانا: مجھے اس کے بارے میں زیادہ تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔

سوال: اسرائیل سے کیسے نجات ملے گی؟

مولانا: اتحاد اور جہاد سے۔

سوال: آپ تصنیف و تالیف اور امارت کے گراں بار فرائض دونوں متضاد کاموں کو کیسے کامیابی سے چلا رہے ہیں؟

مولانا: اللہ کے فضل اور وقت کی صحیح تنظیم سے۔

سوال: حکومت پاکستان (ایوب خان کی حکومت) کی پالیسیوں کے بارے

میں آپ کی کیا رائے ہے؟

مولانا: پاکستانی سیاست کو میں پاکستان کی سرحدوں پر چھوڑ آیا ہوں، اسے اپنے ساتھ باہر دورے پر نہیں لایا۔ (نوجوان مسکرا دیئے)

سوال: یہاں مہر کی رقم اس قدر زیادہ ہے کہ شادی ناممکن ہوگئی ہے۔ نوجوان کیا کریں؟

مولانا: مہر کثیر کے خلاف مل کر ''شادی ہڑتال'' کر دیں۔ (قہقہے)

مولانا نے جواب دیتے ہوئے فرمایا ''اضربوا عن الزواج''

ایک طالب علم نے تین سوال دریافت کئے ——— دسمبر ۱۹۶۱ء

سوال: ہمیں تعلیم کا موجودہ نظام کس طرف لیے جا رہا ہے، کیا اس سے ہمیں شعور و آگہی میسر آ سکتی ہے یا گمراہی والحاد اور بے دینی۔ ہمیں تعلیم میں کس بات کو اہمیت دینی چاہیے۔ تعلیم اور اخلاق میں باہمی کیا رشتہ ہے؟

جواب: تعلیم سے مراد اگر وہ تعلیم ہے جو ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے تو وہ تو ہمیں روز بروز اپنے آپ سے بیگانہ کیے جا رہی ہے وہ ہمیں مسلمانوں کا سا نہیں بلکہ غیر مسلموں کا سا شعور دے رہی ہے، بلکہ غیر مسلموں کا شعور بھی وہ نہیں جو انگلستان میں انگریزوں کو اور امریکہ میں امریکیوں کو دیا جاتا ہے بلکہ وہ شعور جو بیرونی حاکم اپنے محکوموں کو دینا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم اس تعلیم کے ذریعے اپنی ملی خودی اور دینی حمیت و غیرت بھی کھو رہے ہیں اور اب اس تعلیم سے ہمارے اندر کوئی ملی سیرت بھی پیدا نہیں ہو رہی ——— درحقیقت اخلاق اور تعلیم میں وہی رشتہ ہے جو غذا اور قوتِ حیات میں ہے۔ اگر کوئی غذا قوتِ حیات پیدا نہیں کرتی تو وہ صحیح غذا نہیں اسی طرح اگر کوئی تعلیم صالح اخلاق پیدا نہیں کرتی تو وہ صحیح تعلیم نہیں۔

سوال: کیا اسلام میں کوئی ایسا نظریہ اور واضح پروگرام ہے جس سے زندگی کے ہر شعبے پر روشنی پڑ سکے اور ہم اپنی معاشرت کے ہر گوشے کو جانچنے کے لئے کوئی ایسا معیار دریافت کر سکیں جو ہماری مشکلات کا آخری حل ہو؟

جواب: یہ سوال بھی تفصیل طلب ہے۔ مختصراً اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے ہمیں خدا پرستی، آخرت پر یقین اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کے اتباع کا مستقل نظریہ دیا ہے اور اس نظریے کے مطابق زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں واضح ہدایات موجود ہیں۔

ہمارے لئے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار اگر کوئی ہے تو صرف یہ ہے کہ ہم کس حد تک اپنے آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھتے ہوئے رسولِ خدا کی دی گئی ہدایات کا پابند بناتے ہیں۔

سوال: اسلام کے نزدیک انسانی زندگی کے دو شعبے ہیں ایک معاش دوسرے معاد۔ ان دونوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟

جواب: دراصل اسلامی نقطہ نظر سے انسانی زندگی نا قابل تقسیم ہے۔ انسان نے معاش اور معاد کو دو شعبوں میں صرف افہام و تفہیم کے لئے تقسیم کیا ہے۔ فی الحقیقت معاش اور معاد کے درمیان بہت گہرا تعلق ہے۔ اسلام کے نزدیک معاد میں انسان کو انہی نتائج سے واسطہ اور سابقہ پیش آتا ہے جن کے لئے اُس نے معاش میں سر و سامان کیا ہو۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ معاش کے غلط ہونے پر بھی معاد صحیح ہو۔ لازماً تسلیم کرنا پڑے گا کہ معاد کی صحت دراصل معاش ہی کی صحت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسلام نے معاش کے مسائل کا کیا حل پیش کیا ہے۔ یہ موضوع تفصیل کا محتاج ہے۔ مختصراً یہ کہ اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے ان اصول و ضوابط اور حدود سے جو کتاب و سنّت میں واضح طور سے بیان کیے گئے ہیں ان کی پابندی معاش کے بہتر ہونے کی بھی ضامن ہے اور معاد کی بھی۔

☆

طالب علموں کی فکری تہذیب کے لئے ادب بھی ایک بنیادی سرچشمہ ہے۔ طلبہ ادبی شہہ پاروں سے اثر لیتے اور مستقبل میں تخلیق ادب کی ذمہ داری ادا کرنے عزم اور جذبہ حاصل کرتے ہیں۔ ''ادب میں اخلاقی اقدار'' کے مسئلے پر سید مودودیؒ کی مختلف تحریریں اور گفتگوئیں پیش خدمت ہیں۔

آپ کی طبیعت کا رجحان اگر مختصر افسانے لکھنے کی طرف ہے تو اس کو نشو ونما دیجیے اور بڑے بڑے افسانہ نگاروں کے افسانے بکثرت دیکھ کر یہ سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ کسی خاص نقطۂ نظر کو ناظرین کے ذہن میں غیر محسوس طور پر افسانہ کے ذریعہ سے اتار دینے کا کیا طریقہ ہے۔ افسانے کے عیوب میں یہ ایک بڑا عیب ہے کہ پڑھنے والوں کو یہ محسوس ہو جائے کہ فسانہ نگار اُن کے اندر کیا نقش بٹھانا چاہتا ہے۔ اور فسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو نقش آپ بٹھانا چاہتے ہیں، وہ آپ سے آپ بیٹھ جائے، بغیر اس کے کہ ناظر کا ذہن قبل از وقت چوکنا ہو کر اس اثر کو Resist کرنے پر آمادہ ہو۔ اس فن کو خصوصیت کے ساتھ روسی افسانہ نگاروں سے سیکھیے جنہوں نے اشتراکیت کی تبلیغ میں اس سے بہت کام لیا ہے۔ آپ اپنی ایک نہیں بلکہ دو چار کہانیاں مجھے نمونے کے طور پر بھیجیں، میں انہیں دیکھ کر پھر آپ کو رائے دوں گا۔

ایک اور طریقہ کھلم کھلا افسانے کے ذریعے سے کسی چیز کے تبلیغ کرنے کا بھی ہے، مگر اس صورت میں لکھنے والے کو بہت زیادہ قادر الکلام اور قوی الاستدل ہونا چاہیے، تا کہ وہ اپنے زورِ بیان سے سے ناظرین کو اپنے ساتھ بہالے جائے۔ میں آپ کے افسانے دیکھ کر یہ سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ آپ ان دونوں طریقوں میں سے کس طریقے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

(چودھری غلام جیلانی صاحب کے نام جنوری ۱۹۴۳ء)

> ''ہمیں اہلِ قلم کا ایک ایسا لشکر تیار کر لینا چاہئے جو علوم وفنون اور ادب کے ہر پہلو سے نظامِ حاضرہ پر حملہ آور ہو سکے.......... مجتہد مفکرین کو مدد بہم پہنچانے کے لئے ادیبوں' افسانہ نگاروں اور ڈرامہ نویسوں کا ایک گروہ بھی ضرور ہونا چاہیے جو فکری میدانِ کارزار میں ''گوریلا وار'' لڑتا ہے..........
>
> ضرورت ہے کہ ایک لمحہ کا انتظار کیے بغیر ہم میں سے ہر شخص اٹھے اور جس سے جو کچھ ہو سکتا ہے کرے۔ جو اہلِ علم ہیں وہ تخریب وتعمیر افکار کی مہم میں مصروف ہوں' جو اہلِ تعلیم ہیں وہ نئی نسل کی تیاری کے لئے مستعد ہو جائیں۔ جو ادیب ہیں وہ ادب کی مختلف راہوں سے نظامِ حاضر پر حملہ آور ہوں اور نظامِ اسلامی کی دعوت پھیلائیں' جو مضمون نگار ہیں وہ اخباروں اور رسالوں سے اظہارِ خیال شروع کر دیں۔''
>
> (خطاب' ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۳ء دربھنگھ)

معاش کے لئے کوئی ادب پیدا کرنا میرے نزدیک غلط چیز ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ آدمی معاش کے لئے اینٹیں ڈھولے۔ ادب دماغوں کو ڈھالنے والی چیز ہے۔ یہ کام محض معاش کے لئے نہیں کیا جا سکتا' بلکہ اس کو تو بالکل اپنے نظریہ ومسلک کے مطابق کرنا ہو گا۔''

''نفس انسانی کو مطالعہ اور اس کے مختلف پہلوؤں کا اظہار بجائے خود مفید ہے، مگر اس میں ہر ایک کا اپنا تصور انسان کام کرتا ہے۔ جن لوگوں کے نزدیک انسان شریر اور خبیث ہے، وہ نفسِ انسانی کے بُرے پہلوؤں ہی کو نمایاں کرتے ہیں۔ ہمارا تصور انسان یہ نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں نفسِ انسانی کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے نہیں کرنا ہے جس سے مغربی افسانہ وڈرامہ میں کیا جا رہا ہے۔''

''ادب میں دو سکول آف تھاٹ ہیں۔ ایک اسکول اس کا قائل ہے کہ جیسا کچھ

ہے اس کو بیان کیا جائے۔ دوسرا اسکول اس کا قائل ہے کہ جو کچھ ہونا چاہیے اس کی تلقین کی جائے۔ ہم ان دونوں کو جمع کرنا چاہتے ہیں۔ جو کچھ ہے اُس کو اس طرح بیان کیا جائے کہ جو کچھ ہونا چاہیے اُس کی طرف خود بخود ذہن منتقل ہو اور اس کی پیاس پیدا ہونے لگے۔ تنقید کیجیے تو کسی تعمیری معیار کو سامنے رکھ کر کیجیے —— اشتراکی صرف سرمایہ دارانہ نظام پر تخریبی تنقید کرتا ہے۔ مگر ہم انسان کی خود مختارانہ غیر ذمہ دارانہ زندگی اور انسان کی بندگی مخلوقات پر تنقید کرنا چاہتے ہیں۔"

(نعیم صدیقی صاحب کے نام ایک خط، یکم اکتوبر ۱۹۴۱ء)

میں اس نظریے کا قائل ہوں کہ ہر خیال اپنے ساتھ خود الفاظ لاتا ہے۔ اور ہر خیال کو ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں وہی الفاظ ہیں جو اس خیال کے ساتھ خود بخود چلے آتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں صرف مضمون سوچنا چاہیے۔ باقی رہے الفاظ تو اُن کے لئے انتخاب میں الجھنے کی ضرورت نہیں، وہ آپ سے آپ مضمون کے ساتھ آ جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ مجھے جب کبھی کچھ لکھنا پڑتا ہے، تو اپنی تمام تر کوشش صرف خیالات کو مجتمع کرنے اور دلائل و شواہد اور مواد فراہم کرنے میں صرف کرتا ہوں اور جب دماغ میں مضمون مرتب ہو جاتا ہے تو پھر اسے کاغذ پر منتقل کرنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی۔ الفاظ کے انتخاب میں میری بے اعتنائی کچھ ایسی بڑھی ہوئی ہے کہ اکثر و بیشتر میں لکھنے کے بعد نظر ثانی بھی نہیں کرتا۔ اِلّا یہ کہ کوئی خاص ذمہ داری کی تحریر لکھنا ہو۔

کہانی، افسانہ اور تمثیل کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ اس سے مقصود کسی خیال کو واقعہ کے رنگ میں بیان کرنا ہوتا ہے تا کہ وہ خیال سامع کے ذہن نشین ہو سکے۔ اسے سُن کر کسی بلید الذہن آدمی کو بھی کبھی یہ غلط فہمی نہ ہو کہ کہنے والا کسی امرِ واقعہ کی روایت کر رہا ہے، اس لئے اس ایک معروف چیز کو خواہ مخواہ جھوٹ کی ایک قسم سمجھنا اور اس پر اعتراض

کرنا محض ایک تنگ خیالی اور بے جا تشدد ہے۔ کہانی تو خود حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہی اور حدیث میں اس کی روایات موجود ہیں اور تمثیلی قصوں کی مثالیں قرآن مجید میں بھی پائی جاتی ہیں۔

(ماہنامہ ''مشیر'' کراچی' افسانہ نمبر جنوری ۱۹۵۲ء)

''نوعِ انسانی جس المناک اضطراب میں مبتلا ہے اور روز بروز مبتلا ہوتی چلی جارہی ہے، اس کا اصل سبب اعتدال کی سیدھی راہ سے اُس کا بھٹک جانا ہے اور یہ سیدھی راہ اگرچہ نظروں کے سامنے موجود ہے، لیکن جو لوگ بندگیٔ نفس اور فریب نظر میں مبتلا ہیں وہ اوّل تو اسے دیکھنا نہیں چاہتے اور دیکھ بھی لیں تو اس پر آنا نہیں چاہتے۔ اس سیدھی راہ پر آنے کی بجائے وہ ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف بھٹکتے پھرنے کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اس کا نتیجہ خود اُن کے لئے اور ساری دنیا کے لئے کرب والم میں روز افزوں اضافے کے سوا کچھ نہ ہو۔

جن لوگوں کو سواء السبیل کی معرفت حاصل ہے اُن کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اُٹھیں اور قوت کے ساتھ عالمِ انسانی کو اس کج روی سے روک کی سیدھی راہ پر چلائیں۔ اپنی ادیبانہ صلاحیت کو انسانیت کے بھٹکانے میں نہیں بلکہ راہ راست پر لانے میں استعمال کریں۔ کوئی شعر و ادب اپنی لفظی و معنوی خوبیوں کی بنا پر قابلِ قدر نہیں ہے۔ وہ اگر زندگی کی صلاح و فلاح کے لئے کام نہیں کرتا تو ذہن کی عیاشی اور اربابِ نشاط کی عشوہ گری ہے۔ اور اگر زندگی کو بگاڑنے کے لئے کام کرتا ہے تو میٹھا زہر ہے۔ قدر کے قابل وہ صرف اسی وقت ہوتا ہے جب اُس کا حسن' زندگی کے جمال میں اضافے کا موجب ہو رہا ہو۔''

(پروفیسر فروغ احمد صاحب کی کتاب ''سواء السبیل'' پر پیش لفظ سے)

شعر اگر ناپاک جذبات سے خالی ہو اور جمالِ فطرت سے لطف اندوز ہونے کی حد تک رہے تو ناجائز نہیں۔ البتہ جہاں حسن و عشق کے جھگڑے شروع ہوتے ہیں، عدم جواز کی سرحد آ جاتی ہے کیونکہ یہ چیز اپنے اندر محض لطف نہیں رکھتی بلکہ غیر اخلاقی روّیہ کی طرف اس کا رجحان واضح ہے، خواہ اس پر کتنے ہی لطیف پردے ڈالے جائیں۔"

(ایک خط کا جواب ۱۱ جولائی ۱۹۵۱ء ____ "چراغِ راہ" کراچی، اکتوبر ۱۹۵۱ء)

سوال: اخلاقی اقدار کو لٹریچر میں پیش کرنے کا سب سے بہتر طریقہ کیا ہے؟

جواب: (مولانا مودودی نے فرمایا کہ) "اخلاقی اقدار کو لٹریچر میں پیش کرنے کا سب سے بہتر طریقہ وہی ہے جو قرآن حکیم نے اختیار کیا ہے۔ قرآن حکیم حسنِ کلام اور تاثیر کلام کا سب سے مکمل نمونہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ قرآن حکیم نے انسانیت کو سنوارنے کے لئے لٹریچر میں اخلاقی اقدار کو جس طرح پیش کیا ہے، اس کو اختیار کریں۔ جس میں کلام کا حُسن بھی ہے۔ تاثیر اور بلاغت بھی ہے۔ سوسائٹی کے لئے اصلاح کا پروگرام بھی ہے۔ ایک خدا پرست معاشرہ کے قیام کے لئے دعوتِ انقلاب بھی ہے، جس میں فلسفہ، حکایات و قصص اور ضرب الامثال کی نہایت بہترین مثالیں موجود ہیں اور جو اتنا مؤثر ادب پیش کرتا ہے کہ اس کے مطالعہ سے ذہنیتوں اور سیرتوں میں انقلاب آ جاتا ہے۔ جو ایک پست اور گری ہوئی قوم کو اتنا بلند کرتا ہے کہ بہترین تہذیب و تمدّن رکھنے والی قوموں کے چراغ گل ہو جاتے ہیں (مولانا نے فرمایا) کہ قرآن حکیم نے ایک اعلیٰ درجہ کے ادب اور اسلوب میں ایک پاکیزہ نظریۂ حیات کو جس طرح پیش کیا ہے۔ میرے نزدیک لٹریچر میں اخلاقی اقدار کو پیش کرنے کا اس سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے اور نہ اب تک دریافت ہو سکا ہے۔ زبان کی سادگی، بیان کی سلاست، عام فہم الفاظ، شاداب و شگفتہ پیرایۂ بیان، دل ہلا دینے والی باتیں قرآن حکیم کی خصوصیات ہیں اور انھیں خصوصیات کو ہمیں اپنے لٹریچر کا طرۂ امتیاز بنانا چاہیے۔"

سوال: لٹریچر میں محبت کا کیا مقام ہے؟

جواب: اگر محبت سے مراد عشق بازی ہے تو لٹریچر کو اس سے پاک ہونا چاہیے۔ لیکن اگر آپ کی مراد کسی مقصد، نصب العین اور صالح طرزِ حیات سے محبت ہے۔ تو لٹریچر کو اس سے آراستہ ہونا چاہیے کیونکہ عشقِ بازی بہر حال ایسا کوئی نیک کام اور تعمیری مقصد نہیں ہے کہ وہ لٹریچر کا موضوع بنے اور اس کو بیان کرنے کے لئے ادیب اپنی ادبی صلاحیتوں کو وقف کریں۔

سوال: لٹریچر میں عورت کا مقام کیا ہے؟

جواب: عورت کا مقام لٹریچر اور ادب میں وہی ہے جو زندگی میں ہے۔ زندگی میں اس کا مقام کھلونا بننا نہیں بلکہ اچھی ماں بننا ہے۔ اور ایک ماں کے جو فرائض ہیں وہ ہر شخص پر واضح ہیں جدید ادبیات میں عورت کو جس حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ ہوس کے کھلونے کی حیثیت ہے جبکہ ہوس پر کسی پائیدار اور پاکیزہ سوسائٹی کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ تعمیر معاشرہ کے لئے سنجیدگی اور پاکیزگی شرط ہے۔ اور ہوس میں یہ دونوں باتیں مفقود ہیں۔ میرے نزدیک ادب میں عورت کو اس طرح موضوعِ گفتگو بنانا جس طرح آج کل بنایا جا رہا ہے۔ نہ تو جائز ہے اور نہ مفید۔ اب تو عورت کو صنفی تسکین کے لئے ادب میں وہ لوگ بھی پیش کرنے سے پرہیز کرتے ہیں جو سب سے پہلے عورت کو گھر سے گھسیٹ کر بازار میں لائے تھے۔ اگر ایک شخص کے لئے یہ بات صحیح اور درست نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی سے اپنے تعلقات کو برسرِ عام بیان کرے تو ایک غیر عورت سے ادب میں اپنی دل چسپی کا اظہار کیسے درست ہو سکتا ہے؟ معاشرہ کی صحت مندی کا انحصار اس حقیقت پر ہے کہ اس میں صنفی انارکی اور جنسی آوارگی نہ پائی جاتی ہو۔ قیدِ نکاح سے باہر عورتوں اور مردوں کے درمیان کسی قسم کے صنفی تعلقات قائم نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسا ادب کس طرح معاشرہ میں پسندیدہ سمجھا جا سکتا ہے جو جنسی آوارگی پیدا کرنے کا باعث ہو اور جو نکاح کے Institution کو نقصان پہنچانے کا سبب بنے؟ ادب کا فطری منصب یہ ہے کہ وہ اس چیز کو مزین اور نکھار کر دنیا کے سامنے پیش کرے۔ جو معاشرے کے لئے

صحت بخش ہے۔''

(مولانا نے فرمایا کہ) ''خیالی اور ذہنی محبوبہ سے لذت لینے کی عادت جب کسی شخص کو پڑ جاتی ہے۔ تو وہ زندگی میں واقعی ایک محبوبہ تلاش کرنے لگ جاتا ہے اور ہمارے معاشرہ کو محبوبہ قسم کی خواتین کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ان خواتین کی ضرورت ہے جو گھر چلائیں اور ایک بہترین رفیقۂ زندگی بن کر ایک صالح اور جاندار خاندان کی تخلیق کریں۔ ذہنی بدکاری اور صنفی آوارگی سے کوئی معاشرہ تندرست و توانا نہیں بنا کرتا۔ اور اب تو جاہلیت کے نمائندہ معاشرے بھی ایک حد سے آگے ایسے لٹریچر کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں جو کسی وقت بھی صنفی انتشار کا باعث بن سکتا ہو، کیونکہ یہ بات ہر مکتبِ فکر کے نزدیک غلط ہے کہ سوسائٹی میں صنفی آوارگی کسی حیثیت سے بھی مفید ہے۔''

(مولانا نے مزید فرمایا کہ) ''زندگی کے لئے جو باتیں مفید ہیں۔ وہی ہمارے ادب کا موضوع بن سکتی ہیں۔ انھیں کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت مؤثر اور جاندار بنا کر پیش کرنا چاہیے۔ اور اس بارے میں قرآن اور رسولؐ کے کلام سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیے۔ کیونکہ مقصدی ادب کا اس سے بہتر اور مکمل نمونہ اسلام کے مخالفین کے نزدیک بھی کوئی دوسرا نہیں ہے۔''

(انٹرویو نگار: ابو صالح اصلاحی، ماہ نامہ ''یثرب'' لاہور ستمبر ۱۹۵۰ء)

''انسانیت کی تعمیر اور کسی پاکیزہ معاشرے کی تشکیل میں ادب جو اہم اور نمایاں حصہ ادا کرتا ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کے دل و دماغ پر ادب کی قوت تاثیر ایک مسلم حقیقت ہے۔ دراصل کسی کلام کو ادبی کلام کہتے ہی اُس وقت ہیں، جبکہ اس کے مطالب و معانی ایسے الفاظ کا جامہ پہن کر سامنے آئیں، جن سے قلب اور ذہن متاثر اور متحرک ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ یہ تاثیر اور قوتِ متحرکہ ادب کا حسن بھی ہے اور اس کا عیب بھی۔ جو ادب فکر و عمل کی دنیا میں انتشار اور فساد کا موجب ہو، وہ معاشرے کے لئے سمِ قاتل ہے اور جو ادب انسان کو اصلاحِ نفس اور اصلاحِ خلق پر آمادہ کرے اس سے

بڑھ کر معاشرے کے امراض کے لئے کوئی نسخۂ شفا بھی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے جو کتابیں نازل فرمائیں اور ان کتابوں کی تشریح میں انبیاء علیہم السّلام نے جو کلمات ارشاد فرمائے ہیں، وہ ادب کا بہترین اور اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سننے اور پڑھنے سے جو دل پتھر تھے وہ بھی موم ہو گئے اور جو افراد ریت کے ذرّوں کی طرح بے نور تھے، وہ آفتاب و ماہتاب بن کر افقِ عالم پر درخشاں ہوئے۔

آج جو لوگ پاکیزہ اور اصلاحی ادب یا دوسرے لفظوں میں اسلامی ادب کے علمبردار ہیں انھیں دو امور ضرور اپنے پیشِ نظر رکھنے چاہئیں، ایک یہ کہ جدید ادب کے ساتھ ساتھ انھیں اس الہامی. اور ''قدیم ادب'' کا بھی برابر اور بغور مطالعہ کرتے رہنا چاہیے تاکہ ایک طرف وہ اس کے بلیغ اُسلوبِ بیان سے مانوس ہوں اور دوسری طرف اس کے حیات بخش مضامین کا پرتو بھی ان کے دل و دماغ پر پڑتا رہے۔ دوسری بات جس کا ہمارے ادیبوں کو شدت سے اہتمام کرنا چاہیے وہ یہ کہ ان قول اور عمل باہمی تضاد سے بالکل پاک ہوں۔ سیرت و کردار کی بلندی کے بغیر افکار کی بلند پروازی کسی کام کی نہیں۔ اس سے کام بننے کے بجائے اور زیادہ بگڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر ہماری نگاہیں ہمیشہ ہی رہنی چاہئیں۔

یٰایھا الذین اٰمنوا لما تقولون مالا تفعلون ○ کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون ○

(ماہ نامہ ''تعمیرِ انسانیت'' لاہور اپریل ۱۹۵۷ء)

''اسلامی ادب صرف اس ادب کا نام نہیں جو گندگی سے پاک ہو۔ غیر نجس ہو اور صاف ستھرا ہو بلکہ اسلامی ادب وہ ہے جو اسلام کے نظریہ پر مبنی ہو۔ جن باتوں کو اسلام حق کہتا ہے، مسلم ادیب انھیں حق سمجھے اور دوسروں پر ظاہر کرے اور انھیں منوائے۔ جو باتیں اسلام کے نزدیک باطل ہیں، مسلمان ادیب انھیں جھوٹ سمجھے، ان کے جھوٹ ہونے کا اظہار کرے اور انھیں جھوٹ ثابت کرے۔ اسلام جس نظامِ زندگی کو قائم کرنا چاہتا ہے۔

مسلم ادیب اس کے لئے ادب کے دائرہ عمل میں سعی کرے۔

علمی لٹریچر کا مقصد ذہنوں کو تیار کرنا ہوتا ہے لیکن ادب دلوں کو مسخر کر کے انھیں حرکت پر آمادہ کرتا ہے اس لئے ادب کو مؤثر ہونا چاہیے اگر وہ قلوب کو متاثر نہیں کرتا اور ان میں جوش و ولولہ بھر کر انسانوں کو آمادہ حرکت نہیں کرتا تو وہ بے روح اور بے جان ادب ہے۔

ادب کو مؤثر بنانے کے لئے سات چیزوں کی ضرورت ہے اور میں پاکستان کے تمام مسلم ادیبوں سے کہوں گا کہ وہ ان چیزوں کو اپنائیں۔

ادب کو مؤثر بنانے والی پہلی چیز یہ ہے کہ ادب میں ابتذال نہ ہو۔ مسلم ادیب اپنے آپ کو مبتذل اور پامال راہوں سے بچاتے رہیں۔ مسلم ادیب میں اپچ ہونی چاہیے۔ اس کا ذہن نئی راہیں نکال سکتا ہو۔ جو ادیب پٹی ہوئی راہوں پر چلتے ہیں وہ لوگوں کو بہت جلد تھکا دیتے ہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ادیب کی زبان عام فہم ہو وہ گنجلک زبان اور ایسے الفاظ استعمال نہ کرے جن سے ذہن آشنا نہ ہو۔ یہ کمزوری ان ادیبوں میں ہوتی ہے جو غیر زبان میں پڑھتے اور سوچتے ہیں اور اپنی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں۔ لیکن مناسب الفاظ نہ پا کر انھیں گھڑتے ہیں۔ ایسے ادیبوں سے لوگوں کے ذہن مانوس نہیں ہوتے اور وہ ایک اجنبیت سی محسوس کرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ گمراہ ادیبوں کی بڑی تعداد اس مرض میں مبتلا ہے ورنہ ان کی زبان شیریں اور عام فہم ہوتی تو وہ بہت زیادہ لوگوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اسلامی ادیبوں کے اندر یہ صفت پیدا ہو۔

ادب کو مؤثر بنانے والی تیسری چیز پختگیٔ فکر ہے۔ مسلم ادیب کو ادھ کچرے خیال ظاہر نہیں کرنے چاہئیں بلکہ انھیں اپنی فکر خوب اچھی طرح سلجھا لینی چاہیے۔ سلجھی ہوئی فکر زبان اور اسلوب بیان میں کسی قسم کی پیچیدگی پیدا نہیں ہونے دیتی۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ ادیب کی معلومات وسیع ہوں۔ اس کے بغیر ادیب نہ تو کوئی کام کی بات کہہ سکتا ہے نہ دوسرے لوگوں پر اثر ڈال سکتا ہے۔ اس کا سینہ اچھلتے کنوئیں کی

طرح ہوتا ہے۔ جس کا ذخیرہ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ ادیب کی معلومات جس قدر وسیع ہوں گی، اتنی ہی مؤثر بات وہ کہہ سکے گا اس لئے اسلامی ادیبوں کو تاریخ، فلسفے وغیرہ کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے۔

پانچویں ضروری چیز ادیب کی قوتِ استدلال ہے۔ جس طرح علمی مضامین میں استدلال سے کام لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح ایک ادیب اور ایک شاعر کو بھی استدلال کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن ادیب اور شاعر کا اندازِ استدلال منطقی ہونے کے بجائے شیریں اور دلکش ہوتا ہے۔ اس استدلال ہی سے وہ قاری سے اپنی بات منوالیا کرتا ہے۔ استدلال کے بغیر ادب مؤثر نہیں ہوتا۔

چھٹی چیز یہ ہے کہ ادیب میں خلوص ہو، جو ادیب مخلص ہوتا ہے اُس کے الفاظ اُس کے احساسات اور خیالات کے عین مطابق ہوتے ہیں اگر وہ اپنے احساسات کے خلاف کہنا بھی چاہے تو اس کی زبان اور قلم اُس کا ساتھ نہیں دیتے۔ مسلم ادیب حقیقی جذبات اور احساسات کے مطابق زبان اور قلم سے کام لیتا ہے، جس سے اس میں بے پناہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

ساتویں اور آخری چیز یہ ہے کہ ادیب کی زندگی اس کے خیالات کے مطابق ہو۔ جو لوگ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہیں میرے نزدیک ان سے زیادہ فضول آدمی کوئی نہیں۔ ایسے لوگوں نے دنیا میں کوئی کام نہیں کیا۔ سیرت و کردار ہی بیان اور قلم میں زور پیدا کرتا ہے۔ کردار سے خالی گفتار بے اثر چیز ہے۔ کوئی اسلامی ادیب اس ابوالفضولی میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔

(حلقہ ادبِ اسلامی لاہور کے اجلاس میں خطاب: ۱۱ جولائی ۱۹۵۲ء
ترتیب، رفیع الدین ہاشمی۔ ماہ نامہ ''اسوہ'' کراچی جون ۱۹۷۰ء)

سوال: اسلامی نظام میں ادب کا کیا مقام ہوگا؟ اس میں عورت کا کیا کردار ہوگا؟ کیا افسانے اور ڈرامے ختم ہو جائیں گے؟ پھر تو زندگی بڑی خشک ہو کر رہ جائے گی؟

مولانا مودودیؒ: جب زندگی حرام "تری" کی عادی ہو جائے تو وہ حلال "تری" کو خشکی سمجھتی ہے۔ جب اسلامی ریاست قائم ہوگی تو آہستہ آہستہ زندگی حلال کی عادی ہو جائے گی یہاں تک کہ اس ادب سے آپ کو گھن آنے لگے گی جس کو آپ اس قدر پسند کرتے ہیں۔ آخر وہ کیا ادب ہے جس میں بے حیائی اور گندگی ہو۔

ایسا ادب جو شریفانہ ہو۔ انسان بنانے والا، اچھے جذبات کو ابھارنے والا ہو۔ اس کی گنجائش ہوگی، مگر اس میں عورت کا کردار لانے کی کیا ضرورت ہے؟ عورت کا مقام گھر کی ملکہ کا، ماں، بہن کا ہے۔ اس کا مقام اسٹیجوں پر ناچنا اور شہوانیت کو تسکین دینا نہیں ہے۔ عورت کو نچوا کر لطف اٹھانا اسلامیت نہیں ہے۔ ایسی اسلامی حکومت سے کیا حاصل جس میں عورتوں کو اسٹیج پر نچوایا جائے۔ (ہفت روزہ "ایشیا" لاہور ۳۰ ستمبر ۱۹۶۲ء)

"یہ بات کہ ادب کو اسلام اور غیر اسلام کی تفریق سے بلند ہونا چاہیے ایک لحاظ سے درست ہے اس لئے کہ ادب کا کوئی مذہب نہیں ہوتا بلکہ ادیب کا مذہب ہوتا ہے۔ اسے اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ پہلوانی یا سپہ گری وغیرہ بذاتِ خود نہ تو اسلامی ہیں نہ غیر اسلامی۔ یہ فنون ہیں جن کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ البتہ پہلوان یا سپاہی کا کوئی نہ کوئی مسلک ضرور ہوتا ہے۔ اب ایک پہلوان محض پیشہ ور ہوتا ہے اور اس کا مقصد صرف اپنے فن کی نمائش ہوتا ہے۔ اسی مقصد کی خاطر وہ دنگل میں جاتا ہے یا اکھاڑے جماتا ہے۔ اسی طرح ایک پہلوان اپنی قوت کو محض غنڈہ گردی کیلئے استعمال کرتا ہے اور اسے ہم اس نے پہلوان کہہ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک پہلوان ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اپنی توانائی اور قوت کو معاشرے کی غنڈوں سے حفاظت میں صرف کرتا ہے۔ یہ سارے مسلک پہلوانی کے نہیں بلکہ پہلوانوں کے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اسلام اور غیر اسلام اور اشتراکیت اور غیر اشتراکیت سے بحث کوئی مصنوعی چیز نہیں ہے۔ درحقیقت ادیب کا تخلیقی عمل بالکل اسی طرح کا ہوتا ہے۔ جیسے بچے کی ولادت کا تخلیقی عمل ہوتا ہے۔ ادیب کے فکر کی کیفیت حمل

کی مانند ہوتی ہے۔ جس سے بالکل فطری ولادت ہوتی ہے۔ ادیب جو کچھ بھی تخلیق کرتا ہے وہ اس کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ ادیب ایک انسان ہوتا ہے، انسان کے اندر مختلف میلانات پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ادیب کے اندر گمراہی کے میلانات ہیں، وہ دنیا میں فتنہ وفساد برپا کرنا چاہتا ہے تو اس کے اندر بُری نیتوں اور بُرے ارادوں کا حمل قرار پاتا ہے اور اس کے نتیجے میں لازماً وہی چیز پیدا ہوگی جو ان تمام مضرتوں کی حامل ہوگی۔ یہاں ایک بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس گمراہی اور بدی کے باوجود اس ادیب کے اندر یہ صلاحیت ہوسکتی ہے کہ وہ جو چیز بھی پیش کرے اسے نہایت خوش اسلوبی سے فن کے سانچے میں اس طرح ڈھال کر پیش کرے کہ وہ بہت مؤثر بن جائے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا پیش کردہ ادب لوگوں کے اندر بُرے جذبات کو متحرک کرے گا اور اس سے معاشرے کو نقصان پہنچے گا۔ اس کے برعکس ایک دوسرا آدمی کسی اصلاحی مقصد کے پیشِ نظر اپنی ادیبانہ صلاحیتوں سے کام لے کر لوگوں میں پاکیزہ جذبات اُبھارتا ہے۔ اسی لئے یہ چیز کسی مصنوعی طریقے پر نہیں پیدا ہوسکتی۔ ایک ایسا ادیب جو اسلام کے پیش کردہ حقائق کو درست سمجھتا ہو، معاشرت، معاش، تمدن اور سیاست وغیرہ کے اسلامی اصولوں پر ایمان رکھتا ہو وہ جب کبھی اپنی ادبی صلاحیتوں کو استعمال کرے گا تو بلا کسی ارادے اور کوشش کے وہ جو کچھ تخلیق کرے گا وہ اسلامی ادب ہوگا۔ اب جو شخص یہ کہتا ہے کہ ادیب کو اسلام اور غیر اسلام سے بحث نہ ہونا چاہیے وہ دراصل دوسرے معنوں میں یہ کہتا ہے کہ ادیب کو صرف پیشہ ور ہونا چاہیے۔ وہ جس چیز کی بازار میں مانگ دیکھے اسے پیش کر دینا چاہیے لیکن اگر پیشہ ور ہونے کے بجائے مخلص (Sincere) ہوگا تو وہ لامحالہ کافرانہ ادب کے بجائے اسلامی ادب کو جنم دے گا۔

جہاں تک اسلامی ادب کے لئے روایات کا سوال ہے، تمام دنیا کا ادب (ہُومر) سے بلکہ اس سے پہلے سے لے کر اب تک ہر شخص اور زبان کی مشترکہ میراث ہے۔ اس ورثے میں یہ دیکھنا ہے کہ کام کی چیزیں کون کون سی ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔ اسلام پسند ادیبوں کو دراصل شہد کی مکھی کا کام کرنا پڑے گا۔ جہاں پھول ملے وہاں سے رس لیا جاسکتا

ہے۔ کفار کے ادب میں بھی بہت سی اچھی باتیں ملیں گی۔ مغربی مما لک کے ادب میں بھی بہت سی کام کی چیزیں ملیں گی۔ عربی اور فارسی ادب میں بھی بہت فساد نظر آئے گا۔ اصل چیز یہ ہے کہ اسلام کی فطرت اور مزاج کا صحیح ادراک ہو پھر اس فطرت اور مزاج کے مطابق جو چیز مل سکے اسے اخذ کیا جا سکتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک اخلاقی اقدار (Ethical Values) کا سوال ہے ان میں سے اکثر اقدار دنیا کے بیشتر مذاہب میں مشترک ہیں مگر ہمارے لئے محض اسلامی اقدار کا اشتراک ہی کافی نہیں کیونکہ ہر مذہب کے پیچھے ان کا اپنا فلسفۂ حیات، اس کا مابعد الطبیعیاتی نظریہ (Metaphysical Conception) ہوتا ہے۔ مثلاً اسلام اور بدھ مذہب میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں لیکن صرف یہ چیز اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ ہم بودھ مذہب کے پروان شدہ ادب کو اسلامی کہہ دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بودھ مذہب اپنی اخلاقی قدروں کے پیچھے اپنا ایک مخصوص نظریہ 'تناسخ' رکھتا ہے۔ اس کا فلسفۂ حیات راہبانہ ہے۔ اس کے برعکس ہماری اخلاقی اقدار اور ہمارا نظامِ حیات اس دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیتا ہے۔ نتیجۂ ہمارا ذہنی پسِ منظر، ہمارا مابعد الطبیعیاتی نظریہ اور ہماری فلسفیانہ بنیادیں اخلاقی اقدار کے اشتراک کے باوجود مختلف ہوں گی۔ اس لئے ہمارا ادب بودھ ادب سے بہت مختلف ہوگا۔ ہمارے یہاں آخرت کا تصور ہے ان کے وہاں تناسخ کا۔ ہم برائی کی اس لئے مذمت کرتے ہیں اور اس سے اس لئے بچتے ہیں کہ ہمارے خدا کو ناپسند ہے اور اس نے اس سے بچنے کو کہا ہے۔ ایک بدھسٹ برائی سے اس لئے بچے گا کہ انسان کو نقصان نہ ہو اور اس کا اگلا جنم اس جنم سے بہتر ہو۔ اب ظاہر ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سارے تصورات اس کے ادب میں سرایت کریں گے اور بودھ ادب کو اسلامی ادب سے ممیز کر دیں گے۔ اسی طرح مغربی مما لک کا ادب ہے۔ مغرب کا فلسفۂ حیات، مغرب کا نظریۂ زندگی الگ ہے مسلمانوں کا الگ ہے۔ اس لئے ان کے ادب میں فرق ناگزیر ہے۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ مسلمانوں کے پیدا کردہ شعر و ادب میں بھی (علامات)

Symbols بیشتر ایسے ہیں جو حرام یا ممنوع چیزوں سے متعلق ہیں۔ جہاں تک میرے ذوق کا تعلق ہے میں ان علامات سے اجتناب پسند کروں گا لیکن ہمارے ادیب

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

کے قائل ہیں۔ ہمیں جہاں تک ممکن ہو نئے سمبل پیدا کرنے چاہئیں جو ہمارے معتقدات سے ہم آہنگ ہوں۔ یہ کام کچھ آسان نہیں ہے کیونکہ موجودہ علامات ایک عرصہ دراز سے متعارف اور پسندیدہ ہو چکی ہیں پھر بھی اگر اس طرح کی کوشش جاری رہے تو بعید نہیں کہ رفتہ رفتہ کچھ نئی علامات رائج ہو جائیں۔

الشعراء یتبعھم الغاوون .... کا صحیح مفہوم سمجھنے سے پہلے قرآن کی آیتوں کو سمجھنے کے لئے اولاً تو سیاق و سباق کا لحاظ لازمی ہے، ورنہ مفہوم غلط ہو سکتا ہے۔ اصل چیز جس کے متعلق اس مقام پر بحث کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کفار مکہ رسول اکرمؐ کے پیغام پر طرح طرح کی پھبتیاں کستے رہتے تھے اور اس کو رد کرنے کے لئے بہانے تلاش کرتے تھے۔ چنانچہ کبھی آپ کو مجنوں کہا گیا، کبھی ساحر کہا گیا اور کبھی شاعر کہا گیا۔ یہاں کفار کی اسی بات کا جواب مقصود ہے۔ کفار کو خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ تم جس شخص کو شاعر کہتے ہو اس کا ذرا عام شاعروں سے مقابلہ کرو اور دیکھو کہ کیا شعراء اسی وضع قطع کے ہوتے ہیں؟ کیا ان کا رنگ ڈھنگ یہی ہوتا ہے؟ اور پھر کہا گیا کہ ''شعراء'' کی حالت تو یہ ہے کہ بھٹکے ہوئے لوگوں کے پیچھے پھرتے ہیں اور ہر وادی میں بھٹکتے ہیں۔'' کسی وقت ترنگ آئی تو بڑا حکیمانہ شعر کہہ ڈالا، پھر کسی وقت مزاج بدلا تو بڑا ہی صوفیانہ شعر کہہ گئے، کبھی جی چاہا تو بالکل رندانہ شعر کہہ ڈالا۔ کبھی کسی کی شان میں قصیدہ کہا اور پھر خفا ہو گئے تو اس کی ہجو لکھ ڈالی۔ غرض یہ کہ مختلف جذبات کو مبالغہ آمیز انداز میں نظم کر دیتے ہیں۔ اب یہ ساری باتیں عرب کے جاہل شعراء کے بارے میں کہی گئی ہیں۔ کلام جاہلیت موجود ہے اس کو قرآن سے کوئی مناسبت نہیں۔ پھر ان کے زندگیاں رسولِ اکرمؐ کی زندگی کی بالکل ضد تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں نکلتا کہ تمام شعر اور شاعری کالعدم ہے۔ ایسا نہیں ہے شاعری کو پاکیزہ اور بلند جذبات کا آئینہ بنایا جا سکتا ہے۔ خود ہمارے یہاں اقبال کا

کلام موجود ہے۔

اسی طرح اشعر الشعراء قائدہم إلَی النار، امراء القیس کے متعلق نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا۔ عرب میں امراء القیس کی شاعری فن کے لحاظ سے اگر ایک طرف بہت بلند تھی تو دوسری طرف فسق و فجور کو ہوا دیتی تھی۔ اسی لئے فنی نقطہ نظر سے اسے اشعر الشعراء کہا اور مواد کے اعتبار سے جہنمیوں کا سردار کہا۔

(حلقہ ادبِ اسلامی کراچی کے اجلاس (۱۵ مئی ۱۹۵۸ء) میں سوالوں کے جواب میں اظہار خیال، ماہ نامہ ''چراغ راہ'' کراچی، ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۸ء ترتیب محمد حمید اللہ صدیقی)

علمی لحاظ سے ادب کی تعریف ادیبوں اور فلسفیوں نے چاہے کچھ بھی کی ہو لیکن میرے ذہن میں ادب کا تصور یہ ہے کہ وہ حسنِ کلام اور تاثیرِ کلام کا نام ہے جو چیز ادب کو عام انسانی گفتگوؤں اور تقریروں سے ممیز کرتی ہے۔ وہ کلام کا حسن اور تاثیر ہے۔ جب انسان اپنی بات کو خوبصورت طریقے سے ادا کرتا ہے اور اتنے مؤثر طریقے سے ادا کرتا ہے کہ سننے والا اثر قبول کرے اور جو کچھ بات کرنے والا چاہتا ہے وہ اثر ڈال سکے۔ اس نوعیت کے کلام کو ہم ادب کہتے ہیں۔

ادب کی اقسام

ادب کی تقسیم مختلف لوگوں نے مختلف کی ہے۔ اس کی بہت سی اقسام قرار دیجاتی ہیں لیکن اسلامی نقطہ نگاہ سے ہم اس کی تین بڑی اقسام قرار دے سکتے ہیں۔

۱- ناجائز ادب

۲- جائز ادب

۳- اسلامی ادب

ناجائز ادب

الف: ناجائز ادب اسلامی نقطہ نگاہ سے وہ ہے جو انسان کے اندر غلط قسم کے خیالات پیدا

کرے‘ چاہے اس میں حسنِ کلام اور تاثیر ہو لیکن وہ انسان میں غلط افکار و خیالات پیدا کرے۔ مثلاً خدا پرستی سے الحاد کی طرف لے جائے یا اس میں شک و تذبذب پیدا کرے۔ واضح تر حقائق کے مقابلے میں تذبذب اور بے یقینی کی کیفیت پیدا کرے۔ آدمی خیال کرنے لگے کہ معلوم نہیں حقیقت کیا ہے۔ خدا ہے یا نہیں۔ آخرت ہے یا نہیں۔ انسان میں شکی پن پیدا کردے۔ یا وہ جو انسان کی توجہ علمِ آخرت سے ہٹادے۔ جو انسان کے ذہن میں یہ خیال پیدا کرے کہ

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست
اب تو آرام سے گزرتی ہے — آخرت کی خبر خدا جانے

ب: اسی طرح ناجائز ادب کی تعریف میں وہ بھی آتا ہے جو انسان کے اندر جبریت کا عقیدہ پیدا کرے۔ اسے یقین دلائے کہ تو اس عالم میں مجبور ہے۔ جو گناہ کرتا ہے مجبوری سے کرتا ہے۔ دنیا کا نظام ہی ایسا ہے کہ تو برا ہونے پر مجبور ہے۔ جو احساسِ ذمہ داری کو بالکل باطل کردے اور اسے اس امر پر مطمئن کردے کہ بھلا آدمی بن کے رہنا یا بُرا بن جانا اس کے بس میں نہیں ہے۔

ج: وہ ادب بھی ناجائز کی تعریف میں آتا ہے جو انسان کو مایوس کرے اور اسے یاس اور قنوط کی حالت میں مبتلا کردے۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ نوعِ انسانی کی قسمت کے روشن اور منور ہونے کے امکانات نہیں ہیں یا بہت کم ہیں۔

د: اس طرح وہ ادب بھی اسلامی نقطہ نظر سے ناجائز ہے جو انسان کے اندر برے جذبات پیدا کرے۔ مثلاً نسل پرستی۔ ایک نسل کو دوسری نسلوں کے مقابلے میں برتر سمجھنا۔

ایک قوم کو دوسری قوموں سے بالاتر قرار دینا۔

دوسروں کو غلام بنانے کا تصوّر۔ غلط غرور اور فخر یا نفرت اور انتقام کے جذبات ابھارنا۔ وحشت‘ درندگی اور جنگ جوئی کے جذبات ابھارنا۔

ر: اور وہ ادب بھی ناجائز ہے جو انسانیت کے کسی ایک طبقے کی حمایت اس طرح کرے کہ دوسرے طبقے کے خلاف نفرت پیدا کرے۔ جو یہ بات دل میں بٹھائے کہ دنیا کا نظام ہی

ایسا ہے کہ مختلف طبقوں میں کشمکش پیدا ہو۔ جو طبقات کی کشمکش کو لازمی قرار دے۔ جو یہ بتائے کہ انسانی طبقات کے درمیان مساعدت اور باہمی رفاقت۔ رعانت یا یگانگت کا امکان نہیں ہے جو یہ کہے کہ یہ کشمکش تقاضائے فطرت اور (Historical) (Necessity) ہے۔ گویا تاریخی لحاظ سے واجب ہے کہ انسانی طبقے ایک دوسرے سے لڑیں۔ غرض انسان سے متنفر کرنے والا ادب بھی اسلامی نقطۂ نظر سے ناجائز ادب ہے۔

س: اسی طرح وہ ادب بھی ناجائز ہے جو انسان کے حیوانی جذبات کو ابھارے۔ جو انسان کے لئے اخلاقی بے قیدی کو مقدس چیز قرار دے۔

ص: اور وہ ادب بھی جو انسان کے لئے برائیوں کو خوشنما بنائے اور بھلائیوں کو بدنما بنائے۔ جس میں نیکی اور پرہیزگاری اور نیک اور پرہیزگار لوگوں کا مضحکہ اڑایا جائے اور بداخلاق لوگوں کو انسانیت کا نمونہ اور معیار قرار دیا جائے۔ قرآن مجید کا حکم ہے کہ یہ شیطان کا کام ہے کہ وہ گناہ کو مزین کر کے پیش کرتا ہے اور انسان کو کہتا ہے کہ تیرے لئے خوبیاں ان کاموں میں ہیں جنہیں ہر زمانے میں نوعِ انسانی کے رہنماؤں اور صالح لوگوں نے گناہ قرار دیا ہے۔

مختصر طور پر ادب میں یہ تمام رجحانات ناجائز ادب کی تعریف میں آتے ہیں۔

جائز ادب

الف: جائز ادب کی تعریف یہ ہے کہ اس کے اندر پاکیزہ جذبات اور خیالات کا اظہار ہو۔ جو حقائق بیان کرے۔ جو انسان کو برائیوں کی طرف لے جانے والا نہ ہو۔ جو بھلائی کو نگاہ سے اوجھل نہ کرے۔

ب: جس ادب میں اللہ اور اس کے رسول کی تعریف ہو۔ جس میں نیک جذبات کا اظہار ہو۔ اور اخلاقِ حسنہ کو بیان کیا جائے۔

ج: وہ ادب بھی جو ان برائیوں سے پاک ہو جو ناجائز ادب میں ہیں۔ اگر تفریح کے لئے ہو تو وہ بھی پاکیزہ تفریح ہو۔ خواہ وہ مقالہ۔ شعر یا افسانہ ہو وہ برائیوں سے پاک ہو اور برائی کی طرف لے جانے والا نہ ہو۔ اگر کہانیاں بیان کی جائیں تو وہ بھی برائی کو مزین کر

کے پیش کرنے والی نہ ہوں۔ نری تفریح کو بھی ایک حد تک جائز رکھا جائے گا۔ شعر برائی کی تعریف کرنے والا یا بُرے جذبات ابھارنے والا نہ ہو۔

اسلامی ادب

مقصد: اسلامی ادب کی وہ خصوصیت جس سے وہ جائز ادب سے ممیز ہوتا ہے۔ اس کا واضح اور متعین مقصد ہوتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ دنیا کو غیر اسلام سے ہٹائے اور اسلام کی طرف راغب کرے۔ اسلام کے برحق ہونے پر دلوں کو مطمئن کرے۔ انسان میں اس قسم کا جذبہ پیدا کرے کہ وہ خود اسلام کی پیروی کرے اور دنیا میں اسلامی نظامِ زندگی کو برپا کرے۔

جائز ادب اور اسلامی ادب میں مقصد کا فرق ہے۔ اسلامی ادب صرف جائز ادب کی حدود کے اندر ہی نہیں رہتا بلکہ آگے بڑھ کر کوشش کرتا ہے کہ لوگوں کو اسلام کی طرف لائے، اسلام کی حمایت کرے۔ دوسرے نظاموں پر تنقید کر کے اسلام کا ایک برتر نظامِ زندگی ہونا ثابت کرے۔ اسلام جن خوبیوں کو چمکاتا ہے انہیں چمکائے اور اسلام کی حمایت میں ایک صحیح عزم لے کر اٹھنے کا جذبہ پیدا کرے۔

اسلامی ادب کی دو قسمیں ہیں:

اقناعی ادب

محرّک ادب

اقناعی ادب: جس ادب میں اس امر کی کوشش کی جائے کہ علمی اور عقلی دلائل سے انسان کو اسلام کے متعلق حتمی طور پر مطمئن کیا جائے کہ اسلام ہی حق ہے اور اسلام ہی صحیح نظام ہے جس میں دوسرے نظاماتِ زندگی پر تنقید کر کے بتایا جائے کہ ان میں کیا خرابی ہے۔ جس میں درسرے نظامات کے بُرے نتائج کی تسلی بخش حد تک وضاحت کی جائے۔ جس میں علمی اور عقلی حیثیت سے ثابت کیا جائے کہ ان مشکلات کا صحیح حل اسلام میں ہی ہے۔ یہ ادب دل ودماغ کو مطمئن کرنے والا ادب ہوتا ہے۔

محرّک ادب: جو مطمئن ہونے والے لوگوں کو عمل پر ابھارے عمل کے لئے اکسائے اور

عمل کی طرف دھکیلے اور اس طرح اقناعی ادب کی قوتِ نفوذ کو دو آتشہ بنا دے۔ یہ ضروری ہے کہ ادب صرف علمی اور عقلی دلائل کا مجموعہ ہی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ محرک بھی ہو۔ محرک ادب کو ہم الکحل کی مثال دے سکتے ہیں۔ جس طرح الکحل دوا کو حل کر کے انسانی جسم میں سہولت سے جذب کرتا ہے اسی طرح اقناعی ادب میں اگر محرک ادب بھی ملا دیا جائے تو وہ انسانی دل و دماغ میں آسانی سے جذب ہو سکتا ہے۔ لیکن جس طرح دوا میں الکحل اس غرض کے لئے ہوگا کہ دوا کے تحلیل کرنے میں آسانی ہو اسی طرح اقناعی ادب میں بھی محرک ادب اسی مقصد کے لئے شامل کیا جائے گا کہ اس کے جذب ہونے میں آسانی ہو۔ اس سے دلائل میں قوت آئے گی اور فکر میں میں علمی زور پیدا ہوگا۔ محرک ادب کی بنیاد کا بھی علمی حقیقتوں پر مبنی ہونا ضروری ہے۔ محرک ادب میں دلائل بھی ہوتے ہیں۔ معقولیت کے ساتھ بات بھی سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اس کی نمایاں خصوصیت لوگوں کے جذبات کو ابھارنا' اکسانا اور تحریک کے ساتھ ان کا گہرا تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے۔

محرک ادب کے تحت شعر۔ افسانہ۔ خطابت اور صحافت آ سکتے ہیں۔

شعر

شعر' آپ جانتے ہیں کہ بڑی محرک طاقت ہے۔ اس طاقت کو آپ نے اس وقت محسوس کیا ہوگا جب کوئی مقالہ سننے کے درمیان مثلاً اقبال کا کوئی شعر آ جائے۔ اس وقت آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس شعر میں بھی ایک طاقت ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک انسان کے سامنے حق کو دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا جائے اور وہ شخص جان لے کہ حق وہی ہے لیکن اس کے اندر حق کے لئے کام کرنے کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ اس میں کام کی تحریک پیدا کرنے کے لئے اقناعی ادب کے ساتھ محرک ادب کا ہونا بھی ایک ضروری چیز ہے تاکہ وہ ان لوگوں کو جو اسلام کے حق ہونے پر مطمئن ہیں عمل پر بھی ابھارے۔

شاعر

اس میں ایک خطرہ بھی ہے شاعر کے اندر یہ کمزوری ہوتی ہے کہ اس کا ذہن ہر طرح کے تأثرات سے متأثر ہوتا ہے۔ شاعری میں لازمی ہے کہ اس کے اندر جذبات ہوں۔ اس میں ایک طوفانی کیفیت ہوئی ہے اس لئے یہ ہر راستے اور ہر وادی میں بہ نکلتی ہے۔ شاعر ہر وقتی واقعہ سے متأثر ہو کر شعر کہتا ہے اس لئے اس میں توازن کا قائم رہنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ اسلامی ادب اور مبالغے میں عداوت ہے چاہے وہ مبالغہ اللہ اور رسولؐ کی تعریف میں ہی کیوں نہ ہو۔ اس میں بھی توحید کے بیان میں شاعر شرک میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اس لئے شاعری میں خطرہ ضرور رہتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں کہا گیا ہے فی کل وادٍ یّھیمون (ہر وادی میں بھٹک جاتے ہیں) اس لئے شعر کو اگر اسلامی ادب کا جزو بنانا ہے تو اسے بہر حال حدود کا پابند ہونا چاہیے۔ مبالغہ بھی حد کے اندر ہونا چاہیے۔ شعر میں اگر مبالغہ نہ ہو تو زور پیدا نہیں ہوتا۔ شاعر اگر مخالفین پر تنقید کرے تو دیکھے کہ وہ حد میں ہے۔ ہجو بھی کرے تو حد میں کرے۔ دشمنِ اسلام لوگوں کے عیوب واقعی بیان کرے مگر گالم گلوچ اور گندہ ذہنی پر نہ اُتر آئے بلکہ شریفانہ طور پر کرے۔ تعریف کرے تو حد کے اندر کرے اور ممدوح میں وہ خوبیاں بیان نہ کرے جو خدا اور اس کے رسولؐ کے لئے ہونی چاہئیں۔ ممدوح کو بناوٹی خدا نہ بنا کر رکھ دے اس لئے ضروری ہے کہ ایک اسلامی شاعر شعر کہے تو اسلام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کہے۔ حسنِ کلام بھی ہو اور تاثیرِ کلام بھی لیکن دونوں اپنی اپنی حدود کے اندر ہوں باہر نہ ہوں۔

افسانہ

اسی طرح افسانہ بھی ایک محرک کلام ہے۔ یہ بھی لوگوں کے جذبات میں تغیر پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انسان غلط بیانی نہ کرے جو تصویر پیش کرے وہ واقعی صحیح ہو۔ وہ غلط قسم کی تصویر پیش نہ کرے۔ اگر وہ اپنے مخالفین کی اخلاقی حالت کا جائز لے تو ان کے اعمال کو مسخ نہ کرے۔ ان کی حقیقی کمزوریاں ہی بیان کرے۔ ان پر کوئی غلط الزام نہ لگائے اور ان کی طرف کوئی غلط چیز منسوب نہ کرے۔ اگر وہ اپنے پیشِ نظر نظام کے عمدہ پہلوؤں کی نشاندہی کرے اور اس نظامِ زندگی کو پیش کرنے میں ادب کی طاقت

استعمال کرے اور اس کی خوشنما تصویر پیش کرے تو لوگوں کو بے جا اُمیدیں نہ دلائے۔ غلط توقعات پیدا نہ کرے۔ افسانوی ادب میں یہ خوبی ہونی چاہیے کہ اس میں کھلی کھلی بھونڈی تبلیغ نہ ہو۔ قاری یہ محسوس نہ کرے کہ اسے کسی مخصوص سمت کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ تاکہ پڑھنے والا خود بخود افسانہ نویس سے متفق ہو جائے۔ تبلیغ کو وہ تقریر یا مقالے کی نثر میں تو برداشت کرے گا لیکن جب افسانے میں کھلی کھلی تبلیغ آنی شروع ہو جائے تو پھر انسانی طبیعت میں مزاحمت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے ایسے افسانے پڑھے ہیں جو بہتر مقصد کے لئے لکھے گئے تھے لیکن پڑھتے وقت میں نے خود محسوس کیا کہ افسانہ نگار اپنے خلاف ہی جذبات ابھار رہا ہے۔ جو افسانہ نویس کھلم کھلا سامنے آ کر دلائل سے بحث کرے وہ اپنے مقصد پر ظلم کرتا ہے۔ افسانوی ادب کی خوبی تو یہ ہے کہ وہ اس طریقے سے قاری کے سامنے آئے کہ قاری اس سے متوحش نہ ہو۔ پڑھنے والا ہرگز یہ محسوس نہ کرے کہ اسے کسی طرف دھکیلا جا رہا ہے بلکہ وہ خود بخود اس طرف بڑھتا چلا جائے وہ یہ محسوس نہ کرے کہ اسے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا جا رہا ہے بلکہ وہ اپنے آپ کو افسانہ نویس ساتھ چلتا ہوا محسوس کرے۔

صحافت

ادب میں صحافت انسانی ذہن کو ڈھالنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اس میں بھی اسلامی صحافت اور غیر اسلامی صحافت میں بنیادی امتیاز ہوگا۔ اسلامی صحافت کبھی جھوٹ پر مبنی نہ ہوگی۔ وہ ہمیشہ واقعات پر مبنی ہوگی۔ جو شخص واقعات کو توڑ مروڑ کر لوگوں کے سامنے لاتا ہے وہ ذہنی نامردی دکھاتا ہے، وہ ڈرتا ہے کہ جس طرف میں لوگوں کو لے جانا چاہتا ہوں وہ غرض اصلی واقعات بیان کر دینے سے پوری نہ ہوگی۔ اسلامی صحافت ایک بہادرانہ اور مردانہ وار صحافت ہے وہ اگر اپنے مخالف پر حملہ کرے گی تو اس کی اصلی پوزیشن بھی جوں کی توں سامنے رکھ کر حملہ کرے گی۔ اس کی طرف کوئی غلط پوزیشن منسوب نہ کرے گی۔

اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حمایت و مخالفت دونوں میں صداقت کے

بنیادی اصولوں پر قائم رہے گی۔

وہ جس کی مخالفت کرے گی اسے خواہ مخواہ شیطان نہ بنائے گی بلکہ اس کی اصلی کمزوریاں بیان کرے گی اور جس کی حمائت کرے گی اسے خواہ مخواہ فرشتہ بھی نہ بنائے گی بلکہ اس کی اصل خوبیاں سامنے لائے گی۔ جس نظام کی حمایت کرے گی اس کے لئے جھوٹ کے ذریعے رائے عامہ ہموار نہ کرے گی۔ غلط قسم کے وعدوں سے غلط توقعات دلا کر لوگوں کو اس طرف نہ دھکیلے گی بلکہ اس نظام زندگی کے نفاذ سے جو واقعی نتائج ہو سکتے ہیں وہی پیش کرے گی۔ یہ اسلامی صحافت کی اصلی خصوصیت ہے۔

دوسری چیز زبان کی ستھرائی اور پاکیزگی کی پابندی ہے۔ وہ کیچڑ نہ اُچھالے گی۔ گالیاں دینے والی صحافت اسلامی صحافت نہیں ہو سکتی۔ ایک مسلمان اخبار نویس اپنے مخالف کے خلاف اگر لوگوں کے جذبات ابھارے گا تو شریفانہ طور پر بھلے آدمیوں کی طرح، وہ گالیاں نہ دے گا۔ زبان کی ستھرائی اور صداقت اسلامی صحافت کی نہ صرف ایک خصوصیت ہے بلکہ کامیابی کے لئے ناگزیر ہے۔

خطابت

اسی طرح محرک ادب کی ایک قسم خطابت بھی ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کا خطیب پوری قوم کو حرکت میں لے آتا ہے۔ اس میں رونے والوں کو ہنسانے اور ہنسنے والوں کو رلانے کی طاقت ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو لڑا سکتا ہے۔ ہٹا سکتا ہے۔ بڑھا سکتا ہے۔ یہ طاقت بھی ہمارے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن اسے بھی جو چیز اسلامی بناتی ہے وہ خطیب کا اسلامی حدود کا پابند ہونا ہے۔

ایک غیر اسلامی خطیب کی خصوصیت ہے کہ اس کی زبان بے مہار قینچی کی طرح چلتی ہے۔ ہجو کرتا ہے تو مخالف کو شیطان بنا دیتا ہے۔ تعریف کرتا ہے تو ممدوح کو خدا سے جا ملاتا ہے۔ نفرت پھیلاتا ہے تو بدترین جذبات کو حرکت میں لے آتا ہے بولتے وقت بالکل محسوس نہیں کرتا کہ میں حق بات کہہ رہا ہوں یا اس سے تجاوز کر رہا ہوں۔ وہ ہر ممکن طریقے سے لوگوں کو اپنے ساتھ بہالے جانے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں اس کا ہرگز

خیال نہیں کرتا کہ اس کی زبان سے حق نکل رہا ہے یا باطل۔

اس کے برعکس ایک مسلم خطیب انتہائی جذبہ اور جوش کی حالت میں بھی زبان قابو میں رکھتا ہے وہ نہ نفرت پھیلائے گا نہ مخالفوں پر بے جا الزام اور اتہام رکھے گا۔ نہ غصے میں الفاظ کے تیر برسانے کی کوشش کرے گا۔ سخت غصے کی حالت میں بھی اپنی زبان اور جذبات پر قابو رکھے گا۔ اور یہ خیال رکھے گا کہ اس کی زبان سے کوئی بات حق کے خلاف نہ نکلے۔ وہ پاکیزہ جذبات ابھارے گا۔ گندے اور انسانیت کو گندہ کرنے والے جذبات نہ ابھارے گا۔ یہ اسلامی خطابت کی مختصر تعریف ہے۔

ہمیں اگر اس ملک میں ایک اسلامی تحریک کو برپا کرنا ہے تو لامحالہ ہمیں ادب کی ساری اقسام سے کام لینا ہوگا۔ ہمیں بہت بڑی ضرورت ہے کہ ہمارے اندر اقناعی ادب کے لکھنے والے پیدا ہوں۔ ابھی یہ میدان بہت کچھ خالی ہے۔ ہمیں اس امر کی ضرورت ہے کہ ہمارے درمیان اعلیٰ درجے کی تحقیقات کرنے والے لوگ پیدا ہوں۔ ہمیں ضرورت ہے کہ وہ اپنے نتائجِ فکر علمی دلائل کے ساتھ مرتب کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرسکیں۔ میں اکثر محسوس کرتا ہوں کہ سب سے زیادہ جس محاذ پر ہم کمزور ہیں وہ ادب کا ہی محاذ ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو قرآن وحدیث کے گہرے مطالعہ کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم میں بھی اتنی بصیرت رکھتے ہوں کہ وہ اپنے نتائج فکر زبردست علمی اور عقلی دلائل کے ساتھ سامنے لائیں اور یہ ثابت کریں کہ دنیا کے دوسرے نظامہائے فکر انسانیت کے لئے قطعی موجبِ فلاح نہیں ہیں۔ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں دنیا کی خالص اسلام کے نقط نظر سے رہنمائی کرسکیں اور اپنے انکار کو زبردست دلائل کے ساتھ پیش کرسکیں تاکہ پڑھنے والے مطمئن ہو جائیں۔ اس نوعیت کی تحریریں بہت کم ہمارے اخبارات میں دیکھنے میں آتی ہیں۔

ترجمہ

پھر ہمیں ایسے ادیبوں کی بھی ضرورت ہے جو فن ترجمہ کے ماہر ہوں۔ اسلامی ادیبوں میں ترجمہ کرنے والوں کی بھی کمی ہے۔ بہت کم ترجمے ایسے نظر آتے ہیں جن میں

ترجمہ پن نہ پایا جاتا ہو۔ یورپ اور امریکہ نے ترجمے کے فن کو اتنی ترقی دی ہے کہ تحریر ترجمہ کی بجائے اصل تصنیف محسوس ہوتی ہے۔ دوسری زبانوں کے متعلق تو نہیں کہا جا سکتا البتہ انگریزی زبان میں کثرت سے ایسے اچھے ترجمے دیکھے ہیں جن میں ترجمہ پن قطعی نہیں پایا جاتا۔ لیکن ہمارے ہاں ایسے آدمی بہت کم ہیں جو انگریزی اور عربی لٹریچر کو اُردو میں منتقل کریں کہ جس سے زبان کی اجنبیت محسوس نہ ہو۔ ابھی تک ہمارے ہاں دو ایک آدمیوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ ایک دو آدمی اردو کے اسلامی لٹریچر کو عربی میں منتقل کر رہے ہیں۔ انگریزی میں کوئی بھی نہیں۔ ہمارا جو تھوڑا بہت لٹریچر ترجمہ شدہ ہے اسے پیش کرتے ہوئے بھی ہم شرم محسوس کرتے ہیں اسی طرح ہمیں ایسے مترجمین کی بھی ضرورت ہے جو انگریزی، عربی، فارسی اور دوسری زبانوں سے بھی اردو میں ترجمے کریں۔ عربی زبان اسلامی علوم وفنون کا اتھاہ سمندر ہے۔ اُردو کے پرانے ترجمے ناقص ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں کی مانگ ہے لیکن اس وقت تک ان کی کتابوں کا کوئی ترجمہ نہیں ہو سکا جو موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ طبقے کے لئے قابلِ فہم ہو۔ ابن تیمیہؒ ابن قیمؒ کے علوم کے بیش بہا ذخیرے ہیں لیکن افسوس کسی کتاب کا ایسا ترجمہ نہیں ہوا جس سے ہمارے تعلیم یافتہ لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔ حدیث کا پورا ذخیرہ محتاج ہے کہ اسے موجودہ زمانے کی اعلیٰ ادبی زبان کے مطابق ترجمہ اور ترتیب دیا جائے اور جو ترجمے ہیں ان کے متعلق شکایت ہے کہ وہ معیار سے کم ہیں۔ اب جو لوگ انہیں اردو میں منتقل کریں وہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے ذوق اور عوام کے فہم کا لحاظ رکھتے ہوئے کریں۔

نوجوانو! آگے بڑھو

اسی طرح سے ہم کو شدید ضرورت ہے کہ ہمارے اندر مسلم اخبار نویس پیدا ہوں اس سے میری مراد مسلمان اخبار نویسی ہے۔ ایسے صحافیوں کی ہمیں بڑی ضرورت ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اگر ایک اخبار بھی ایسا نکالنے کی کوشش کی جائے جو اسلامی حدود و اخلاق کا پابند ہو۔ جو صحیح طور پر اسلام کی ترجمانی کرے۔ جو بے لگام صحافت سے بچنا چاہے تو ایسے اخبار کے لئے سٹاف نہیں ملتا۔ ان ضروریات کو میں اس لئے بیان کر رہا

ہوں تاکہ ہماری قوم کے نوجوان جنہیں خدا نے اعلیٰ درجے کی دماغی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں وہ ان ضرورتوں کو محسوس کریں اور ان کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔ ہر شخص کو اپنے آپ کو ٹٹول کر دیکھنا چاہیے جو ادب کے جس شعبے کے لئے موزوں ہے وہ اپنے آپ کو اسی کے لئے تیار کرے۔ جو خطابت کی صلاحیت پاتے ہوں وہ اپنے آپ کو اسی کے لئے تیار کریں تاکہ ان کی یہ قوتِ ناطقہ اور قوتِ کلام خدا کے کام کام میں آئے۔ جن کے اندر لکھنے کی صلاحیت ہو تو وہ اپنا جائزہ لیں کہ وہ کس نوعیت کے کام کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔

صحافت۔ شاعری۔ افسانہ نویسی۔ جس چیز کے لئے اپنے آپ کو موزوں پائیں اسی کے لئے اپنے نفس کی تربیت کریں اور جو لوگ بہتر علمی اور دماغی صلاحیتیں رکھتے ہوں وہ علم کے مختلف شعبوں میں آگے قدم بڑھائیں۔ اقائع ادب میں تحقیقی کام کریں۔

ہم ایک بڑے طوفانی دور سے گزر رہے ہیں۔ اس وقت دنیا میں دو نظریوں کی کشمکش جاری ہے اور وہ ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ ہم ان کے درمیان تیسرے نظریے والے ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی ہے کہ اپنی ساری قوتوں سے اپنے نظریۂ حق کو کامیاب بنائیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کی ہیں۔ قوتِ ناطقہ اور قوتِ فکر و فہم سب سے زیادہ ضروری ہیں۔ جسمانی طاقتیں بھی ان طاقتوں سے علیحدہ استعمال نہ کی جائیں۔ میں خاص طور پر اپنے نوجوانوں کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اس جمود کو ختم کریں اور ادب کے ہر شعبے میں آگے بڑھیں۔ مجھے توقع ہے کہ میری یہ اپیل بہرے کانوں سے نہ سنی جائے گی اور رفتہ رفتہ ادب کے محاذ کی طرف ہمارے نوجوان کثرت سے متوجہ ہو جائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ۔

اسلامی ادب کے موضوع پر خالق دینا ہال، کراچی میں تقریر ۳۱ جولائی ۱۹۵۰ء ____ "جہانِ نو" کراچی ستمبر ۱۹۵۰ء و "سید مودودیؒ کی تقاریر" جلد دوم ص۱۲۲-۱۳۲)

شعبۂ صحافت، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ایک طالب علم نے نظامِ تعلیم کے حوالے سے یہ انٹرویو لیا ______ ۱۸ اپریل ۱۹۶۲ء

طالب علم: مولانا! نظامِ تعلیم کی ایک معاشرے میں کیا اہمیات ہے؟

مولانا مودودیؒ: تعلیم یہ ہے کہ آدمی ان تمام معلومات اور تجربات کو جو ایک نسل کو پچھلی نسلوں سے پہنچی ہیں اور جو اسے خود اپنی زندگی میں حاصل ہوئی ہیں، زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے آئندہ نسل تک منتقل کرے، تاکہ وہ انسانی تہذیب و تمدن کو اور زیادہ آگے بڑھانے کے قابل ہو سکے۔ لیکن صرف اتنی تعریف سے بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی جب تک کہ ساتھ ساتھ یہ امر ملحوظ نہ رکھا جائے کہ تمام نوعِ انسانی میں انسانی روایات اور معلومات ایک ہی نوعیت کی نہیں بلکہ مختلف تہذیبوں کے پیروؤں نے ان معلومات و تجربات کو اپنے اپنے طرزِ فکر کے مطابق مرتب و منظم کیا ہے۔ ان سے کچھ خاص نتائج نکالے ہیں اور ان نتائج کے مطابق ہی اس تہذیب کی صورت گری ہوئی ہے جس کی وہ پیروی کرتے ہیں۔ یہ بات تعلیم کے مقصد میں ازخود شامل ہے کہ ایک قوم اپنی آئندہ نسلوں کے لئے اپنے دور تک کی تمام معلومات اور تجربات اس طرح مرتب کرے کہ جس سے اُس کی آئندہ نسلیں اس کی تہذیب سے واقف، اس کی قائل اور پیرو بن کر اُٹھیں اور آئندہ انہی خطوط پر ترقی کریں جو اس کی تہذیب سے مطابقت رکھتی ہوں۔ جو قوم یہ کام نہیں کرتی وہ خودکشی کا ارتکاب کرتی ہے اور جو قوم اپنی آئندہ نسلوں کو اپنی تہذیب کے خلاف کسی دوسری طرز کی تہذیب پر تعلیم دیتی ہے وہ اپنی تباہی کا سامان کرتی ہے۔ اس کو صحیح معنوں میں تعلیم کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

طالب علم: اسلامی تاریخ کے اوّل دور میں نظامِ تعلیم کے کیا مقاصد پیشِ نظر

تھے؟

مولانا مودودیؒ: اسلامی دور میں تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ صحیح معنوں میں مسلمان بن کر اٹھیں اور دنیا میں تہذیب و تمدّن کے نظام کو اس طرز پر چلانے کے قابل ہوں جو اسلام چاہتا ہے۔ اس غرض کے لئے مسلمانوں کی تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت قرآن، حدیث اور فقہ کے علوم کو حاصل تھی۔ مزید برآں مسلمانوں نے دنیا کے وہ تمام علوم پڑھے اور پڑھائے جو دنیا کے نظام کو چلانے کے لئے درکار تھے۔ مگر ان سارے علوم کو انھوں نے مسلمان بنایا پھر ان کو تعلیم میں داخل کیا۔

طالب علم: ایک مثالی نظامِ تعلیم قائم کرنے کے لئے کونسی باتوں کو مدِ نظر رکھا جائے؟

مولانا مودودیؒ: دنیا میں جو بھی نظامِ تعلیم قائم کیا جائے اس میں بنیادی سوال یہ ہوتا ہے کہ اپ کس قسم کے انسان تیار کرنا چاہتے ہیں اور آدمیت کا وہ کیا نقشہ ہے جس کے مطابق آپ لوگوں کو تعلیم و تربیت دے کر ڈھالنا چاہتے ہیں؟

بعض لوگوں کے نزدیک تعلیم کا مقصد صرف علم حاصل کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگوں کو بالکل غیر جانبدارانہ تعلیم دی جانی چاہیے تا کہ وہ زندگی کے مسائل اور معاملات اور حقائق کا بالکل معروضی مطالعہ کریں اور آزادانہ نتائج اخذ کرسکیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس طرح کا معروضی مطالعہ صرف کیمرے کیا کرتے ہیں انسان نہیں کرسکتے۔ انسان ان آنکھوں کے پیچھے ایک دماغ بھی رکھتا ہے جو بہر حال اپنا نقطہ نظر رکھتا ہے۔ وہ مسائل، معاملات اور حقائق کے متعلق سوچنے کا ایک طرز اور فکر رکھتا ہے اور اسی فکر پر وہ نظامِ زندگی قائم ہوتا ہے جسے ہم کلچر کہتے ہیں اور ایک قوم کے لئے جس کے اپنے کچھ عقائد ہوں، اپنا نظریہ زندگی ہو، اپنے اصول ہوں، لازم ہے کہ وہ اپنی آنے والی نسلوں کو اس غرض کے لئے تیار کریں کہ وہ اس کے کلچر کو سمجھیں، زندہ رکھیں اور آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔

دوسری چیز جو کسی نظامِ تعلیم میں بنیادی حیثیت کی حامل ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ دین

و دنیا کی تفریق مٹا دی جائے۔ ایسے نظامِ تعلیم کے مطابق لازم ہے کہ انسان دنیا کو سمجھے اور دنیا کے سارے کام چلانے کے قابل ہو اور اپنی تعلیم کو ایسے سانچے میں ڈھال سکے کہ کسی مرحلہ پر بھی دین اور دنیا میں ٹکراؤ کی صورت پیدا نہ ہو سکے۔ اور جب کبھی ایسا مسئلہ درپیش ہو تو دنیا کو دین کے نقطہ نظر سے سمجھا جائے۔

اس سلسلہ میں اور بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن ایک اور چیز تشکیل سیرت ہے۔ وہ نظامِ تعلیم جس کا مقصد محض کتابیں پڑھانے اور علوم و فنون سکھا دینے سے حل ہو سکتا ہے کبھی مثالی نظامِ تعلیم نہیں کہلا سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تشکیل سیرت کو کتابی علم سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ جس کے نتیجہ میں بنیادی انسانی اخلاقیات پیدا ہوں گی اور معاشرہ کی تعمیر صالح بنیادوں پر رکھی جا سکے گی، اور قوم کے وہ تمام تقاضے پورے ہو سکیں گے جو ایک آزاد اور ترقی پسند قوم کو درپیش ہوتے ہیں۔

طالب علم: موجودہ نظامِ تعلیم سے آپ کس قدر مطمئن ہیں؟

مولانا مودودیؒ: اگر مروجہ نظامِ تعلیم سے مراد وہ نظامِ تعلیم ہے جو انگریزوں نے یہاں قائم کیا اور جسے ہم قیامِ پاکستان کے پندرہ سال بعد بھی بوجوہ سینے سے لگائے ہوئے ہیں تو معاف کیجئے اس سے مطمئن ہونے کا سوال تو درکنار ایک پاکستانی اور خصوصاً مسلمان کے لئے یہ نظامِ تعلیم شرمناک ہے۔ اس نظامِ تعلیم کو رائج کرتے وقت انگریز کے پیشِ نظر یہ تھا کہ وہ اس ملک میں سے ایسے آدمی تیار کرے جو باہر سے آ کر حکومت کرنے والی قوم کے بہتر سے بہتر آلۂ کار بن سکیں۔ اس کو یہاں ایسے آدمی درکار تھے جو اس کی زبان سمجھتے ہوں، جو اس کے ان اصولوں کو جانتے اور سمجھتے ہوں جن پر وہ ملک کا نظام چلانا چاہتا تھا، اور جن میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ اس سرزمین میں انگریز کی منشا کو خود انگریز کی طرح پورا کر سکیں۔ یہ اسی نظامِ تعلیم کا اثر ہے کہ آج ہم اپنی روایتی فرض شناسی، مستعدی، جفاکشی، صبر و ثبات، عزم و استقلال، باقاعدگی و باضابطگی، ضبطِ نفس سب کچھ بھول چکے ہیں، قومی کردار تباہ ہو چکا ہے اور مغربی قوموں کی تقلید میں اس قدر آگے بڑھ چکے ہیں کہ دینی و ملی غیرت کا جنازہ اپنے ہاتھوں نکالنے پر تیار ہیں۔

طالب علم: مولانا! جس طرح آپ نے ابھی فرمایا یہ مروّجہ نظامِ تعلیم کسی صورت قابلِ اطمینان نہیں ___ تو ___ پھر موزوں نظامِ تعلیم کن اصولوں پر استوار کیا جائے؟

مولانا مودودی: ہمیں ایک ایسا نظامِ تعلیم رائج کرنا چاہیے جو ایسے افراد تیار کرے جو ہماری ملی تہذیب کو اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ اس کے اصولوں کو خوب جانتے ہوں، ان کے برحق ہونے کا یقین رکھتے ہوں، اس کے مطابق مضبوط سیرت اور قابلِ اعتماد اخلاق کے مالک ہوں۔ ان کی قابلیت اس نہج کی ہو کہ اجتماعی زندگی کے پورے کارخانے کو ہماری اس تہذیب کے اصولوں پر چلا سکیں اور مزید ترقی دے سکیں اور یہ نظامِ تعلیم ایسا ہو کہ آنے والی نسلوں کو اگر سول سروس کے امتحان کے لئے تیار کرے تو ساتھ ساتھ انھیں امام، مفتی اور علمائے دین بھی بنا سکے۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ہم بچے کی تعلیم کا آغاز اس طرح کریں کہ اس کے ذہن پر یہ ثبت ہو جائے کہ یہ دنیا ایک خدا کی سلطنت اور ایک خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ یہاں ہم خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہیں اور جو کچھ بھی ہے خدا کی امانت ہے جو ہمارے حوالے کی گئی ہے۔

یاد رکھیے جب تک آپ قرآن و حدیث کا دامن نہیں تھامتے، بچوں میں وہ اسلامی روح پیدا کر سکنے سے قاصر رہیں گے جو اسلامی زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے۔ ان اداروں سے پڑھ کر نکلنے والے کسی طور پر بھی ملی قیادت سنبھالنے کے قابل نہیں بن سکتے۔ وہ اسی طرح رشوتیں کھائیں گے، اسی طرح بددیانتی اور خیانت کریں گے جیسا کہ آج ہو رہا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ علوم حاضرہ کو چھوڑ دیں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ آپ ان تمام علوم کو اپنائیے جو آج دنیا میں پڑھائے جاتے ہیں لیکن ان کے پڑھانے سے قبل بچے کے ذہن میں اسلامی اقدار، اسلامی عقائد اور اسلامی اخلاقیات اس قدر پختہ کر دیجیے کہ اس کا ذہن کسی مرحلہ پر بھی شک و شبہ کا شکار نہ ہو سکے اور اس کا عمل کسی صورت میں

بھی اسلام کے خلاف نہ ہو۔

تاریخ کی تعلیم میں ضروری ہے کہ ہمارے طلبہ نہ صرف قوم و ملک کی تاریخ پڑھیں بلکہ اس کے ساتھ اسلام کی تاریخ سے بھی واقف ہوں، اور ثانوی تعلیم ختم کرنے سے پہلے ہی یہ جان لیں کہ اسلام ایک ازلی وابدی تحریک ہے، ساتویں صدی میں وہ یکا یک شروع نہیں ہوگئی تھی۔ انھیں ان مثالی شخصیتوں سے روشناس کرایا جائے جو ان کے لئے معیارِ انسانیت کا درجہ رکھتی ہوں تاکہ جب وہ عملی دنیا میں قدم رکھیں تو اپنی ملی تہذیب کے احترام کے جذبہ سے سرشار ہوں۔ لیکن سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی تعلیمی پالیسی کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیں جو فکر اسلامی سے واقف ہوں، جو روحِ اسلامی سے سرشار، اور اس نظام کو قائم کرنے کے خواہاں ہوں۔ ورنہ وہ لوگ جو اسلام سے واقف ہوں نہ اس کے قیام کے خواہاں، ایسا نظامِ تعلیم قائم کرنے سے قاصر رہیں گے جو ہماری دینی اور دنیاوی احتیاجات کا حل ہو۔

طالب علم: آپ تعلیمی اداروں کے ماحول کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟

مولانا مودودیؒ: میں اپنی تعلیم گاہوں کے موجودہ ماحول سے کسی صورت مطمئن نہیں۔ یہ مخلوط تعلیم، یہ فرنگیت کے مظاہر، یہ از فرق تا بقدم مغربی تہذیب وتمدن کا غلبہ، یہ کالجوں کے مباحثے اور انتخابات کے طریقے، اگر یہ سب کچھ آپ کے ہاں یوں ہی جاری رہے اور ان میں سے کسی چیز کو بھی بدلنے پر آپ راضی نہیں تو اس ذہنی وتہذیبی غلامی کے ماحول میں ایک آزاد مسلم مملکت کے وہ باعزت شہری اور کارکن کبھی پروان نہیں چڑھ سکتے جنھیں اپنی ملی تہذیب پر فخر ہو۔

اگر آپ ایک ایمان دار اور باضمیر قوم تیار کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ تمام نظام بدلنا ہوگا۔ یہ مخلوط تعلیم، یہ فرنگی طرزِ زندگی سب چھوڑنا ہوگا۔ اس کے لئے ایسے معلمین اور معلمات کی ضرورت ہے جو سیرت واخلاق اور اعلیٰ قابلیت کے حامل ہوں۔ یاد رکھیے فاسد العقیدہ اور فاسد الاخلاق اُستاد اپنے شاگردوں کو ہرگز وہ ذہنی، اخلاقی اور عملی تربیت نہیں دے سکتے جس کی ہمیں نئے دور کے لئے ضرورت ہے۔ تعلیم اگر بگڑے ہوئے

لوگوں کے ہاتھوں میں ہو تو وہ آئندہ نسل کا بھتیاناس کر دے گی۔ اس لئے اگر ہم اپنی قومی زندگی کو خرابیوں سے پاک کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اپنے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ماحول کی تطہیر سے اس کا آغاز کرنا ہوگا۔

طالب علم: ہماری مذہبی درس گاہوں کے رائج الوقت نظامِ تعلیم کے سلسلہ میں آپ کچھ فرمانا پسند کریں گے؟

مولانا مودودیؒ: دراصل ان درسگاہوں کو مذہبی درسگاہیں کہنا ایک غلط فہمی ہے۔ ان درسگاہوں میں جو نظامِ تعلیم زیرِ عمل ہے وہ دراصل مذہبی نہیں بلکہ سول سروس کا نظام تھا جو قدیم دور میں مسلمان حکومتوں کی ضروریات کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ اس نظامِ تعلیم کی افادیت عملاً اسی دن ختم ہو گئی تھی جس دن انگریزی حکومت یہاں مسلط ہوئی۔ لیکن چونکہ اس میں ہماری مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بہت کچھ سامان موجود تھا۔ دوسرے ہم اپنی آبائی میراث سے بالکل منقطع نہیں ہونا چاہتے تھے اس لئے ہم نے اسے سینے سے لگا لیا اور بوجوہ کسی تغیر و تبدل کے بغیر اس کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم کے مطابق تعلیم پانے والے عملی زندگی میں کوئی نمایاں حصہ نہ لے سکے اور وہ وقت زندگی اور اس کے مسائل سے ناآشنا رہ گئے۔ سوائے اس کے کہ وہ مسجدیں سنبھال لیں یا وعظ گوئی کا پیشہ اختیار کر لیں زمانے کا ساتھ نہ دے سکے۔

قابلِ توجہ مسئلہ یہ ہے کہ اس نظام کے تحت تعلیم پانے والوں کی طرف سے جب زمانے نے بے اعتنائی برتنی شروع کی تو انھوں نے نزاعی مسائل کو ابھارا تاکہ قوم کو ان کی ضرورت محسوس ہوتی رہے اور اس طرح یہ لوگ نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکے اور نہ موجودہ زندگی کے مسائل پر اسلامی اصولوں کو منطبق کر سکے۔

جیسا کہ قبل ازیں عرض کر چکا ہوں کہ یہ نظامِ تعلیم جسے ہم دینی نظامِ تعلیم سمجھے ہوئے ہیں اور جس سے مذہبی پیشوا اور علمائے دین تیار کرنے کا کام لیا جا رہا ہے، دراصل آج سے دو اڑھائی سو برس پہلے کی سول سروس کی تعلیم ہے۔ جس میں زیادہ تر اس وجہ سے دینی تعلیم کا جوڑ لگایا گیا تھا کہ اس وقت ملک کا قانون اسلامی فقہ تھی اور اسے نافذ

کرنے والوں کے لئے اس کا جاننا ضروری تھا اور آج ہم اسے غنیمت سمجھ کر اس کو اپنی دینی تعلیم سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو یہ دین کی ضروریات پوری کر سکا اور نہ ہی زمانے کے موجودہ درپیش مسائل کا حل۔

> **طالب علم:** ہمارے ہاں اکثر ماہرین تعلیم، تعلیم کو محدود کرنے کے حامی ہیں اور حکومت اور بعض تعلیمی ادارے بڑی حد تک اپنی اس پالیسی پر گامزن ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

مولانا مودودیؒ: میرے نزدیک یہ بعض خاندانوں اور بعض طبقوں کی سیاسی و معاشی اجارہ داری کو برقرار رکھنے کی ایک خواہش کا نتیجہ ہے۔ تعلیم ہی وہ طاقت ہے جس سے کسی طبقے کو معاش کے میدان میں بھی اور سیاست کے میدان میں بھی برتری حاصل ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو پہلے برتری کا اجارہ حاصل ہو چکا ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ عوام الناس کو تعلیم صرف اس حد تک ملے کہ وہ ان کے اچھے خادم بن سکیں۔ تعلیم کے بلند مدارج پر وہ نہ پہنچنے پائیں، تاکہ قیادت اور فرمانروائی اور معاشی بالادستی اس اجارہ دار طبقے اور اس کی آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ رہے۔ اصولی اعتبار سے یہ خیال کرنا کہ معاشی حیثیت سے جو لوگ کمزور ہیں ان کے اندر ذہانت نہیں ہوتی اور ان پر اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھلے رکھنا قوتوں کے ضیاع کے سوا کچھ نہیں، ایک غلط اور خلاف حقیقت بات ہے۔ اس کے برعکس حقیقت حال یہ ہے کہ جن طبقوں میں زیادہ دیر تک خوشحالی رہتی ہے، وہ رفتہ رفتہ اخلاقی اور ذہنی تنزل میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جبکہ بالعموم اعلیٰ درجہ کی ذہانت کے لوگ وہی ثابت ہوتے ہیں جو زندگی کی سختیاں سہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اگر ہمارے ہاں مؤثر اور اعلیٰ تعلیم اونچے طبقوں کی اولادوں کو مخصوص تعلیمی اداروں میں دینے کی روش یوں ہی برقرار رکھی گئی تو یہ بالآخر پوری قوم کے انحطاط پر منتج ہوگی۔

☆

سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ سے جب ان کی تحریکی زندگی کے یادگار واقعات پر سوال کئے گئے ـــــــ ستمبر ۱۹۶۳ء

سوال: تحریک ختمِ نبوت ۱۹۵۳ء کے دوران میں جب آپ کو گرفتار کر کے فوجی عدالت نے سزائے موت کا حکم سنایا تو کیا اس لمحے آپ کو اس نوعیت کی کڑی سزا کی کوئی امید تھی؟ اور جب آپ نے سزائے موت کی خبر سنی تو آپ کا فوری تاثر کیا تھا؟

قائدِ تحریک: اصل میں یہ چیز کچھ مشتہر کرنے کی نہیں ہے۔ اس کے جواب میں جو کچھ میں آج کہوں گا اسے غلط معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے۔ دراصل میں ایک مدت سے اس بات کا متمنی ہوں کہ موت آئے تو بعد کا مرحلہ بھی دیکھ لوں۔ اس وجہ سے مجھے ایک تو یہ بڑا اطمینان ہوا کہ چلیے اب موت کے دروازے سے گزر کر عالمِ آخرت کو دیکھنے کا موقع ملے گا اور دوسرے یہ کہ میں اس شخص کا شکر گزار ہوں گا جو مجھے شہید کر دے تاکہ نجاتِ اُخروی یقینی ہو جائے۔ اس وجہ سے مجھ پر ذرہ برابر بھی غم کی کیفیت طاری نہیں ہوئی بلکہ میں ایک طرح کی خوشی محسوس کرتا تھا۔ البتہ میں یہ ضرور سمجھتا تھا کہ یہ حضرات شاید ہی مجھے پھانسی دینے کی ہمت کر سکیں۔ لیکن یہ بھی سوچتا تھا کہ ان لوگوں کا کیا بھروسا! مجھ سے نجات تو پانا ہی چاہتے ہیں اور میرا وجود ان کو سخت ناگوار ہے۔ ممکن ہے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر یہ کارروائی کر گزریں۔ میری خواہش تھی کہ کاش یہ ایسا ہی کریں۔ اسی وجہ سے میں پوری طرح مطمئن اور خوش تھا۔

سوال: کس خاص واقعے نے آپ کو اس جانب موڑ دیا کہ آپ نے باقاعدہ ایک تحریک منظم کرنے کا فیصلہ کیا؟

قایدِ تحریک: میں اس طرح کا آدمی نہیں ہوں کہ کوئی خاص واقعہ مجھے کسی طرف موڑ دے میں سوچ کر، غور وفکر کر کے کسی طرف بتدریج جاتا ہوں۔ صرف ایک خاص واقعہ تھا جس نے مجھے بہت زیادہ چونکا دیا۔

۱۹۳۷ء میں حیدر آباد سے نو سال کے قیام کے بعد میں دہلی پہنچا تو محسوس کیا کہ اتنے عرصے میں مسلمانوں کی اسلام سے دوری کی رفتار بڑی تیز رہی ہے۔ حیدر آباد میں صورت حال وہ نہیں تھی جو دہلی میں آ کر محسوس ہوئی۔ مسلمان شرفاء کی ان خواتین کو کھلم کھلا بازاروں میں گھومتے پھرتے دیکھا جن کے متعلق میں یہ تصور نہیں کر سکتا تھا، اس چیز نے مجھے چونکایا۔ دہلی کے حالات کی بنا پر راتوں کو مجھے نیند نہ آتی کہ یہ کیا ہو گیا صرف نو سال کے اندر اتنا بڑا تغیر؟ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ کانگریس کی وزارتیں تھیں اور ہر طرف ہندوؤں کا تسلط نظر آتا تھا اور یہ چیز بڑی پریشان کن تھی۔ جب میں ۱۹۳۷ء میں دہلی سے واپس حیدر آباد جا رہا تھا تو میرے ڈبے میں ایک کانگریسی لیڈر بھی سفر کر رہے تھے۔ ان سے کچھ مسلمان بات کرنے لگے۔ ان لوگوں کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ جیسے اب کانگریسی لیڈر ہی اس ملک کے حکمران ہیں اور مسلمان ان کی رعیّت۔ گویا یہ مانگنے والے اور وہ دینے والے۔ ان لوگوں کی ساری گفتگو میں خاموشی سے سنتا رہا۔ میرے سامنے پورا نقشہ آ گیا کہ اب مستقبل میں مسلمانوں کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ اسی واقعہ کے بعد میں نے ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ اوّل'' لکھی۔ حیدر آباد میں میں اخبارات کے ذریعے جن حالات کا ٹھیک اندازہ نہیں لگا سکا تھا ان کو دیکھ کر اور چل پھر کر میں نے محسوس کیا اور یہی وہ چیز تھی جس سے میرے اندر اجتماعی جدوجہد کی تحریک پیدا ہوئی۔

سوال: کیا آپ پر کبھی ایسا بھی وقت آیا ہے کہ آپ کو کھانے کے لئے صرف رُوکھی سُوکھی روٹی ہی میسّر آئی ہو؟

قایدِ تحریک: جی ایسا تو نہیں ہوا۔ اللہ کا شکر ہے۔ لیکن ایک مرتبہ صرف یہ ہوا کہ خیال آیا کہ شاید آج فاقے کی نوبت آئے۔ لیکن اس کے آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ

بھیج دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج تک اس کی نوبت نہیں آئی۔ وہ اس وجہ سے کہ چونکہ میں برسوں تنہا رہا ہوں اور بسا اوقات میں خود ہی کھانا پکا لیا کرتا تھا۔ بلکہ کبھی تو اپنے کام میں انہماک کی وجہ سے اتنی بھی فرصت نہ ملتی تھی کہ کھانا تیار کرسکوں۔ اگر کھانے کا وقت آ گیا تو میں نے کیلے منگا لیے اور کھا لیے۔

سوال: آپ کس وقت زیادہ بیٹھ کر کام کرتے رہے ہیں اور کتنے گھنٹے؟

قائدِ تحریک: میں ہر وقت کام کرسکتا ہوں۔ لیکن ایسی حالت میں جبکہ میں دیکھوں کہ دن کو فرصت نہیں ملتی تو عموماً میں رات ہی کو کام کرتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ قریباً عشاء کی نماز سے فجر کی نماز تک میں مسلسل کام کرتا تھا۔ پھر دن میں بھی لوگ آتے رہتے تھے اور بات چیت ہوتی رہتی تھی۔

سوال: یہ تحریکی کام اور ان حالات میں آپ آخر اپنی صحت کا کتنا خیال رکھتے ہیں؟

قائدِ تحریک: صحت کی طرف سے میں ایک مدت تک بے پروا رہا ہوں۔ بلکہ ایک زمانہ میں تو میں یہ سمجھتے ہوئے کام کر رہا تھا کہ بہر حال مجھے اپنی طاقت لگا دینی ہے خواہ کچھ بھی اس کے نتائج ہوں۔ میں اس زمانہ میں تقریباً Desperate ہو کر کام کر رہا تھا۔ کوئی پروا نہ تھی کہ کیا Strain پڑ رہا ہے اور صحت پر کیا اثر ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک میں اسی طرح کام کرتا رہا۔ کوئی مددگار نہ تھا، تنہا کام کر رہا تھا، میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ کام چلے یا نہ چلے اس کے لئے جو کچھ میں کرسکتا ہوں وہ تو کر ڈالوں۔ بہر حال کوئی یقین تو تھا نہیں کہ ساتھی مل جائیں گے اور جس کام کے لئے میں کوشش کر رہا ہوں اس میں کامیابی بھی ہوگی۔

سیدؒ مودودیؒ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان سے اپنے تعلق پر روشنی ڈالتے ہیں ____ ۱۶ نومبر ۱۹۶۳ء

”اس سے پہلے میں ایک مختصر بیان میں اس الزام کی واضح تردید کر چکا ہوں جو پنجاب یونیورسٹی اور بعض کالجوں کے ہنگاموں کے سلسلے میں مجھ پر اور جماعت اسلامی پر تھوپا جا رہا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ اس معاملے میں حکومت کو گمراہ کرنے کی کوشش کا سلسلہ برابر جاری ہے اور عوام میں بھی بدگمانی پھیلانے کے لئے ایک مہم چل رہی ہے۔ اس لئے میں تمام حقائق حکومت اور عوام کے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں۔

اس الزام کی پوری عمارت صرف دو بنیادوں پر کھڑی کی جا رہی ہے۔ ایک یہ کہ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے ساتھ میرے (مربیانہ) تعلقات ہیں۔ دوسرے یہ کہ لاہور کے بعض طلبہ جن میں پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے صدر نصر اللہ شیخ صاحب اور امیدوارِ صدارت بارک اللہ صاحب بھی شامل ہیں۔ ایک مدت سے میرے پاس آتے جاتے رہے ہیں۔ لیکن قطع نظر اس سے کہ حال کے ہنگاموں میں اسلامی جمعیت طلبہ اور لاہور کے ان طالب علموں کی ذمہ داری کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا کسی جماعت یا چند اشخاص کے ساتھ کسی کے تعلقات کا ہونا اس بات کے لئے کافی ہے کہ ایک خاص واقعہ کی ذمہ داری اس پر تھوپ دی جائے؟ اس لئے تو یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ اس واقعہ کا صدور اس شخص کے ایماء پر ہوا ہے۔ اس کا کوئی ثبوت اگر موجود نہ ہو تو کوئی ایماندار انسان محض قیاسات اور بدگمانیوں پر فیصلہ صادر نہیں کرسکتا۔

جہاں تک اسلامی جمعیت طلبہ اور اس کے افراد کے ساتھ میرے روابط کا تعلق ہے' ان کی نوعیت صرف یہ ہے کہ جمعیت پاکستان کے ان طلبہ کی جماعت ہے جو کالجوں میں جدید

علوم کی تعلیم پانے کے ساتھ ساتھ دینی رجحانات بھی رکھتے ہیں۔ ان کی اپنی ایک مستقل جماعت ہے جس کا مجھ سے یا جماعت اسلامی سے کوئی باضابطہ تعلق نہیں ہے البتہ ملک اور بیرون ملک کے ہزارہا دوسرے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی طرح یہ لوگ بھی شخصی حیثیت سے مجھ پر یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ میں اسلام کی صحیح تشریح کرتا ہوں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق موجودہ زمانے کے پیچیدہ مسائل کا حل انھیں بتا سکتا ہوں۔ اسی بناء پر دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح یہ لوگ بھی میری طرف رجوع کرتے ہیں۔ اپنے اجتماعات میں بھی درس یا تقریر کے لئے مجھے بلاتے رہے ہیں۔ اور میری کتابیں بھی پڑھتے رہے ہیں۔ ان کا یہ تعلق جماعتِ اسلامی کے ساتھ نہیں بلکہ میری ذات کے ساتھ ہے اور میری ذات کے ساتھ بھی اس تعلق کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ ایک جماعت کی حیثیت سے ان کی پالیسی میں بناتا ہوں اور ان کے جماعتی کاموں کے لئے ہدایات میں جاری کرتا ہوں۔ یہ نتیجہ اگر کوئی نکالتا ہے تو حقیقت سے بے خبری کی بناء پر محض قیاسی گھوڑے دوڑا کر نکالتا ہے۔

جہاں تک حال کے افسوس ناک واقعات کا تعلق ہے اس امر کا فیصلہ تو کسی غیر جانب دارانہ تحقیق ہی سے ہو سکے گا کہ صداقت اور انصاف کی بنیاد پر ان کی ذمہ داری میں کس کس کا کیا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اپنی اور اپنی جماعت کی حد تک میں برملا صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا نہ کروں گا کہ اس میں بر بنائے واقعہ ہمارا قطعاً کوئی حصہ نہیں ہے، بلکہ یہ بھی کہوں گا کہ بر بنائے اصول ہمارا کوئی حصہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ جماعت اسلامی پاکستان اپنے قواعد کی رو سے کسی طالب علم کو اپنا رکن یا متفق نہیں بناتی۔ کسی طالب علم کے متعلق اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ وہ جماعت اسلامی کا رکن یا متفق ہے تو وہ بالکل خلاف واقعہ اور قطعی بے ثبوت بات کہتا ہے۔

۲۔ جماعت اسلامی درسگاہوں میں یا طلبہ میں جا کر کام کرنے سے ہمیشہ اجتناب کرتی رہی ہے۔ اور اس کی مستقل پالیسی یہ ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے۔ میں نے خود بارہا طلبہ کے جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے علانیہ یہ کہا ہے کہ طلبہ اپنے ملک کے معاملات سے واقفیت ضرور پیدا کریں تا کہ کل موجودہ نسل کی جگہ لینے کے

لئے تیار ہو سکیں۔ لیکن جب تک وہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں انھیں عملی سیاست سے الگ رہنا چاہیے۔ یہ بات جماعت اسلامی کے طے شدہ اصولوں میں سے ہے اور ہم نے اپنے کسی کارکن کو کبھی اس کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں دی ہے۔

۳۔ میں اصولاً قانون شکنی اور غیر آئینی طریقِ کار اور زیرِ زمین کام کا سخت مخالف ہوں۔ میری یہ رائے کسی سے خوف یا کسی وقتی مصلحت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ میں سالہا سال کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قانون کا احترام مہذب معاشرے کے وجود کے لئے ناگزیر ہے اور کوئی تحریک اگر اس احترام کو ایک دفعہ ضائع کر دے تو پھر خود اس کے لئے بھی لوگوں کو قانون کا پابند بنانا سخت دشوار بلکہ محال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زیرِ زمین کام اپنے اندر وہ قباحتیں رکھتا ہے جن کی وجہ سے اس طریقے پر کام کرنے والے آخر کار خود ان لوگوں سے بھی بڑھ کر معاشرے کے لئے مصیبت بن جاتے ہیں جن کو ہٹانے کے لئے وہ یہ طریقے اختیار کرتے ہیں۔ انہی وجوہ سے میرا عقیدہ یہ ہے کہ قانون شکنی اور خفیہ کام قطعی غلط ہے۔ میں نے ہمیشہ جو کچھ کیا ہے علانیہ کیا ہے اور آئین و قانون کے حدود کے اندر رہ کر کیا ہے۔ حتیٰ کہ جن قوانین کا میں شدید مخالف ہوں ان کو بھی میں نے آئینی و جمہوری طریقوں سے بدلوانے کی کوشش کی ہے مگر کبھی ان کی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔

۱۔ یہی عقیدہ جماعت اسلامی کا بھی ہے۔ اس کے دستور کی دفعہ ۵ میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ ہم ایسے ذرائع اور طریقے کبھی استعمال نہیں کریں گے جو صداقت و دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فساد فی الارض رونما ہو۔ ہم جو کچھ کریں گے جمہوری اور آئینی طریقوں سے کریں گے اور خفیہ طریقوں سے نہیں بلکہ کھلم کھلا اور علانیہ کریں گے۔ جماعتِ اسلامی کا ہر فرد اس دستور کی پابندی کا حلف اٹھا کر اس کا رکن بنتا ہے اور یہ جماعت ان لوگوں پر مشتمل نہیں ہے جو ایک چیز کا حلف اٹھا کر اس کو توڑتے ہوں۔ جماعت کا کوئی آدمی اس حلف کی خلاف ورزی کرے تو دوسروں سے پہلے خود جماعت اس کی خبر لے گی۔

(۷ نومبر ۱۹۶۳ء، 'ایشیا' لاہور)

☆

"اسلام عصرِ حاضر میں" کے زیرِ عنوان 'اسلامی جمعیت طلبہ' کراچی نے جلسہ منعقد کیا' اور خطاب کے بعد طلبہ نے سوالات کیے ___ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۳ء

"اگر کوئی قوم پوری طرح سے اسلام کو اپنائے اور اپنا پورا نظامِ زندگی اس کے مطابق چلائے اور اسی کے لئے جینے اور اسی کے لئے مرنے کو تیار ہو تو میرا خیال ہے کہ آج دنیا اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ لوگوں کے لئے ناممکن ہے کہ چلتے پھرتے اسلام کو دیکھیں اور اس کو قبول نہ کریں' البتہ اگر آپ زبانی تقریروں اور کتابوں کے ذریعہ سے اسلام پھیلانے کی کوشش کرتے رہیں گے تو قیامت تک آپ یہ "شغل" جاری رکھیے، دنیا کو اس بات پر قائل کرنا مشکل ہوگا کہ اسلام قابلِ عمل ہے۔

میں جو چاہتا ہوں ___ اب اپنے مدعا کی بات بھی آپ سے عرض کیے دیتا ہوں ___ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس قوم میں پیدا کیا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ___

وہ قوم' یہی قوم ہو' جس میں میں پیدا ہوا ہوں۔
تمام میری سیاست ہے تو یہی ہے
اور میرا مذہب ہے تو یہی ہے۔

میری ساری کوششوں کا مدعا یہ ہے کہ یہ قوم جس کے اندر میں پیدا ہوا ہوں یہ وہ قوم ہو کہ جو اسلام کو پوری طرح اپنالے اور اس کو اپنی زندگی میں نافذ کر کے دکھا دے' ایسی زندگی جس کے اندر چلتا پھرتا اسلام نظر آئے۔

سوال: آپ نے فرمایا ہے کہ ایک زبردست طاقتور داعی ہونا چاہیے۔ کیا آپ اس منصب کے دعویدار ہیں؟

جواب: میں بالکل حیران ہوں کہ سائل کے ذہن میں یہ تصور کیسے آیا۔ میں اس طرح کا نہ کوئی دعویٰ رکھتا ہوں نہ میرے ذہن میں ایسا کوئی تصور ہے، میں تو اس بات کی ضرورت ظاہر کر رہا ہوں کہ اگر یہ انقلاب ہو سکتا ہے تو اس کے لئے بڑی زبردست انقلابی شخصیت کی ضرورت ہے۔ ویسے آپ خود بھی دعا فرمائیں اور میں بھی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے بھی اپنے دین کی کوئی خدمت لے لے۔

سوال: آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا ہے کہ "اسلام آج بھی دنیا میں پھیل رہا ہے۔ کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ اسلام پھیلانے کا یہ مقدس کام کون کر رہا ہے؟

جواب: کچھ اس سوال کی نوعیت یہ بتا رہی ہے کہ ایک خاص گروہ کی طرف سے یہ سوال آیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ وہ گروہ جس چیز کو پھیلا رہا ہے اسے میں اسلام نہیں مانتا۔ البتہ یہ ہے کہ دنیا میں اسلام بڑے پیمانے پر پھیل رہا ہے۔ اور پہلے بھی پھیلتا رہا ہے۔ یاد رکھیں کبھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ اسلام کے پھیلانے کے لئے باقاعدہ مشنری تنخواہ دار نکلے ہوں اور باقاعدہ مشن بنے ہوں۔ اسلام پھیلا ہے ایک ایک مرد مسلمان کی انفرادی کوششوں سے۔ تاجر گئے ہیں، اپنی تجارت بھی کی ہے، اپنے اثرات لوگوں پر ڈالے ہیں اور لوگ مسلمان ہوئے ہیں۔ مسلمان تنخواہ دار آرگنائزڈ مشنری کے تحت کام کرنے کے کبھی عادی نہیں رہے اور اسلام اس ذریعے سے کبھی تاریخ میں پھیلا ہو تو مجھے بتا دیا جائے۔

سوال: آپ کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ سندھ سے لے کر ہسپانیہ تک کے ممالک مسلمانوں کے اخلاق نے فتح کیے تھے جبکہ مسلمانوں کا اخلاق اور اس کے متعلقات تو خلافتِ راشدہؓ کے بعد ہی رخصت ہو گئے تھے۔ دور خلافت کے بعد جتنے بھی ممالک فتح کیے گئے وہ صرف تلوار کے بل بوتے پر فتح ہوئے، فاتح فوجوں اور امیروں کا کردار یہ ہوتا تھا کہ ان کے حرم مفتوحہ علاقوں کی حسین عورتوں سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ مسلمان فوجیوں کا

کردار تو خلافتِ راشدہؓ کے بعد اس واقعے سے اچھی طرح سامنے آ جاتا ہے جس میں مدینے کو تین دن کے لئے مباح قرار دے دیا گیا تھا؟

جواب: اصل میں اس طرح کی جو بحثیں ہیں یہ کبھی تاریخ کو سمجھنے میں مددگار نہیں ہوسکتیں۔ آپ کو یہ جان لینا چاہیے کہ وہ دور جس میں انسان کو بلندترین مقام پر اٹھایا گیا ہو اس دور میں بھی جرائم بھی پیش آئے ہیں‘ گناہ بھی ہوتے ہیں‘ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اگر کسی کا چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹا گیا ہے تو بہرحال چوری کا فعل تو ہوا تھا نا‘۔

اس معاشرے میں اگر کسی کو زنا کی سزا دی گئی ہے تو زنا کا ارتکاب کسی نے کیا تھا نا‘ تبھی تو سزا دی گئی تھی۔ کوئی بلندترین اور پاکیزہ ترین‘ معاشرہ بھی لے لیجیے‘ یہ تصور کرنا کہ اس میں گناہ اور جرم کا قطعی طور پر استیصال ہو جائے یہ بالکل غلط ہے۔ اسی طرح سے جب ہم یہ ذکر کرتے ہیں کہ فلاں دور جو آیا تو اس دور میں یہ خرابیاں پیدا ہوئیں تو یہ تصور کرنا کہ وہ دور خود سے مجسم گناہ بن گیا تھا۔ یہ خیال غلط ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے آپ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے دور میں جو زبردست Momentum اسلام کو ملا تھا‘ اس کے اثرات تو آج تک ختم نہیں ہوئے کجا کہ قریب کے زمانے میں ختم ہو گئے ہوتے۔

اب مسلمان بادشاہوں اور اُمراء کے افعال جیسے کچھ بھی رہے ہوں مگر اس کے مقابلہ میں عام مسلمان کا کردار نہایت بلند تھا اس لئے کہ ان کی سیاسی لیڈرشپ بادشاہوں اور اُمراء کے ہاتھ میں تھی اور ان کی روحانی اور اخلاقی اور ذہنی لیڈرشپ جو تھی وہ ہمیشہ علماء فقہا اور صوفیاء کے ہاتھ میں رہی۔ ان پاکیزہ ترین انسانوں کے ہاتھ میں رہی ہے جن کی نظیر فی الواقع انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ تو ان لوگوں کو اثرات کے تحت آپ کے اسی ملک میں مسلمانوں کے اخلاق اتنے بلند تھے کہ ایک مسلمان جا کر اپنی مونچھ کا بال توڑ کر بنیے کے پاس رہن رکھواتا تھا اور بنیا اس کو رکھتا تھا اس اطمینان پر کہ یہ اسے لینے کے لئے آئے گا اور قرض ادا کرے گا‘ کھا نہیں جائے گا۔ آخر ۸۰۰‘ ۹۰۰ برس تک یہ کردار

اور یہ سیرت آپ کے ہاں رہی ہے، اس وجہ سے یہ خیال کرنا کہ ملوکیت کا دور آیا تو مسلمانوں کے کردار اور سارے اخلاق کا خاتمہ ہوگیا بالکل غلط ہے۔ اس طرح کی کوئی رائے قائم کرنے کے لئے کسی جزئی واقعہ کو بنیاد بنالینا کہ یزید کے زمانے میں یہ ہوا اور فلاں زمانے میں یہ ہوا تھا پھر ان چیزوں سے یہ اندازہ کرنا کہ مسلمانوں کا کردار بحیثیت مجموعی یہ کچھ ہوگیا تھا' یہ غلط ہے۔ انفرادی واقعات اور جزئی واقعات ہر زمانے میں پیش آتے ہیں۔

سوال: نظامِ تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھال دینے کا کوئی فوری ذریعہ بتائیں؟

جواب: (مولانا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا) فوری ذریعہ صرف ایک تعویذ ہوتا ہے اور وہ مجھے لکھنا نہیں آتا ہے۔ اس طرح کے معاملات فوری طور پر کبھی نہیں ہوا کرتے۔ (پھر فرمایا) اس طرح کے معاملات بتدریج ہی ہوا کرتے ہیں۔

سوال: سعودی عرب میں سیکولر حکومت نہیں ہے مگر پھر بھی وہ بہت پسماندہ ہے؟ (یہ وہ زمانہ ہے جب پٹرول کی دولت اس وسیع پیمانے پر نہیں نکلی تھی۔ مرتب)

جواب: اس طرح کے معاملات کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے قریبی واقفیت کی ضرورت ہے۔ سعودی عرب کی تاریخ کیا ہے؟ صدیوں سے وہاں کیا حالات رہے ہیں؟ اگر آپ ان حالات سے واقف ہوں تو آپ کو پتہ چلے کہ سعودی عرب کی پوزیشن کس لحاظ سے اچھی ہے اور کس لحاظ سے بری ہے۔ آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تقریباً نو دس صدیوں سے عرب کا جزیرہ نما انتہائی Neglected (نظر انداز) علاقہ رہا ہے۔ تمام مسلمان ریاستوں نے اس سے غفلت برتی ہے۔ خصوصاً ترکی حکومت کے زمانے میں عرب ملکوں میں تعلیم کا سرے سے کوئی انتظام نہیں تھا۔ کوئی قابلِ ذکر مدرسہ سارے ملک میں نہیں پایا جاتا تھا۔ حرمین میں کچھ علماء درس وغیرہ دیا کرتے تھے۔ باقی سارا ملک

اور یہ سیرت آپ کے ہاں رہی ہے، اس وجہ سے یہ خیال کرنا کہ ملوکیت کا دور آیا تو مسلمانوں کے کردار اور سارے اخلاق کا خاتمہ ہو گیا بالکل غلط ہے۔ اس طرح کی کوئی رائے قائم کرنے کے لئے کسی جزئی واقعہ کو بنیاد بنا لینا کہ یزید کے زمانے میں یہ ہوا اور فلاں زمانے میں یہ ہوا تھا پھر ان چیزوں سے یہ اندازہ کرنا کہ مسلمانوں کا کردار بحیثیت مجموعی یہ کچھ ہو گیا تھا' یہ غلط ہے۔ انفرادی واقعات اور جزئی واقعات ہر زمانے میں پیش آتے ہیں۔

سوال: نظامِ تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھال دینے کا کوئی فوری ذریعہ بتائیں؟

جواب: (مولانا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا) فوری ذریعہ صرف ایک تعویذ ہوتا ہے اور وہ مجھے لکھنا نہیں آتا ہے۔ اس طرح کے معاملات فوری طور پر کبھی نہیں ہوا کرتے۔ (پھر فرمایا) اس طرح کے معاملات بتدریج ہی ہوا کرتے ہیں۔

سوال: سعودی عرب میں سیکولر حکومت نہیں ہے مگر پھر بھی وہ بہت پسماندہ ہے؟ (یہ وہ زمانہ ہے جب پٹرول کی دولت اس وسیع پیمانے پر نہیں نکلی تھی۔ مرتب)

جواب: اس طرح کے معاملات کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے قریبی واقفیت کی ضرورت ہے۔ سعودی عرب کی تاریخ کیا ہے؟ صدیوں سے وہاں کیا حالات رہے ہیں؟ اگر آپ ان حالات سے واقف ہوں تو آپ کو پتہ چلے کہ سعودی عرب کی پوزیشن کس لحاظ سے اچھی ہے اور کس لحاظ سے بری ہے۔ آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تقریباً نو دس صدیوں سے عرب کا جزیرہ نما انتہائی Neglected (نظر انداز) علاقہ رہا ہے۔ تمام مسلمان ریاستوں نے اس سے غفلت برتی ہے۔ خصوصاً ترک کی حکومت کے زمانے میں عرب ملکوں میں تعلیم کا سرے سے کوئی انتظام نہیں تھا۔ کوئی قابلِ ذکر مدرسہ سارے ملک میں نہیں پایا جاتا تھا۔ حرمین میں کچھ علماء درس وغیرہ دیا کرتے تھے۔ باقی سارا ملک

مدارس سے خالی پڑا تھا۔ اس وقت بھی حالت یہ ہے کہ صحرائی علاقوں میں اگر آپ جائیں تو ایسے بدو آپ کو ملیں گے کہ جو سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص نہیں جانتے۔ جن کو یہ معلوم نہیں کہ نماز میں کیا پڑھا جاتا ہے ______ جن کو یہ معلوم نہیں کہ مسلمان کیا کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ یہ عرب میں اس وقت بھی بدوؤں کی حالت ہے۔ اس سعودی حکومت کو ابھی قائم ہوئے ۳۵، ۴۰ سال ہوئے ہیں۔ اس علاقے کے اندر تبدیلی آئی ہے۔ اب انھوں نے بڑے پیمانے پر اس علاقے کے اندر مدارس کھولنے شروع کیے ہیں۔ وہ اپنا کام کر رہے ہیں، ان تمام نقائص کے باوجود جو اس سعودی حکومت میں پائے جاتے ہیں اور میں ان کے نقائص کا حامی نہیں ہوں لیکن بہر حال وہ کوشش کر رہے ہیں کہ عرب کی عام آبادی خوشحال ہو جائے۔ صدیوں کے انحطاط کے جو نتائج ہیں اُن کو چند برس میں نہیں ختم کیا جاسکتا۔

سوال: شرع کی رُو سے بھوک ہڑتال کے مسئلے پر روشنی ڈالیں۔ آیا کہ موجودہ حالات میں جب کہ کوئی بھی جائز بات نہیں مانی جاتی ہے اور جیلوں میں ڈال کر من مانیاں کی جاتی ہیں ______ اس سلسلے میں کس قسم کی رعایت اسلام دیتا ہے؟ کیا یہ حرام ہے؟

جواب: (مولانا نے شگفتہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے فرمایا) بھوک ہڑتال تو ہر گھر میں ہوتی ہے۔ بچے بھوک ہڑتال کرتے ہیں، بیویاں بھوک ہڑتال کرتی ہیں، کبھی شوہر بھی بھوک ہڑتال کر دیتے ہیں، بھوک ہڑتال کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہ کوئی ممنوعہ اور حرام چیز بھی نہیں ہے۔ البتہ اتنی احتیاط برتیے کہ مرنے کی نیت سے بھوک ہڑتال نہ کیجیے۔ مرنے کے لئے اگر بھوک ہڑتال کریں گے تو یہ خودکشی کا ارادہ ہوگا جو ناجائز ہے۔ باقی مخصوص صورتِ حال میں بھوک ہڑتال کرنے سے پہلے آپ اس بات کا انتظام کر رکھیے کہ جب آپ بھوک ہڑتال کریں تو کچھ لوگ شور مچائیں تا کہ آپ کا مسئلہ حل ہو اور اسلامی اصولوں سے تجاوز بھی نہ ہو۔

سوال: طلبہ کا سیاست میں حصہ لینا کیسا ہے؟___ خاص طور پر اس بات کے پیشِ نظر کہ ان کے ناپختہ ذہنوں کا کسی بھی سیاسی جماعت کے ہاتھوں شکار ہو جانا عین ممکن ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح ہے یا غلط؟

جواب: اس معاملے میں میرا جو نقطہ نظر ہے وہ مختصراً میں آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ طلبہ کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ اُن کو سیاست کے سمجھنے کا حق پہنچتا ہے۔ بلکہ یہ ضروری ہے کیونکہ کل ان کو قومی زندگی کا چارج لینا ہے۔ موجودہ نسل کی قیادت کرنا اور معاملات کو چلانا ہے۔ اس لئے اُن کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مختلف گروہوں کے خیالات سے واقف ہوں، اپنے ملک کے حالات سے واقف ہوں، سیاسی نظریات سے واقف ہوں۔ انھیں اس بات کا علم ہو کہ ملک کا نظام کیسے چلایا جاتا ہے۔ اس معاملے میں اگر کوئی حکومت طلبہ کو بسم اللہ کے گنبد میں پرورش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور یہ چاہتی ہے کہ جن لوگوں کی بات ہم سنوانا چاہتے ہیں۔ طلبہ صرف ان کی بات سنیں اور جن کی بات ہم نہیں سنوانا چاہتے طلبہ ان کے قریب پھٹکنے نہ پائیں۔ ایسی حکومت طلبہ کے ساتھ بھی اور ملک کے ساتھ بھی ظلم عظیم کا ارتکاب کرتی ہے۔ تو جہاں تک جاننے اور سمجھنے کا تعلق ہے، یہ طلبہ کے فرائض میں سے بھی ہے اوان کے حقوق میں سے بھی ہے، اس کے ساتھ طلبہ کہ یہ بھی حق ہے، خصوصاً وہ نوجوان طلبہ کہ جو تعلیم سے فراغت کے قریب ہیں ان کو یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ وہ دیکھیں کہ جوان سے پہلے کی نسل ملک کے معاملات چلا رہی ہے وہ جانے سے پہلے ان کے حق میں کہیں کانٹے تو بو کر نہیں جا رہی۔ اس لئے کہ کل اُن کانٹوں سے ان کو سابقہ پیش آنا ہے۔ اگر وہ الجھنیں پھیلا کر جا رہی ہے تو کل ان الجھنوں سے ان کو سابقہ پیش آئے گا۔ جو مشکلات وہ پیدا کر کے جائیں گے ان مشکلات کو حل کرنا انھیں پڑے گا۔

عام طور پر سیاسی مسائل کے فیصلے کے لئے میدان میں اُتر آنا یہ طلبہ کا کام نہیں ہے۔ اس وقت کی جو نسل معاملات کو چلا رہی ہے۔ اس کام کو وہ ان کے لئے چھوڑ دیں۔ کیونکہ یہ کام ان کا نہیں ہے کہ وہ اپنے کالجوں اور یونیورسٹیوں اور مدرسوں سے نکل

آئیں اور سیاسی مسائل کے تصفیے زبردستی کرائیں۔ البتہ بعض خاص مواقع ایسے آتے ہیں کہ جن میں یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ طلبہ بھی میدان میں آئیں اور سیاسی تحریکات میں حصہ لیں۔ جیسے کہ پاکستان کی آزادی کا مسئلہ تھا۔ کون آدمی ہے جو کھڑے ہو کر کہہ سکتا ہے کہ پاکستان کی آزادی میں طلبہ نے جو حصہ لیا وہ ناجائز تھا اور اگر وہ جائز تھا تو معلوم ہوا کہ طلبہ کا سیاست میں حصہ لینا ہر حالت میں حرام نہیں۔ لیکن اس کو عام چیز بھی نہیں ہونا چاہیے کہ یہ آئے دن کا کھیل بن جائے اور عام سیاسی پارٹیاں وقتاً فوقتاً طلبہ کو اپنا آلۂ کار بنا کر استعمال کریں۔ اس معاملے میں جو طلبہ کے لیڈر ہیں۔ ان میں اتنی سمجھ بوجھ ہونی چاہیے کہ وہ طلبہ کو غلط راستے پر نہ جانے دیں اور طلبہ کو آئے دن سیاسی کھیل کھیلنے سے روکیں۔ اگر وہ آئے دن سیاسی کھیل کھیلتے رہیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی تعلیم کا ستیاناس ہو جائے گا اور وہ اس قابل نہ بن سکیں گے کہ مستقبل میں جب ملک کے معاملات ان کے ہاتھ میں آئیں تو خوبی کے ساتھ ان معاملات کو چلا سکیں۔

* * *

۶ جنوری ۱۹۶۴ء کو جنرل ایوب خان کی حکومت نے جماعت اسلامی پر پابندی عائد کر کے سیّد مودودیؒ سمیت اس کی پوری قیادت کو جیلوں میں بند کر دیا تھا۔ حکومت کی ”فرد قرار داد جرم“ میں ایک شق کا تعلق جمعیت کی سیّد مودودیؒ سے عقیدت واحترام کے بارے میں بھی تھا۔

سیّد نے لاہور ہائی کورٹ میں جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا:

”یہ الزام مجھ پر صرف اسی وقت چسپاں ہو سکتا ہے، جب دو باتیں ثابت کر دی جائیں، ایک یہ کہ اسلامی جمعیت طلبہ نے کبھی کسی تعلیمی ادارے میں کوئی غیر قانونی ہڑتال کرائی ہے یا کسی درس گاہ کے اندر کوئی بدامنی اور ہنگامہ برپا کرایا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کام میں میرا کوئی ایما شامل رہا ہے۔ میں پورے دعوئ کے ساتھ کہتا ہوں کہ حکومت ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ثابت نہیں کر سکتی۔ اسی وجہ سے اس نے تحفظ امن عامہ کے آرڈی ننس اور کرمنل لاء ایمنڈمنٹ ایکٹ ۱۹۰۸ء کا سہارا لیا ہے تا کہ کسی عدالت کے سامنے کوئی ثبوت پیش کرنے کی ”دشواری“ پیش نہ آئے اور نہ یہ ”خطرہ“ مول لینا پڑے کہ غیر جانبدارانہ عدالتی تحقیقات سے حقیقتِ حال کھل جائے گی!!

اسلامی جمعیت طلبہ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں قائم ہوئی تھی۔ یہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ان طلبہ کی تنظیم ہے جو ہمارے ملک کی درس گاہوں میں سائنس، معاشیات، قانون، انجینئرنگ، ڈاکٹری، فلسفہ اور دوسرے جدید علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی رجحانات بھی رکھتے ہیں، اخلاقی قدروں کی پابندی بھی کرتے ہیں، اور اپنی درس گاہوں میں الحاد، بے دینی اور اخلاقی فسق و فجور کو روکنے اور طلبہ میں اسلامی روح بیدار کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ان نوجوانوں میں آپ کو بکثرت ایسے افراد

بھی ملیں گے جو جدید مغربی علوم کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ تہجد گزار بھی ہیں۔ ان لوگوں نے پچھلے کئی برسوں میں نوجوان نسل کے اعتقادی اور اخلاقی بگاڑ کو روکنے اور انھیں ملحدانہ خیالات اور فاسقانہ افعال کے سیلاب سے بچانے کے لئے بہت کچھ کام کیا ہے۔

مجھے ان طلبہ کے انہی اوصاف کی بنا پر ان سے دلچسپی ہے کیونکہ میں اس ملک میں ایسی ہی نوجوان دیکھنا چاہتا ہوں جو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ سچے اور پکے مسلمان رہیں اور ان طلبہ کو بھی مجھ سے اسی بنا پر دلچسپی ہے کہ وہ مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ میں ان کو اسلام کی روشنی میں زندگی کے جدید مسائل کا حل بتا سکتا ہوں ــــــ میرا اور ان کا تعلق چھپا ہوا نہیں ہے اور نہ اس کو چھپانے کی کوئی وجہ ہے!!''

☆

محترم سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ذوقِ مطالعہ سے متعلق
یہ معلومات افزاء مصاحبہ ''سیارہ'' میں شائع ہوا ____ ستمبر ۱۹۶۵ء

سیارہ: آپ کے اندر ذوقِ مطالعہ کب نمایاں طور پر متحرک ہوا؟ اس کا نشوونما کس طرح ہوا؟ اس دوران میں ذوقِ مطالعہ کو مہمیز لگانے میں کونسی شخصیات کا حصہ رہا؟

سید مودودیؒ: مجھے مطالعے کا شوق چودہ پندرہ سال کی عمر میں ہوا۔ ابتدا میں میں نے کئی سال تک ہر طرح کی چیزیں پڑھیں یعنی مطالعہ کسی خاص موضوع سے متعلق نہیں تھا۔ اُردو فارسی، عربی میں جو کچھ ملا پڑھ ڈالا۔ پھر بعد میں، میں نے اتنی انگریزی سیکھ لی کہ اس میں مطالعہ کر سکوں۔ چنانچہ میں نے انگریزی میں بھی اسی طرح ہر موضوع کا مطالعہ کر ڈالا۔ اس وقت بس محض ہر چیز کو جان لینے کا شوق مسلط تھا۔ کسی خاص موضوع کی طرف رجحان نہیں تھا۔ جہاں تک ذوقِ مطالعہ کو مہمیز کرنے اور رہنمائی لینے کا تعلق ہے، اس معاملے میں خود ہی اپنا رہنما ہوں۔

سیارہ: تحقیقی مطالعہ کی جانب آپ کا رجحان کب ہوا؟ اس میں کونسے محرکات شامل تھے؟ نیز آپ کا طریقِ تحقیق کیا ہے اور کن زبانوں میں زیادہ مطالعہ و تحقیق کی؟

سیّد مودودیؒ: تحقیقی مطالعے کی طرف رجحان ۲۳-۱۹۲۲ء کے زمانہ میں شروع ہوا۔ اس وقت بھی کسی خاص موضوع پر تعین کر کے میں نے اس میں خصوصی واقفیت بہم پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ جس موضوع پر بھی میں لکھنا چاہتا تھا۔ اس موضوع کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرنے اور اُن کو مرتب کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ چند سال کے

بعد ذہن کا رجحان قطعی طور پر اسلامی نظامِ زندگی کو سمجھنے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو مرتب طریقے سے پیش کرنے کی طرف ہو گیا اور پھر میرے مطالعہ و تحقیق کی کوششیں اسی راستے کے لئے وقف ہو گئیں —— میرے رجحانات میں یہ تغیر ۲۹-۱۹۲۸ء کے لگ بھگ زمانے میں شروع ہوا۔ یہ تبدیلی میرے اندر آہستہ آہستہ ازخود پیدا ہوئی اور متعین طور پر اس کا کوئی خارجی محرک نہ تھا۔

میرا طریقِ تحقیق اس وقت تک سے یہ رہا ہے کہ جس چیز کے متعلق بھی میں رائے قائم کرنا چاہتا ہوں اس کے تمام گوشوں کے متعلق جہاں جہاں سے بھی معلومات فراہم ہو سکتی ہوں ان کا مطالعہ کرتا ہوں۔ مطالعے کے دوران میں کتابوں پر نشانات لگاتا جاتا ہوں۔ اس کے بعد پھر نشان زدہ مقامات سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ الگ نوٹ کر لیتا ہوں اور لکھتے وقت میرے سامنے کتابیں نہیں ہوتیں بلکہ صرف میرے نوٹس ہوتے ہیں —— لکھنے کے دوران میں اگر کسی گوشے کے متعلق تشنگی محسوس ہوتی ہے تو بسا اوقات کئی کئی روز تک لکھنا ملتوی کر کے اس گوشے کے بارے میں معلومات جمع کرنی شروع کر دیتا ہوں۔

جب سے علمی تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا ہے زیادہ تر عربی اور انگریزی تصنیفات سے استفادہ کرتا آیا ہوں!

سیارہ: آپ کی نگاہ میں وہ بہترین ادب اور ادبی شہ پارہ کونسا تھا جس نے آپ کو متاثر کیا؟ مزید یہ کہ آپ کی تحریروں میں ادبی چاشنی کا سبب کیا ہے؟

سیّد مودودیؒ: جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آغازِ کار میں ہر طرح کی چیزیں پڑھی ہیں۔ اس ضمن میں کسی خاص مصنف یا کتاب کا تعین لاحاصل ہے۔ جہاں تک پسندیدہ شعراء کا تعلق ہے، مجھے زیادہ تر غالب، مومن اور اقبال سے دلچسپی رہی ہے، لیکن اب یہ دلچسپی بھی مسلسل سنجیدہ اور خشک تحقیقی کام کرتے رہنے کی وجہ سے ختم ہو گئی ہے۔ اب مصروفیات کے ہجوم کی وجہ سے ادبی مطالعے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔ تاہم جب تھک جاتا ہوں تو لائٹ لٹریچر، اخبار، رسالے یا کوئی دلچسپ چیز پڑھتا ہوں۔ اب ان

چیزوں کا مصرف میرے ہاں دماغی تکان کو دور کرنے کی حد تک ہے۔

جہاں تک میری تحریروں میں ادبی چاشنی کا سوال ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ابتدائی زمانہ چونکہ برسوں ہر طرح کی چیزیں پڑھنے میں صرف ہوا ہے۔ اس لئے ادب کے تاثرات (میری تحریروں میں) تو ہیں لیکن اب ادبی مطالعے کا وقت میرے پاس نہیں ہے ____ میری کوئی ادبی تصنیف بھی نہیں ہے۔ اوّلین تصنیف ’’الجہاد فی الاسلام‘‘ ہے اس سے پہلے متفرق مضامین لکھے ہیں لیکن کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے۔ ’’سلاجقہ‘‘ اس کے بعد کی تصنیف ہے۔

سیارہ: ایسے دو چار مکالموں یا ادبی شہ پاروں کا ذکر جن سے آپ کی فکری یا عملی زندگی متاثر ہوئی ہو، خاص کر موجودہ ادبِ لطیف؟

سیّد مودودی: ترقی پسند مصنفین کے لٹریچر سے مجھے ہمیشہ وحشت ہوتی ہے۔ اس لٹریچر کا مطالعہ کسی خاص دور تک محدود نہیں اور نہ ہی اسے میں نے باقاعدہ طور سے مطالعہ کیا ہے۔ وقتاً فوقتاً مختلف چیزیں نظروں سے گزرتی رہی ہیں اور ہر دور میں ان کے مطالعہ سے مجھے وحشت ہوئی ہے۔ اسی طرح سے جو لوگ مذہبی مسائل میں جدت طرازیاں کرتے ہیں ان کی بے لگام اور اُوٹ پٹانگ تحریروں سے طبیعت میں سخت انحراف ہے۔ اس مؤخر الذکر طبقے کے بعض حضرات ایسے ہیں جن کی تحریریں اگر میں آدھ گھنٹے مسلسل پڑھ لوں تو میرے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔

سیارہ: بالعموم آپ کے اوقاتِ مطالعہ کیا ہوتے ہیں؟ پروگرام کس طرح چلتا ہے؟ رفتارِ مطالعہ کیا ہوتی ہے؟

سیّد مودودیؒ: عام طور پر جب مجھے فرصت ہوتی ہے بیکار نہیں بیٹھتا، یا پڑھتا ہوں یا لکھتا ہوں۔ کبھی بیماری میں مجبوراً لکھنے اور پڑھنے کا موقع نہ ملے تو میرے لئے وقت گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ صرف عصر اور مغرب کے درمیان لکھنے اور پڑھنے کی عادت مجھے کبھی نہیں رہی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس وقت میں طبیعت کا رجحان اس طرف بالکل

نہیں پاتا۔

جہاں تک رفتارِ مطالعہ کا تعلق ہے۔ یہ موضوع کے اعتبار سے ہوتی ہے بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں بڑے غور سے پڑھنا ہوتا ہے، اس میں رفتار تیز نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس بعض چیزوں کا سرسری مطالعہ ہی کافی ہوتا ہے۔ تحقیقی مطالعہ کے لئے اہم کتابوں کو بسا اوقات لفظاً لفظاً پوری یکسوئی سے پڑھتا ہوں اور ان میں سے ضروری حصوں کو نشان زد کر لیتا ہوں ______ بعض اوقات دوسری قسم کی کتابوں کو ایک دفعہ نظر سے گزار کر اندازہ کر لیتا ہوں۔ کہ ان میں کام کی چیزیں کیا کیا ہیں۔

سیارہ: تنہائی یا خموشی آپ کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے یا آپ ہجوم اور شوروشغب میں بھی پڑھ لیتے ہیں؟

سیّد مودودیؒ: شوروشغب میں بھی پڑھ اور لکھ سکتا ہوں اور بارہا اس حال میں بھی کام کیا ہے۔ لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ اس کا اعصاب پر بُرا اثر پڑا ہے۔ اب زیادہ تر میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ تنہائی اور سکون میں کام کیا جائے۔

سیارہ: کیا آپ کبھی نیند لانے کے لئے بھی مطالعہ کرتے ہیں؟

سیدہ مودودی: نیند لانے کے لئے میں کبھی مطالعہ نہیں کرتا لیکن بعض اوقات جب میں لیٹ کر پڑھتا ہوں تو نیند آ جاتی ہے۔ البتہ زیادہ سنجیدگی سے مطالعہ کرنے سے میری نیند غائب ہو جاتی ہے۔

سیارہ: آپ کا حافظہ آپ کی وسعتِ مطالعہ کا ساتھ کہاں تک دیتا ہے؟ کیا آپ کو پڑھی ہوئی کتابوں اور مضامین کے مطالب اور ان کے مُصنفین کے نام پُوری طرح یاد رہتے ہیں؟

سیّد مودودی: میرے اندر یہ عیب ہے کہ میں کتابوں اور مصنفین کے نام اکثر بھول جاتا ہوں اور بیشتر کتابوں کے مطالعے کے بعد ان کا جو خلاصہ ذہن میں رہ جاتا ہے اس کے

اور کتاب اور مصنف کے درمیان تعلق میرے ذہن میں باقی نہیں رہتا۔ اسی وجہ سے میری تحریروں میں دوسروں کے اقوال کی کوٹیشنز بہت ہی کم ہوتی ہیں۔ کام کی کثرت کی وجہ سے میں اپنے حافظے پر زیادہ دباؤ ڈالنا مناسب نہیں سمجھتا۔ مطالعہ صرف ضروری معلومات حاصل کرنے کے لئے کرتا ہوں' مزید تفصیلات میں دلچسپی نہیں پاتا۔ صرف اتنی بات ذہن میں رہتی ہے کہ کسی خاص موضوع کے متعلق معلومات فراہم کرتی ہیں اور ان کے لئے کن کن کتابوں اور مصنفین کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔

سیارہ: کیا آپ کی ذاتی لائبریری ہے؟ اور آپ نے اپنی لائبریری کے لئے کوئی باقاعدہ بجٹ بھی بنا رکھا ہے؟

سیّد مودودیؒ: میں اپنی ضرورت کی کتابیں بڑی حد تک جمع کرتا ہوں اور مجھے لائبریریوں کی طرف رجوع کرنے کی کم ہی ضرورت پڑتی ہے۔ میری ذاتی لائبریری میں کئی ہزار کتابیں ہیں جو برسوں کی محنت سے جمع ہوئی ہیں اور ان کا شمار بھی مجھے معلوم نہیں۔ بہت سی کتابیں اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کے مصنفین کی دی ہوئی ہیں۔ کتابوں کی خرید کے لئے میں نے کبھی کوئی باقاعدہ بجٹ مخصوص نہیں کیا۔ جیسی ضرورت ہوتی رہی کتابیں فراہم کرتا رہا ہوں۔

سیارہ: کیا آپ اپنے مطالعہ، ذوقِ مطالعہ، حاصلِ مطالعہ میں اپنے بچوں کو بھی حصہ دار بناتے ہیں؟

سیّد مودودیؒ: افسوس ہے کہ مجھے اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے بچوں کی تربیت کی طرف زیادہ توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بس خدا سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ اپنے باپ کی مثال سے بچوں میں بھی یہ ذوق پیدا ہوگا۔

سیارہ: کتابیں مستعار لینے اور دینے کے متعلق آپ کے تجربات کیا ہیں؟

سیّد مودودی: میں نے مستعار لے کر آج تک نہ تو کسی کی کتاب ضائع کی ہے۔ نہ غصب

کی ہے لیکن میری لائبریری سے بہت سی کتابیں بندگانِ خدا نے ضبط کر لی ہیں اور مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ کون سی کتاب کس نے لی ہے۔ چنانچہ بعض ایسی کتابیں بھی ضائع ہوئیں کہ پھر کہیں سے مل نہیں سکیں۔ میری کتابوں کا اچھا خاصا نقصان میری نظر بندیوں کے زمانے میں بھی ہوا۔ زیادہ تر مجھے ان کتابوں کے ضائع ہونے کا افسوس ہے جن پر میں نے اپنے برسوں کے مطالعہ کے دوران میں نوٹس لکھے تھے۔

سیارہ: آپ ایک اوسط درجہ کے عام تعلیم یافتہ آدمی کو مشورہ دیں کہ وہ کس طرح مصروف زندگی میں مطالعہ کا پروگرام بنائے اور کتابیں کیسے فراہم کرے؟

سید مودودیؒ: جہاں تک عام تعلیم یافتہ آدمی کے لئے مطالعہ کے پروگرام کے سلسلہ اور کتابوں کے فراہم کرنے کا مسئلہ ہے' دراصل یہ کام مشوروں سے نہیں ہوتا۔ علمی ذوق آدمی کے اندر خود اُبھرتا ہے۔ جب کسی آدمی کو تضیعِ اوقات پسند نہ ہو اور علم حاصل کرنے سے اسے دلچسپی ہو تو اپنا راستہ وہ خود بناتا ہے۔ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں کہ جن کے پاس ذرائع کی کمی ہوتی ہے لیکن اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر کتابیں حاصل کرتے ہیں اور ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جن کے پاس وافر دولت ہوتی ہے لیکن وہ اس کا سب سے زیادہ غیر ضروری مصرف یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے کتابیں خریدی جائیں!!

ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد سیّد مودودیؒ آزاد کشمیر کے دورے پر گئے، جہاں گورنمنٹ کالج، میر پور کے اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ یہ نشست ہوئی ____ ۲۹ نومبر ۱۹۶۵ء

سوال: بحیثیت معاشیات کے ایک استاد کے، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہمیں کالجوں میں جن افکار کی تعلیم دی جاتی ہے وہ مغرب سے مستعار ہیں۔ جب تک ہم اپنے نصب العین کو نہیں بدلتے اس وقت تک اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ میں جناب سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس ضمن میں علماء نے بالعموم اور آپ نے بالخصوص کیا اقدامات کیے ہیں؟

جواب: یہ ایک عملی مسئلہ ہے۔ آپ اس بات کو سمجھ لیں کہ صرف ایک معاشیات ہی نہیں تمام علوم کے نصاب میں تبدیلی کرنی چاہیے۔ تعلیم یافتہ حضرات کی اکثریت پر اس مسئلے کی اہمیت واضح ہو چکی ہے مگر تعلیمی پالیسی بنانا جن لوگوں کا کام ہے معلوم نہیں، انھوں نے بھی اسے سمجھا ہے یا نہیں۔ ادھر عام طور پر علماء دین ____ ان جدید علوم کو نہیں جانتے۔ اس لئے ان کے بس میں نہیں کہ وہ ایسی تبدیلی کر سکیں اور جو لوگ جدید علوم میں بصیرت رکھتے ہیں وہ بڑی حد تک دین سے ناواقف ہیں۔ ان کے ہاں دین کا سطحی تصوّر تو ہے لیکن اتنی گہری بصیرت نہیں ہے کہ وہ ان علوم پر تنقیدی نگاہ ڈالیں اور انھیں اسلامی اصولوں کے مطابق مرتب کر سکیں۔ بہت کم لوگ ہیں جو ایسا کر سکتے ہوں۔ جدید علوم میں بصیرت رکھنے والے ایسے لوگ جن میں اسلامی شعور اور حس موجود ہے، ان سے مدتِ دراز سے درخواست کر رہا ہوں کہ آپ لوگ تھوڑی سی محنت اور کوشش سے عربی زبان

سیکھیں، کیوں کہ عربی زبان سیکھے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس کے بغیر آپ اسلامی علوم کے ماخذ نہیں جان سکتے۔ پھر معاشیات کے مرتب اور ماہرین کے لئے تو یہ ناگزیر ہے۔ قرآن پاک، احادیث اور فقہ کی کتابوں کے ترجمے بلاشبہ ملتے ہیں مگر وہ ناکافی ہیں۔ محض ترجموں سے کام نہیں چلتا۔ جس علم کے متعلق گہری واقفیت نہ ہو، اس کے بارے میں یہ ممکن نہیں کہ نصاب کی کتابوں پر نظر ثانی کر کے اسے نئے سرے سے مرتب کیا جا سکے۔ ہم نے بارہا کوشش کی مگر ہمارے پاس ذرائع نہیں۔ مالدار طبقہ اس ضرورت کو محسوس نہیں کرتا اور متوسط طبقے کے پاس ذرائع نہیں ہیں۔ اس لئے ہم اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اُٹھا سکے۔ البتہ ایک اکیڈیمی قائم کی ہے۔ جس میں کچھ نوجوانوں کو تیار کیا جا رہا ہے۔ وہاں عربی جاننے والے جدید علوم سیکھ رہے ہیں اور جدید علوم جاننے والے عربی زبان سیکھ رہے ہیں۔ کچھ مدت میں یہ لوگ تیار ہو کر میدانِ عمل میں آ جائیں گے۔ اور پھر انشاء اللہ وہ اس سلسلے میں مفید خدمت انجام دے سکیں گے۔

> سوال: آج کل زمانہ ایسا ہے کہ بنک سسٹم کے بغیر کام نہیں چلتا، بنک میں جمع کردہ رقم پر جو منافع ملتا ہے وہ سود کی تشریح میں آتا ہے مگر دنیا دھڑا دھڑا سے وصول کر رہی ہے؟

جواب: دنیا تو دھڑا دھڑا ایسے کام کر رہی ہے جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ دنیا کی خاطر آپ کس کس کو حلال کریں گے۔ قرآن میں سود کو واضح طور پر حرام ٹھہرایا گیا ہے بلکہ فرمایا گیا کہ اگر تم سود کو نہ چھوڑو گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ قرآن مجید میں سود کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ قرض کے معاملے میں اصل سے زائد رقم لینے دینے کا جو معاہدہ ہو وہ سود ہے۔ اس لحاظ سے بنک کا سود بھی ویسا ہی سود ہے۔ جیسے کسی بھی اور قسم کا۔ میرے بس میں یہ بات نہیں کہ دنیا میں اگر کوئی چیز چل پڑی ہو تو میں حرام کو حلال کر دوں۔ اگر آپ کرنٹ اکاؤنٹ کھولتے ہیں تب بھی گویا آپ ڈاکو کو ڈاکہ مارنے کے لئے ہتھیار فراہم کر رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص مجبوری سے ایسا کرے تب بھی اسے گناہ تو سمجھے۔ اگر اسے مجبوری کی بناء پر بنک کی طرف سے سود لینا پڑ رہا ہے تو

اسے غریبوں میں تقسیم کردے۔ اس سے ہو سکتا ہے کہ سزا میں کمی ہو جائے لیکن بجز غفلت کے کوئی شے نہیں جو انسان کو ایسا کرنے پر مجبور کرے۔ مالیات کے موجودہ بنکنگ سسٹم کو با آسانی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ بنکنگ بجائے خود حرام نہیں۔ موجودہ سود کی شکل میں چلنے والی بنکنگ کی صورت حرام ہے۔ اسے شرکت و مضاربت Profit-Sharing کی بنیاد پر چلایا جائے تو ٹھیک ہے۔

سوال: کیا امپیریلزم کے خلاف جنگ، جہاد ہے؟ اگر ہے تو کیسے؟

جواب: جہاد فی سبیل اللہ کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے کیا جائے۔ دوسرا جو مظلوموں کو ظالموں سے نجات دلانے کے لئے کیا جائے۔ تیسرا جو خود اپنے دفاع کے لئے کیا جائے یعنی کسی مسلمان ملک پر جب کوئی دشمن حملہ آور ہو تو اس کے باشندوں کا فرض ہے کہ وہ مدافعت کریں اور ملک کو دشمن کے قبضے میں جانے سے روکیں ___ اگر ان شکلوں میں پیشِ نظر خدا اور اس کی رضا ہو گی، تو جہاد فی سبیل اللہ ہو گا اور اگر خدا کی رضا پیشِ نظر نہ ہوئی تو جہاد نہ ہو گا۔ محض کسی کے خلاف جنگ چھیڑ دینا جہاد نہیں ہو سکتا ___ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے کہ امپیریلزم کے اندر طغیان، سرکشی، اپنی حد سے تجاوز اور دوسروں پر زیادتی پائی جاتی ہے تو وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی مخالفت کی جائے مگر نیت یہ ہونی چاہیے کہ انسان پر سے انسان کی حاکمیت کو ہٹایا جائے اور اللہ کی حاکمیت قائم کی جائے۔ یہ مقصد ہو گا تو وہ جہاد ہو گا۔ اسلام کے نقطہ نظر سے انسان ہر ایک سے آزاد ہو مگر خدا کا غلام ہونا چاہیے۔ انسان اگر خدا کی غلامی سے بھی آزاد ہو جائے تو پھر کسی آزادی کو کوئی قدر و قیمت نہیں۔

سوال: کشمیر کی جنگِ آزادی کو کس حد تک جہاد کہا جا سکتا ہے؟

جواب: پوری طرح ___! اس کے جہاد ہونے میں کوئی کسر نہیں ہے۔ بس یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ لڑائی میں نیت کیا ہے۔ اگر کفر کے تسلط سے آزاد ہو کر مسلمانوں کی سی زندگی بسر کرنے کی نیت ہو تو بلاشبہ یہ جہاد ہے۔ لیکن اگر کوئی اور نیت ہو تو پھر یہ جہاد نہیں

ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ آیا یہ میری راہ میں مجاہد ہیں یا کسی اور کی راہ میں۔

سوال: کیا بھارت اور پاکستان کی جنگ کو دونوں ملکوں کی ہوس ملک گیری کہا جاسکتا ہے؟

جواب: بھارت کی حد تک تو یہ بات درست ہے مگر پاکستان کے بارے میں ہوس ملک گیری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ برصغیر کی تقسیم جس اصول پر ہوئی تھی اور جسے ہندوؤں اور انگریزوں نے بھی تسلیم کیا تھا، وہ یہ تھا کہ مسلم آبادی کے متصل علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے اور ہندو اکثریت کے متصل علاقے ہندوستان ہیں۔ اس لحاظ سے کشمیر کو آپ سے آپ پاکستان میں شامل ہونا چاہیے۔ اس لئے پاکستان اگر کشمیر کے لئے لڑائی پر مجبور کر دیا جائے تو اسے ہوسِ ملک گیری نہیں کہا جا سکتا۔ کشمیری ہمارے دینی بھائی ہیں انھیں ہمارے ساتھ شامل ہونا چاہیے۔

سوال: سندھ میں ایک مسلمان عورت کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے عرب سے محمد بن قاسم پہنچا۔ مگر آج کشمیر میں ہماری ماؤں بہنوں کی عزت لوٹی جارہی ہے، ہم خاموش کیوں ہیں؟

جواب: ہمارے ایمان' شرم اور غیرت کی آزمائش ہے اس لئے میں حکومت سے کہہ رہا ہوں کہ اگر یہ ظلم نہ رکے تو فائر بندی ختم کر دینی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ میرے بس میں نہیں ہے۔ میں بے ضابطہ باتوں اور کارروائیوں کا بہر حال قائل نہیں ہوں اور یہ نہیں ہوسکتا کہ اگر حکومت نہ لڑے تو میں لوگوں سے کہوں کہ آپ جا کر لڑائی کریں۔

سوال: عہد خیر القرون کے شہداء اور شہداء کشمیر میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟

جواب: شہادت کا درجہ جذبے کی شدت کے حساب سے ہوتا ہے۔ ایک شخص لاکھوں روپے اللہ کی راہ میں پیش کرتا ہے۔ دوسرا صرف ایک کھجور۔ کھجور والے کے پاس جو کچھ تھا' اس نے سب کچھ پیش کر دیا۔ گویا اس کے جذبے کی Intensity، لاکھوں روپے

دینے والے کے مقابلے میں زیادہ ہے تو اس کو اجر زیادہ ملے گا۔ جس شخص کا جتنا شدید جذبۂ خداپرستی ہوگا، اتنا ہی بڑا درجہ اس کو نصیب ہوگا۔ مگر درجات کا فیصلہ کرنا بہرکیف ہمارا کام نہیں۔ ہم تو صرف اس قدر جانتے ہیں کہ ایک شخص مومن تھا، لڑا اور شہید ہو گیا ___ خدا اس کی شہادت اور جذبہ شہادت کو قبول کرتا ہے!

سوال: کیا شہید کے کبیرہ گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں؟ اگر کوئی پورے خلوص سے جہاد میں شریک ہو مگر شہید نہ ہو بلکہ غازی کا درجہ حاصل کرلے اس کے گناہ کہاں تک معاف ہوں گے؟

جواب: ان معاملات میں ہم اتنا جانتے ہیں کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں ان کی مغفرت ہوتی ہے اور انھیں اجر ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں قرب کا درجہ عطا فرماتا ہے۔ مگر بعض چیزیں مثلاً قرض معاف نہیں ہوتا۔ غازیوں کو اجرِ عظیم ملتا ہے مگر یہ کوئی گارنٹی نہیں کہ اُن کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ گناہ معاف کرنا اللہ کے سوا کسی کا کام نہیں۔ **یغفر لمن یشاء و یعذب من یشآء** اس اُمید پر گناہ نہیں کرنے چاہئیں کہ فلاں خدمت انجام دینے سے یہ گناہ معاف ہو جائیں گے اور نہ مایوس ہونا چاہیے کہ خواہ کیسا ہی نیک کام کیوں نہ کریں گناہ معاف نہیں ہو سکیں گے۔ مومن کو **بین الخوف والرجاء** ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے بھی رہنا چاہیے اور اس سے اُمیدیں بھی رکھنی چاہئیں۔

سوال: اسلام جمہوری اقدار اور عوام کے حقوق کو تسلیم کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ سرزمین جہاں سے اسلام کی سچائی کے سرچشمے پھوٹے، میری مراد عرب سے ہے، ابھی جمہوریت کی برکتوں سے محروم ہے؟

جواب: جہاں سے چشمے پھوٹے اور جہاں جہاں یہ چشمے پہنچے سب ملکوں میں ایک ہی حالت ہے اور یہ ہماری بدقسمتی ہے۔

سوال: قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ ہر شخص کو ایک بار موت آنی ہے لیکن

جب انسان مر جاتا ہے تو کیا اس سے سوال جواب کرنے کے لئے اسے نئی زندگی ملتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر یہ سوال روح سے روحوں کے مقام پر بھی پوچھا جاسکتا ہے۔ مردے سے قبر میں کیوں پوچھا جاتا ہے؟ اگر مردے سے سوال کیا جاتا ہے تو مردہ کس طرح جواب دیتا ہے؟

جواب: قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی ایک حالت وہ تھی جب وہ محض روح تھا، جسم نہ تھا، اب دوسری حالت یہ ہے کہ روح ایک جسم کے اندر ہے۔ ایک تیسری صورت یہ ہوئی کہ روح جسم سے نکل جائے گی مگر باقی رہے گی اور چوتھی حالت وہ ہوگی جب روح دوبارہ جسم میں داخل ہوگی۔ تب قیامت برپا ہوگی۔ موجودہ زندگی کے بعد کی حالت جو قیامت تک رہے گی اسے عالمِ برزخ کا نام دیا گیا ہے۔ عالمِ برزخ میں روح ہوگی مگر جسم نہیں ہوگا مگر روح اس پوری شخصیت کو لئے ہوئے ہوگی جو ہم نے Develop کی ہے۔ اس روح سے خاص نوعیت کے سوالات و جوابات ہوں گے۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے مثلاً ایک آدمی کام کر کے دنیا سے رخصت ہوتا ہے وہ اگر نیک ہے تو موت کے دروازے سے اس کا استقبال مہمان کی حیثیت سے ہوگا اور اسے اس وقت تک مہمان کی حیثیت سے رکھا جائے گا جب تک کہ عالمِ آخرت میں فیصلے نہیں ہو جاتے۔ دوسری طرح کا انسان وہ ہے جو بدقماش اور ظالم ہے۔ موت کے دروازے سے اسے زیرِ حراست لے لیا جاتا ہے جیسے مجرم کو پولیس پکڑ لیتی ہے اور جب تک مقدمہ عدالت کے سامنے پیش نہیں ہو جاتا اسے حراست میں رکھتی اور Interrogation کرتی ہے۔ یہ سیدھی سادی بات' حیرت کی بات نہیں۔ مجرم سے اور قسم کو معاملہ ہوگا اور نیک سے اور قسم کا۔ موت کے بعد روح اپنے پورے احساسات کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ نیک انسان کی روح راحت محسوس کرتی ہے اور بد آدمی کی روح مصیبت کا شکار ہوتی ہے۔

اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سولہویں سالانہ اجتماع میں

طلبہ کے درمیان ____ ۱۹ نومبر ۱۹۶۷ء

سوال: تحریکی مزاج سے کیا مراد ہے؟ تحریک کی صورت میں اسلام کا کام کرنے کے لئے کس طرح کے مزاج کی ضرورت ہے؟

جواب: نوعیت کے لحاظ سے بڑا جامع سوال ہے۔ اگرچہ مختصر الفاظ میں کیا گیا ہے۔ تحریکی مزاج سے مراد دراصل یہ ہے کہ آدمی پوری طرح سے اسلام کو سمجھے، سمجھ کر اپنے اخلاق، کردار، سوچنے کے انداز، کام کرنے کے طریقے، یہ سب کچھ اسلام کے مزاج کے مطابق ڈھال لے، جس طرح کا اسلام چاہتا ہے ویسے ہی آپ بنیں یہ پہلی چیز ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اسلام کو آپ جامد مذہب نہ سمجھیں، بلکہ یہ ایک دعوت ہے، تمام انسانیت کو ایک پکار ہے۔ اسلام تمام انسانیت کو اس چیز کی طرف بلا رہا ہے، کہ وہ اپنی زندگی کے نظام کو اس کے اصولوں کے مطابق ڈھال لے، یعنی اس کے محض مذہب ہونے کا تصور آپ کے ذہن میں نہ ہو، بلکہ اس کے ایک دعوت ہونے کا تصور ہو۔ دعوت ہونے کا تصور جب آپ کے اندر آئے گا تو آپ صرف وہ اخلاق ہی پیدا نہیں کریں گے جو ایک عام مسلمان کی سی زندگی بسر کرنے کے لئے درکار ہے بلکہ وہ اخلاق بھی اپنے اندر پیدا کریں گے جو اللہ کے راستے کی طرف بلانے کیلئے موزوں ہے، ایک آدمی کے اخلاق عمدہ ہوتے ہیں مگر ایسے نہیں ہوتے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچیں۔ آدمی اس کو سراہتا Appreciate کرتا ہے۔ اس کی تعریف کرتا ہے، مگر اس کی طرف کھنچتا نہیں۔ ایک اخلاق وہ ہوتا ہے کہ جس کی طرف آدمی کھنچتا ہے۔ تو آپ وہ اخلاق پیدا کریں گے جو مطلوب ہے۔ اگر آپ کے اندر تحریکی مزاج پیدا ہو جائے یعنی اسلام کو آپ دعوت سمجھ کر

اور اس کی دعوت لے کر جب آپ چلیں گے تو آپ وہ اخلاق پیدا کریں گے جو عام لوگوں کو آپ کی طرف متوجہ کرنے والا ہو، آپ کا سراپا جاذبِ نظر ہو اور باتیں جاذبِ قلب جاذبِ روح ہوں اور تو جاذبِ اخلاق اور تحریکی مزاج آپ سے آپ پیدا ہو جائے گا۔

اس کے ساتھ آپ کو اپنی بنیادی عادتوں کو بھی تبدیل کرنا ہوگا۔ اپنی بول چال، تحریر وتقریر گویا کہ ہر چیز کو آپ کو ایسے طرز پر ڈھالنا ہوگا کہ جس سے آپ اللہ کے راستے کی طرف بلانے میں کامیاب ہو جائیں۔ یاد رکھیں وہ آدمی جو محض نیک بن کر رہ جائے وہ دعوت کے کام کا نہیں ہے، وہ آدمی جو نیک بن کر اپنے اندر وہ حکمت پیدا کرے جس سے دوسرے لوگوں کو فریضہ اقامتِ دین کے لئے اپنا ہم خیال بنائے، ان کے خیالات تبدیل کرے، ان کی زندگیاں تبدیل کرے، وہ حکمت آپ کو اپنے اندر پیدا کرنی ہوگی۔ وہ طریقے آپ کو سیکھنے ہوں گے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرتوں سے، جن سے ابتداء میں اسلام ساری دنیا میں پھیلا۔

سوال: اسلامی نظامِ تعلیم کے لئے طلبہ نے اب تک جو کوششیں کی ہیں آپ کے خیال میں ان کے علاوہ اور کون سے اقدامات عمل میں لائے جا سکتے ہیں؟

جواب: اس کے متعلق میں صرف یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ کسی مقصد صحیح کے لئے کوئی کوشش کر کے بھی آپ یہ نہ سمجھیں کہ جو کوشش کا حق تھا وہ ہم نے ادا کر دیا۔ یہ وہ کام ہے جس میں ہر کوشش کے بعد آپ کو یہی سمجھنا چاہیے کہ ابھی حق ادا نہیں ہوا۔ مزید کوشش کرتے جائیے، اور جب مقصد صحیح کیلئے ایک آدمی کوشش کر رہا ہو تو اس کو اس بات کی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ اس کی کوشش کامیاب ہو رہی ہے یا نہیں۔ آپ کا کام حق کے لئے کوشش کرنا ہے قطع نظر اس سے کہ کامیابی ہو یا نہ ہو۔ اگر آپ حق کے لئے کوشش کرتے ہوئے ناکام ہو جائیں تب بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ ناکام نہیں ہیں کیونکہ آپ نے اپنی حد تک جو کچھ کیا جا سکتا تھا وہ کیا۔

اب جو لوگ کافرانہ نظامِ تعلیم پر اصرار کر رہے ہیں یا مادہ پرستانہ نظامِ تعلیم کو جاری

رکھنے پر تلے ہوئے ہیں، ظاہر بات ہے طاقت ان کے پاس ہے۔ ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں ہے، ساری تعلیم گاہوں کو وہ چلا رہے ہیں، ان کے مقابلہ میں آپ کا کامیاب ہونا آسان بات نہیں لیکن آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ اپنی طرف سے اس بات کی پوری کوشش کریں کہ یہ غلط نظامِ تعلیم بدلے اور صحیح نظامِ تعلیم رائج ہو، اس کے بعد یہ اگر نہیں رائج نہیں ہوتا تو آپ کی ذمہ داری اس حد تک ختم ہو جاتی ہے اور آپ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی باز پُرس نہیں ہوگی کہ تم نے کیوں نہیں اسلامی نظامِ تعلیم رائج کر دیا، آپ سے باز پرس اس کی ہوگی کہ آپ نے کیا کوشش کی ہے؟

باقی یہ کہ عملاً آپ کو کیا کرنا چاہیے تو میرا خیال یہ ہے کہ عملاً آپ کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ کوئی طبقہ اس ملک میں ایسا نہ ہو جس میں آپ کے ہم خیال کثیر تعداد میں نہ پیدا ہو جائیں۔ اگر کسی درس گاہ میں پانچ فی صدی ہم خیال ہیں تو آپ کوشش کریں کہ یہ سو فیصد ہو جائیں۔ سو فیصدی کا تعین رکھ کر آپ کام کریں۔ اگر کسی درس گاہ میں کثیر تعداد ان لوگوں کی ہو جو اس غلط نظامِ تعلیم پر غیر مطمئن ہوں اور ہر ممکن طریقہ سے اس کا اظہار کریں تو یہ چیز ان لوگوں کے لئے Discouraging ہو جائے گی جو اس غلط نظامِ تعلیم کو چلا رہے ہیں۔ آپ کا مشاہدہ بتا رہا ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد ابھی بہت کم ہے جو غلط نظام پر غیر مطمئن ہوں۔ آپ کا یہ کام ہے کہ اس بات کو اتنا پھیلائیں کہ کثیر تعداد غیر مطمئن ہو جائے۔ اس کے بعد دباؤ جو پڑے گا وہ مجبور کر دے گا کہ اس میں تبدیلی لائی جائے۔ جب تک کوئی غلط کام فروغ پا رہا ہو، غلط کام کرنے والوں کی ہمتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ اس کا فروغ پانا دشوار ہو گیا ہے تو اس کے بعد وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ اپنی اصلاح کریں اور اس نقطہ نظر کو اختیار کریں جس کا ان پر دباؤ پڑ رہا ہے، کوئی ہنگامے کرنے کی حاجت نہیں ہے، کوئی شور مچانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ٹھنڈے طریقہ سے صبر کے ساتھ اپنے خیالات پھیلاتے چلے جائیں یہاں تک کہ درس گاہوں کی ایک کثیر تعداد اس نقطہ نظر کو اپنے اندر سمو لے جس کی اصلاح آپ نظامِ تعلیم میں کرنا چاہتے ہیں۔

(ہم قدم، جنوری ۱۹۶۸ء)

سیّد مودودیؒ ”مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) کے دورے پر گئے“ تو وہاں پر اسلامی جمعیت طلبہ، ڈھاکہ نے یہ نشست منعقد کی ____ فروری ۱۹۶۸ء

سوال: صنعتی تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ بیروزگاری کا جو مسئلہ پیدا ہوتا ہے، کیا اس کا حل برتھ کنٹرول اور سوشلسٹ معاشی نظام کے بغیر ممکن ہے؟

جواب: پہلی بات تو یہ سمجھ لیجیے کہ یہ جو موجودہ صنعتی تہذیب ہے اس میں بیروزگاری کس طرح آئی ہے۔ آپ ایک جامع اور صحیح منصوبہ بندی کے بغیر جتنا زیادہ مشینری کو استعمال میں لائیں گے اتنا انسانوں کو استعمال کرنے کے مواقع کم ہو جائیں گے۔ مشینیں آگے بڑھتی جائیں گی انسان پیچھے ہٹتے جائیں گے۔ ایک مشین لگنے کے معنے یہ ہیں کہ ایک یا دو آدمی جو اس مشین پر کام کر رہے ہیں۔ وہ اس مشین کی مدد سے اتنا کام کریں جتنا پہلے پچاس یا سو آدمی کرتے تھے ____ تو اس صنعتی تہذیب میں یہ چیز موروثی ہے کہ بے روزگاری پیدا ہو۔ اب اگر اس بے روزگاری کا علاج یہ تجویز کیا جائے کہ مزید آدمیوں کو پیدا نہ ہونے دیا جائے گا بلکہ صرف اتنے آدمیوں کو پیدا ہونے کی اجازت دی جائے جتنے آدمی مشینوں کو چلانے کے لئے درکار ہیں اور باقی انسانوں کو وجود میں آنے سے روکا جاتا رہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ایک وقت میں اگر یہ صنعتی تہذیب ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے کہ ایک ہی آدمی پورے ملک میں کام مشین کی مدد سے انجام دے لے تو پھر صرف ایک صاحب کی ضرورت باقی رہ جائے گی۔ باقی سارے انسان غیر ضروری اور بے کار قرار دیے جائیں گے۔ اور انھیں رخصت کرنے اور آئندہ کے لئے پیدائش کو مکمل طور پر روک دینے کی ”خاندانی منصوبہ بندی“ پر کام شروع ہو

جائے گا۔ بیروزگاری کا علاج یہ نہیں ہے کہ آپ برتھ کنٹرول کے ذریعے سے آبادی کو گھٹانا شروع کر دیں بلکہ اس کا علاج ایک دوسرا اقتصادی نظام ہے جو کہ بیروزگاری کی خرابیوں کو دور کرسکتا ہے اور اس کے لئے ایک اور انداز کی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے اس وقت یہ سمجھ لیجیے کہ برتھ کنٹرول صرف ایک معاشی پہلو نہیں رکھتا اس کے بعض اور بھی پہلو ہیں۔ درحقیقت برتھ کنٹرول کے کچھ اخلاقی نتائج ہیں اور کچھ اس کے نفسیاتی نتائج ہیں۔ اگر ان ساری چیزوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اس کے تمام نقصانات سامنے آ جاتے ہیں۔

اسی طرح جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سوشلزم بے روزگاری کا علاج کر دے گا تو وہ بھی نہ صرف غلطی پر ہیں بلکہ ناقص معلومات رکھتے ہیں۔ سوشلزم اس کا علاج نہیں کرے گا، بلکہ ایک زیادہ بڑی بیماری لے آئے گا۔ اس وقت تو یہ نقشہ ہے کہ کچھ لوگ برسرِ روزگار ہیں اور کچھ لوگ بے روزگار۔ لیکن بہر حال اس ملک کے عام باشندے آزاد تو رہتے ہیں۔ اس بات کا امکان تو رہتا ہے کہ ایک آدمی جو آج بے روزگار ہے کسی جگہ اسے ملازمت مل جائے وہ آزادی سے پھرے گا اور جہاں بھی اسے موقع ملے گا روزگار حاصل کرلے گا۔ لیکن سوشلزم ایک پوری کی پوری کمیونٹی کو باندھ لیتا ہے۔ اس کا انتظام چند ہاتھوں میں چلا جاتا ہے اور ملک کی پوری آبادی غلام بن کر رہ جاتی ہے۔ ساری صنعت اور زراعت ایک اقلیت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ زمین، مشینیں، تجارت، سب چیزیں وہ ایک چھوٹا سا گروہ اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ انسانی آزادیوں کو یوں سلب کر لینے کے بعد بھی یہ نظام بیروزگاری کو ختم نہیں کرسکتا۔ اس وقت بھی روس میں بیروزگاری (Un-Employment) موجود ہے۔ سوشلسٹوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ سوشلزم بیروزگاری کو ختم کرسکتا ہے۔ روس میں سوشلزم بھی ہے اور بے روزگاری بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں کی بیروزگاری کی دنیا بھر میں تشہیر ہوتی ہے لیکن روس میں کوئی آواز نہیں اُٹھا سکتا۔ کوئی خبر رساں ایجنسی نہیں ہے جو ان کی خبروں کو دنیا کے سامنے لائے، کوئی ہڑتال یا احتجاجی جلسہ نہیں ہو سکتا۔ حالت یہ ہے کہ دو آدمی بیٹھ کر یہ بات کرتے ہیں کہ اس دورِ ظلمت (Regime) کو بدلنے کی

ضرورت ہے لیکن قبل اس کے کہ یہ بات تیسرے آدمی تک پہنچے وہ جیل میں پہنچ چکے ہوتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ نہ ______ خاندانی منصوبہ بندی بے روزگاری کا کوئی حل ہے اور نہ سوشلزم اور اشتراکیت سے انسانی زندگی کے ان مسائل کا آبرومندانہ حل ممکن ہے۔

اس سب کچھ کا علاج اگر کوئی ہے تو وہ اسلام کے اقتصادی نظام کے پاس ہے۔ یہ نظام کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص بے روزگار ہو تو بیت المال فوراً اس کی کفالت کی ذمہ داری لے لے گا اور اس کی ضروریات فراہم کرنا شروع کر دیگا۔ جب بیت المال پر اس کا بار پڑے گا تو حکومت کو اس بات کا انتظام کرنا پڑے گا کہ اسے روزگار دلائے، یہ ہے اسلامی نظام میں بے روزگاری کے مسئلے کا حل۔

یہی نہیں بلکہ جہاں تک بے روزگاری کے آغاز اور اس کے پھیلنے کا تعلق ہے، اسلامی نظام اپنی ایک ایسی منصوبہ بندی اختیار کرے گا' جس میں انسان کی بھلائی نقطۂ آغاز ہوگی۔ مثلاً اس منصوبہ بندی کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کوئی کارخانہ بھی قائم کیا جا رہا ہو تو پہلے اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ مشینیں لگیں گی تو کتنے آدمیوں کو کام ملے گا اور کتنے آدمی بے کار ہو جائیں گے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ یہ کارخانہ کام شروع کرے سب سے پہلے ان آدمیوں کے لئے متبادل روزگار کا انتظام سوچا جائے گا۔ ہمارے موجودہ زمانے کے منصوبہ بندوں کے دماغ میں اس طرح کی منصوبہ بندی نہیں آتی۔ وہ اس طرح سوچتے ہی نہیں۔ سوچنے کا یہ انداز صرف ایک اسلامی حکومت اپنا سکتی ہے جو مملکت کے ایک ایک فرد کے معاملے میں خدا کے سامنے جوابدہی کا احساس رکھتی ہے۔

سوال: کیا ماڈرن میڈیکل (جدید طبی) سائنس میں مسلمانوں کا بھی کوئی حصہ ہے؟

جواب: ماڈرن میڈیکل سائنس دراصل مسلمانوں ہی کی تحقیقات کے نتائج کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ اٹھارہویں صدی تک مغربی ممالک کے ہاں مسلمانوں ہی کی میڈیکل سائنس پڑھائی جاتی تھی۔ اس وقت تک اس سائنس میں جتنی ترقی ہوئی ہے اس سب کی

بنا مسلمانوں کی ڈالی ہوئی ہے۔ جدید آلات جراحی سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے ایجاد کیے تھے۔ انھیں کو ترقی دے کر رفتہ رفتہ موجودہ شکل اختیار کی گئی ہے۔ مختلف قسم کی دوائیں بھی اس وقت بیشتر وہی استعمال ہو رہی ہیں جو پہلے مسلمانوں کی میڈیکل سائنس میں استعمال ہوتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ ______ انیسویں اور بیسویں صدی میں میڈیکل سائنس میں جو ترقی ہوئی ہے اس میں مسلمانوں نے کوئی حصہ نہیں لیا، اس لئے کہ مسلمان پچھلی کتابیں ہی پڑھتے پڑھاتے رہے آگے انھوں نے تحقیقی کام نہیں کیا۔ لیکن یہ مغربی عالموں کی بد دیانتی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے کام Contribution کو چھپانے کی کوشش کی ہے اور اسے اس طرح سے پیش کرتے ہیں گویا یہ سب کچھ ان کا اپنا کیا ہوا ہے۔ دوسروں نے کچھ نہیں کیا۔ اس سلسلے میں مفصل معلومات کے لئے انگریزی' اُردو اور بنگلہ زبانوں میں متعدد کتب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

سوال: پاکستان ایک غیر سودی معاشی سوسائٹی برپا کرنے میں کیسے کامیاب ہوگا جبکہ اس کے پیشِ نظر ترقی بھی ہو؟

جواب: یہ سوال بہت تفصیل طلب ہے تاہم میں مختصر طور پر اس کا جواب بتا دیتا ہوں۔ ______ آپ اس کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ غیر سودی معاشی سوسائٹی زیادہ پھلتی پھولتی اور ترقی کرتی ہے بہ نسبت اُس سوسائٹی کے جس میں سودی نظام کارفرما ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بچے کے پیدا ہونے کے وقت سے ہی اس کا خون نکالنا شروع کر دیا جائے تو اس کی نشو و نما نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح سے فرض کیجیے کہ اگر سود کا روپیہ قرض لے کر کوئی صنعت قائم کی جائے یا تجارت شروع کی جائے تو وہ صنعت یا کاروبار کب منافع دینے کے قابل ہو ______ ممکن ہے کہ ______ سال دو سال میں ہو لیکن سود تو اسی روز سے اس پر بڑھنا شروع ہو جائے گا جس روز سے وہ قرض لیا گیا ہو' بلکہ ابھی کاروبار کا آغاز بھی نہیں ہوتا کہ سود لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کاروبار یا صنعت کے پھلنے پھولنے کی صورت یہ نہیں ہے کہ جو لوگ یہ سرمایہ لے کر

کام شروع کریں انھیں چاہے کچھ ملے یا نہ ملے، سرمایہ دینے والے کو پہلے روز سے سود ملنا شروع ہو جائے۔

پھر آپ دیکھیں کہ یہ سود آخر کن کی جیبوں سے ادا کیا جائے گا۔ جب ایک کارخانہ یا کاروبار اپنی اشیاء کی قیمتیں مقرر کرے گا تو اس میں دوسرے اخراجات کے علاوہ اس سود کی رقم بھی شمار کرے گا جو اسے ماہانہ یا سالانہ بنیادوں پر ادا کرنا ہوتا ہے۔ گویا سود کی یہ رقم ان اشیاء کے خریدنے والوں سے وصول کی جاتی ہے ____ یعنی نفع کارخانہ دار کا، سود روپیہ دینے والوں کا اور سود ادا کرنے والے معاشرے کے عام انسان۔ کیا اس چیز سے ایک معاشرہ ترقی کر سکتا ہے؟ ____ اسلام دراصل اسی لئے سود کو ختم کرنے کا حکم دیتا ہے کہ یہ ایک معاشرے کو پروان نہیں چڑھاتا بلکہ اس کا خون چوستا چلا جاتا ہے۔

سوال: مادی ترقی اور اخلاقی و روحانی ارتقاء میں توازن کیسے برقرار رکھا جاسکتا ہے؟

جواب: اس دنیا میں یہی تو انسان کی ساری آزمائش ہے کہ وہ اس دنیا کو برتتے بھی اس میں اپنی روزی، اپنی خوشحالی اور آسائش و آرام کے لئے کوشش بھی کرے لیکن ہر کام میں اپنے خدا کی خوشنودی اور رضا کو بھی پیشِ نظر رکھے اور اپنے اخلاق کو بھی ٹھیک رکھے، یہی انسان کی آزمائش ہے اور اسی توازن کو برقرار رکھنے پر انسان کی کامیابی کا انحصار ہے۔ اسی توازن کو برقرار رکھنے کے لئے قرآن مجید میں یہ بات بار بار ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ اس دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرو کہ ہمیں خدا کو حساب دینا ہے۔ جب آدمی یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرے گا تو اپنی خوشحالی کے لئے وہی کام کرے گا جس کے متعلق اسے یہ اطمینان ہوگا کہ یہ میرے رب کے احکامات کے مطابق ہے۔ لیکن جس جگہ اسے یہ محسوس ہوگا کہ یہ کام اگر میں نے کیا تو اس کا میں اپنے خدا کو جواب نہیں دے سکتا' اس جگہ وہ رک جائے گا۔ جو آدمی اس بات سے غافل ہو کہ اسے کبھی خدا کے حضور جوابدہی بھی کرنائی ہے اور جا کر اپنا حساب بھی پیش کرنا ہے۔ وہ بگٹٹ چلتا رہے گا۔ جدھر بھی اس کے نفس کی خواہشات اور اغراض چاہیں گی' اسی طرف چلتا جائے گا۔ لیکن جو آدمی یہ

احساس رکھتا ہو کہ مجھے جا کر اپنے خدا کو حساب دینا ہے، وہ ہر لفظ زبان سے نکالتے وقت، ہر کام کرتے وقت اور دنیا میں ہر جدوجہد کرتے وقت برابر یہ دیکھتا جائے گا کہ میں کس فعل اور کس بات کا جواب دے سکتا ہوں اور کس بات کا جواب نہیں دے سکتا۔ بس یہ توازن قائم کرنے کا نسخہ ہے جو قرآن مجید نے ہمیں بتایا ہے۔

سوال: ہم تحریکِ اسلامی کے لئے اپنا وقت صرف کرتے ہیں تو والدین ناراض ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: بچوں اور ان کے والدین کے درمیان تعلق کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ اس کے قانونی حدود مقرر نہیں کیے جا سکتے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ اپنے والدین کو بھی راضی رکھنے کی کوشش کریں اور اسلام کا کام بھی کرتے جائیں۔ عملاً یہ صورت ہے کہ بہت سے نوجوان سینما دیکھنے جاتے ہیں۔ جوا کھیلتے ہیں اور فسق و فجور کی دوسری صورتوں میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن والدین اپنی اولاد کو برداشت کرتے ہیں وہ اسے ذبح نہیں کر ڈالتے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ وہ اپنی نیک اولاد کو نہ برداشت کریں۔ اگر وہ آپ پر ناراض ہوتے ہیں تو ان کی ناراضی سہہ لیں، وہ ڈانٹتے ہیں تو آپ پلٹ کر جواب نہ دیں اور خاموشی سے ان کی ڈانٹ کو برداشت کرلیں لیکن اپنا کام کرتے جائیں۔

سوال: جب ہم تحریک اسلامی کا پیغام دوسروں تک پہنچاتے ہیں تو ہم پر مختلف الزامات چسپاں کیے جاتے ہیں۔ اور یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ ہم امریکی امداد حاصل کر رہے ہیں۔ کیا ان الزامات کا جواب دینے کی ضرورت ہے؟

جواب: الزام لگانے والوں کے پیشِ نظر یہ ہے کہ آپ اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر ان کے الزام کی جوابدہی میں لگ جائیں۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ انھیں الزامات لگانے دیجیے اور آپ اپنا کام کرتے جایئے۔ کچھ لوگ الزامات لگاتے لگاتے تھک جائیں گے اور بالآخر خاموش ہو جائیں گے اور کچھ لوگ انہی الزام تراشیوں میں اپنی عمر کھپا دیں گے لیکن آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ میرے ساتھ بھی ایک مدتِ دراز سے یہ ہو رہا ہے لیکن میں کسی

الزام کا جواب نہیں دیتا اور اپنا کام کیے چلا جاتا ہوں۔

رہی امریکی امداد تو اس کی حقیقت صاف ظاہر ہے۔ لوگ اپنے آپ اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جن کے پاس موٹریں ہیں، عالی شان کوٹھیاں ہیں، بے حساب بنک بیلنس ہے۔ وہ کون سا گروہ ہے اور جس پر امریکی امداد کا الزام لگایا جا رہا ہے اس کی حالت کیا ہے، امریکہ بڑا احمق ہے کہ وہ ان لوگوں کو امداد دے رہا ہے جو اس کا کام نہیں کرتے اور اسلام کا کام کیے جاتے ہیں۔ کیا واقعی امریکہ اسلام سے اتنی محبت کرنے والا ہے؟ لوگ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بیرونی امداد کا ظہور کہاں ہو رہا ہے' خستہ حال لوگوں میں یا عالیشان کوٹھیوں اور بڑی موٹروں والوں میں!

سوال: اسلامی ممالک کے ایک بلاک بننے کی امید ہے یا نہیں۔ براہِ کرم اس پر روشنی ڈالیے۔

جواب: میں اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ ممالک جنھوں نے اشتراکیت کو بطورِ طریق زندگی کے اختیار کیا ہے وہ اس اتحاد کے شدید مخالف ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم اسلام کی بنیاد پر اکٹھے نہ ہوں' اگر اکٹھے ہوں تو اشتراکیت کی بنیاد پر۔ گویا اُن کے نزدیک اسلام تو وجہِ اتحاد نہیں بن سکتا البتہ اشتراکیت بن سکتی ہے۔ تمام کمیونسٹ ممالک ان کی اس مخالفت کو شہ دے رہے ہیں۔ دوسری طرف سرمایہ دار ممالک ہیں تو وہ بھی اس کے لئے تیار نہیں۔ اور اس راہ میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ بعض مسلم ریاستیں ایسی ہیں جو چاہتی ہیں کہ اسلام کے نام پر جمع ہوں لیکن ان کی داخلی و خارجی مصلحتیں سدراہ ہیں ـــــ لیکن میرے نزدیک سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ان ممالک میں اسلامی حکومتیں قائم نہیں، گو نام کے اعتبار سے وہ مسلمان ضرور ہیں۔ اگر اسلامی حکومتیں قائم ہوتیں تو اس اتحاد میں ایک دن کی بھی تاخیر نہ ہوتی۔

سوال: کیا اسلامی حکومت میں بینکنگ جائز ہے اور وہ لوگ جو بنکوں میں ملازمت کر رہے ہیں ان کی ملازمتیں جائز اور درست ہیں؟

جواب: بینکنگ تو اس چیز کا نام ہے کہ کسی ایجنسی کے ذریعے کاروبار چلائے جا سکیں اور اسلام اس راہ میں رکاوٹ نہیں ہے۔ بینکنگ کی ایک شکل وہ بھی تھی جو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں رائج تھی اور خود آپ کی دکان بہت بڑا پیمانے پر یہ کام سرانجام دے رہی تھی۔

موجودہ زمانے میں بنکوں کی اصل خرابی یہ ہے کہ وہ سود کے ذریعے سے سارا کاروبار چلاتے ہیں اور روپیہ بھی سود کے نام پر جمع کیا جاتا ہے۔ ان حالات میں موجودہ بنکوں کی ملازمت ایسی ہی ہے جیسے کوئی قحبہ خانے یا شراب خانے میں ملازمت کرے۔

سوال: خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں اسلام کے احکامات کیا ہیں؟
براہِ مہربانی وضاحت فرمائیں؟

جواب: اگر حضورؐ کے زمانے میں ایسی کوئی تحریک اٹھتی تو میرا خیال ہے کہ حضور اکرمؐ اسی انداز سے اس کے خلاف جہاد کرتے جس طرح آپؐ نے شرک کے خلاف جہاد کیا تھا۔

بات شرم کی ہے لیکن ناگزیر ہے کہ میں اسے کھول کر سمجھاؤں۔ ہمارے ہاں عورت اور مرد کے آزادانہ میل جول کے بے شمار مواقع فراہم کیے جا رہے ہیں۔ سکولوں اور کالجوں میں مخلوط تعلیم کا رواج ہو رہا ہے ـــــــ ریڈیو دن رات عشقیہ گانے نشر کر کے ساری قوم کو عاشق مزاج بنا رہا ہے۔ ملازمتوں میں عورتوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ فلموں کے ذریعے نوجوانوں میں آوارگی پھیلائی جا رہی ہے۔ یہ سب کام کرنے کے بعد اگر کوئی رکاوٹ باقی رہ جاتی ہے تو وہ یہ ہے کہ عورت محض اس لئے اپنے آپ کو ایک غیر آدمی کے حوالے کرنے سے ڈرتی ہے کہ کہیں ناجائز حمل نہ قرار پا جائے۔ یہ تحریک اس خوف کو دور کر دیتی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ جن ممالک میں بھی خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک شروع کی گئی، وہاں زنا کی کثرت عام ہو گئی ہے اور اس وقت مغرب میں ایسے ممالک بھی موجود ہیں جہاں سو میں سے پینسٹھ بچے حرامی پیدا ہوتے ہیں۔ اگر روٹی اتنی ہی اہم چیز ہے کہ لوگوں کو یہ تو ملے، خواہ اس کے نتیجے میں ان کے اخلاق تباہ ہو کر رہ جائیں تو اسلام میں

ایسی روٹی کھانے سے مر جانا بہتر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر حضورؐ کے زمانے میں یہ تحریک اٹھتی تو وہ شرک کے خلاف کیے جانے والے جہاد سے بڑھ کر اس کے خلاف جہاد کرتے۔ لیکن ستم یہ ہے کہ آج کہا جا رہا ہے کہ حضورؐ خود اس تحریک کی حمایت فرماتے تھے۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو خدا کے خوف سے بے بہرہ اور اسلامی اصولوں سے بالکل ناواقف ہو۔

اسلامی جمعیت طلبہ، کراچی، کی محترم سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ساتھ سوال و جواب کی ایک نشست ——— ۱۷ مارچ ۱۹۶۸ء

ناظم کراچی تسنیم عالم منظرؒ نے سوال و جواب کی اس نشست سے قبل کہا:

”ہمارے لئے یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ ہماری دعوت پر مولانا مودودی صاحب اس وقت یہاں موجود ہیں۔ ہمارے درمیان محبت و یگانگت کے گہرے رشتے موجود ہیں۔ ہمیں مولانا سے اور مولانا کو ہم نوجوان طلبہ سے محبت ہے ——— اس لیے کہ اسلامی نظامِ زندگی کے قیام کے داعی کی حیثیت سے مولانا محترم جس مشن کو لے کر اٹھے ہیں، ہمیں اللہ کے فضل سے یہ شرف حاصل ہوا ہے کہ ہم بھی اس مشن کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مطمحِ نظر بنائیں اور جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیرے کو اسلام کی شمع دکھائیں۔“

سوال: مغربی تہذیب کا جو سیلاب ہمارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لئے چلا جا رہا ہے۔ ہم اس کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں کونسی تدابیر مؤثر ہو سکتی ہیں؟

جواب: پہلی چیز تو یہ ہے کہ آپ خود اس سیلاب سے بچیں۔ یہ سب سے اوّلین چیز ہے۔ ہمیشہ یہ خطرہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی اگر کسی سیلاب میں خود بہتا چلا جا رہا ہو، تو اس کا دوسروں سے یہ کہنا کہ ”بھائیو! اس سیلاب میں نہ بہو“، بالکل ایک فضول بات ہے۔ اگر آپ اس سیلاب سے دوسروں کو بچانا چاہتے ہیں تو پہلے خود بچیے۔ تب لوگوں کو معلوم ہوگا

کہ ہاں یہ واقعی Sincere اور سنجیدہ ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس سیلاب کا مقابلہ اس وقت آپ اس کے سوا کسی اور طرح نہیں کر سکتے کہ اس کے نقصانات پورے دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے لائیں، کیونکہ آپ کے پاس وہ طاقت نہیں ہے جس سے آپ سیلاب کے دھارے کو روک دیں، وہ ذرائع نہیں جن سے آپ بند باندھ دیں۔ وہ طاقت نہیں ہے جس سے آپ ان لوگوں کا ہاتھ پکڑ سکیں، جو یہ سیلاب لیے چلے آ رہے ہیں۔ جب یہ طاقت نہیں ہے، یہ ذرائع نہیں ہیں تو اب آپ جو کچھ کر سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ نہایت معقول دلائل کے ساتھ ہر اس شخص کو جو اس سیلاب میں بہا جا رہا ہو، بچانے کے لئے اس کو بتائیں کہ اس کے یہ یہ نقصانات ہیں۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ وہ مغربی تہذیب جو یہاں سیلاب کی طرح آ رہی ہے، خود اپنے گھر میں اپنے تمام برے نتائج ظاہر کر چکی ہے۔ جہاں سے وہ آ رہی ہے وہاں اس کے تمام بُرے نتائج ظاہر ہو چکے ہیں اور خود مغربی لٹریچر ہی میں پورے Facts & Figures کے ساتھ یہ تفصیلات موجود ہیں۔ آپ کا کام یہ ہے کہ مطالعہ کریں۔ مغربی ممالک کے اخبارات و رسائل پڑھیں۔ وہاں کے مصنفین کی کتابیں دیکھیں، اس کے اندر خود انھوں نے وضاحت کے ساتھ بتا دیا ہے۔ مثلاً مخلوط تعلیم، اس کے تمام نقصانات وغیرہ، مثلاً امریکہ میں جہاں اس کا سب سے زیادہ زور ہے وہاں کے اخبارات و رسائل اور کتابوں میں ان کے قبیح نتائج کی تفصیلات موجود ہیں۔ آپ نے اگر انگریزی پڑھی ہے تو اس کا فائدہ اٹھائیے، اس طرح کا مواد جمع کیجیے، اس کو بڑے پیمانے پر پھیلائیے اور لوگوں کو بتائیے کہ کیا یہ نتائج تم اپنے معاشرے میں چاہتے ہو؟

اسی طرح سے دوسری جتنی چیزیں ہیں، جس کو آپ مغربی تہذیب کے فواحش کا سیلاب کہتے ہیں، وہ جہاں سے آیا ہوا ہے وہاں اس کے نتائج پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہیں، آپ اس مواد کو جمع کریں، جمع کرنے کے بعد اس کو نہ صرف اُردو میں اور انگریزی میں تحریری شکل میں لا کر پھیلائیں بلکہ زبانی طور پر بھی جن جن لوگوں سے آپ

کو سابقہ پیش آئے، بتائیں۔ آپ کے پاس جس قدر Material موجود ہو، آپ دلائل، نظائر اور شواہد کے ساتھ ان کے سامنے واضح کریں۔ اس کے بعد بھی جو کوئی اس سیلاب میں بہنا چاہتا ہو اور بہہ رہا ہو اسے آپ روک نہیں سکتے۔ آپ روک تو اسی کو سکتے ہیں جس کے دل میں بُرائی کا خوف ابھی کچھ باقی ہے۔ لیکن دلائل سننے کے بعد جو خود ان ممالک کے اپنے لٹریچر میں موجود ہیں، وہ پھر بول نہیں سکتا۔

سوال: تحریک کا ایک کارکن لٹریچر پڑھے اور پڑھائے، اجتماعات میں شرکت کرے، کالج میں تحریک کا کام کرے، اس کے ساتھ گھر کے کام اور دیگر ذمہ داریوں کو ادا کرے اور اس کے ساتھ پڑھے، یہ کیسے ممکن ہے! سوال یہ ہے کہ توازن کس طرح قائم کیا جائے؟

جواب: کبھی آپ نے غور کیا اس بات پر کہ ایک آدمی جب سائیکل کی سواری سیکھنے کی کوشش کرتا ہے، تو آغاز میں وہ کس قدر گرتا ہے، کبھی ادھر گرتا ہے اور کبھی اُدھر گرتا ہے۔ کبھی ٹھوکر کھاتا ہے۔ رفتہ رفتہ مشق اور محنت کر کے وہ ''توازن'' قائم کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ آگے چل کر توازن پر اس کو اتنی قدرت حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کے لئے کوشش کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔

_______ مسلمان کی زندگی ایک معتدل اور ایک متوازن زندگی ہوتی ہے۔ مسلمان Extremist نہیں ہوا کرتا، مسلمان اس مزاج کا نہیں ہوتا کہ ایک رخ پر تو وہ حق ادا کرے اور دوسرے رخ پر وہ حق مارنے لگے۔ والدین کے حقوق بھی ایک فریضہ ہیں۔ آخر اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بھیجا ہے تو بے شمار ذمہ داریاں اُس کے ذمے عائد کی ہیں اور اس کی کامیابی کا سارا دار و مدار اور انحصار اس پر ہے کہ وہ تمام ذمہ داریوں کو ٹھیک طریقہ سے محسوس کرے۔ تمام حقوق و فرائض ٹھیک ٹھیک ادا کرے۔ پھر اس بات کی مشق بھی ہونی چاہیے کہ ہر ایک کے حق کو اس طرح سے ادا کرے کہ کسی دوسرے کا حق ساقط نہ ہونے پائے۔ خدا کا حق اس طرح سے ادا کرے کہ والدین کے حقوق بھی ساتھ ساتھ ادا ہوں۔ اس کے ساتھ اس کو اپنے نفس کا حق بھی ادا کرنا ہے اور آپ کے

نفس کا حق یہ ہے کہ آپ اپنی تعلیم کو ٹھیک مکمل کریں۔ خدا کا حق یہ ہے کہ آپ برائیوں کے مقابلہ میں جدوجہد کریں، بھلائی کو قائم کرنے کی کوشش کریں۔ والدین کا حق یہ ہے کہ اپنے گھر کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بھی بٹائیں اور ان کے لئے آخرکار سہارا بھی بنیں۔ یہ ساری چیزیں بیک وقت آپ کو کرنی ہوں گی۔ یہ توازن کیسے قائم کیا جائے، یہ میں نہیں بتا سکتا، میں تو آپ کو یہ بتاؤں گا کہ سائیکل چلانے کی کوشش آپ کریں گے تو رفتہ رفتہ توازن قائم کرنا آپ کو آ جائے گا۔

> سوال: آپ ہمارے لئے کچھ ایسی چیزیں تجویز کریں جن کی بدولت ہم اپنی سیرت و کردار کی تعمیر کر سکیں اس سلسلے میں وہ کیا کیا چیزیں ہیں، جو ہمارے لئے مضرت رساں بن سکتی ہیں۔’’

جواب: یہ ایک ایسا سوال ہے کہ اگر میں آپ کو ایک فہرست دینا شروع کروں کہ کیا کیا چیزیں ہیں جو آپ کے لئے مضرت رساں ثابت ہو سکتی ہیں، تو آپ کو صبح کی نماز کے وقت تک تو بہرحال بیٹھنا پڑے گا۔ اس لئے میں بجائے فہرست دینے کے آپ کو صرف ایک معیار دینا چاہتا ہوں، جس سے آپ یہ اندازہ کر سکیں گے کہ کیا چیزیں آپ کے لئے مضر ہیں اور کیا چیزیں آپ کے لئے مفید ہیں۔ یہ معیار میرا اپنا تجویز کردہ نہیں‘ قرآن مجید میں صرف ایک چھوٹے سے فقرے میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ

> **یایھا الذین امنوا اتقوا اللّٰہ و لتنظر نفسٌ ما قدمت لغد .**
>
> اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور ہر متنفس یہ دیکھے کہ کل کے لئے اُس نے کیا سامان کیا ہے۔’’

‘‘کل’’ سے مراد ‘‘آخرت’’ ہے اور ‘‘آج’’ سے مراد ‘‘موجودہ زندگی’’ ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ کل کے لئے اُس نے کیا اُٹھا رکھا ہے تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ وہ آج کی زندگی میں یہ دیکھے کہ آخرت کے لئے اُس نے کیا سامان کیا ہے۔ ہر متنفس کو اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت فرمائی ہے اس آدمی سے زیادہ نادان کوئی نہیں ہو سکتا جو اپنی آج کی زندگی میں اپنے تمام وسائل و ذرائع اور ساری قوتیں‘ ساری محنتیں اور کوششیں سب کچھ

صرف ''آج'' کے لئے کھپا دے اور ''کل'' کے لئے کوئی سامان جمع کر کے نہ رکھے۔ ظاہر ہے کہ یہ کل کا دن جب طلوع ہوگا تو اس کے لئے نہ کوئی سایہ کی جگہ ہوگی' نہ سر چھپانے کی' اس لئے اللہ تعالیٰ یہ کہتا ہے کہ کل کی فکر کرو، جو ایک لازمی طور پر آنے والی چیز ہے۔ یہ دیکھو کہ آج تم اپنے ''کل'' کے لئے کیا سامان کرتے ہو اور یہ دعوت ہر متنفس کو دی گئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنا محاسب اور محتسب خود بنے۔ خود جائزہ لے کر دیکھے۔ کوئی دوسرا آدمی اس کو فہرست دینے والا نہ ہو۔ قرآن اصول بیان کر دیتا ہے، ہدایت دے دیتا ہے، اس کی تفصیلات نہیں بیان کرتا۔ احادیث میں بھی کچھ تفصیلات ملتی ہیں۔ ساری تفصیلات موجود نہیں ہیں۔ اس لئے ایک ایک آدمی کو اپنی جگہ خود جائزہ لے کر دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یہ میری کل کی زندگی کے لئے مفید ہوگا یا نقصان دہ۔ اگر آج وہ کوئی ایسا کام کر رہا ہے جو اس کے مستقبل کے لئے تباہ کن ہو تو اس کو رک جانا چاہیے۔ اپنا حساب خود کر کے دیکھے کہ وہ کل کے لئے کیا کر رہا ہے۔ اس وجہ سے میں آپ کو ایک جامع چیز بتا رہا ہوں جس سے آپ خود ہی معلوم کر سکیں گے کہ کیا نقصان دہ ہے اور کیا مفید ہے۔ یہی چیز سیرت و کردار بنانے والی ہے۔

سوال: تحریکی مزاج کسے کہتے ہیں؟ اور یہ کن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے؟

جواب: ایک آدمی جو اپنی ذات کی حد تک ایک فلسفہ زندگی اور مقصدِ حیات رکھتا ہے۔ اگر وہ اس کو دنیا میں پھیلانے، دوسرے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے اور اس کے لئے سعی و جہد کرنے کا کوئی جذبہ نہ رکھتا ہو تو گویا یہ غیر تحریکی مزاج ہے۔ یہ ایسا آدمی ہے جس نے اپنا ایک راستہ خود اپنی ذات کے لئے تجویز کر لیا ہے اور اس پر وہ مخلصانہ طور پر کوشش بھی کرتا ہے۔ مگر اپنی ذات کی حد تک! اس مزاج کا حامل انسان کسی تحریک کو نہیں چلا سکتا۔ تحریکی مزاج اس کے برعکس یہ ہے کہ میں جس چیز کو حق سمجھتا ہوں' دنیا کو بھی اس حق کو قبول کرنے کی دعوت دوں اور کوشش یہ کروں کہ اس حق کے خلاف جو چیزیں ہیں ان کا فروغ رکے اور حق کے مقاصد فروغ پائیں۔ جب کوئی شخص عملاً یہ کام شروع کر دے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اندر ایک تحریکی سیرت پیدا ہوگئی ہے۔ بعض لوگ ایسے

ہوتے ہیں جن کے اندر تحریکی مزاج نہیں ہوتا' وہ تحریک کا جو کام بھی کرتے ہیں' بالعموم بگاڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ اس کام کو وہ جانتے نہیں ہیں۔ ان کے اخلاق و عادات، ان کی طبیعت اس کام کے ٹھیک مناسب نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ غلط طریقے سے کام کرتے ہیں اور بالآخر جس مقصد کے لئے وہ کام کرنے اُٹھتے ہیں۔ اسی کے لیے نقصان وہ ثابت ہوتے ہیں۔

تحریکی مزاج کیا ہے؟ تحریکی مزاج سے مراد یہ ہے کہ ایک آدمی جو حق کو قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور باطل کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے تو اس کی سیرت و عادات و احوال ایسے ہونے چاہئیں جو اس مقصد کے لئے سازگار بن سکیں۔ مثلاً ایک آدمی بداخلاق ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ کسی تحریک کا کام کرے گا تو تحریک کو نقصان پہنچائے گا۔ اس کے مقابلہ میں ایک آدمی میں ایسا اخلاق ہے کہ جن لوگوں سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اس کے لئے قدر و عزت پیدا ہوتی ہے' وہ ایک جاذب شخصیت رکھتا ہے۔ یہی ایک صحیح قسم کا تحریکی مزاج ہے۔ اس کے برخلاف ایک شخص ہے جو کسی کی تنقید برداشت نہیں کر سکتا' کسی کا اعتراض نہیں سہہ سکتا' ذرا کوئی بات مزاج کے خلاف ہوئی تو لڑ پڑا تو وہ تحریک کے لئے موزوں نہیں ہے۔ تحریکی جذبہ تو اس میں ہو سکتا ہے مگر تحریکی مزاج نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس ایک شخص زبان کا شریں ہے' متحمل ہے' اس کے اندر ضبط کا مادہ ہے' بہت سی چیزیں جو مزاج کے خلاف ہوتی ہیں' برداشت کر جاتا ہے۔ بہت سی چیزیں جو اسے سخت ناگوار ہوتی ہیں، ان پر تحمل سے کام لیتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس شخص میں تحریکی مزاج ہے۔ وہ کام بگاڑنے والا نہیں ہے۔ کام کو بنانے والے اوصاف اس کے اندر موجود ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ تحریکی مزاج کیسے پیدا ہو تو میرے خیال میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ اس کے لئے بہت نافع اور مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہم وہی کام کرنے اُٹھے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا۔ اس وجہ سے ہمارے لئے اگر کوئی بہترین نمونہ ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا

چاہیے کہ آپؐ نے کس طرح اس حق کو پھیلایا۔ کیا مزاج تھا، جس کی وجہ سے شدید مخالفت پر تلی ہوئی دنیا آخر مسخر ہوگئی اور آپؐ کے بدترین مخالفوں کو بھی بالآخر ہتھیار ڈالنے پڑے اور بعد میں انھیں اللہ کے رسولؐ کے ساتھ عشق اور قلبی لگاؤ پیدا ہوگیا۔ دوسری چیز جو درکار ہوسکتی ہے۔ وہ دوسرے انبیاء علیہم السّلام کی سیرت کا مطالعہ ہے جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ آپ کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ انبیاء علیہم السّلام کی سیرتوں سے واقف ہونے کا نہیں ہے۔ جن دوسرے مقامات پر ان کی سیرتیں موجود ہیں وہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ انبیاء کے جو حالات قرآن میں بتائے گئے ہیں ان کو بڑے غور سے آپ پڑھیں۔ آپ کو معلوم ہوگا، کہ یہ کام جن لوگوں کو کرنا ہو، ان کے اندر کیا اوصاف ہونے چاہئیں۔

اصلاحِ احوال کی کوئی تنظیم اس وقت مؤثر ہوسکتی ہے۔ جب وہ خود بحیثیت ایک جماعت اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرے۔ پھر اس کے ساتھ جو لوگ بھی ملتے جائیں گے اس کے مطابق ڈھلتے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے تنظیم میں یہ قوت پیدا کی ہے کہ افراد اس کے سانچے میں ڈھلتے ہیں بشرطیکہ وہ افراد اس کے اندر شامل ہوں جو اس کے اثرات کو Resist کرنے کا جذبہ نہ رکھتے ہوں بلکہ اس کے اثرات کو قبول کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں۔ اگر Resist کرنے والے افراد اس میں شامل ہوتے جائیں تو جیسے جیسے وہ داخل ہوں گے، اس تنظیم کی بنیادوں کو کمزور کرتے چلے جائیں گے۔

سوال: حکمت اور موعظۃ الحسنہ کے وہ کیا کیا پہلو ہیں جو دین کی دعوت دیتے وقت ایک داعی کے پیشِ نظر رہنے چاہئیں؟

جواب: اس چیز کو میں نے بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف مواقع پر بیان کیا ہے، اچھا ہو گا کہ آپ اس کو میری کتابوں میں پڑھ لیں۔ میں یہاں مختصر طور پر آپ کو دو باتیں بتاؤں گا حکمت کیا چیز ہے اور موعظۃ الحسنہ کیا ہے۔

حکمت یہ ہے کہ آپ جب کام کرنے اٹھیں تو اپنی تحریک کے نقطہ نظر سے جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہم کس وقت، کس زمانے میں اور کن حالات میں کام کر رہے ہیں؟ تحریک کے نقطہ نظر سے جائزہ لینے سے مراد یہ ہے کہ آپ اس لحاظ سے دیکھیں کہ آپ

جو کام کرنے اٹھے ہیں، اس کام کے لحاظ سے اس وقت اس زمانے میں کون سی چیزیں اس مقصد کے لئے مددگار ہیں۔ انکا ٹھیک ٹھیک آپ حساب لگائیں کہ وہ کس حد تک مددگار ہیں اور کس کس پہلو سے مددگار ہیں۔ جو چیزیں مانع ہیں ان کا اس پہلو سے جائزہ لیں کہ ان کی وسعت کیا ہے؟ کس پیمانے پر یہ پھیلی ہوئی ہیں؟ ان کی پشت پر کون سی قوتیں کام کر رہی ہیں؟ ان کا پس منظر کیا ہے؟ کہاں سے یہ آ رہی ہیں؟ ان کا مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ یہ حکمت ہے۔ ایک آدمی جو حکیم ہو وہ سب سے پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کرے گا، کہ میں کس زمانے میں اور کن حالات میں کام کر رہا ہوں! مثال کے طور پر ایک داعی جب یہاں دین کی دعوت لے کے اٹھے گا تو وہ یہ دیکھے گا کہ کتنا کچھ مصالحہ گرد و پیش میں موجود ہے جو اس کے لئے مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

مثلاً اسلام کو ماننے والی سوسائٹی ہے، یا اسلام کی مخالف سوسائٹی ہے، اسلام کی منکر سوسائٹی ہے یا اسلام کی دشمن اور مزاحمت کرنے والی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایک آدمی جو اسلام کی سخت مخالف دشمن سوسائٹی میں ہو، وہ کوئی اور طریق کار اختیار کرے گا۔ ایک آدمی جو اسلام کی منکر لیکن بے حس سوسائٹی میں ہو وہاں کوئی اور راستہ اپنائے گا اور اسلام کو ماننے والی سوسائٹی میں بالکل مختلف طریقِ کار اختیار کرے گا وہ آدمی بالکل کم فہم ہو گا جو مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بداخلاقیاں یا ان میں پائے جانے والے تساہل کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ یہاں تو اسلام برائے نام ہے اور یہ سوسائٹی تو اسلام سے منحرف ہو چکی ہے اور نتیجتاً اسی احساسِ غلط کے نتیجے میں وہ ایسا کام کرنا شروع کر دے جو مثلاً کفار کے اندر کرنے کا ہے۔

اسی طرح ایک داعی کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کون سی قوتیں یہاں اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں اور ان کے محرکات کیا ہیں؟ ان کے افکار کی بنیادیں کیا ہیں؟ ان کا فلسفہ کیا ہے؟ ان ساری چیزوں کا جائزہ لینا اس لیے ضروری ہے کہ اسے ان کا مقابلہ کرنا ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی جو پہلوان سے کشتی لڑنے جا رہا ہو وہ پہلے یہ دیکھے گا کہ یہ پہلوان کتنا طاقتور ہے؟ اس کا وزن کتنا ہے؟ اس کی طاقت کا کیا حال ہے؟ اس کے

مقابلے میں مجھے کس قدر طاقت فراہم کرنی چاہیے۔ تب میں جا کر اس سے کشتی لڑوں۔ دوسرے کی طاقت کا اندازہ لگائے بغیر اکھاڑے میں اترنے والا آپ سے آپ پچھڑ جائے گا۔

اس کے ساتھ پھر حکمت کا ہی یہ تقاضا ہے کہ Line of action ایسی اختیار کی جائے جو زیادہ سے زیادہ مواد کو استعمال کرنے کے لیے موزوں ہو اور جو طاقتیں مزاحم ہیں، ان کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ طاقت فراہم کی جائے۔ یعنی داعی ایسا طرزِ عمل اختیار کرے ان کا زور کم سے کم وقت میں آسانی کے ساتھ توڑ دے۔ میرے نزدیک مختصراً حکمت کا مفہوم یہی کچھ ہے۔

دوسری چیز موعظہ حسنہ ہے۔ موعظہ حسنہ میں دو چیزیں خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں، گو اس کے دوسرے اور پہلو بھی ہیں۔

پہلی چیز یہ ہے کہ نصیحت، دعوت اور تبلیغ کرنے کا ایسا طریقہ استعمال کیا جائے جو دوسرے شخص کے اندر ضد پیدا نہ کرے۔ دوسرے شخص میں کد اور غصے کے جذبات نہ ابھریں۔ دوسرے شخص سے آپ اس طرح اپیل کریں کہ اگر اس کی فطرت میں ذرہ برابر بھی کوئی بھلائی موجود ہو تو وہ متاثر ہو جائے اور اس کے اندر کوئی کجی اور ٹیڑھ ہو تو آپ کے لئے آئندہ کام کرنے کے مواقع باقی رہنے چاہئیں۔ اس معاملہ میں ایک مرتبہ امام ابوحنیفہؒ نے ایک بڑی دلچسپ بات کہی۔ امام ابوحنیفہؒ ایک زمانے میں بہت بڑے متکلم تھے اور مناظرے کیا کرتے تھے۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ میں بصرہ میں جا کر ٹھہرتا تھا اور وہاں مختلف گمراہ فرقوں سے مناظرے کیا کرتا تھا۔ بعد میں ان کے صاحبزادے کو بھی علم کلام سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور وہ بھی مناظرے کرنے لگے۔ امام ابوحنیفہؒ نے اپنے بیٹے کو مناظرے کرنے سے روکا۔ صاحبزادے نے کہا ابا جان! آپ بھی تو پہلے مناظرے کیا کرتے تھے۔ آپ آخر آج مجھے کیوں روک رہے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہم جب مناظرے کرتے تھے تو یہ سمجھتے ہوئے کرتے تھے کہ جیسے ایک آدمی کے کندھے پر ایک پرندہ بیٹھا ہوا ہے اور کہیں ہم ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں کہ یہ پرندہ اڑ جائے۔ اس پرندے کو تو

ہمیں پکڑنا ہے۔ اتنی احتیاط کے ساتھ ہم مناظرہ کرتے تھے۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ جتنا کچھ ایمان ایک شخص میں موجود ہے۔ مناظرے کا مقصد اس کو بڑھانا ہوتا تھا، نہ کہ جتنا کچھ ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔ انھوں نے کہا کہ تم لوگ اتنی بیدردی سے مناظرہ کرتے ہو کہ جتنا کچھ ایک آدمی دین سے دور ہے، تمھارے مناظرے کی بدولت اس سے بھی زیادہ دور چلا جاتا ہے۔

پس موعظہ حسنہ یہ ہے کہ آپ دعوت و تبلیغ کا ایسا طریقہ اختیار کریں کہ جو دوسرے شخص کو زیادہ سے زیادہ اپیل کرے۔ اس کے اندر ضد پیدا نہ کرے۔ اس کو اور زیادہ دور نہ پھینک دے۔ زبان اور طرزِ بیان ایسا ہونا چاہیے کہ آپ کو لوگوں سے قریب کرے اور ان کو آپ سے مانوس کرے۔ نہ کہ ان کے دلوں میں آپ کے خلاف نفرت اور غصہ پیدا ہو۔

دوسری چیز جو موعظہ حسنہ کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آپ کسی شخص کو نصیحت کرنے اور اس کو سمجھانے کی سعی کرنے سے پہلے یہ جانیں کہ اس کی گمراہی کی پشت پر کیا کیا محرکات ہیں؟ پھر اُسے ایسے طریقے سے سمجھائیں جو اس کے دماغ اور دل دونوں کو متاثر کرنے والا ہو۔ اگر وہ ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہے تو اس کی ذہنی الجھنیں آپ رفع کرنے کی پہلے کوشش کریں۔ پھر معقول دلائل کے ساتھ اسے مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔ اگر کوئی شخص کسی جذباتی بگاڑ میں مبتلا ہے تو اس کے جذبات کو اپیل کریں، اور ایسا طریقہ اختیار کریں جس سے اس کے جذبات میں اگر دین سے انحراف کرنے والی کوئی چیز ہو تو وہ پلٹ کر دین کی طرف مائل ہونے والی چیز بن جائے۔

سوال: کیا عالمِ اسلام میں اسلامی تحریک اور بھی ہے؟ اور اگر ہے تو کس مرحلے پر ہے؟ کیا پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی جماعت اسلامی ہے؟

جواب: تمام مسلمان ملکوں میں اسلام کے لیے کام ہو رہا ہے۔ کہیں منظم صورت میں اور کہیں اپنے طور پر۔

کوئی مسلمان ملک ایسا نہیں ہے کہ جہاں ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو اسلام کی سربلندی کے لیے کام نہ کر رہے ہوں۔ انڈونیشیا، ترکی، ایران اور مختلف عرب ممالک میں، غرضیکہ کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اس طرح کی تحریکیں یا افراد موجود نہ ہوں۔ جن ممالک میں حکومتوں نے ایسی رکاوٹیں ڈال رکھی ہیں کہ وہاں منظم صورت میں تحریک نہیں چلائی جا سکتی، وہاں غیر منظم صورت میں کام ہو رہا ہے درحقیقت اس کا سارا انحصار اس بات پر ہے کہ آئینی طور پر مواقع کتنے ملتے ہیں۔ بدقسمتی سے رکاوٹیں ہر جگہ موجود ہیں۔ کہیں زیادہ ہیں اور کہیں کم۔ جہاں رکاوٹیں زیادہ ہیں وہاں تحریکیں ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ جہاں رکاوٹیں کم ہیں وہاں تحریکیں کافی آگے بڑھ چکی ہیں۔

جماعت اسلامی کے نام سے اس وقت ہندوستان میں جماعت موجود ہے، سیلون میں موجود ہے، مقبوضہ کشمیر میں موجود ہے۔ اور اب میں نے سنا ہے کہ نیپال میں بھی جماعت اسلامی قائم ہوگئی ہے۔ اسی طرح لبنان میں بھی اس کا قیام عمل میں آیا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کا تعلق پاکستان کی جماعت اسلامی سے تنظیمی نوعیت کا نہیں ہے۔ جماعت اسلامی کے لٹریچر سے ہر جگہ فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے لیکن ہر جگہ ہر ملک میں اسی ملک کی جماعت منظم کی گئی ہے۔ کسی بین الاقوامی پیمانے پر کوئی تنظیمی تعلق نہیں ہے۔

سوال: جماعت اسلامی کے مستقبل کے بارے میں کچھ بتائیے۔ ایک خطرہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ کہیں یہ تحریک اپنے قائد کے بعد ختم نہ ہو جائے؟

جواب: ہمیں اللہ سے دعا مانگنی چاہیے کہ ایسا نہ ہو۔ جو لوگ ہمارے بعد جماعت اسلامی کے کارکن بنیں گے، یہ ان کا کام ہوگا کہ وہ اس کے کام کو آگے بڑھائیں۔ اگرچہ میرے پاس اس بات کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ میرے بعد کیا ہوگا۔ لیکن مجھے لوگوں کے یہ اندازے صحیح معلوم نہیں ہوتے کہ جماعت اسلامی خالی میرے گرد گھوم رہی ہے۔ ہوسکتا ہے دُور سے دیکھ کر یہ بات معلوم ہوتی ہو، لیکن خدا کے فضل سے جماعت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو کام کو چلا بھی سکتے ہیں اور ان کے دلوں میں وہ جذبہ بھی موجود ہے جو میرے دل میں ہے، بلکہ اب میری ذمہ داریوں کا بڑا حصہ بھی انھوں نے اٹھالیا ہے۔ یہ

اللہ تعالیٰ کا اس تحریک پر اپنا خاص فضل ہے کہ یہ مردانِ کار سے خالی نہیں ہے۔

سوال: پاکستان میں تحریکِ اسلامی کی کامیابی کا امکان کس قدر ہے؟ اسلامی انقلاب کے لئے کب تک چشم براہ رہنا پڑے گا؟

جواب: کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کو کب تک چشم براہ رہنا پڑے گا ـــــ میرا خیال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ میرا فرض کیا ہے تو اس کو کبھی یہ فکر لاحق نہیں ہو سکتی کہ اس کو کامیابی ہوگی یا نہیں ہوگی اور ہوگی تو کب ہوگی؟ فرض کیجیے کہ کامیابی کا ایک فیصد بھی امکان نہیں ہے۔ تو کیا اس صورت میں فرض آپ سے ساقط ہو جائے گا؟ ایک شخص ایک محلے میں جا کر اذان دیتا ہے تو اسے یہ فکر کیوں کر لاحق ہو سکتی ہے کہ کتنے لوگ میری اذان پر نماز کے لئے آتے ہیں اگر کوئی نہ آئے تو اسے خود تکبیر کہہ کہ نماز پڑھ لینی چاہیے اور ساری عمر اذان دینے کا یہ فریضہ ادا کرتے رہنا چاہیے’ کوئی آئے یا نہ آئے’ اذان بند نہیں ہونی چاہیے۔ کامیابی یا ناکامیابی کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ ہم اپنا فرض انجام دیں۔ جتنا زیادہ آپ دیکھیں گے کہ دنیاوی معنوں میں کامیابی کے امکانات کم ہیں۔ اتنا ہی زیادہ آپ کا فرض بڑھ جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ یہ خیال کر کے کہ جب امکانات ہی نہیں ہیں تو پھر خدا کا نام لینے کے بجائے اور کسی کا نام لیا جائے، خدا کا نام لینا چھوڑ دیں۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ آپ اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ خدا کا نام بلند کرنا شروع کر دیں۔

اسلامی جمعیت طلبہ سکھر (صوبہ سندھ) کے زیر اہتمام

تعمیر نو ہائی اسکول میں منعقد ایک مجلس ـــــ ۲۲ مارچ ۱۹۶۸ء

سوال: کیا طلباء کا سیاست میں حصہ لینا جائز ہے؟

جواب: حرام بھی نہیں اور فرض بھی نہیں، صورت یہ ہے کہ ایک نسل ملک کو چلاتی ہے تو دوسری نسل اس کی جگہ لینے کے لئے تیار ہوتی ہے۔ جانشین کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ وہ پہلی نسل سے بہتر تیار ہو اور جو غلطیاں پہلی نسل سے سرزد ہوئی ہوں، ان کو یہ سمجھے اور ان سے محترز رہے۔ اس غرض کے لئے طلبہ کو اپنے اندر زیادہ سے زیادہ قابلیت پیدا کرنی چاہیے اور انھیں چاہیے کہ ملک کو چلانے کی ذمہ داری کو بخوبی نبھانے کے لئے حالات کو اچھی طرح سے جانیں بوجھیں اور سمجھیں۔ نظامِ حکومت میں کیا خرابیاں ہیں اور ان کی کیا اور کس طرح سے اصلاح ہوسکتی ہے۔ اسی کا نام سیاست ہے، انھیں یہ اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ معاملاتِ ملک کو کیسے چلایا جاتا ہے، اور یہ بارِ عظیم کن کن چیزوں کا متقاضی ہے۔ انھیں اپنے اندر یہ قابلیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ طلبہ کا کام اس واقفیت کو بہم پہنچانا اور اس کے مطابق اپنے اندر صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ لیکن ان کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ موجودہ انتظام ملک میں حصہ دار بننے کی بھی کوشش کریں۔ عملی سیاست ان کے لئے مناسب ہے نہ موزوں۔ لیکن دوسری طرف میں کہوں گا کہ نئی نسل کو واقفیت بہم پہنچانے اور قابلیت پیدا کرنے کے مواقع سے محروم کرنا ظلم سے کم نہیں ہے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ درحقیقت آئندہ نسل کو ان مواقع سے محروم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ طلبہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ نظامِ مملکت کی خرابیاں معلوم کریں۔ پھر اس کی اصلاح کے لئے تنقیدی مواد کو بھی دیکھیں۔ اس واقفیت کے حصول کا انھیں حق پہنچتا ہے اس لئے کہ ان کو آگے چل کر

ملک کی باگ ڈور سنبھالنا ہے۔ لیکن یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ وہ علمی سیاست حاصل کرتے کرتے عملی معاملاتِ سیاست میں کود پڑیں۔

سوال: ''تحریکی مزاج'' سے کیا مراد ہے؟

جواب: ایک آدمی حق کو صرف انفرادی طور پر ہی جان کر رہ جاتا ہے۔ وہ نیک اور بھلا آدمی ہے، لیکن ایک دوسرا شخص ہے جو نہ صرف حق کو خود جانتا ہے بلکہ اس کو پھیلانے اور قائم کرنے کے لئے اپنے ساتھ رفقائے کار بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کا نام ہے تحریک۔ لہٰذا تحریکی مزاج سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا مزاج و اخلاق تحریک کو چلانے کے لئے اپنی زندگی کا ہر ہر لمحہ وقف کردے!!

سوال: ''اسلامی سوشلزم'' کے نعرے کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: نعرے بالعموم بغیر سوچے سمجھے لگائے جاتے ہیں، جو لوگ اس وقت اسلامی سوشلزم کے حامی و مدعی ہیں، وہ نہ اسلام کے منشاء کو سمجھتے ہیں نہ سوشلزم کو۔ یہ دونوں نظام یکسر مختلف حیثیت کے حامل ہیں اور اپنے مزاج، فلسفہ اور بنیاد کے اعتبار سے بالکل متضاد ہیں۔ دونوں کا نظام الگ، عقائد الگ اور افکار الگ ہیں۔ ان کے اپنے اپنے اخلاقی، معاشرتی، تمدنی اور معاشی منہاج ہیں، جو ان کے فکر و فلسفہ سے مناسبت رکھتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ ان دونوں کو کیسے ملایا جا رہا ہے۔ اگر اصطلاحوں کا اسی طرح سے رواج رہا تو شاید کل کو اسلام اور شرک کو جمع کرکے اسلامی شرک کی اصطلاح بھی پیدا ہو جائے۔ سوشلزم کا مفہوم ہے کہ فرد اپنے ذرائع پیداوار کے صحیح استعمال سے طبعاً قاصر ہے، گویا اس سے بدگمانی ہے کہ اس میں ان کے صحیح استعمال کی صلاحیت نہیں ہے۔ سوشلزم کا موقف ہے کہ ذرائع پیداوار کو افراد کی نجی ملکیت سے نکال کر اجتماعی تصرف میں دے دیا جائے۔ اسلام اس پالیسی کے خلاف ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ تمام معاملات کو جن میں معاشی معاملات بھی ہیں افراد چلائیں الّا یہ کہ ان کے اوپر اجتماعی نگرانی کی کوئی معقول وجہ یا ضرورت ہو۔ Nationalization قومیانا حرام نہیں۔ لیکن اس کو اختیار کرنے کے

لئے کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے۔ اگر اجتماعی ملکیت قائم کرنا مقصود ہے، تو سیدھا کہنا چاہیے کہ ہم سوشلزم چاہتے ہیں۔ پھر اسلام کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت ہے اور اگر اسلام مقصود ہے تو سیدھا اسلامی نظام کا مطالبہ کیجیے۔

سوال: موجودہ نظامِ تعلیم میں اچھا مسلمان کس طرح بنا جا سکتا ہے؟

جواب: یہ نظامِ تعلیم ایک طالب علم کو مسلمان بنانے کے لئے نہ قائم کیا گیا ہے نہ موزوں ہے۔ اسے صحیح معنوں میں اسلامی نظامِ تعلیم بنانے کے لئے آپ کو خود جدو جہد کرنی پڑے گی۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ آپ اسلام کا صحیح علم حاصل کریں۔ آپ خود اچھی طرح سے سمجھ لیں کہ اسلام کیا ہے اور کیا چاہتا ہے۔ پھر جو حق آپ کو ملے اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ سارے کام تنہا آپ ہی کو کرنے ہوں گے۔ موجودہ نظامِ تعلیم اس معاملے میں آپ کو کوئی مدد بہم نہیں پہنچائے گا۔ اس سلسلے میں آپ کو جہاں اجتماعی سعی کی ضرورت محسوس ہو تو اسلامی جمعیت طلبہ سے مدد لی جا سکتی ہے۔

سوال: نظریۂ پاکستان قبول کر لینے کے بعد طلبہ پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟

جواب: پاکستان اسلام کے لئے حاصل کیا گیا تھا، لیکن افسوس کہ اس میں رائج نظامِ تعلیم اپنے طلبہ کو اسلام سے غیر جانبدار بنا رہا ہے۔ اگر آپ کو نظریۂ پاکستان کو زندہ و توانا رکھنا ہے تو لازم ہے کہ آپ علوم جدیدہ بھی حاصل کریں اور اسلام کا علمِ صحیح بھی۔ اور اس کا مطالعہ بھی کیجیے کہ نظریۂ پاکستان کے نفاذ میں کہاں کہاں بگاڑ اور کوتاہی واقع ہوئی ہے اور اس کو آئندہ کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے انفرادی کوشش بھی کریں اور اجتماعی بھی ______ اگر آپ کو نظریہ پاکستان کا صحیح شعور حاصل ہو گیا ہے تو یہ سب آپ کی ذمہ داریاں ہیں۔

سوال: چینی کمیونزم اور روسی کمیونزم میں فرق کیا ہے؟

جواب: (مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا) اتنا ہی فرق ہے جتنا وھابیوں اور بریلویوں میں۔!

(پھر فرمایا) ”کمیونزم دعویٰ تو یہ رکھتا ہے کہ وہ ایک بین الاقوامی نظریہ ہے۔ لیکن روس میں یہ ایک شدید قومی جذبے کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔ یوگوسلاویہ، ہنگری اور پولینڈ میں تو یہ کلیتاً قوم پرستانہ نظریہ بن گیا ہے اور یہی حالت چین کی ہے۔ چین کے ایک علاقے سنکیانگ میں پچانوے فی صد مسلمان تھے۔ لیکن اس پر زبردستی قبضہ کرلیا گیا۔ اور اس طرح بالکل استعمار پسند طاقتوں کی طرح ان کا کمیونزم اپنی حدود وسیع تر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ روس اور چین چاہے اپنے پروپیگنڈے میں کچھ دعوے کرتے رہیں۔ لیکن یہ بالکل واضح ہے کہ دونوں قوم پرست اور استعمار پسند طاقتیں بن چکی ہیں۔ کمیونزم اب امپیریلزم کے مقابلے کی کوئی طاقت نہیں ہے بلکہ خود بہت بڑی امپیریلسٹ طاقت ہے۔“

سوال: سائنس اور ٹیکنالوجی کو اسلامی کس طرح بنایا جاسکتا ہے؟

جواب: ایک وہ علوم ہیں، جو انسان اور انسانی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جن کا تعلق فطرت اور طبیعات سے ہے۔

پہلی قسم کے علوم میں تو بہت بڑی تبدیلی کی ضرورت ہے کیونکہ ان علوم کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ آدمی مادہ ہے اور اسے مادی زندگی ہی بسر کرنی ہے۔ یہ فکر اسلام کی صریح ضد ہے۔ اس لئے ان علوم میں تو بنیادی تبدیلی کرنی ہوگی۔

دوسرے ہیں طبیعی علوم۔ ان میں ایک حصہ حقائق (Facts) کا ہے اور ایک ان کی ترتیب وتہذیب کا۔ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے، یہ عالم گیر ہوتے ہیں اور ان میں کسی ردوبدل کی ضرورت نہیں۔ لیکن جہاں تک ان کی ترتیب وتہذیب کا تعلق ہے، یہیں آکر رنگ بدلتا ہے۔ کافران حقائق کو کفر کی نگاہ سے دیکھتا اور بیان کرتا ہے اور مومن اپنی بصیرتِ ایمانی سے، دنیا میں کوئی مطالعہ معروضی (Objective) نہیں ہوتا۔ اشتراکی اپنے زاویۂ نگاہ سے ان امور کو ترتیب وتہذیب دیتے ہیں اور اہلِ مغرب اپنے نقطۂ نگاہ

ے، اس لئے سب سے اوّل اس کی ضرورت ہے کہ آدمی مومن بنے، جب تک ایک سائنسدان پہلے مومن نہیں بنے گا۔ وہ علوم کو ہرگز اسلامی رنگ نہیں دے سکے گا۔ مثال کے طور پر ایک آدمی ڈاکٹر بنتا ہے۔ اگر وہ مسلمان یا انسان نہیں تو گویا وہ ایک تربیت یافتہ حیوان ہے۔ وہ انسانوں کو اپنے علم کے زور سے لوٹے گا، ان کی حالت پر رحم کھائے بغیر۔ اور ایسی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں کہ مریض تڑپ رہا ہے اور ڈاکٹر صاحب فیس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ سائنس کے ساتھ اخلاق کی تعلیم ضروری ہے اور اخلاق اسلام کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے؟ اگر اخلاق نہیں تو علم درندگی ہے۔

سوال: خطبات میں آپ نے جہاد کے بارے میں لکھا ہے کہ مدافعانہ بھی ہوتا ہے اور جارحانہ بھی۔ اس کی وضاحت فرمایئے؟

جواب: جس جگہ میں نے یہ بات لکھی ہے وہاں میں نے پوری وضاحت سے بیان کیا ہے کہ مدافعانہ اور جارحانہ کی اصطلاحیں قوم پرستانہ ہیں۔ جبکہ ایک نظریے کے لئے ان اصطلاحات کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ ایک نظریے کے لئے لڑی جانے والی جنگ بیک وقت مدافعانہ بھی ہوتی ہے اور جارحانہ بھی۔ جارحانہ ان معنوں میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے نظریے کو پھیلانے اور غالب کرنے کے لئے جدوجہد کا نام ہے۔ اور مدافعانہ ان معنوں میں ہوتی ہے۔ کہ اگر ہم اپنے نظریے کو پھیلانے اور غالب کرنے کے لئے جدوجہد نہ کریں گے اور نہ لڑیں گے تو دوسرا نظریہ ہم پر مسلط ہو کر رہے گا، کیونکہ کوئی سوسائٹی کسی نظریہ سے کبھی خالی نہیں رہتی۔ ہم کہیں خلاء میں نہیں رہتے، اگر ہمارا نظریہ نہ چلے گا تو ہمارے مخالفین کا نظریہ چلے گا۔ اس لئے ہمیں لامحالہ اس کے مقابلے کے لئے جدوجہد کرنا پڑے گی۔ فرض کیجیے اس ملک میں رہتے ہوئے تعلیم کے متعلق میرا نظریہ کچھ ہے اور ملحدین کا کچھ اور۔ اگر میں اپنے نظریہ کو غالب کرنے کی جدوجہد نہیں کرتا تو لامحالہ ملحدین کا نظریہ غالب آئے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ میرے بچوں کو بھی الحاد کی تعلیم دیں گے۔ اس لئے میں ان کے نظریے کو ہٹانے پر مجبور ہوں گا۔ یہ کشمکش لامحالہ مدافعانہ بھی ہے اور جارحانہ بھی ـــــــ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ اگر میری بستی میں کوئی درندہ گھس آئے

اور میں اس پر حملہ نہ کروں تو وہ لامحالہ مجھ پر، میرے بچوں پر حملہ کرے گا اور پھاڑ کھائے گا، اس لئے میں اپنی مدافعت کے لئے لازماً خود آگے بڑھ کر اس پر حملہ کروں گا۔

سوال: کیا اسلامی نظام مکمل طور پر دنیا کے کسی حصے میں رائج ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ مختلف تحریکیں اس کام میں اب تک ناکام ہو چکی ہیں؟

جواب: وجوہ اس کی بہت سی ہیں، اور اس مختصر وقت میں تو بیان نہیں کی جاسکتیں۔ بہرحال یہ صورت حال اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اسلام اس زمانے میں نہیں چل سکتا۔ اگر کوئی شخص اسے اس بات کی دلیل بناتا ہے تو وہ عملاً اسلام کی ناکامی کا نہیں، آج کل کے مسلمانوں کی ناکامی کا ذکر کرتا ہے۔ آج مسلمان ملکوں میں اسلام کے راستے میں وہ رکاوٹیں ہیں جو بعض غیر مسلم ملکوں میں بھی نہیں ہیں۔

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فاتحہ خلف الامام کے ثبوت میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ براہِ کرم تبصرہ فرمایئے؟

جواب: میں نے اس مسئلے پر جتنا غور کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو شخص فاتحہ خلف الامام پڑھتا ہے، اس کی نماز بھی ہو جاتی ہے اور جو شخص امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز بھی ہو جاتی ہے ـــــ یہ زیادتی ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے والے کی نماز نہیں ہوتی یا نہ پڑھنے والے کی نماز نہیں ہوتی۔ یہ بالکل ایسا ہے کہ جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے عمر بھر نماز نہیں پڑھی ـــــ اس لئے جو لوگ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے ہیں ان کی نماز بھی ہو جاتی ہے اور جو نہیں پڑھتے ان کی بھی ہو جاتی ہے۔ خواہ مخواہ اس میں لڑنے جھگڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر کسی کا ان دلائل پر اطمینان ہو جو فاتحہ خلف الامام کے حامی بیان کرتے ہیں تو وہ فاتحہ پڑھے۔ لیکن اگر کسی کا اطمینان اُن دلائل پر ہو جاتا ہے جو فاتحہ خلف الامام نہ پڑھنے والے پیش کرتے ہیں تو وہ نہ پڑھے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ امام ابوحنیفہؒ یا امام شافعیؒ نے تمام عمر نماز نہیں پڑھی۔

سوال: اسلامی نظام ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش چلنے میں ہماری کیا مدد کرسکتا ہے؟

جواب: بحیثیت مسلمان ہمیں ان ممالک کے آگے چلنا ہے نہ کہ دوش بدوش۔ حق تو یہ ہے کہ یہ قومیں ہمارے پیچھے چلیں، لیکن آج ہم کو اسلام کی قوت سے اسی طرح ناواقفیت ہے جس طرح جوہری کا بچہ لعل و جواہر میں ہر وقت گھرے رہنے سے ان کی قدر و قیمت کا احساس کھو دیتا ہے۔ چونکہ ہم مسلمان پیدا ہوئے ہیں اور حق ہمیں بن مانگے مل گیا ہے اس لئے ہم اس کی قدر کا شعور نہیں رکھتے۔ یہ وہ قوت ہے جس کو عرب قوم پا کر دنیا کی امام بن گئی تھی۔

خطابِ آخر

کلمۂ آخر کے طور مختصراً فرمایا:

''آپ اس وقت ایک نہایت نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ ایک طرف ایمان کا تقاضا ہے، دوسری طرف زمانے کا چلن۔ ایمان کا تقاضا اور ہے اور زمانے کا چلن اور ہے۔ موجودہ نظام میں آپ اپنے اخلاق درست کرنا چاہیں تو آپ کے لئے سخت مشکل ہے۔ لیکن اگر آپ بداطواری کا راستہ اختیار کرنا چاہیں، تو ہر طرف آسانیاں ہی آسانیاں ہیں۔ اس صورت حال میں اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اپنے آپ کو ان فتنوں سے بچائے رکھیں جو آپ کے معاشرے اور آپ کی درس گاہوں میں بڑی قوت سے پھیلائے جا رہے ہیں۔ آپ اسلام کا علم حاصل کریں لیکن یہ ہمت آپ کی ہے کہ آپ اس کو آگے بڑھ کر حاصل کریں۔ یہ علم آپ کے پاس خود چل کر نہیں آئے گا۔ آپ کو اسے خود حاصل کرنا ہوگا اور اس کو آپ اس لئے حاصل کریں کہ آپ جب بڑے ہو کر اس ملک کی باگ ڈور سنبھالیں، تو اسے اسلام کے رخ پر موڑ سکیں''۔

راولپنڈی میں طلبہ اور شہریوں کی ایک نشست میں
سوال و جواب کی محفل ____ ۱۱ مئی ۱۹۶۸

سوال: آپ جب سے اسلامی تحریک کو لے کر چلے ہیں اس پر سب سے زیادہ نازک وقت کب آیا تھا اور وہ کیا حالات تھے؟

جواب: ٹھیک اوّل روز سے، جب سے ہم اسلام کے نصب العین کو لے کر چلے ہیں تحریک نازک حالات سے گزر رہی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نازک وقت سے گزرے بغیر رہے ہوں۔

سوال: کیا ہم اس بات کی امید رکھیں کہ ہماری زندگی ہی میں پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ اگر نہیں تو تحریک کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: یہ سوال بہت دلچسپ نوعیت رکھتا ہے ____ اس میں سوچنے کا انداز یہ ہے کہ اگر آپ کو جہاد میں شریک ہونے کا موقع ملے تو آپ پہلے یہ دیکھیں گے کہ میری زندگی ہی میں کامیابی ہوگی یا نہیں۔ اگر میں شہید ہو گیا تو پھر کیا فائدہ؟ یہ ملک فتح بھی ہو گیا تو پھر کیا فائدہ؟ یہ ملک فتح بھی ہو گیا اور اسلام پھیل بھی گیا تو مجھے کیا حاصل ہوگا۔ میں تو شہید ہو گیا۔ ____ یاد رکھیے اس طریق سے سوچنے والا آدمی کبھی خدا کا کام نہیں کر سکتا۔ خدا کا کام وہی شخص کر سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ میرا جو فرض ہے، وہ مجھے ادا کرنا ہے، قطع نظر اس سے کہ نتائج کیا ہوں۔

سوال: اگر یہاں صدارتی نظام ہی اپنانے پر بعض لوگوں کو اصرار ہے تو

امریکی دستور کا ڈھانچہ کیوں نہیں اپنایا جاتا جو اپنے باشندوں کو زیادہ بنیادی حقوق دیتا ہے؟

جواب: امریکہ کا دستور، پارلیمنٹری سسٹم کی دستور کی بہ نسبت زیادہ پیچیدہ ہے اور اسے یہاں چلانا پارلیمانی نظام سے زیادہ مشکل ہے۔ وہاں تین برابر کی طاقتیں پیدا کر دی گئی ہیں۔ مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ۔ تینوں اپنی اپنی جگہ پر بالکل آزاد ہیں۔ یہاں اس سسٹم کا چلنا بالکل ناممکن ہے۔ مقننہ وہاں جس طرح سے کام کرتی ہے خصوصاً سینٹ جو برتاؤ صدر کے ساتھ کرتا ہے۔ اگر یہاں صدر کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جائے تو آئے دن مقننہ پر فوج چڑھ دوڑے گی۔

سوال: یہ کہا جاتا رہا ہے کہ جماعت اسلامی کو امریکہ سے خفیہ مالی امداد ملتی ہے، اس میں کس حد تک صداقت ہے؟

جواب: اگر میرے متعلق اسی طرح کی باتیں کہی جاتی رہیں تو بعید نہیں ہے کہ کل کوئی صاحب یہ بھی پوچھنے لگیں کہ ہم نے سنا تھا کہ تم فلاں مسجد سے جوتے چرا کر نکلے تھے ____ حقیقت یہ ہے کہ جب لوگ خدا سے بے خوف ہو جائیں اور انھیں اس بات کا کچھ احساس نہ رہے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے، وہ بڑی بڑی عبائیں پہن کر کھلے جلسوں میں جھوٹ بولتے پھریں تو سوائے اس کے کہ آدمی اس پر صبر کرے اور خاموشی سے اپنا کام کرتا رہے اور کیا کیا جا سکتا ہے ____ یہ لوگ اس بات کو بالکل بھول چکے ہیں کہ کوئی خدا بھی ہے، کبھی اس کے سامنے جانا ہے اور وہاں باز پرس بھی ہونی ہے۔

سوال: سوشلزم کے حواری یہ کہتے ہیں کہ اگر اس ملک میں اسلام آ گیا تو اس کا چلنا بہت مشکل ہو جائے گا کیونکہ اسلام میں بہت سے فرقے ہیں اور تمام فرقے آپس میں لڑنا شروع کر دیں گے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اسلام کے بجائے کوئی اور نظام چلایا جائے؟

جواب: ان عقل مندوں کو غالباً یہ بات معلوم نہیں ہے کہ سوشلزم کے کتنے فرقے ہیں

______ دو سب سے بڑے فرقے تو چین اور روس ہیں۔ ایک ''وہابی'' ہے اور ایک ''بدعتی'' ہے۔ چینی روسیوں کو ترمیم پسند کہتے ہیں تو یہ گویا بدعتی کے معنوں میں ہے۔ ان کے علاوہ اور نہ معلوم کتنے فرقے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سوشلسٹ اپنے کون سے فرقے کو یہاں لانا چاہتے ہیں، جس کے بعد ہمیں اسلامی فرقوں سے نجات مل جائے گی۔

سوال: آپ نے ''خلافت وملوکیت'' لکھی ہے۔ اس پر چند لوگوں کو اعتراض ہے۔ آپ کے نزدیک اس کتاب کو لکھنے کا مقصد کیا تھا؟ علاوہ ازیں بعض علماء آپ کے بارے میں بڑے افسوس ناک الفاظ استعمال کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ لکھنے کا مقصد کتاب کے شروع میں بھی بیان کر دیا گیا ہے اور آخر میں بھی ______ اگر کوئی صاحب محسوس کرتے ہیں کہ یہ کتاب وہ مقصد پورا نہیں کرتی جو اس میں بیان کیا گیا ہے تو وہ علمی انداز میں اپنے دلائل سامنے لائیں۔

______ دوسری بات یہ ہے کہ یہ جو آپ علمائے کرام کے الفاظ بولتے ہیں اس پر بھی نظرثانی کر لیجیے ______ ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو علمی اور دینی معاملات میں اپنا خاص طرزِ فکر رکھتا ہے اور انھیں اپنی خاص زبان میں پیش کرتا ہے۔ دینی اور علمی معاملات میں یہ زبان اور یہ طرزِ عمل بہر حال نہیں چل سکتا۔ ملک میں ہزارہا علمائے کرام موجود ہیں جن کے وہ خیالات نہیں ہیں جو اس چھوٹے سے گروہ کے ہیں۔ اس گروہ کے لوگوں کو آپ اگر علمائے کرام میں شمار کرنا چاہتے ہیں تو اتنا سوچ لیجیے کہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں جو زبان یہ استعمال کرتے ہیں کیا وہ علمائے کرام کی زبان ہے؟ کیا علماء کے یہی اخلاق ہوتے ہیں؟ ______ یہ اس قوم کی بدقسمتی ہے کہ دینی مدارس میں کچھ تعداد ایسے لوگوں کی بھی گھس جاتی ہے جو دینی تعلیم تو حاصل کر لیتے ہیں، دینی تربیت حاصل نہیں کرتے۔ دینی اخلاق کی انھیں ہوا تک نہیں لگتی۔ ایسے لوگوں کی زبان بتا دیتی ہے کہ یہ شریف انسانوں کی زبان نہیں ہے کجا یہ کہ علمِ دین رکھنے والوں کی زبان ایسی ہو۔ اگر خدانخواستہ ہمارے علمائے دین کا یہ معیار بن گیا تو واقعہ یہ ہے کہ یہ خود دین کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہو

گا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس ملک میں علماء کی عظیم اکثریت ایسی ہے جو اس طبقے سے تعلق نہیں رکھتی۔

> سوال: کچھ علماء کی طرف سے آپ کے خلاف یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ آپ نے اپنی تحریروں میں صحابہ کرامؓ پر نکتہ چینی کی ہے اور ان کے مقام اور مرتبے کو پوری طرح سے ملحوظ نہیں رکھا۔ براہِ کرم وضاحت فرمایئے کہ احترام صحابہؓ کے بارے میں آپ کا مسلک کیا ہے؟ اور آیا اس سلسلے میں اہلِ سنت کے درمیان میں کوئی اختلاف رائے پایا جاتا ہے؟

جواب: چونکہ یہ سوال آ گیا ہے اس لئے اس کے متعلق میں چند کلمات کہہ دیتا ہوں۔ دراصل میں کبھی ایسے اعتراضات کا جواب نہیں دیا کرتا جن کے متعلق مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعتراضات میرے خلاف ناراضی کی اصل وجہ نہیں ہے بلکہ ناراضی کی اصل وجہ کچھ اور ہے اور اِدھر اُدھر سے یہ اعتراضات محض اس لئے نکالے جاتے ہیں تاکہ دنیا کو یہ یقین دلایا جائے کہ ہم اس شخص سے اپنے نفس کے لئے نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ یہ شخص ایسا ظالم ہے کہ اس نے صحابہؓ اور انبیاءؑ سے متعلق یہ اور یہ کہہ دیا ہے، بس ہم اس سے اس وجہ سے ناراض ہیں ـــــــــ تو جن لوگوں کے متعلق مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی مخالفت کی اصل وجہ یہ نہیں ہے بلکہ اس کی اصل وجہ کچھ اور ہے اور صحابہؓ اور انبیاءؑ کا بہانہ بنایا جا رہا ہے تو میں ایسے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اپنی عمر تم اس کام میں کھپاتے رہو، میں اپنی عاقبت کے لئے جس کام کو صحیح اور ضروری سمجھتا ہوں اس کو کرتا رہوں گا۔ تمھیں جواب دینے میں اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ البتہ جو اعتراضات کسی نہ کسی حد تک معقولیت یا کسی دلیل کے ساتھ ہوتے ہیں اُن کا جواب میں پہلے بھی دیتا رہا ہوں اور آئندہ بھی انشاء اللہ دینے کی کوشش کروں گا اور اگر اعتراض معقول ثابت ہوگا تو اس کو مان بھی لوں گا اور اپنی اصلاح بھی کرلوں گا۔ بارہا میں نے ایسا کیا ہے۔ اب دیکھیے کہ اس معاملے میں ان لوگوں کے اعتراضات کی حقیقت کیا ہے، اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ بات سمجھ لیجیے کہ کسی آدمی کی کسی ایک عبارت' یا کسی عبارت

کے ایک فقرے سے اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس کا اس بارے میں یہ مسلک ہے درآنحالیکہ وہ اپنی بیسیوں عبارتوں میں اپنا مسلک واضح طور پر بیان کر چکا ہو۔ یہ بجز ایک ضدی آدمی کے اور کسی کا کام نہیں ہوسکتا، یعنی اگر ایک آدمی اپنے مسلک کی وضاحت بار بار نہ صرف اپنے قول سے اور اپنی تحریروں سے کر چکا ہو بلکہ اس کا مسلک اس کے مجموعی طرزِ عمل سے بھی صاف طور پر معلوم ہوتا ہو تو اس کی کسی ایک عبارت یا ایک فقرے سے اس کے بالکل برعکس نتیجہ نکالنا کسی معقول آدمی کا کام نہیں ہوسکتا اور نہ اس قسم کی حرکت کا کوئی علمی مقام ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میری کتاب تفہیم القرآن موجود ہے جس میں میں نے جہاں کہیں فقہی مسائل یا دینی مسائل کے متعلق کوئی بحث کی ہے تو ان کے اندر آپ دیکھیں گے کہ میں نے صحابہ کرامؓ کے اقوال سے استدلال کیا ہے۔ جہاں کہیں صحابہ کرامؓ کا ذکر آیا ہے میں نے بارہا یہ بات لکھی ہے کہ روئے زمین پر آفتاب نے کبھی ایسے انسان نہیں دیکھے تھے جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ تھے۔ تمام بنی نوع انسانی کا بہترین گروہ اگر کوئی تھا تو وہ صحابہ کرامؓ تھے۔ پھر میں نے بارہا یہ بات بھی لکھی ہے کہ صحابہ کرامؓ کا جس چیز پر اجماع ہو وہ دین میں حجت ہے اس کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ آدمی کے مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے اجماع کو اسی طرح تسلیم کرے جس طرح سنت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ اسی تفہیم القرآن میں دیکھ سکتے ہیں کہ میں مختلف مسائل میں صحابہ کرامؓ کے اقوال نقل ______ اور پھر ان کے اقوال میں سے کسی قول کو اختیار کر کے اس کی تائید میں اپنی رائے بیان کرتا ہوں۔

کیا یہ سارا کام کسی ایسے فرد کا ہوسکتا ہے جو صحابہؓ کے معاملے میں منفی ذہنیت رکھتا ہو؟

یہ تو ہوئی سوال کے اس حصے کی وضاحت کہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں میرا مسلک کیا ہے۔ اب بعض ایسے معاملات کو لیجیے جن کے بارے میں تمام محدثینؒ، مفسرین اور مؤرخین کا ایک ہی ریکارڈ ہوسکتا ہے ______ اگر بعض ایسے واقعات جو احادیث میں

آئے ہیں یا جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے یا جو تاریخ سے ثابت ہیں تو محض ان واقعات کو بیان کرنا اگر ''گناہ'' ہے تو اس امت کے تمام محدثینؒ اور مؤرخینؒ اور مفسرین سب ''گناہگار'' قرار پاتے ہیں' کوئی نہیں بچتا۔ خود قرآن مجید میں صحابہ کرامؓ کی بعض غلطیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورہ جمعہ میں یہ ذکر کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کہ تاجروں کا ایک قافلہ آیا اور صرف بارہ صحابہؓ رہ گئے (بعض روایات میں یہ تعداد ۴۰ آئی ہے) باقی سارے کے سارے خطبہ چھوڑ کر قافلے کی طرف چلے گئے۔ یہ قرآن مجید کا بیان کیا ہوا واقعہ ہے اور حدیث وتفسیر کی کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جس میں سورہ جمعہ کی تفسیر میں اس واقعہ اور اس کی تفصیلات کو بیان نہ کیا گیا ہو۔ اگر اس چیز کا نام صحابہ کرامؓ پر نکتہ چینی ہے تو اس سے کون بچا ہے؟ سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ نے ابتدا کی اور اس کے بعد سارے محدثینؒ اور مفسرینؒ نے یہ کام کیا۔ اگر ان واقعات کو بیان کرنا، صحابہ کرامؓ کی تنقیص اور نکتہ چینی ہے تو مجھے بتایا جائے کہ قرآن مجید اور اس اُمت کے عظیم دینی، علمی اور تفسیری خزانے کے ساتھ کیا سلوک کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے؟

اب اس مسئلے کے ایک دوسرے پہلو کو لیجیے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ خود یہ چاہتا تھا کہ صحابہ کرامؓ پر تنقید کی جائے؟ اگر نہیں چاہتا تھا تو قرآن مجید میں ان واقعات کا ذکر کیوں کیا گیا کہ لوگ قیامت تک انھیں پڑھتے رہیں؟______ جنگ اُحد کے موقع پر جو پچاس صحابیؓ ایک خاص مقام پر متعین کیے گئے تھے اور وہ وہاں سے ہٹ گئے تھے، ان کا ذکر بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔ اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ حدیث اور تاریخ کی کون سی کتاب ہے جس میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ اب اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قرآن وحدیث میں ان واقعات کو بیان کرنے کا مقصد نکتہ چینی نہیں ہے بلکہ بنیادی طور پر یہ سمجھانا مقصود ہے کہ صحابہ کرامؓ کے معاملے میں ہم وہی غلطی نہ کر بیٹھیں جو انبیاء بنی اسرائیل کی اُمتیں کرتی رہیں کہ پہلے اپنے انبیاء کو خدا کی اولاد قرار دیا۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو چلڈرن آف گاڈ ______(Children of God) قرار دے لیا۔ قرآن وحدیث

ہمیں صحابہ کرامؓ کے احترام کے ساتھ ساتھ انھیں انسان سمجھنے کا شعور بخشتے ہیں اور ان میں اس بات کی تربیت دی گئی ہے تو اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ صحابہ کرامؓ سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی تو وہ قرآن وحدیث کے خلاف بات کہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب قرآن و احادیث میں مختلف مثالوں کا ذکر کیا گیا ہے تو ایک مسلمان ان کے برعکس موقف کس طرح اختیار کر سکتا ہے اور کس طرح سے کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر ان سے غلطی ہوئی تو اس کا بیان کرنا گناہ ہے؟ غلطی بھی ہوئی اور اسے بیان بھی کیا گیا، حدیثوں اور تفسیروں میں بیان کیا گیا اور ائمہ کرامؒ، محدثینؒ اور مفسرینؒ نے بیان کیا ـــــــ اب اگر ان حقائق کے باوجود کوئی شخص قرآن وحدیث کے اصل منشاء کو نظر انداز کر کے اسے صحابہ کرامؓ پر نکتہ چینی کرنا کہتا ہے تو اس کے صرف دو سبب ہو سکتے ہیں:

ایسی بات کہنے والے یا تو ان پڑھ ہیں اور نہیں جانتے کہ احادیث اور تفاسیر و فقہ میں کیا چیز موجود ہے۔

یا یہ لوگ جانتے تو سب کچھ ہیں مگر جان بوجھ کر غلط بات کہتے ہیں۔ مقصد مخالفت ہے اور فریق بنا رہے ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کو ـــــــ یعنی دل میں گرہ تو کسی اور چیز کی ہے اور اعتراض کچھ اور تصنیف کیا جا رہا ہے۔

آخری بات میں یہ کہتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجیے کہ ان حضرات کی ناراضی کی وجہ یہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت میں دوسروں کو گالیاں دینا جائز ہو جاتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کی خاطر ناراض ہونے والے شخص دوسرے شخص کی گھر کی خواتین پر تو حملے نہیں کر سکتا۔ اگر آدمی فی الواقع کسی شخص سے حق کی خاطر ناراض ہو تو وہ اس پر بہتان تو نہیں باندھ سکتا، اس کی عبارتوں میں اُلٹ پھیر تو نہیں کر سکتا، اس کے خلاف جھوٹے الزامات تو نہیں تصنیف کر سکتا ـــــــ اب اگر کوئی شخص یہ سارے کام بھی کرتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ کی خاطر یہ کام کر رہا ہے تو آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کی توہین کون کر رہا ہے؟

سوال: مصر کا چپکے سے اسرائیل کو اسلحہ دے کر بھاگ جانا ور روس، کا پھر مصر

کے اسلحہ کی کمی کو پورا کر دینا کیا یہ سازش نہیں ہے؟[1]

جواب: یہ کہنا کہ مصر نے چپکے سے اسلحہ دیا اور بھاگ گیا، صحیح نہیں ہے۔ مصر کسی آدمی کا نام تھوڑا ہی ہے جو بھاگ گیا تھا ـــــ صورتِ حال دراصل یہ ہے کہ جن ملکوں میں قوم کو دبا کر رکھا جاتا ہے اور انھیں اپنے گھر میں ظلم برداشت کرنے کی تربیت دی جاتی ہے، وہ ملک سے باہر جارحیت کے مقابلے میں بھی بڑے اطاعت گزار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ جو آمریت کسی قوم سے روا رکھتی ہے۔ جو لوگ اپنی قوم کے سینے پر چڑھے بیٹھے ہوتے ہیں، وہ دوسروں سے لامحالہ جوتے کھاتے ہیں کیونکہ ان کے ہاتھ آزاد ہی نہیں ہوتے، جو وہ دوسروں سے لڑ سکیں۔ ان کی تو ساری قوت اپنی قوم کو دبانے میں صرف ہو رہی ہوتی ہے ـــــ یہی برسوں سے مشرقِ وسطیٰ کے بعض ممالک میں بھی ہوتا رہا ہے۔ اب آپ اندازہ کیجیے کہ اخوان المسلمون اور مصر کے اندر کام کرنے والے جو غیر اشتراکی اور غیر ملحد عناصر تھے ان کے تو ایک ایک آدمی کے پیچھے سی۔ آئی۔ ڈی لگی ہوئی تھی اور ان کے پل پل کی خبر رکھتی تھی۔ لیکن دوسری طرف اسرائیل کی جنگی تیاریوں اور سکیموں کے بارے میں ان کی کوئی معلومات نہیں تھیں۔ آج وہ خود مانتے ہیں کہ ہمیں اس کا اندازہ نہیں تھا کہ اسرائیل اتنی طاقت پیدا کر چکا ہے کہ اس انداز کے ساتھ حملہ آور ہو رہا ہے۔ اب یہ نہ پٹتے تو اور کیا ہوتا۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ لوگ سب کچھ یونہی چھوڑ چھاڑ کر بھاگ آئے۔ اس شکست کے لئے برسوں سے تیاری ہوتی رہی ہے، فوج کو چونکہ اندرونِ ملک اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے، اس لئے اس میں خوشامدی اور جی حضوریوں کے لیے ترقی کے راستے کھلتے چلے گئے۔ نااہل اُوپر آتے گئے۔ ان کی تنخواہوں اور رینک وغیرہ میں وہ اضافے ہوئے جن کے وہ خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ اس چیز نے عیاشی کو عام کر دیا۔

---

[1] یہ سوال، جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے ہاتھوں عرب دنیا کی شکست کے حوالے سے تھا، جس میں نہ صرف مصر کے صحرائے سینا پر بلکہ اُردن کے حصے بیت المقدس (یروشلم) اور شام کی گولان پہاڑوں پر بھی یہودیوں نے قبضہ کرلیا تھا۔

رہا روسی امداد کا سوال تو اصل میں جہاں تک میں سمجھا ہوں' میرا خیال ہے کہ امریکہ اور روس کے درمیان اب دنیا باقاعدہ تقسیم ہوگئی ہے اور پورے سمجھوتے کے تحت ہوئی ہے، چین کے مقابلے میں اب چونکہ روس اور امریکہ کے درمیان ایک طرح کا سمجھوتہ ہے۔

امریکہ کو مسلمان ممالک میں روس کے اثر اور سوشلزم کے پھیلنے سے کوئی تشویش نہیں ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر سوشلزم پھیلے گا تو کم از کم اسلام کی جڑ تو کٹے گی، اور ظاہر بات ہے کہ انھیں بھی اسلام سے وہی دشمنی ہے جو چار پانچ سو برس پہلے عیسائیوں کو صلیبی لڑائیوں میں تھی۔ آج بھی اگر انھیں کمیونزم اور اسلام میں سے کسی کو ترجیح دینے کے لئے کہا جائے تو وہ کمیونزم کو ترجیح دیں گے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ جمہوریت ہمارے ملک میں ناکام ہوگئی ہے تو ہم اس کی بحالی کے لئے کیوں کام کریں۔ جبکہ یہ بھارت میں بھی خاص طور پر ناکام ہورہی ہے آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: یہ کہنا ہی غلط ہے کہ جمہوریت ہمارے ملک میں ناکام ہوگئی ہے ـــــــ پہلے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ جمہوریت نام کس چیز کا ہے؟

جمہوریت اس چیز کا نام ہے کہ ایک ملک کے باشندے خود اپنے معاملات طے کرنے کے مختار ہوں' اور ملک کے باشندوں کی جو رائے ہو ملک کا انتظام اس کے مطابق چلایا جائے۔ یہ ہے جمہوریت کا مفہوم۔

کیا یہ چیز اس ملک کے باشندوں کو حاصل ہے؟

آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان کا نظام حکومت ۱۹۳۵ء کے ایکٹ پر چل رہا تھا۔ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ اس تصور پر قائم تھا کہ یہ برطانوی پارلیمنٹ ہے' جو ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ گویا ہندوستان پر اقتدار اعلیٰ برطانوی عوام کا تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا اس ملک کے اندر برطانوی پارلیمنٹ کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ جو تھوڑی بہت خود مختاری یہاں دی گئی تھی وہ اس قسم کی تھی'

جس سے اصل فیصلے کے اختیارات کسی ایسی اسمبلی کو حاصل نہیں تھے جو اس ملک کے اندر انتخابات سے بنی ہو، بلکہ اصل فیصلے کے اختیارات وائسرائے کے ہاتھ میں تھے اور وائسرائے برطانوی پارلیمنٹ کے ماتحت تھا۔ اسی طرح صوبوں میں اصل فیصلے کے اختیارات گورنروں کے ہاتھ میں تھے، اور گورنر وائسرائے کے ماتحت تھے اور وائسرائے برطانوی پارلیمنٹ کا ماتحت تھا۔ اس تصور اور نظریے پر ۱۹۳۵ء کا ایکٹ مبنی تھا۔ جب پاکستان آزاد ہوا تو اس ایکٹ ہی کو ملکی دستور کی حیثیت سے Adopt کر لیا گیا اور جو اختیارات برطانوی پارلیمنٹ کی طرف سے پاکستان کے عوام کو منتقل ہوئے تھے۔ ان اختیارات کی امین دستور ساز اسمبلی بنی، یعنی برطانوی پارلیمنٹ کی جگہ اس دستور ساز اسمبلی نے لے لی تھی۔ باشندوں کی طرف ابھی اختیارات منتقل نہیں ہوئے تھے۔ دستور ساز اسمبلی جب تک دستور نہ بنا دیتی اس وقت تک اختیارات ملک کے باشندوں کی طرف منتقل نہیں ہو سکتے تھے۔

دستور ساز اسمبلی نے دستور بنانے کے فرض کی تکمیل میں مسلسل کوتاہی کی۔ ۱۹۵۶ء تک دستور نہیں بنا۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۶ء تک جس طرح آپ پہلے برطانوی پارلیمنٹ کی رعایا تھے۔ اس طرح اب اس دستور ساز اسمبلی کی رعایا بنے ہوئے تھے، کیوں کہ جو اختیارات برطانوی پارلیمنٹ کو حاصل تھے وہی اختیارات اس دستور ساز اسمبلی کو حاصل تھے اور اس نے یہ اختیارات سالہا سال تک اپنے ملک کے باشندوں کو منتقل نہیں کیے۔ انتقالِ اختیارات کا یہ پہلا مرحلہ ۱۹۵۶ء کے دستور کے ساتھ مکمل ہوا۔ لیکن ۱۹۵۶ء کے دستور کی حد تک بھی صرف نظری طور پر اختیارات آپ کی طرف منتقل ہوئے تھے، عملاً وہ اس وقت تک منتقل نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ ملک میں عام انتخابات نہ ہو جائیں۔ ان عام انتخابات کا مرحلہ آتا تو آپ اپنے ان اختیارات کو عملاً استعمال کرتے، یعنی ملک پر خود حکومت کرنے کے قابل ہوتے۔ لیکن قبل اس کے کہ عام انتخابات ہوتے اور ملک کے باشندے ان اختیارات کو استعمال کرتے جو ان کی طرف منتقل کیے گئے تھے ملک پر فوجی آمریت قائم ہو گئی اور مارشل لاء کے نفاذ کا اعلان کر دیا

گیا۔ اس طرح انتخابات روک دیے گئے اور وہ ساری طاقت جو برطانوی پارلیمنٹ سے دستور ساز اسمبلی کی طرف منتقل ہوئی تھی، اس آمریت کے ہاتھ میں چلی گئی۔ یعنی جس طرح پہلے آپ برطانوی پارلیمنٹ کے غلام تھے اسی طرح اب فوجی آمریت کے غلام بن گئے۔

۱۹۶۲ء تک کوئی آئین نہیں بنایا گیا اور ملک مارشل لاء کے تحت رہا۔ ۱۹۶۲ء میں جو دستور بنا اس میں تمام اختیارات صدر کے ہاتھ میں دے دیے گئے۔ عوام کی طرف منتقل نہیں کیے گئے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ۱۹۶۸ء تک یہ پورے بیس سال جو گزرے ہیں ان میں ایک دن بھی یہاں پر جمہوریت بحال نہیں کی گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ جب یہاں عملاً جمہوریت کا آغاز ہی نہیں ہونے دیا گیا تو اس کی ناکامی کا پروپگنڈا کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اسے یہاں کام کرنے کب دیا گیا ہے؟ یہاں جمہوریت قائم کب ہوئی ہے؟ اور کب اختیارات لوگوں کی طرف منتقل کیے گئے ہیں؟

جمہوریت کے ناکام ہونے کا جو ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے ذرا اس کو بھی دیکھ لیں۔

جمہوریت اس چیز کا نام ہے کہ ایک ملک کے باشندے اپنے اختیارات سے اپنے ملک کے معاملات کو چلائیں۔ اب ایک آدمی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ملک کے باشندے اپنے معاملات کے چلانے کے قابل نہیں ہیں اس لئے میں سارے ملک کے معاملات کو خود چلاؤں گا۔ یعنی لوگوں نے اسے یہ نہیں کہا ہے کہ تم ہماری طرف سے معاملات چلاؤ بلکہ اس نے خود ہی یہ دعویٰ کر دیا اور خود ہی سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ معاملے کو آپ ایک مثال سے سمجھیں۔ مثلاً پندرہ سولہ برس کا ایک لڑکا ہے جسے اپنے باپ کی طرف سے ایک بڑی میراث اور جائداد ملی ہے۔ اس کے باپ کے ملازموں میں کوئی منشی جی ہیں جو اس کے معاملات چلایا کرتے تھے۔ یہ منشی جی دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ لڑکا اپنی جائیداد سنبھالنے کے قابل نہیں ہے اس لئے میں اس کے سارے معاملات کو چلاؤں گا۔ چنانچہ منشی جی تمام اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ وہ اسے جائیداد میں کوئی کام نہیں کرنے دیتے۔ کسی قسم کا اختیار اس کے ہاتھ میں نہیں چھوڑتے اور عملاً اس کی

ساری جائیداد کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ منشی جی اپنے جیتے جی سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھیں تو کیا یہ نوجوان کبھی اپنے معاملات چلانے کے قابل ہو سکتا ہے؟ ______ وہ تو اسی وقت اس قابل ہو گا جب کہ اس کی جائیداد اس کے ہاتھ میں ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی معاملے میں غلطی کرے، نقصان اُٹھائے یا تکلیفیں جھیلے، لیکن اسی طرح وہ حالات کو سمجھے گا۔ اسی طرح وہ بہت کچھ سیکھے گا اور اپنے معاملات کو چلانے کے قابل ہو جائے گا۔ جمہوریت بھی اسی طرح اپنے معاملات کو خود سمجھنے اور تجربات سے سیکھنے کا نام ہے۔ یعنی Learing by experience۔ ایک قوم تجربات سے آہستہ آہستہ یہ بات سیکھ جاتی ہے کہ وہ اپنے معاملات کو کس طرح چلائے ______ لیکن اگر منشی جی عمر بھر جائیداد پر قابض رہیں تو وہ لڑکا بوڑھا ہو جائے گا مگر اپنے معاملات کو چلانے کے کبھی قابل نہ ہو سکے گا، اور اس کے بعد، قبل اس کے کہ منشی جی کا انتقال ہو وہ اپنے بیٹے کو بتائیں گے کہ اب یہ معاملات کو سنبھالے گا۔ یا ممکن ہے اپنے کسی بھائی بند کے حوالے کر دیں یا ان کے دفتر میں کوئی اور کلرک صاحب منتظر ہوں اور وہ قابض ہو جائیں اور سب کا ''استدلال'' یہ ہو کہ یہ لڑکا کوئی تجربہ نہیں رکھتا، اس لئے ہم جائداد کو سنبھالیں گے تو اس طرح وہ لڑکا ہی نہیں بلکہ اس کی اولاد بھی کبھی اس قابل نہیں ہو سکے گی کہ اپنی جائیداد کو سنبھال سکے۔ اسے کبھی تجربہ ہی حاصل نہیں ہو گا کیونکہ اس کے ہاتھ میں کوئی اختیارات ہی نہیں تھے۔

چنانچہ جمہوریت کی ناکامی کا دعویٰ فقط ایک مکاری ہے جو ایک ملک کے باشندوں کے حقوق پر ڈاکہ مارنے کے لئے کی جاتی ہے۔ ورنہ ظاہر بات ہے کہ کوئی قوم بھی جب آزاد ہوتی ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ پہلے دن سے اپنے معاملات کو چلانے کے کام میں ماہر ہو جائے۔ وہ قوم اپنے اختیارات کو انتخابات کے ذریعے Exercise کرتی ہے۔ انتخابات میں وہ دھوکا کھا سکتی ہے۔ غلط قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اپنے معاملات دے سکتی ہے۔ چار پانچ سال تک غلط قسم کے لوگ معاملات کو چلاتے رہتے ہیں۔ قوم اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی رہتی ہے کہ جن لوگوں کو ہم نے چنا تھا وہ ہمارے ساتھ کیا

زیادتیاں کر رہے ہیں۔ دوسرے انتخابات کی نوبت آتی ہے تو قوم انھیں اُٹھا کر پھینک دیتی ہے اور دوسرے لوگوں کو آگے لاتی ہے۔ وہ بھی اگر قوم کی اُمنگوں کا ساتھ نہیں دیتے تو قوم تیسرے انتخابات میں جا کر زیادہ بہتر لوگوں کو آزماتی ہے۔ اس طرح اسے جانچنے اور پرکھنے کا موقع ملتا رہتا ہے مگر شرط یہی ہے کہ قوم کو آزادی حاصل رہے، اس کے بنیادی حقوق محفوظ رہیں۔ حالات لوگوں کے سامنے آتے رہیں، اخبارات آزاد ہوں، پبلک پلیٹ فارم آزاد ہو، اور لوگ اپنے ملک کے حالات سے باخبر ہوتے رہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ وہ اس بات کو سیکھتے جاتے ہیں کہ کن لوگوں پر وہ اعتماد کریں۔ اور کیسے لوگوں کے ہاتھ میں اپنے معاملات دیں —— یہ ہے ایک قوم کی زندگی میں جمہوریت کی کامیابی کا راستہ۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی قوم آزاد ہوتے ہی پہلے دن جمہوریت کو بڑی کامیابی کے ساتھ چلانے لگے۔ جس طرح قومی خوشحالی کے لیے دو یا تین پنج سالہ منصوبوں کی تکمیل شرط ہوتی ہے اسی طرح اگر جمہوریت کی کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لئے ایک قوم کو دو تین آزادانہ انتخابات کے مراحل سے گزرنا پڑے تو اس میں کیا ہرج ہے! اور اگر فرض کیجیے کہ اس دوران میں ملک کے حالات خراب بھی ہو جائیں تو ملک کے کسی ملازم کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ یکا یک ملک پر قابض ہو جائے۔ نوکر ہے تو نوکری کرے، ملک کا مالک بننے کا اسے کیا حق ہے!

لاہور میں نوجوانوں کے ساتھ سید مودودیؒ رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس سوال و جواب ____ ۱۲ اگست ۱۹۶۸ء

سوال: آج سے پچیس تیس سال قبل برصغیر کے حالات کے مطابق تحریک اسلامی نے اپنا لائحہ عمل طے کیا اور کام کا آغاز کر دیا، لیکن اس دوران میں حالات مسلسل بدلتے چلے گئے حتیٰ کہ آج بیماری کی نوعیت ہی بدل چکی ہے۔ موجودہ رجحانات اور میلانات کے پیشِ نظر دعوتِ اسلامی کا کام کس طرح کرنا چاہیے؟

جواب: یہ ایک ایسی روداد ہے۔ اگر تفصیل سے بتائی جائے تو پھر صبح کی نماز تک آپ حضرات کو بیٹھنا پڑے گا۔ البتہ میں مختصر طور پر بتاؤں گا کہ بدلتے ہوئے حالات میں ہم نے کیا طریقِ کار اختیار کیا۔

جس وقت ہم نے اس کام کو شروع کیا تھا تو اس وقت کے حالات کو دیکھ کر اور سمجھ کر کیا تھا۔ اسی طرح جیسے جیسے حالات میں تغیر بپا ہوتے گئے۔ ہم اپنے کام کے طریقوں میں تغیر کرتے رہے۔ یعنی ہم آنکھیں بند کر کے نہیں چلتے رہے۔ ہم نے زندہ انسانوں کی طرح کام کیا ہے ”گراموفون بن کر نہیں رہ گئے۔ اور نہ دعوتِ اسلامی کا کام آنکھیں بند کر کے انجام دیا جا سکتا ہے۔ ہم نے اپنے نصب العین کو ہر حال میں برقرار رکھتے ہوئے کام کے طریقوں کو کس طرح بدلا ہے، اس کو اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں تو میری ۱۹۵۷ء کی تقریر ”تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل“ غور سے پڑھیں اس سے آپ کی سمجھ میں یہ بات بخوبی آ جائے گی کہ حالات کے بدلنے کے ساتھ کام کے طریقے کو کیسے بدلا جاتا

ہے اور یہ چیز بجائے خود اس کام کیلئے کس قدر ضروری ہوتی ہے جس کے لئے اللہ کے بندے اپنی زندگیاں وقف کر چکے ہوتے ہیں۔

سوال: آپ نے جن نکات کو سامنے رکھ کر کام کا آغاز کیا تھا' ان میں آپ کو کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ہے؟

جواب: جو چیز ہمارے پیشِ نظر تھی اور اس کے مطابق ہم نے خدا کے فضل سے جو کام کیا ہے، اس کے نتائج ہمارے لئے قابل اطمینان ہیں۔ جن حالات میں ہم کام کرتے رہے ہیں' ان میں اس سے بہتر نتائج کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی بلکہ زیادہ سے زیادہ جن نتائج کی ہم توقع رکھتے ہیں خدا کے فضل سے نتائج اس سے بھی کچھ زیادہ برآمد ہوئے ہیں۔ میں ان چیزوں کو اس لئے بیان نہیں کیا کرتا کہ ان چیزوں کے بیان کرنے میں بڑی حد تک کچھ اپنی ہی تعریف و توصیف ہو جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس سے جدوجہد پر بھی اثر پڑنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ جو لوگ کام کر رہے ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اب تو بہت کام ہو گیا ہے۔ اس سے ان کی مزید جدوجہد ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس سلسلے کی تفصیلات بیان نہیں کیا کرتا۔ لیکن میرے سامنے وہ حالت بھی ہے جو ۱۹۲۴ء میں تھی، وہ حالات بھی ہیں جو ۳۳-۱۹۳۲ء میں تھے اور وہ حالت بھی ہے جو آج ہے۔ اس پوری مدت میں چونکہ میں خود کام کرتا رہا ہوں اور آنکھیں کھول کے کام کرتا رہا ہوں اس لئے دیکھتا رہا ہوں کہ مسلمان معاشرہ کن حالات سے گزرتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے سارے حالات دیکھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ۱۹۲۴ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک کا زمانہ ایسا گزرا ہے جس میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسلام مسلمانوں کے ہاتھوں میں ختم ہونے والا ہے۔ علانیہ بڑی جرأت کے ساتھ گمراہی کی تحاریک اُٹھ رہی تھیں۔ فتنہ جڑ پکڑ رہا تھا اور پھیل رہا تھا ______ اور اب کے مقابلے میں کام کرنے والوں کے ہتھیار کند ثابت ہو رہے تھے، وہ ان کا مقابلہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ مختلف حقائق کو دیکھ کر ہمیں اس بات کا پورا اندازہ ہو چکا تھا کہ جن ہتھیاروں سے ان تحریکوں کا مقابلہ کیا جا رہا ہے وہ ہتھیار کس حد تک چل سکیں گے اور کس حد تک مقابلہ کر

سکیں گے ______ ان حالات میں ہم تحریک اسلامی کو لے کر چلے اور یہ خدا کا فضل ہے کہ اسلام کے زاویہ نگاہ سے حالات میں مثبت تبدیلیاں بھی رونما ہوئی ہیں۔

سوال: آپ کو تحریک اسلامی کے سلسلے میں شروع شروع میں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

جواب: اگر آپ ''رسائل و مسائل'' کے چاروں حصوں کو پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہماری مشکلات کی نوعیت کیا ہے۔ ہماری بعض مشکلات وسائل کی کمی کے باعث ہیں۔ کچھ مشکلات معاشرے کے مختلف عناصر کی طرف سے پیدا کی جاتی ہیں جو دعوتِ اسلامی کے کام میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ قریب قریب ان سب کا ذکر آپ ''رسائل و مسائل'' میں دیکھ سکتے ہیں۔ کچھ مشکلات حکومتوں کی طرف سے پیدا کی جاتی رہی ہیں۔ انگریزی حکومت کے زمانے میں مشکلات کی نوعیت کچھ اور تھی' پاکستان بننے کے بعد کچھ اور رہی ہے۔ اور اس عرصہ میں جو حکومتیں بھی بنی ہیں ان میں سے کوئی حکومت بھی کبھی ایسی نہ تھی جو ہمارے وجود کو برداشت کرنے والی ہو۔

سوال: کیا آپ تحریک اسلامی کا کام کرتے ہوئے کبھی بہت زیادہ پریشان بھی ہوئے؟ اگر کبھی ایسا ہوا ہے تو کس موقع پر ہوا اور کیوں؟

جواب: میں کچھ اس مزاج کا آدمی ہوں کہ مجھے پریشانی ذرا کم ہی لاحق ہوا کرتی ہے۔ تاہم صرف ایک وقت ایسا تھا کہ جس میں پریشانی کا غلبہ ہوا اور وہ زمانہ تھا ۱۹۵۳ء کا ______ اس موقع پر جس غلط طریقے سے ختم نبوت کی تحریک اُٹھائی گئی اور جس طرح سے اس تحریک کے اُٹھانے والے خود اس کے کچلے جانے کا ذریعہ بنے، اور پھر اس کی آڑ میں جس طرح پورے ملک میں اسلام اور اسلامی کام کرنے والوں کو بدنام کرنے کے لئے ایک طوفانِ عظیم کھڑا کر دیا گیا، اس نے مجھے اس لئے پریشانی میں مبتلا کیا کہ اس مہم کی زد میں اسلام اور اسلامی آئین آ رہا تھا۔ میں ان دنوں جیل میں تھا۔ جماعت اسلامی کے جتنے بھی نمایاں کام کرنے والے رفقاء تھے، وہ بھی جیل میں تھے۔ ہمیں کچھ خبر نہیں تھی

کہ جماعت ان حالات میں کیا کام کر رہی ہے اور کیا کر سکتی ہے۔ ہم بالکل تاریکی میں تھے۔ اور ہمارے پاس جیل میں وہی اخبارات پہنچتے تھے جن کے ذریعے سے اسلام اور اسلامی نظام کے خلاف شدید پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ یہ ایک ایسا دور تھا جس میں مسلمانوں کی اس عظیم جدوجہد پر پانی پھر رہا تھا جو اُنھوں نے اسلامی دستور کے مطالبے کے سلسلے میں کی تھی۔ اُس دور میں مجھے بہت پریشانی لاحق ہوئی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ پھر کبھی پریشانی لاحق نہیں ہوئی۔

سوال: کیا کسی تحریک کے شروع میں ہی اس تحریک کے روحِ رواں لوگوں کا نکل جانا، اس تحریک کی ناکامی کا ثبوت نہیں ہے؟

جواب: اصل بات یہ ہے کہ جب تک کچھ لوگ تحریک میں رہتے ہیں تو اس وقت اس تحریک کے مخالفین انھیں ادنیٰ اہمیت بھی نہیں دیتے۔ لیکن تحریک سے نکلتے ہی وہ روحِ رواں قرار دے دیے جاتے ہیں۔ ورنہ آپ خود غور کیجیے کہ ان کے نکلنے کے بعد جماعت اسلامی کو کیا ضعف پہنچا؟ اگر وہی اصل میں اس گاڑی کو چلانے والے انجن تھے تو ان انجنوں کے ہٹ جانے کے بعد تحریک کی گاڑی کھڑی ہو جانی چاہیے تھی۔ مگر تحریک کی تاریخ گواہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ جماعت پر مسلسل ابتلاء کے دور آئے۔ چار سال تک جماعت مارشل لاء میں پابند رہی۔ پھر نو ماہ تک دوبارہ اس کو Ban کیا گیا۔ اس کے باوجود جماعت اسلامی اپنے نصب العین کو لئے آگے بڑھ رہی ہے۔ کسی کے نکلنے نہ نکلنے سے کیا فرق واقع ہوا ہے؟ جماعت سے نکلتے ہی اگر کسی شخصیت کو بڑی شخصیت بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہی ایک آدمی تھا، یہ نکل گیا۔ اب جماعت میں باقی کیا رہ گیا ہے تو ایسے لوگوں کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ نکلنے والوں نے نکلنے کے بعد کیا بنا کر دکھایا ہے اور ٹھوس حقائق کس حد تک اس پروپیگنڈے کی تصدیق کرتے ہیں۔

سوال: ایک اسلامی حکومت آج کس حد تک اسلامی نظامِ حیات کو اپنا سکتی ہے؟

جواب: اس سوال میں ''کس حد تک'' کے الفاظ بے معنی ہیں۔ اسلامی حکومت اس حکومت کا نام ہی نہیں ہے جو اسلام کو پوری طرح نافذ نہ کرے۔ ''کس حد تک'' کا تصور یہ معنی رکھتا ہے کہ اسلامی نظام ''کسی حد تک'' اپنایا جا سکتا ہے اور ''کسی حد تک'' نہیں۔

اگر میں یہ مان لوں کہ اسلامی نظام اپنایا نہیں جا سکتا تو میں آج ہی اس کام سے دستبردار ہو جاؤں ______ میں اس وجہ سے اس کو مانتا ہوں اور اس کے لئے جدوجہد کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک ہر زمانے میں اس کو اپنایا جا سکتا ہے۔ یہی ایک مسلمان کا ایمان ہونا چاہیے۔

سوال: چند روز قبل مصر کے اخبار ''الاھرام'' کے حوالے سے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ اب عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ کا آغاز مصر کی طرف سے ہوگا۔ کیا اس کی توقع کی جا سکتی ہے؟

جواب: مصر کے بارے میں یہ بات آپ سمجھ لیں کہ جس وقت وہاں فوجی انقلاب برپا ہوا اس کے بعد مسلسل ہم یہ چیز دیکھ رہے ہیں کہ وہاں سب سے بڑا ہتھیار پروپیگنڈے کو سمجھا گیا ہے۔ یعنی فوجی طاقت کو بنانے اور اپنی فوجوں کو تیار کرنے کی انھوں نے کوئی فکر نہیں کی ہے اور وہ تمام دوسرے ذرائع، جن سے کوئی قوم اُٹھا کرتی ہے، ان سب سے انھوں نے غفلت برتی ہے لیکن اپنے پروپیگنڈے کے ہتھیاروں کو انھوں نے بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ مصر کا ''صوت العرب'' دنیا کے بہت طاقتور ریڈیو اسٹیشنوں میں سے ہے۔ اس کے علاوہ مصر کے پروپیگنڈے کے دیگر ذرائع دنیا کی کسی دوسری قوم کے مقابلے میں فروتر نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اصل طاقت پروپیگنڈا ہے۔ لیکن انھوں نے اسی پروپیگنڈے کے ذریعے سے مار کھائی ہے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں ان کی شکست کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ پروپیگنڈا ہے۔ اس جنگ سے پہلے ناصر صاحب بہت زور شور سے اعلان کرتے رہے کہ ہم اسرائیل کا وجود ختم کر دیں گے۔ آپ ۱۹۶۷ء کے اخبارات کے فائل نکال کر دیکھ لیں، ان کی وہ تقریریں اب بھی موجود ہیں جن میں انھوں نے اس طرح کے دعوے کئے تھے۔ اب اس کا مدعا اس کے سوا کیا تھا کہ

عرب قوم یہ سمجھے کہ بھئی کیا لاجواب لیڈر ہمیں ملا ہے جو اسرائیل کے وجود کو ختم کر دے گا۔ پھر جب جنگ شروع ہوئی تو اس وقت مصر کے ریڈیو سٹیشن سے عرب فوجوں کی ایک ایک نقل و حرکت براڈ کاسٹ کی گئی تا کہ عربوں کی ہمت بندھی رہے اور انھیں یہ معلوم ہوتا رہے کہ فلاں جگہ سے اتنی فوج آ رہی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب فوجوں کی نقل و حرکت کی پل پل کی خبریں اسرائیل کو خود عربوں کے ریڈیو سٹیشن سے ملتی رہیں کہ عرب کتنی طاقت لے کر آ رہے ہیں، اور بعض اوقات جتنی فوج آ رہی تھی اس سے زیادہ بیان کی گئی۔ اس کے نتیجے میں اسرائیل نے اور زیادہ طاقت سے حملہ کیا۔ یہ چیز منجملہ ان اسباب کے ہے جن سے عربوں نے شکست کھائی۔

افسوس کہ اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا گیا اور پروپیگنڈے کی یہ مہم اسی طرح جاری ہے۔ اب پھر عربوں کو یہ یقین دلایا جا رہا ہے کہ مصر اسرائیل پر حملہ کرنے والا ہے —— اسرائیل ہمیشہ اس کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں اُس نے یہ فائدہ اُٹھایا کہ ادھر ناصر صاحب کے منہ سے یہ نکلا کہ ہم اسرائیل کے وجود کو ختم کر دیں گے، ادھر اسرائیل نے تمام مغربی ممالک میں اور امریکہ میں اس بات کی بڑے پیمانے پر اشاعت کی کہ دیکھیے ہماری اس چھوٹی سی ریاست کو اتنے بڑے عرب ملک جمع ہو کر ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے اُس نے ان سب کی ہمدردیاں حاصل کیں۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ میں اس کے پروپیگنڈے کی بدولت عام خیال یہ تھا کہ اسرائیل سخت مظلوم ہے اور عرب ممالک اس پر حملہ کر کے اسے ختم کرنا چاہتے ہیں اور وہ نقشے پر یہ دکھا دیتے کہ یہ دیکھیے ادھر اسرائیل ایک ذرا سا ملک ہے اور ادھر عظیم الشان عرب ممالک ہیں —— اب پھر وہی حماقت کی جا رہی ہے تا کہ اسرائیل مزید مدد اور ہمدردیاں حاصل کر لے کہ اب عرب ممالک پھر اس پر حملہ کرنے والے ہیں —— درآنحالیکہ آپ خود اندازہ کر لیجیے کہ ۵۶ء کے بعد سے ۱۹۶۷ء تک گیارہ سال کی مدت میں ان لوگوں نے جنگ کی جو تیاری کی تھی، وہ چار دن کے اندر معلوم ہو گئی تھی۔ اب جون ۱۹۶۷ء سے اگست ۱۹۶۸ء تک زیادہ سے زیادہ ۱۴ مہینے میں اُنھوں نے کیا تیاری کی ہوگی جس سے وہ اب حملہ کریں

گے۔ پھر بار بار یہ خبریں دنیا میں آ چکی ہیں کہ روس نے مصر کو جتنے ہتھیار دیے ہیں وہ سب دفاعی مقاصد کے لئے ہیں جارحانہ جنگ کے لئے نہیں ہیں۔ وہ خود بھی یہ اعلان کر چکا ہے کہ ہم مصر کو اپنے دفاع کے لئے تیار کر رہے ہیں، جارحانہ حملے کے لئے نہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو اس طرح کے اعلانات کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے کہ اب مصر حملہ کرنے میں پہل کرے گا ____ اس سے فائدہ اگر کسی کو ہو سکتا ہے تو صرف اسرائیل کو کہ وہ پہلے کی طرح دوسرے ممالک کی ہمدردیاں اور اُن کی مدد حاصل کرلے۔

سوال: اسلامی نظام سب سے پہلے کس ملک میں آنے کے امکانات ہیں؟

جواب: آپ اس چکر میں نہ پڑیں کہ کس ملک میں آنے کے امکانات ہیں بلکہ کوشش کریں کہ اسی ملک میں آئے۔

گردے کے آپریشن کے سلسلے میں سید مودودیؒ لندن گئے۔ ان کی روانگی سے قبل کراچی میں یہ نشست ہوئی ______ اگست ۱۹۶۸ء

سوال: مزدوروں کے مسائل حال کرنے کے سلسلے میں جماعت نے کیا کیا ہے؟ صورت حال یہ ہے کہ تخریبی اور اشتراکی عناصر مزدوروں میں اثر ونفوذ بڑھا رہے ہیں۔ اس کا تدارک کیسے ہوگا؟

جواب: اس سے قبل ہم مرکزی طور پر مزدوروں کے مسائل حال کرنے کی کوشش کر رہے تھے اب یہ کام ہم نے مقامی جماعتوں کے سپرد کر دیا ہے تاکہ وہ ہر جگہ کے مخصوص حالات کے مطابق مقامی طور پر مزدوروں کے لئے کام کریں۔ ہمارے سامنے کچھ مشکلات ایسی تھیں جن کی بنا پر مرکزی ادارہ کا قیام مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اصل مشکل یہ ہے کہ ہمارے حکمران بھی اور صنعت کار و سرمایہ دار بھی یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے مزدور تخریبی عناصر کے ہاتھ میں ہی رہیں تاکہ وہ وقتاً فوقتاً مزدوروں کو پٹوادیا کریں۔ اس تکنیک کا مقصد یہ ہے کہ محنت کار کے مسائل کبھی حل نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ یہی ہو رہا ہے، اس کے مقابلے میں جو لوگ اخلاص کے ساتھ مزدوروں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ان کی نگاہ میں بری طرح کھٹکتے ہیں۔ گویا کمیونزم ان سرمایہ داروں کو ناگوار نہیں ہے، کیونکہ وہ ان کے کام آتا ہے اور اسلام ناگوار ہے کہ وہ مسائل کا حقیقی حل سامنے لاتا ہے جو انھیں پسند نہیں۔ کمیونزم اور سوشلزم کا پروپیگنڈا کرنے والوں کے لئے کھلی چھٹی ہے، کمیونسٹوں کی حوصلہ افزائی بھی کی جا رہی ہے اور ان کا لٹریچر بھی لایا اور پھیلایا جا رہا ہے،

یہ لٹریچر آج پرائیویٹ، سرکاری اور نیم سرکاری ہر نوع کے اداروں سے دستیاب ہے۔ ابھی حال ہی میں باضابطہ طور پر ڈھاکہ یونیورسٹی میں ماؤزے تنگ کی کتابیں بیس ہزار کی تعداد میں بھیجی گئیں۔ اب یہ بات کون نہیں جانتا کہ ماؤ کی کتابیں طلباء کو کیا سکھا رہی ہیں، ان کو سکھایا جا رہا ہے کہ انقلاب کبھی سیدھے طریقے اور آئینی ذرائع سے نہیں آتا۔ انقلاب آتا ہے تو خون خرابے، مار دھاڑ اور تخریبی کارروائیوں سے آتا ہے۔ یہ ہے وہ فکر جسے شکریہ کے طور پر قبول کیا جا رہا ہے اور نئی نسل میں پھیلایا جا رہا ہے! اب آپ ہی بتائیے کہ جہاں اس طرح نادانوں سے سابقہ پیش آئے وہاں کیا کیا جائے۔

ہم نے تجربات کی روشنی میں محسوس کیا ہے کہ اگر محنت کاروں کے سلسلہ میں مرکزی طریقے پر کام کیا جائے تو الجھنیں بہت ہوں گی اور کام نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے ہم نے یہ کام مقامی جماعتوں کے سپرد کر دیا ہے تا کہ وہ حالات کا براہ راست مطالعہ کر کے قدم اٹھائیں۔ اللہ تعالیٰ جب بھی بہتر حالات پیدا کرے گا تو انشاء اللہ مرکزی ادارہ کا قیام بھی عمل میں لایا جائے گا۔'' اس سے قبل جماعت کے جو صاحب مزدوروں کے لئے کام کر رہے تھے، ان کو جب گرفتار کیا گیا اور عرصے تک قلعہ میں نظر بند رکھا گیا، تو انھوں نے نظر بندی کے دوران میں ایک دن سی آئی ڈی کے ایک افسر سے پوچھا کہ میں نے کونسا غیر آئینی کام کیا ہے جس کی بنا پر مجھے نظر بند کر دیا گیا ہے۔'' اس پر ان سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ ''تم مزدوروں میں کمیونسٹوں کے کام میں رکاوٹ بنتے ہو اور یہ چیز ہمیں پسند نہیں ہے۔''

سوال: چیکوسلواکیہ کے حالیہ واقعات سے کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کیا ان سے سوشلزم کا نظام عریاں ہو کے سامنے نہیں آ گیا؟

جواب: عریاں تو وہ پہلے ہی تھا۔ لباس تو پہلے بھی سوشلزم کے تن پر کبھی نہ تھا۔ حقیقت یہ ہی کہ انسان کے خلاف شیطان کمیونزم سے زیادہ خطرناک حربہ آج تک نہیں لا سکا ہے۔ کمیونزم سامراج کی بدترین شکل ہے اور اس لحاظ سے امریکہ اور روس کا سامراج ایک ہی ہے۔

جہاں تک چیکوسلواکیہ کے موجودہ حالات کا تعلق ہے تو اس بات کو آپ اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ روس مشرقی یورپ میں ہٹلر (جرمن نازی آمر) کا وارث ہے، روس نے علاقے کو ہٹلر کے قبضے سے اس لئے آزاد نہیں کرایا تھا کہ یہاں جمہوریت پھلے پھولے، بلکہ اپنی کالونی بنانے کے لئے ہٹلر کو یہاں سے نکالا تھا۔ اس کی نظر میں یہاں کے باشندوں کی کوئی آزادانہ حیثیت سرے سے ہے ہی نہیں، روس نے اس پورے علاقے پر اپنا اقتدار جمانے کے لئے یہاں کمیونسٹ پارٹیوں کو اپنا ایجنٹ بنایا۔ اب جب بھی کوئی کمیونسٹ پارٹی روس کی مرضی کے خلاف چلے گی اور اپنی قوم کے مفاد کے لئے کام کرنا چاہے گی، روس کی فوجیں اسی طرح وہاں داخل ہوں گی جیسے وہ چیکوسلواکیہ میں داخل ہوئی ہیں اور اسی طرح پرانے ایجنٹوں کو ہٹا کر نئے ایجنٹ لا کر کھڑے کر دیے جائیں گے۔ یہی مشرقی جرمنی میں ہوا۔ یہی پولینڈ اور ہنگری میں ہو چکا ہے، اور اب یہی کچھ چیکوسلواکیہ میں ہو رہا ہے۔

ایک بات اس سلسلہ میں اور سمجھ لیجیے، وہ یہ کہ چیکوسلواکیہ ان ممالک میں سے ہے جنھوں نے اسرائیل کے قیام سے لے کر آج تک اُس کے ہر اقدام کی کھل کر حمایت کی۔ یوں تو پورے اشتراکی بلاک نے اسرائیل کی حمایت کی اور اس کے قیام میں امریکہ اور برطانیہ کے دوش بدوش شریک رہے مگر چیکوسلواکیہ نے تو اسرائیل کی حمایت اعلانیہ کی۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے گھر پر جب ڈاکہ پڑے تو وہ زندہ باد کے نعرے لگائیں اور جب اُن کے گھروں پر پڑے تو ہم ماتم کیوں کریں؟ ہمارے لئے تو دونوں سامراج برابر ہیں۔ رسوائی امریکہ کے حصے میں آئے یا بدنامی روس کی ہو، ہمارے لئے ان کی نوعیت ایک ہے۔ ہم تو مخالف ظلم کے ہیں۔ ظلم جہاں بھی ہو اور جس صورت میں بھی ہو قابلِ مذمت ہے۔ اس لحاظ سے یہ تازہ واقعات بھی قابلِ افسوس ہیں۔

”یو کے اسلامک مشن“ برطانیہ کی پانچویں سالانہ کانفرنس کے دوران یہ نشست ہوئی ـــــ ستمبر ۱۹۶۸ء

سوال: کیا ہمیں غربت و افلاس کو دور کرنے کے لئے‘ یہودیوں کے طرز پر ”قبوت“ (Kibbutz) بنانے چاہئیں۔

جواب: یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ دوسرے لوگ جو طریقے اختیار کریں مسلمان بھی انھیں اپنائیں۔ یہودیوں نے جو ”قبوت“ آباد کیے تھے وہ صرف اسرائیل کے وسائل پر مبنی نہیں تھے بلکہ دنیا بھر کے یہودی انھیں مالی مدد پہنچاتے رہے۔ خود اسرائیلی بجٹ ہی فلسطین کے وسائل پر منحصر نہیں ہے۔ جتنی رقم انھیں فلسطین سے حاصل ہوتی ہے اس سے دس گناہ باقی یہودی دنیا مہیا کر رہی ہے۔ ہمارا اصل مسئلہ غربت اور افلاس نہیں ہے بلکہ جو چیز‘ مسلمانوں کے لئے مہلک ہے وہ یہ ہے کہ ان میں اسلامی روح ختم ہو جائے یا سرد پڑ جائے۔ نہ تو وہ پورے کافر بنیں کہ کافرانہ تہذیب اپنا کر ترقی کر سکیں اور نہ وہ مسلمان رہیں کہ اسلامی نظام کی برکتوں سے فیضیاب ہو سکیں۔ ہمارے تمام مسائل کا اصل سبب اسلامی اخلاق کا فقدان ہے۔ اسلامی اخلاق نہ ہونے سے ہمارے وسائل بھی ہمارے کام نہیں بلکہ ہمارے دشمنوں کے کام آ رہے ہیں۔

سوال: آپ کسی ملک میں برسر اقتدار آ جائیں تو ملک کو سائنٹیفک ترقی دینے کے لئے آپ کے پاس کیا پروگرام ہے؟

جواب: ایک نظریاتی تحریک کو معاشرے کے تمام افراد کے ذہنوں کو اپنے خیالات کے

مطابق ڈھالنا ہوتا ہے، معاشرے میں ہر طرح کے لوگ صنعت کار، سائنسداں، ڈاکٹر اور فلاسفر موجود ہوتے ہیں، انھیں ایک نصب العین دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہی لوگ جو پہلے نظامِ کفر کے لئے کام کر رہے ہوتے ہیں اسلام کے لئے کام کرنا شروع کر دیں گے۔

ایک اور سوال کے جواب میں مولانا نے ارشاد فرمایا:

جماعت اسلامی نے جس مقصد کو سامنے رکھ کر کام شروع کیا تھا اس میں اسے کافی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ اگرچہ ہم پاکستان میں اسلامی نظام کو عملاً برپا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں لیکن پھر بھی ہم نے اُس کے لئے کافی حد تک زمین ہموار کر لی ہے۔ جماعت اسلامی اور بعض دیگر جماعتوں اور افراد نے اس وقت تک جو کام کیا ہے اُس کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں کسی شخص کے اندر یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ غیر اسلام کی دعوت دیتے ہوئے لوگوں کی تائید اور حمایت حاصل کر سکے۔ اگر کوئی غیر اسلام کا کام کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی اسلام کا نام لینے پر مجبور ہے۔ وہاں سوشلزم بھی ''اسلامی'' کہہ کر سامنے لایا جاتا ہے جبکہ دوسرے مسلمان ممالک میں اس کی ضرورت بھی نہیں محسوس ہوتی۔ ان ممالک میں کھلم کھلا غیر اسلامی نعرے اور پروگرام اُٹھتے ہیں بلکہ اسلام کا مذاق اُڑانے کی جسارت کی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کسی کو ایسا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ دوسرا کام جو اس وقت ہم نے کیا ہے کہ تمام باشندوں پر ہم نے اسلامی نظام کا تصور واضح کر دیا ہے۔ لوگ اچھی طرح جان گئے ہیں کہ اسلامی نظام میں معیشت، معاشرے، سیاست اور اخلاق کے کیا معنیٰ ہیں۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے ہمارے بڑے بڑے اہلِ علم صرف چند قضائے شرعیہ کے اجرا اور شیخ الاسلامی کے قیام کو ہی اسلامی نظام کا آخری مقصد سمجھتے تھے مگر اب نئی نسل تک کو اسلامی نظام کی تفصیلات بڑی حد تک معلوم ہو گئی ہیں۔

سوال: پاکستان میں اشتراکیت کی نشر و اشاعت کو روکنے کے لئے جماعت اسلامی کیا کر رہی ہے؟

جواب: جماعت کے وسائل قلیل ہیں مگر پھر بھی ہم اپنے لٹریچر کے ذریعے اس کا بخوبی مقابلہ کر رہے ہیں۔ پاکستان میں اس کے کوئی آثار نہیں ہیں کہ اشتراکی انقلاب برپا ہو۔ اس معاملے میں جماعت کو یہ مشکل درپیش ہے کہ اشتراکی لٹریچر کو پھیلانے کی کھلی چھٹی ہے اور جماعت کے لٹریچر کے پھیلنے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جارہی ہیں۔"

سوال: غیر مسلم ممالک میں مسلم خواتین کو پردے کے احکامات کی تعمیل کرنی چاہیے یا نہیں؟

جواب: مسلم خواتین کو بالکل اسی طرح غیر مسلم ممالک میں پردہ کرنا چاہیے جس طرح مسلم ممالک میں کیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں کسی رعایت یا ہچکچاہٹ کی کوئی گنجائش نہیں۔ دنیا میں وہی قوم عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے جو اپنے اصولوں پر فخر کر کے ان پر کاربند ہو اور کسی احساس کہتری میں مبتلا نہ ہو۔ ورنہ آپ کسی ایک مسئلے میں "مصالحانہ" رویہ اختیار کر کے اپنے اصول کو ترک کریں گے تو پھر آپ کا کوئی اصول بھی باقی نہیں رہے گا۔"

سوال: چند سال قبل آپ نے مسلم ممالک کو اپنی خبر رساں ایجنسی قائم کرنے کی جو تجویز پیش کی تھی اس کے قیام کی کوئی توقع ہے؟

جواب: اب تک کے تجربہ کے مطابق اس کے قیام کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اوّل تو کسی کو اس اہم اور مفید کام کی ضرورت کا احساس ہی نہیں اور اگر کسی کو ہے بھی تو وہ روپیہ لگانے کے لئے تیار نہیں۔ اپنی خبر رساں ایجنسی نہ ہونے سے جو نقصان ہوا ہے اسے سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ مگر کوئی آگے بڑھ کر اس کمی کو پورا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ رابطہ عالمِ اسلامی کے اجلاس میں میں نے اور بعض دیگر لوگوں نے اس تجویز کو بار بار پیش کیا ہے اور کئی کمیٹیاں بھی بنتی رہی ہیں مگر عملاً ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکا۔

ترکی میں اسلام کے احیاء کے متعلق ایک سوال کے جواب میں مولانا نے بتایا:

"اگرچہ وہاں کے ملکی قانون کے مطابق اسلام کے نام پر کوئی جماعت بنانے کی

اجازت نہیں ہے مگر پھر بھی وہاں بڑے پیمانے پر کام ہو رہا ہے۔ وہاں پر ایک غیر منظم لہر جاری ہے جو اسلام کے احیاء کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔ گزشتہ چالیس سال کے دوران میں بعض اہلِ علم کی انفرادی کوششوں سے بھی انتہائی سخت حالات کے باوجود اتنا اچھا کام ہو گیا ہے جس سے اسلام کی خاطر جدوجہد کرنے والی ایک نئی نسل تیار ہو گئی ہے۔ خصوصاً بدیع الزماں نوریؒ کی کوششوں کا اس میں کافی حصہ ہے۔ نوجوانوں کی اس جدوجہد سے یہودی بہت خائف ہیں اور انھوں نے پوری دنیا میں خطرے کی گھنٹیاں بجانی شروع کر دی ہیں۔ اس سے پہلے بھی یہودیوں نے خطرے کی گھنٹیاں بجائی تھیں جن کے نتیجے میں فوجی انقلاب برپا ہوا تھا اور اب وہ پھر کوشش کر رہے ہیں، مگر اب انھیں کامیابی نہیں ہوگی۔ یہودیوں کی تمام کوششوں اور سازشوں کے باوجود اب انشاء اللہ ترکی میں اسلام کے احیاء کو روکا نہیں جا سکے گا۔"

سوال: اگرچہ مغربی استعمار اور مشرقی لادینیت (اشتراکیت) دونوں اسلام کے دشمن ہیں لیکن اگر وقت آ پڑے تو ان میں سے کس کو ترجیح دینی ہوگی؟

جواب: ہم ترجیح دینے کے بجائے ہر دو پر لعنت بھیجیں گے۔ کیونکہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں سے اخبث کون ہے۔ میرے نزدیک دونوں برابر ہیں۔ مغربی استعمار اشتراکیت کے لئے خود میدان خالی کر رہا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو خود اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتا جتنا اشتراکیت پہنچا سکتی ہے۔ ان حالات میں کسی کی ترجیح کا کوئی سوال نہیں۔ دوسروں کے سہارے پر جینے والی قوم کبھی اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اس کی مثالیں موجود ہیں۔"

سوال: غیر مسلموں کے ذبیحے کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: عرب ممالک میں سب پہلے مفتی عبدہٗ نے غیر مسلموں کے ذبیحے کی حلت کا فتویٰ دیا تھا۔ اس کے بعد تقریباً تمام عرب ممالک میں یہ مسئلہ متفق علیہ ہو کر رہ گیا۔ میں نے رسالہ ترجمان القرآن' میں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ میرے مضمون کو بعض

عرب اخبارات نے جب شائع کیا تو متعدد عرب علماء اور خصوصاً سعودی عرب کے علماء کی اکثریت نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔"

سوال: اسرائیل کے قبضے سے عرب مقبوضہ علاقے چھڑانے کے لئے مسلمان ممالک کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: یہ مسئلہ بہت ہی پیچیدہ بن چکا ہے اور اس معاملے میں حقیقی حل کی طرف قدم نہیں بڑھایا جا رہا ہے۔ اسرائیل کو جس چیز نے قائم کیا وہ بڑی طاقتوں کی سازش بھی تھی اور مسلمانوں کی اپنی کمزوریاں بھی اس میں مددگار ثابت ہوئیں۔ مسلمانوں کی جو کمزوریاں بلا ارادہ و شعور اسرائیل کے قیام میں ممد ثابت ہوئیں، بدقسمتی سے اب ان کو مزید تقویت دی جا رہی ہے۔ اسلام کو ملی حیثیت سے اپنانے کے بجائے نگاہیں آج بھی سطحی سہارے ڈھونڈ رہی ہیں۔ بعض مسلم ممالک اسرائیل کو قائم کرنے والی دو طاقتوں میں سے ایک کو کوستے ہیں اور دوسری کی گود میں پناہ لیتے ہیں، حالانکہ اسرائیل کو قائم کرنے والی یہ دونوں طاقتیں اس معاملے میں باہم متفق ہیں۔ پھر بعض عرب ممالک کا حال یہ ہے کہ وہاں فخریہ انقلاب پر انقلاب برپا کیے جا رہے ہیں۔ جو انقلاب لاتا ہے وہ اپنے سے پہلے حکمرانوں کو غدار قرار دیتا ہے اور پھر جو اس کی جگہ لیتا ہے وہ اسے غدار ٹھہراتا ہے۔ یہ کھیل مسلسل کھیلا جا رہا ہے۔ جبکہ اسرائیل مزید آگے بڑھنے اور علاقے ہتھیانے کے لئے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ جہاں تک باقی مسلمان ممالک کا تعلق ہے وہ اگر کچھ کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ ان حالات میں اسرائیل کے سیلاب سے اللہ تعالیٰ ہی بچانے والا ہے۔ بظاہر آثار بڑے ہی خراب ہیں اور وہ سیلاب کہیں رکتا نظر نہیں آتا جس میں بہت بڑا دخل ہماری خامیوں اور کوتاہیوں کا ہے۔"

سوال: کیا مسلمانانِ عالم پر اسرائیل کے خلاف جہاد فرض نہیں ہو گیا؟ اگر فرض نہیں ہوا تو کن صورتوں میں فرض ہوتا ہے؟

جواب: یہ سوال کر کے آپ نے اپنے آپ کو بھی اور مجھے بھی ایک مشکل میں ڈال دیا

ہے۔ اسلامی اصول یہ ہے کہ جب کسی مسلمان شہر یا علاقے پر کفار حملہ آور ہوں تو پہلے وہاں کے لوگوں پر جہاد کا فرض عائد ہوتا ہے۔ اگر وہ نہ کر سکتے ہوں تو ان کے متصل علاقے کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ وہ بھی نہ کر سکتے ہوں تو ان کے متصل علاقے پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار روئے زمین کے تمام مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ اب آپ سوچ لیں کہ مسئلہ پوچھنے کے بعد اگر جہاد پر نہ جائیں تو آپ کی کیا پوزیشن ہوگی ـــــ دراصل جہاد کے لئے بھی کچھ شرائط مقرر ہیں۔ اگر وہ پوری نہ ہوں تو یہ فرض نہیں ہوتا۔ جہاد کی جو شرائط ہیں، بدقسمتی سے وہ اس مسئلے میں پوری نہیں ہوتیں۔ اگر کوئی مسلمان ملک اسرائیل کے خلاف اپنی فوجیں بھیجے بھی تو انھیں لامحالہ کسی مسلمان ملک سے گزر کر جانا پڑے گا۔ اب آپ یہ معلوم کر لیجیے کہ کون کون سا مسلمان یا عرب ملک ایسا ہے جو دوسروں کی فوجوں کو اپنے ملک میں سے گزر کر اسرائیل پر حملہ کرنے کی اجازت دینے کے لیے تیار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی اتحاد نہ ہونے کے سبب ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہو چکے ہیں اور اس سے سامراجی طاقتوں کے مقاصد پورے ہو رہے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ کانفرنسوں میں فیصلے کچھ ہوتے ہیں اور ان پر عمل ان کے برعکس ہوتے ہیں۔ ان حالات میں مسلمانانِ عالم پُرنم آنکھوں کے ساتھ بے بسی سے یہ سب کچھ دیکھنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔

سوالات ختم ہونے کے بعد مولانا مودودیؒ نے حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

''اب مجھے آپ لوگوں سے چند ضروری باتیں کہنی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ آپ لوگوں پر، اور ان تمام مسلمانوں پر جو یہاں رہتے ہیں، اسلام کی طرف سے بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ اس ملک میں اسلام کے سفیر ہیں۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں مگر یہاں کے غیر مسلم آپ کو اسلام کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے آپ یہاں جو کچھ بھی کریں گے اسے اسلام کے ساتھ منسوب کیا

جائے گا۔ اس طرح آپ کے اعمال اور روّیہ سے وہ جو رائے بھی اسلام کے متعلق قائم کریں گے اس کے آپ ذمہ دار ہوں گے۔ قیامت کے روز جب یہاں کے غیر مسلموں کا مقدمہ پیش ہوگا تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے پیروکاروں نے نہ صرف ہمیں دین نہیں سکھایا تھا بلکہ اُلٹا اپنے غلط کردار سے ہم کو اسلام سے متنفر کرنے کا موجب بنے تھے۔ اب آپ سوچ لیجیے کہ یہ کتنی بڑی ذمہ داری ہے جس کا آپ کو آخرت میں جواب دینا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ حضرات اپنے آپ کو اس کام کے لئے باقاعدہ تیار کریں کہ آپ اسلام کے متعلق یہاں کے باشندوں کے شکوک وشبہات دور کرسکیں۔ آپ اسلام کو عمدگی کے ساتھ اور احسن طریق سے اپناتے ہوئے عیسائیت کے بارے میں پوری معلومات حاصل کریں۔ اس کے لئے آپ اپنا دینی لٹریچر بھی پڑھیں اور عیسائیت کا بھی مطالعہ کریں۔ اس طرح آپ کو ان کے حالات کی اصلاح کرنے میں کافی آسانی رہے گی۔ عیسائیت کا مطالعہ کرنے سے آپ انھیں بتا سکتے ہیں کہ وہ لوگ خود اصلی دینِ مسیح سے کتنے دور ہیں۔ آپ ان پر ثابت کرسکتے ہیں کہ موجودہ عیسائیت تو سینٹ پال کی پیرو ہے نہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی۔ اس طرح ان کا اپنا لٹریچر بھی آپ کا مددگار بن سکتا ہے اور آپ یہاں اسلام کی تبلیغ کرسکتے ہیں۔

لندن میں مقیم عرب طلبہ نے اپنے رسالے ''مجلۃ الغربا''
کے لئے یہ انٹرویو لیا ______ نومبر ۱۹۶۸ء

سوالنامہ

۱- پاکستانی مسلمانوں کے اندر مختلف مذہبی تصورات پائے جاتے ہیں، جماعت اسلامی نے اختلاف مذاہب کے مسئلہ کو کس طرح حل کیا ہے؟

۲- موجودہ حالات میں وہ کونسا اہم ترین میدانِ کار ہے جس پر اسلامی تحریک کو اپنی تمام تر کوششیں مرکوز کر دینی چاہئیں؟ کیا سیاسی میدان؟ یا تعلیمی میدان؟ یا کوئی اور میدان؟

۳- اسلامی تحریک کی ایک متحدہ عالمی قیادت قائم کرنے پر مدت سے سوچ بچار ہو رہا ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

۴- عالم اسلام اس وقت جن حالات سے گزر رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہیں۔ ان حالات میں امورِ ذیل کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

الف: مسلمان سربراہوں کی کانفرنس کا انعقاد۔

ب: مشترکہ اسلامی منڈی کا قیام

ج: بین الاقوامی اسلامی نیوز ایجنسی کا اجراء

۵- اسلامی تحریکیں اس وقت جگہ جگہ حکومتوں کے جبر و تشدد کی فضا میں سانس لے رہی ہیں۔ چنانچہ آپ کی نظر میں وہ کونسا مناسب ترین رویّہ ہے جو اسلامی تحریکوں کو ان

حکومتوں کے بارے میں اختیار کرنا چاہیے؟

۶- آپ کی رائے میں اسلامی تحریک کو مغربی ممالک میں کس اہم پہلو پر زیادہ زور دینا چاہیے؟

۷- مغرب میں کام کرنے والے داعیان اسلام کے لئے آپ کے مشورے کیا ہیں؟

۸- دوحرفی سوال ہے کہ بیت المقدس کی واگزاری کا صحیح راستہ کیا ہے؟

۹- آپ کے قلم نے اسلامی تاریخ کے متعدد گوشوں پر وافر لٹریچر فراہم کردیا ہے مگر ابھی تک سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر آپ کی کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی۔ کیا آپ اس موضوع پر لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

۱۰- اسلامی مفکرین نے موجودہ صدی میں، بلکہ کسی حد تک گزشتہ صدی میں بھی متعدد مغربی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ مثلاً ڈیموکریسی، نیشنلزم، وطنیت، پارلیمنٹ، دستور، سوشلزم وغیرہ۔ یہ اصطلاحیں ماضی قریب کے زمانے تک برابر استعمال ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض اسلامی مفکرین ان اصطلاحوں کے استعمال سے گریز کرتے ہیں، بلکہ اسلامی نظام کی تشریح میں ان اصطلاحوں کو اختیار کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں اور ان کا رجحان ہی نہیں بلکہ اصرار ہے کہ خالص اسلامی اصطلاحات کو استعمال کرنا چاہیے جو قرآن کریم اور سنت رسول سے ماخوذ ہوں۔ کیا آپ اپنے تجربات اور اسلامی احساسات کی روشنی میں بتا سکتے ہیں کہ ہماری آئندہ نسلوں میں ایسے اسلامی مفکرین پیدا ہوں گے جو ہر اس چیز کو کلیتہً رد دیں گے جو قرآن وسنت سے خارج ہوگی اور اسلامی شریعت، احکام قرآن اور دیگر اسلامی معاملات کے بارے میں کسی بحث وجدال کو برداشت نہیں کریں گے، بلکہ ان تمام چیزوں کو اسی طرح اصل حالت میں اختیار کریں جس طرح دعوت اسلامی کے آغاز میں ان کو اختیار کیا گیا تھا؟

۱۲- دنیائے اسلام مین بیشتر لوگ اس خیال کا اظہار کر رہے ہیں، کہ ظہور مہدی (جس کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے) سے پہلے جس قسم کے حالات

کی خبر دی گئی ہے وہ اس زمانے میں رونما ہو چکے ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

۱۳۔ مسلم اور اسلامی کے درمیان کیا فرق ہے؟ کیا ان دونوں لفظوں کا استعمال درست ہے؟

جواب

مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ برطانیہ میں آپ لوگ مجلۃ الغرباء کے نام سے ایک عربی پرچہ شائع کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کی کوششوں میں برکت دے اور آپ اس پرچے کے ذریعے سے طلبہ میں اسلامی روح بیدار کرنے اور بیدار رکھنے کے لئے کوئی مفید خدمت انجام دے سکیں۔

۱۔ پاکستان میں اس وقت تین ہی فقہی مذاہب ہیں۔ ایک حنفی، دوسرے اہل الحدیث، تیسرے شیعہ امامیہ۔ ان تینوں مذاہب کے علماء نے ۱۹۵۱ء میں باہم اتفاق سے یہ بات طے کر لی تھی کہ ملکی قانون (Law of Land) اکثریت کے مسلک پر مبنی ہوگا اور ہر فقہی مذہب کے پیروؤں کو یہ حق دیا جائے گا کہ ان کے شخصی معاملات ان کے اپنے پرسنل لاء کے مطابق طے کئے جائیں۔ رہے مختلف مذاہب کے اعتقادی اختلافات، تو نہ وہ دور کئے جا سکتے ہیں، نہ اُن کو دور کرنا ضروری ہے۔ صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہر گروہ اپنے عقیدے پر قائم رہے اور سب ایک دوسرے کے ساتھ رواداری برتیں۔ اس کے لئے ہم ملک میں مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔

۲۔ اسلامی تحریک کے لئے ساری دنیا میں کوئی ایک لگا بندھا طریقِ کار نہیں ہو سکتا۔ مختلف ممالک کے حالات مختلف ہیں، اور ہر جگہ کام کرنے والوں کو اپنے حالات کے مطابق ایک طریقِ کار اختیار کرنا ہوگا۔ البتہ جو چیز مشترک رہے گی وہ اصول اور مقصد ہے جس کا منبع قرآن وسنت ہے اور وہی تحریک اسلامی کے تمام کارکنوں کو ایک وحدت میں منسلک کرتا ہے۔ جو گروہ جس ملک اور معاشرے میں اس تحریک کے لئے کام کرنے اٹھے، اُس کا یہ فرض ہے کہ اعتقاد اور عمل میں کتاب و سنت کی تعلیمات کا پورا اتباع کرے، اور اقامتِ دین کو اپنا مقصود بنا کر اپنی تمام

مساعی اس پر مرکوز رکھے۔ اس کے بعد اپنی تحریک کے لئے عملی پروگرام طے کرنا ہر علاقے کے لوگوں کا اپنا کام ہے' اور ان میں اتنی حکمت ہونی چاہیے کہ وہ اپنی قوت' ذرائع اور حالات کے لحاظ سے اقامتِ دین کے لئے مناسب ترین طریقِ کار تجویز کریں۔

۳- جن حالات سے اس وقت ہم گزر رہے ہیں ان میں یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ دنیا کے تمام ممالک کے لئے اسلامی تحریک کی کوئی ایک مرکزی قیادت قائم ہو سکے۔ بلکہ اس وقت کے بین الاقوامی حالات تو اتنی بھی اجازت نہیں دیتے کہ ہمارے درمیان کوئی مراسلت اور تبادلۂ خیالات ہو سکے' یا ہم وقتاً فوقتاً کوئی مشترک کانفرنس کر سکیں۔ سرِ دست زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنی مطبوعات کے تبادلے کر کے ایک دوسرے کے حالات و خیالات سے واقف ہوتے رہیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو' حج کے اجتماع سے فائدہ اُٹھاتے رہیں۔

۴- عالمِ اسلام کو اس وقت نہ صرف ان تینوں امور کی ضرورت ہے بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کام ہیں جو ان ممالک کو باہم مل کر کرنے چاہئیں۔ دو سال پہلے میں نے اس کے متعلق ۱۲ نکات پر مشتمل ایک پروگرام پیش کیا تھا۔ لیکن اس طرح کی تجویزیں اس وقت تک عمل میں نہیں آ سکتیں جب تک مسلمان ملکوں کی حکومتیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہوں جو اسلام کے رشتے کی بنا پر باہم متفق و متحد ہونے کے لئے تیار ہوں۔ سرِ دست تو وہ "رجعت پسند" اور "ترقی پسند" کے جھگڑوں میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے ملکوں میں آئے دن انقلابات برپا کرنے سے ان کو فرصت نہیں مل رہی ہے۔

۵- میرے نزدیک یہ طے کرنا ہر ملک کی اسلامی تحریک کے کارکنوں اور قائدین کا کام ہے کہ جس قسم کا ظلم و استبداد ان پر مسلط ہے اس کے مقابلے میں وہ کس طرح کام کریں۔ ہر ملک میں اس کی صورتیں اور کیفیتیں اتنی مختلف ہیں کہ سب کے لئے کوئی ایک طریقِ عمل تجویز کرنا مشکل ہے۔ البتہ جو چیز میں ان سب کے لئے

ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کو خفیہ تحریکات اور مسلح انقلاب کی کوششوں سے قطعی باز رہنا چاہیے اور ہر طرح کے خطرات ونقصانات برداشت کرکے بھی علانیہ پرامن اعلائے کلمۃ الحق کا راستہ ہی اختیار کرنا چاہیے، خواہ اس کے نتیجے میں ان کو قید وبند سے دوچار ہونا پڑے یا پھانسی کے تختے پر چڑھ جانے کی نوبت آجائے۔

۶۔ مغربی ممالک میں جو لوگ اسلامی تحریک کا کام کریں ان کو چاہیے کہ پہلے عملاً اپنی زندگی کو ٹھیک اسلامی سانچے میں ڈھالیں اور مغربی سوسائٹی کے اندر اپنی شان نمایاں کریں۔ اہلِ مغرب کے ساتھ اخلاق اور اعمال اور طرز زندگی میں ہم رنگ ہوجانے کے بعد ان کی تحریک کے مؤثر ہونے کے امکانات آدھے سے زیادہ ختم ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری چیز یہ ہے کہ ان کو اہلِ مغرب کی تہذیب اور ان کے مذہب اور ان کے فلسفۂ حیات کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے اور پھر ایسے حکیمانہ طریقہ سے تنقید اور تبلیغ کرنی چاہیے جس سے مغربی ممالک کے سنجیدہ طبقے اسلام کی طرف متوجہ ہوسکیں۔ آپ کا کم سے کم ہدف یہ ہونا چاہیے کہ جس مغربی ملک میں بھی آپ ہوں وہاں کے کم ازکم دو چار اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے انسانوں کو اسلام کی طرف کھینچ لیں اور ان کو اسلامی تحریک کے لئے عملاً کام کرنے پر آمادہ کریں۔ اس کے بعد یہ ان کا کام ہوگا کہ اپنے ملک میں دعوتِ اسلامی کے کام کی ذمہ داری سنبھال لیں۔

۷۔ سوال نمبر ۷ کا جواب اوپر آچکا ہے۔ میرے نزدیک کسی مغربی ملک میں کام کرنے والے داعیٔ اسلام کو مشرقی ممالک کا کام کرنے والوں سے بھی بڑھ کر اسلامی احکام کا سخت متبع ہونا چاہیے۔

۸۔ بیت المقدس کی واپسی کا کوئی امکان میرے نزدیک اس وقت تک نہیں ہے جب تک فلسطین کے گردوپیش کی عرب ریاستیں اپنی اس روش کو چھوڑ نہ دیں جس کی وجہ سے انھوں نے ۱۹۴۸ء سے اب تک پے در پے یہودیوں سے شکستیں کھائی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ بیت المقدس کی سیاسی تصفیے کے ذریعہ سے اب مسلمانوں کے

قبضے میں واپس نہیں آ سکتا۔ اس کے لئے لامحالہ لڑنا ہوگا۔ اور اتنی طاقت سے لڑنا ہوگا کہ اسرائیل کو شکست دی جا سکے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ شام، عراق، مصر اور اُردن میں اس وقت جو حالات پائے جاتے ہیں ان میں جنگ کا نتیجہ بیت المقدس کی واپسی کے بجائے رہے سہے کچھ مزید علاقے کھو دینے کی صورت میں رونما ہو گا۔ رہے دوسرے اسلامی ممالک، تو وہ اسرائیل کے خلاف کوئی عملی اقدام نہیں کر سکتے جب تک وہ عرب ملک ان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے تیار نہ ہوں، جن کی سرحدیں اسرائیل سے ملتی ہیں۔

۹- میں ایک مدت سے یہ تمنا رکھتا ہوں کہ سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی کتاب لکھوں، مگر مجھے ابھی تک اس کا موقع نہیں مل سکا ہے۔ سرِ دست میں نے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن مجید کی جو تفسیر آج کل میں لکھ رہا ہوں اس میں قرآن اور سیرت کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے اُن حالات کی تفصیل بیان کرتا جاؤں جن میں قرآن مجید کی آیات مختلف مواقع پر نازل ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس تفسیر کی تکمیل کے بعد اگر مجھے اتنی مہلت اور طاقت دی کہ میں سیرت پاک پر بھی کوئی مستقل کتاب لکھ سکوں تو میرے لئے یہ بہت بڑی سعادت ہوگی۔

۱۰- میں نے پچھلے ۴۰ سال میں فکرِ اسلامی کے اندر مسلسل ایک تغیر محسوس کیا ہے، اور الحمدللہ کہ وہ بہتری کی طرف ہے۔ پہلے کے مقابلے میں اب بہت زیادہ واضح شکل میں اسلامی تصورات دنیا کے سامنے آ رہے ہیں۔ اگرچہ اس زمانے میں مغربی مستشرقین کے شاگردوں نے بھی پہلے سے بہت زیادہ پرفریب اور بظاہر علمی طریقے اختیار کر کے اسلام اور اس کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہیں۔ مگر ہر مرحلے پر ان کی سرکوبی کی جاتی رہی ہے۔ اور کم از کم مسلمان آبادیوں پر وہ اپنا اثر ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ مسلمان بالعموم اب اسلام کو اتنی صاف شکل میں جان اور پہچان رہے ہیں کہ ان کو یہ مشرقی مستغربین دھوکا نہیں دے سکتے۔

۱۱- موجودہ زمانے کے لوگوں کو بات سمجھانے کے لئے جدید اصطلاحات کا استعمال تو

ناگزیر ہے' لیکن ان کے استعمال میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض اصطلاحوں سے پرہیز اولیٰ ہے' بلکہ اجتناب واجب ہے۔ مثلاً اشتراکیت۔ اور بعض کا استعمال اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ ان کے اسلامی مفہوم اور مغربی مفہوم کا فرق پوری طرح واضح کر دیا جائے، مثلاً جمہوریت، یا دستوریت، یا پارلیمنٹری سسٹم اور بعض کو سرے سے کوئی اسلامی مفہوم دیا ہی نہیں جا سکتا، مثلاً نیشلزم۔

۱۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشین گوئیاں ارشاد فرمائی ہیں ان میں سے کسی کے ظہور کی بھی تاریخ نہیں بتائی گئی ہے بلکہ صرف اُن حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں کوئی واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اس طرح کے بیانات کی بناء پر قطعیت کے ساتھ کسی وقت بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب کسی پیشین گوئی کا ظہور ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم جن حالات کو دیکھ کر یہ رائے قائم کریں کہ یہ فلاں پیشین گوئی کے ظہور کا وقت ہے مگر ان کے بارے میں ہمارا اندازہ غلط ہو۔ ویسے تو ظہور قیامت کی علامات بھی اب بڑی حد تک دنیا میں پائی جاتی ہیں' لیکن قطعیت کے ساتھ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ اب اس کے برپا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔

۱۳۔ مسلم اور اسلامی میں ایک لحاظ سے تو کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ مسلم حقیقت میں کہتے ہی اس کو ہیں جو اسلام کا متبع ہو۔ لیکن ایک دوسرے لحاظ سے ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ مسلم ہر اس گروہ یا شخص کو کہا جا سکتا ہے جو دائرۂ اسلام سے خارج نہ ہو، خواہ وہ عملاً اسلام کی پیروی نہ کر رہا ہو اور اس کے برعکس اسلامی صرف وہی چیز ہے جو ٹھیک اسلام کے مطابق ہو۔ مثلاً ایک مسلم حکومت ہر اس حکومت کو کہا جا سکتا ہے جس کے حکمراں مسلمان ہوں۔ لیکن اسلامی حکومت صرف اسی کو کہا جا سکتا ہے جو اپنے دستور اور قوانین اور انتظامی پالیسی کے اعتبار سے پوری طرح اسلام پر قائم ہو۔

☆

۲۱۷ لینس ڈاؤن اسٹریٹ، لندن میں یہ نشست ہوئی ____ نومبر ۱۹۶۸ء

سوال: اسلامی سوشلزم کی اصطلاح استعمال کرنے والے بعض لوگ سوشلزم کے جواز میں یہ موقف پیش کرتے ہیں کہ اسلام پر سوشلزم کے لفظ کا اضافہ اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں تمام ذرائع پیداوار پر حکومت کا کنٹرول ہوتا ہے اور اسلام بھی مساوات کا قائل ہے، یہ کہنا کہاں تک درست ہے؟

جواب: دراصل یہ لوگ خالص سوشلسٹ نظام چاہتے ہیں لیکن مجبوراً اسلام کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہاں شرک بھی پھیلانا چاہتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ یہ اسلامی شرک ہے۔ جو شخص شراب پینا چاہتا ہے اس کی کوشش بھی یہ ہے کہ وہ پہلے اسے اسلامی شراب باور کرائے پھر پیے۔ لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے، اس کے ساتھ کسی دوسرے ازم کی پیوندکاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نام لیتے ہیں انھیں منافقت ترک کر کے صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی قبول نہیں کرتے۔ مارکس اور لینن کی رہنمائی چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک مغربی سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کفر ہیں اور اسلام دونوں کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ جب ہم کمیونزم کی مخالفت کرتے ہیں تو ہمیں سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب ہم سرمایہ داری کی مخالفت کرتے ہیں۔ تو یہی لوگ کان بند کر لیتے ہیں۔ جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نام لیتے ہیں سوال یہ ہے کہ انھیں صرف اسلام کہتے ہوئے کیوں شرم آتی ہے۔

بہر حال نام سوشلزم کا ہو یا اسلامی سوشلزم کا، اسلام کے خلاف اس قسم کی جو تحریک بھی چلائی جائے گی، تحریک اسلامی اس کا مقابلہ کرے گی اور اسے یہاں چلنے نہیں دے گی۔ خوش کن نعروں یا لیبلوں سے کوئی اور دھوکا کھائے تو کھائے لیکن خدا کے فضل سے جماعت اسلامی دھوکہ نہیں کھائے گی۔

سوال: تحریکِ جمہوریت کے زعماء بار بار یہ کہتے ہیں کہ تبدیلیٔ اقتدار آئینی ذرائع سے ہونی چاہیے، لیکن گزشتہ انتخابات سے ثابت ہوگیا ہے کہ رائے عامہ کی واشگاف تائید کے باوجود پرامن تبدیلی ممکن نہیں ہے، دوسری طرف تخریب پسندی اور توڑ پھوڑ میں ہلاکت ہے پھر آخر اس کا حل کیا ہے؟

جواب: آئینی طریقے سے حالت کی تبدیلی کا مفہوم اور ہے اور کسی ملک کے آئین کی پابندی کرتے ہوئے حالات کو تبدیل کرنے کا مفہوم اور ہے۔ آئینی ذرائع سے نظام کی تبدیلی کا مطلب یہ نہیں کہ موجودہ آئین (۱۹۶۲ء) کے مقرر کردہ طریقوں کے اندر رہ کر ہی کوششیں کی جائیں گی بلکہ دنیا بھر میں آئینی ذرائع سے جو مطلب لیا جاتا ہے وہ یہ ہے ان ذرائع کو اختیار کر کے تبدیلی لائی جائے گی اور یہ ذرائع موجودہ آئین کے مقرر کردہ طریقوں سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک توڑ پھوڑ کی کاروائیوں کا تعلق ہے اس ملک میں ایک ایسا عنصر موجود ہے جو ایسی کاروائیوں کے ذریعے سے اقتدار پر قبضہ کر کے اشتراکی آمریت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اشتراکی انقلاب آتا ہی توڑ پھوڑ کے ذریعے سے ہے۔ ان کا فلسفہ یہی ہے کہ ”بندوق کی نالی انقلاب کا سرچشمہ ہے“ ______ اگر اس وقت ملک کے حالات توڑ پھوڑ کی طرف گئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک اشتراکی انقلاب کے قریب جا رہا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ توڑ پھوڑ اور تشدّد کے ذریعے کوئی مستحکم اور پائیدار نظامِ حکومت قائم نہیں کیا جا سکتا۔ لاطینی امریکہ اور افریقہ کے اُن ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ جہاں اس قسم کی کاروائیوں کے بعد انقلاب لائے گئے اور پھر وہاں انقلاب در انقلاب کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس لئے نہ ہم خود تشدّد کا راستہ اختیار کریں گے اور نہ

دوسروں کو اختیار کرنے دیں گے۔

سوال: بعض عناصر ملک میں توڑ پھوڑ اور تشدد کی کاروائیوں کی راہ اختیار کر رہے ہیں، ان کو روکنے کے لئے آپ کیا لائحہ عمل تجویز فرماتے ہیں؟ کیا جمہوریت کی بحالی کے سلسلے میں ان سے کسی طرح کا اشتراک کیا جا سکتا ہے؟

جواب: اس غرض کے لئے لائحہ عمل پہلے بھی ہم پیش کرتے رہے ہیں تاہم اس موقع پر جو پہلی بات میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ پاکستان کسی سوشلزم، برطانیہ ازم، امریکہ ازم یا مارکس ازم کے لئے قائم نہیں کیا گیا تھا۔ یہ ملک صرف اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا، اس لئے یہاں صرف اسلامی نظام ہی آئے گا۔ کسی طاقت کی یہ جرأت نہیں کہ وہ یہاں اسلام کے علاوہ کوئی اور ازم نافذ کرے۔ جب تک ہم زندہ ہیں ایسا نہیں ہو سکے گا۔

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم اس ملک کی اصلاح کے لئے اٹھے ہیں، اُسے خراب کرنے کے لئے نہیں۔ اللہ کے فضل سے تحریکِ اسلامی ایک منظم تحریک ہے اور وہ صرف ایسے عناصر کے ساتھ مل کر کام کرے گی جو مفید ہیں، غارت گر نہیں ہیں۔ تحریکِ اسلامی نہ تو کسی تخریب کار گروہ سے تعاون کرے گی اور نہ اسے یہاں کام کرنے دے گی۔

سوال: جب موجودہ ایوب حکومت کے خلاف عوام کا لاوا اچانک پھٹ پڑا تو اس کے متعلق خبریں سن کر آپ کے تأثرات کیا تھے؟

جواب: میرے لئے کوئی چیز خلاف توقع نہیں تھی۔ میں ہر وقت یہ توقع رکھتا تھا کہ جو لاوا اندر ہی اندر پک رہا ہے، وہ کسی نہ کسی وقت پھوٹ بہے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ یہاں آمریت چلا رہے تھے، خدا نے انھیں عقل نہیں دی ہے اور افسوس یہ ہے کہ آنکھیں بھی نہیں دی ہیں۔ اپنے اردگرد انھوں نے ایک خصار چن رکھا تھا۔ جس کے اندر

وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ انھیں اس ملک میں کوئی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ اس غلط فہمی کو بہر حال کسی نہ کسی وقت رفع ہونا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اب بھی رفع ہوئی ہے یا نہیں۔ بہر حال ڈکٹیٹروں کا یہ خاصا ہوتا ہے کہ چاہے سارا ملک ان پر پھٹکار بھیجتا رہے مگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سارا ملک اس بات کا خواہش مند ہے کہ وہ ان کے سر پر سلامت رہیں۔

سوال: بحالیٔ جمہوریت کی تحریک کے اس دور میں پھر بعض حلقوں کی طرف سے ایک اپوزیشن پارٹی کے قیام کی تجویز آ رہی ہے۔ کیا جماعت اسلامی کے لئے ایسی کوئی تجویز قابل قبول ہوگی؟

جواب: جو لوگ ایک اپوزیشن پارٹی کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ انھیں سیاست کی ہوا بھی نہیں لگی ہے، وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ ایک ملک میں ایک پارٹی نہیں بنا کرتی۔ اگر آپ جمہوریت چاہتے ہیں تو مختلف الخیال لوگوں کو اس بات کا موقع دیں چاہیے کہ وہ اپنے ہم خیال لوگوں کو جمع کریں۔ اپنا نقطہ نظر پیش کریں۔ خلق خدا جس نقطۂ نظر کو قبول کرے گی وہی ملک میں جاری ہوگا۔ جو لوگ آج ایک پارٹی کی بات کرتے ہیں، بعید نہیں ہے کہ وہ کل یک جماعتی ریاست (One Party State) قائم کرنے کی فکر کریں۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ سارے ملک کی تمام پارٹیاں ختم ہو جائیں اور ایک پارٹی بن جائے۔ جو کچھ معقول تھا وہ یہاں ہو گیا۔ یعنی ملک میں جو پانچ جماعتیں واقعی جمہوریت کی قائل تھیں اور جن کے پیشِ نظر واقعی ایمانداری سے یہ بات ہے کہ اس ملک میں جمہوریت قائم ہو، وہ باہم متحد ہو گئی ہیں۔ جس نوعیت کا اتحاد درکار تھا وہ خدا کے فضل سے قائم ہو گیا ہے۔

سوال: آئندہ یورپ میں اسلام کا مستقبل کیا ہوگا؟

جواب: میں دنیا بھر کے حالات کا مطالعہ کرتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ جب تک ہم پاکستان میں اسلامی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتے اس وقت تک ہم باقی

دنیا میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔

سوال: کیا سوشلزم کا اقتصادی نظامِ اسلامی قانون کے ساتھ چل سکتا ہے؟

جواب: یہ بات اس سے پہلے بھی میں بارہا بتا چکا ہوں کہ جو اسلام کا قائل ہے اسے سیدھی طرح یہ کہنا چاہیے کہ ہم اسلام کے ذریعے سے اپنے مسائل حل کریں گے جو اسلام کا نہیں سوشلزم کا قائل ہے وہ کھل کر سامنے آئے اور کہے کہ میں اس ملک میں سوشلزم چاہتا ہوں، اسلام نہیں چاہتا۔ یہاں جو اسلام اور سوشلزم کا جوڑ لگاتا ہے وہ یا تو اسلام کو نہیں جانتا یا سوشلزم کو نہیں جانتا یا پھر دونوں کو نہیں جانتا۔

اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے اٹھارہویں سالانہ اجتماع، لاہور کی نشست میں شرکت ______ ۹ نومبر ۱۹۶۹ء

"میرے نہایت عزیز نوجوانو!

آپ لوگوں نے میرے لئے ۹ بجے کا وقت رکھا تھا اور میں اپنے حساب سے اس وقت چلا تھا کہ یہاں بلا تاخیر پہنچ جاؤں گا، لیکن مجھے آپ کے نعروں کا پتہ نہ تھا۔ ان نعروں کی وجہ سے راہ میں جو تاخیر ہوئی ہے، امید ہے آپ مجھے اس کا ذمہ دار نہ سمجھیں گے۔ یہ بھرپور اجتماع دیکھ کر مجھے وہ وقت یاد آتا ہے، جب ۲۲ سال پہلے چند نوجوانوں نے ایک مختصر جمعیت کی بنیاد ڈالی تھی اور کوئی یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ آگے چل کر یہ ایک عظیم جمعیت کی شکل اختیار کرلے گی۔ اللہ تعالیٰ خلوص کی قدر فرماتا ہے اور تھوڑے سے کام میں بھی برکت عطا کرتا ہے۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی ان درس گاہوں میں، جو عقائد اور اخلاق دونوں کو خراب کرنے والی ہیں، ایسے نوجوان بھی پائے جاتے ہیں جو نہ صرف خود صحیح عقیدے اور پاکیزہ اخلاق کے مالک ہیں بلکہ اپنی درسگاہوں میں اسی عقیدے اور اخلاق کی خوشبو پھیلانے کے لئے کوشاں بھی ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں میں مزید برکت عطا فرمائے اور وہ وقت جلد لائے جب ان درسگاہوں میں اسلامی نظامِ تعلیم اور اس ملک میں اسلامی قانون رائج ہو۔

سوال: پچھلے دنوں پے در پے ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جن سے ہم نوجوانوں میں سخت اشتعال پایا جاتا ہے، مثلاً عبدالمالک کی شہادت، یادگار عبدالمالک کی تعمیر

میں رکاوٹ اور ایسے ہی دوسرے واقعات! کیا اب ہمارے لئے یہ روا نہیں ہے کہ ہم اپنے مخالفین کے تشدد کا جواب تشدد سے دیں؟

جواب: ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہم بہرحال معقولیت کے ساتھ کام کریں، لیکن جیسا کہ میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ شرافت اور معقولیت کے معنی بزدلی کے نہیں ہیں۔ جو لوگ آپ سے اُلجھیں انھیں ایسا سبق دیجیے کہ وہ ساری عمر یاد رکھیں۔ مخلص، شریف اور بلند کردار لوگوں کے آگے بدکردار اور کرائے کے آدمی کبھی نہیں ٹھہر سکتے۔ شریف آدمی بہادر ہوتا ہے۔ کمینہ کبھی بہادر نہیں ہوتا۔ وہ اسی وقت تک شیر رہتا ہے جب تک کہ اُسے یقین ہو کہ دوسرا آدمی اس پر ہاتھ نہیں اُٹھائے گا، لیکن جب اسے معلوم ہو جائے کہ اس کی پٹائی ہو جائے گی تو وہ کبھی یہ خطرہ مول نہیں لے گا۔

سوال: اس زمانے میں پورا ملک دو کیمپوں میں تقسیم ہو چکا ہے اور نوجوان طالب علم جوق در جوق اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل ہو رہے ہیں۔ وہ اسلامی جذبے سے سرشار ہیں، لیکن ابھی پوری طرح جمعیت کے مزاج سے واقف نہیں ہیں، کیا انھیں جمعیت کا کارکن بنانا چاہیے؟

جواب: جو نوجوان آپ کی طرف آ رہے ہیں انھیں دھکیل کر دور پھینکنا عقل مندی نہیں ہے۔ وہ بہرحال اسلامی جذبہ رکھتے ہیں اور اسی جذبے سے سرشار ہو کر وہ اپنا وزن اسلام کے پلڑے میں ڈال رہے ہیں۔ آپ کو ایسے لوگوں کی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ البتہ آپ یہ کوشش کیجیے کہ ان لوگوں کی پوری ہمت افزائی کے ساتھ فکری اصلاح بھی ہو۔ بلاشبہ یہ محنت طلب اور وقت طلب کام ہے لیکن آپ کو یہ کام کرنا پڑے گا۔ اس مقصد کے لئے آپ کے پاس ایسا مختصر لٹریچر ہونا چاہیے جسے پڑھ کر وہ اسلامی تحریک کے مزاج سے پوری طرح آشنا ہو جائیں۔ اگر آپ یہ کام نہیں کریں گے تو ممکن ہے کہ نووارد نوجوان کسی وقت کوئی غلطی کر بیٹھیں اور وہ آپ کے سر منڈھی جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ ملک میں ایک ایسا گروہ موجود ہے جو ہر وقت الزام تراشی کی مہم میں لگا رہتا ہے اور ہمارے ہاں کا اخلاقی معیار اس قدر گر گیا ہے کہ کوئی آدمی اُٹھ کر خواہ کیسا ہی لغو اور بے ہودہ الزام

چسپاں کر دے اسے اخبارات میں جگہ مل جاتی ہے۔

آپ کو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ بنگلہ، اُردو اور انگریزی میں آپ کے پاس مختصر تربیتی لٹریچر کا ہونا ضروری ہے۔ آپ باقاعدگی کے ساتھ کارکنوں کے تربیتی اجتماعات کرتے رہیں اور انھیں بتائیں کہ عام زندگی میں اور موجودہ بحرانی حالات میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

سوال: تحریکِ اسلامی اس وقت جن حالات سے گزر رہی ہے اس میں طلبہ کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

جواب: یہ سوال بہت وسعت رکھتا ہے، تاہم میں مختصراً آپ کو بتاتا ہوں کہ تحریکِ اسلامی اس وقت ایک نہایت نازک دور سے گزر رہی ہے۔ اگرچہ قیامِ پاکستان کے بعد سے ہی یہ مختلف آزمائشوں سے دوچار رہی ہے اور قدم قدم پر اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں۔ لیکن ۵۸ء سے حالات نازک سے نازک تر ہوتے گئے۔ ۵۸ء کے انقلاب کے نتیجے میں یہاں ایسے لوگ برسرِ اقتدار آئے جو اسلام کا نام لے کر عوام کو تو دھوکا دیتے ہیں۔ لیکن اسلام کا کام کرنے والوں کے ہاتھ باندھتے رہے اور ان لوگوں کو کھلی چھٹی دیتے رہے جو اسلام کے سوا کسی دوسرے نظریے پر ملک کا نظام چلانا چاہتے تھے۔ مزدوروں میں انہیں لوگوں کو کام کرنے کے مواقع دیے گئے۔ طلبہ میں انہی کو آگے بڑھنے کا راستہ دیا گیا جو نوجوانوں کے عقیدے اور اخلاق کو خراب کرتے رہے۔ اسی طرح صحافت، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی اسی طائفے کو مسلط کر دیا گیا اور بڑے بڑے سرکاری مناصب بھی اس کے قبضے میں آ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب تحریک جمہوریت کے ذریعہ سے عوام نے اپنے حقوق کی بحالی کی مہم شروع کی تو عین اس وقت جبکہ عوام اپنی منزل کے قریب تھے، ان لوگوں نے ہنگامے برپا کرا دیے اور عوام کو ملنے والے حقوق پھر سلب کر لئے گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ مارشل لاء اس دعوے کے ساتھ لگایا گیا تھا کہ وہ ان خرابیوں کا سدِّ باب کرے گا جو اس وقت ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن ایسا نہ ہوا اور شر پسند عناصر نے خود اس مارشل لاء کے تحفظ میں اپنی پوزیشن اور مضبوط کر لی ۔

ان حالات میں طلبہ کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ اپنی درسگاہوں کو مفسدین کے گروہ سے پاک کرنے کی کوشش کریں۔ ان لوگوں نے طلبہ کی خانہ ساز انجمنوں کا ایک جال بچھا رکھا ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ باشعور اور محب وطن طلبہ کی تنظیم نہایت مستعد اور فعال ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ ملک کے حالات سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ آپ کو دونوں محاذوں پر کام کرنا ہے۔ ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے جدوجہد بھی اور درس گاہوں کی تطہیر بھی۔

سوال: تحریک اسلامی ایک مدت سے عوام میں کام کر رہی ہے لیکن اس نے ابھی تک عوام کے پریشر گروپس میں اپنے اثر کو وسیع نہیں کیا اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: بلاشبہ تمام پریشر گروپس مثلاً مزدور، کسان، طلبہ، صحافی، وکیل اور اساتذہ (وغیرہ) میں تحریک اسلامی کا کام ہونا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ایوب خان کے زمانے میں تحریک اسلامی کی راہ میں سخت رکاوٹ ڈالی گئی تھی اور عوام کے ان مؤثر حلقوں میں اس کے لئے کام کرنا عملاً ناممکن بنا دیا گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں مفسد گروہوں کو کام کرنے کے پورے مواقع فراہم کیے گئے تھے۔ طویل عرصہ تک یہی ہوتا رہا، اب اس کی تلافی آناً فاناً تو نہیں ہو سکتی۔ خدا کے فضل سے ہر حلقے میں کام کا آغاز ہو گیا ہے اور انشاء اللہ اس کے نتائج بھی بہت جلد برآمد ہوں گے۔

سوال: آج کل بڑے بڑے سرمایہ دار اسلام کی حمایت کر رہے ہیں، کیا اس طرح سے وہ اپنا تحفظ چاہتے ہیں؟

جواب: میرے علم میں تو نہیں ہے کہ وہ کون سے بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں جو اسلام کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ میں تو یہی جانتا ہوں کہ تمام بڑے بڑے سرمایہ دار سوشلزم کے علمبردار ہیں۔ لیکن اگر کوئی سرمایہ دار اسلام کا نام لیتا بھی ہے تو اس سے تحریکِ اسلامی کے کام میں کیا فرق واقع ہوتا ہے۔ یہ تحریک تو اس لئے کام کر رہی ہے کہ وہ اسلامی نظام کو رائج

کرے اور اسلامی قانون کے تحت کوئی سرمایہ دار نہیں رہ سکتا۔ وہ اسلام کی حدود کو توڑ کر جب بھی ناجائز نفع خوری کرے گا۔ اسلامی قانون کی زد میں آئے گا۔

سوال: موجودہ حالات میں ہم نوجوانوں کے لئے کون سا محاذ زیادہ اہم ہے۔ کیا ملک کو لادین عناصر کی یلغار سے بچانے کے لئے ہم تعلیم سے دست کش ہو کر ان کے مقابلے پر آ جائیں یا تعلیم میں لگے رہیں؟

جواب: اس معاملے میں ٹھیک توازن کی ضرورت ہے۔ نہ تو یہ صحیح ہے کہ آپ تعلیم کو چھوڑ کر ملک کے مسائل میں لگ جائیں اور نہ یہ درست ہے کہ آپ کتاب کے کیڑے بنے رہیں اور ملک کے حالات کی بالکل خبر نہ رہے۔ آپ تعلیم بھی حاصل کیجیے اور پوری توجہ سے حاصل کیجیے اور ملک کے حالات پر بھی نظر رکھیے۔ آپ کو اس بات کی بھی فکر کرنی چاہیے کہ آپ کی درس گاہوں کو کون لوگ خراب کر رہے ہیں۔ اور اس بات پر بھی توجہ ہونی چاہیے کہ کون لوگ ملک کے حالات بگاڑنا چاہتے ہیں اور اس بگاڑ کا کیسے سد باب کیا جا سکتا ہے۔ خدا کے دین کو سربلند کرنا بھی آپ کا کام ہے اور تعلیم کو حاصل کرنا بھی۔

اگر آپ تعلیم حاصل نہیں کریں گے اور ہمہ وقت ملک کے مسائل میں لگ جائیں گے تو اسلامی انقلاب کے بعد ملک کے نظام کو چلانے کے لئے جس اہلیت کی ضرورت ہے اس سے آپ تہی دامن رہ جائیں گے۔ مسلمان کی زندگی ہی دراصل اعتدال و توازن کی زندگی ہے۔ آپ اسی اعتدال کو اختیار کیجیے۔

سوال: بفرض محال ہمارے ملک میں اچانک اشتراکی انقلاب آ جائے تو آپ کیا کریں گے؟

جواب: فرض کیجیے راتوں رات زلزلہ آ جائے، مکانات گر جائیں، ہزاروں لوگ ان کے تلے دب کر مر جائیں، لاکھوں زخمی ہو جائیں اور ایک قیامت برپا ہو جائے تو ایسی صورت میں زلزلے سے متاثر ہونے والوں کے لئے جو ممکن ہو گا کیا جائے گا۔ آدمی پہلے سے اس کے لئے کوئی اسکیم نہیں بنا سکتا۔ یہی معاملہ اشتراکی انقلاب کا ہے۔ یہ آفت اگر یکایک

نازل ہو جائے تو قبل از وقت اس کے تدارک کی کیا سبیل ہو سکتی ہے! اس وقت جو ممکن ہو گا کیا جائے گا۔

سوال: کیا تاریخ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ کوئی قوم زوال کے بعد پھر ابھری ہو۔ اگر نہیں تو پھر مسلمان قوم کے بارے میں یہ اُمید رکھنا کہ وہ زوال کے بعد پھر ابھر آئے گی۔ درست ہے؟

جواب: یہ سوال صرف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ہم مسلمانوں کو صرف ایک قوم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مسلمان محض ایک قوم نہیں ہیں۔ اسلام ایک نظریہ اور تحریک ہے جس کے علمبردار بن کر لوگ پہلے بھی اُٹھے تھے اور اب بھی اُٹھ سکتے ہیں۔ اگر وہ صرف ایک قوم بن کر رہ جائیں تو بلاشبہ ان کے دوبارہ اُبھرنے کا امکان نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر اسلام جیسی انقلابی تحریک کے کارکن بن کر اُٹھیں تو ان کے دنیا پر چھا جانے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

جب کمیونزم ایک نظریے کی حیثیت سے دنیا میں پھیل رہا ہے باوجودیکہ وہ سراسر شر ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ اسلام جو اس سے کہیں زیادہ معتدل نظام اور سراسر سچا نظریہ ہے، نہیں پھیل سکتا! دنیا میں اس کی کامیابی کے امکانات بہت روشن ہیں بشرطیکہ مسلمان اسے ایک تحریک کی حیثیت سے اپنا لیں۔

سوال: علمائے سُوء ان دنوں دیہاتوں میں عوام کو تحریک اسلامی اور اس کے قائدین کے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ ان کا کیا علاج کیا جائے؟

جواب: علمائے سُوء کا ہمیشہ سے یہ خاصا رہا ہے کہ وہ عوام کو صحیح کام کرنے والوں کے خلاف بھڑکاتے ہیں اور عوام جتنے زیادہ ان پڑھ ہوتے ہیں اتنے ہی زیادہ ان کے دام میں آ جاتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسان پیدائشی طور پر سلیم الفطرت واقع ہوا ہے۔ ماں کے پیٹ سے بُری فطرت لے کر نہیں آیا۔ ہمارے عوام الحمد للہ مسلمان ہیں۔ وہ نیک و بد میں تمیز کرنا جانتے ہیں۔ آپ بھی ان دیہاتی لوگوں میں کام کیجیے وہ خود بخود یہ فیصلہ کر لیں گے کہ حق بات کون کہتا ہے اور ناحق بات کون کہتا ہے۔ کس کے دلائل معقول

اور انداز شریفانہ ہے اور کون غنڈوں کی سی زبان استعمال کر رہا ہے۔ انھیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ کیسے علمائے دین ہیں جو منبر رسولؐ پر تقریر کرتے ہوئے دوسروں کو غلیظ گالیاں دیتے ہیں۔ اگر آپ دیہاتی عوام کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے تو اس میں عوام کا نہیں آپ کا قصور ہے۔

سوال: بعض لوگ آپ پر اعتراض کرتے ہیں کہ ''خلافت و ملوکیت'' لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کتاب کو لکھ کر بہت سے اختلافی مسائل کو بھڑکایا گیا ہے۔ براہِ مہربانی اس کا جواب عنایت فرمائیے۔

جواب: ان حضرات کو دنیا بھر کے مصنفین کے نام ایک سوالنامہ جاری کرنا چاہیے، کہ انھوں نے جو کتابیں لکھی ہیں آخر ان کی ضرورت کیوں محسوس کی ہے اور جب وہ کوئی شافی جواب دیں تو ان کتابوں کو ہاتھ لگایا جائے ورنہ نہیں —— سوائے جاہل آدمی کے کوئی اس قسم کی بات نہیں کر سکتا۔ جہاں تک ''خلافت و ملوکیت'' کے لکھنے کا تعلق ہے میں نے دیباچے میں بھی اس کی صراحت کر دی ہے۔ البتہ جو لوگ اس کتاب پر اعتراض کرتے ہیں ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ آخر انھیں اس کتاب کے خلاف گاؤں گاؤں جا کر تقریریں کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ وہ اس کی مخالفت میں یوں بے چین ہوئے جاتے ہیں؟

سوال: لوگ آئے دن آپ پر طرح طرح کے الزامات لگاتے رہتے ہیں اگرچہ آپ ان کو جواب بھی دیتے ہیں لیکن وہ پھر بھی باز نہیں آتے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ ان کے الزامات کو عدالت میں چیلنج کر کے انھیں بے نقاب کر دیں اور آئندہ کبھی انھیں آپ کے خلاف الزام تراشی کی جرأت نہ ہو۔

جواب: میں نے کبھی کسی شخص کے الزام کا جواب نہیں دیا ہے الا یہ کہ اس نے کسی علمی دلیل کی بنیاد پر کوئی اعتراض اُٹھایا ہو اور میں نے علمی انداز میں اس کی وضاحت کر دی

ہو۔ میرا نقطۂ نظریہ ہے کہ آدمی کو دنیا میں جو وقت ملا ہے وہ اسے ایسے کام میں صرف کرے کہ اس کے نامۂ اعمال میں کوئی نیکی لکھی جائے۔ لیکن اپنا وقت کسی ایسے کام میں صرف کرنا کہ اس کے نامۂ اعمال میں کوئی نیکی نہ لکھی جائے اور لکھی جائے تو بدی لکھی جائے کسی ایسے شخص کا شیوہ نہیں ہو سکتا جو سمجھتا ہو کہ اسے اپنے رب کے پاس حاضر ہونا ہے۔

میرے پاس کہاں اتنا وقت ہے کہ ان لوگوں کے الزامات کو عدالت میں چیلنج کرتا پھروں میں نے تو یہ مقدمہ ایک اور عدالت کے لئے اُٹھا رکھا ہے جہاں پورا کیس تیار ہو رہا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ اس طرح سے میں بہت بڑی کمائی کر لوں گا۔ اور ان لوگوں سے جرمانے کے طور پر وہ تمام نمازیں اور روزے دھرالوں گا جو وہ دنیا میں ادا کرتے رہے ہیں۔ انشاءاللہ۔

> سوال: اسلام سود کو حرام قرار دیتا ہے لیکن پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک کے لئے بیرونی قرضے ایک ضروری جزو کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ قرضے بغیر سود کے نہیں ملتے۔ ایسی صورت میں ہم سود سے کیسے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں؟

جواب: بیرونی ممالک سے جو قرضے لیے جا رہے ہیں ان کا بہت بڑا حصہ بالکل غیر ضروری ہے۔ آپ دیکھیے کہ ان کا کتنا حصہ حقیقی ترقی کے کاموں میں صرف ہوا ہے اور کتنا ضائع کیا گیا ہے یا عیاشیوں میں اُڑایا گیا ہے۔ آخر ایک غریب ملک میں بڑی بڑی عمارتیں بنانے اور اسلام آباد کی تعمیر میں اربوں روپے صرف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اس کے بغیر ملک کا نظام نہیں چل سکتا تھا۔ ان عیاشیوں کی مثال تو ایسی ہی ہے جیسے پرانے وقتوں کے نواب اور جاگیردار اپنی جاگیروں کو رہن رکھ کر دولت حاصل کرتے تھے اور ٹھاٹھ جماتے تھے۔ پھر ایک دن کنگال ہو کر سب کچھ کھو بیٹھتے تھے۔ کیا ضرورت ہے کہ ہم دوسرے ملکوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں؟ کیا اپنے وسائل سے کام نہیں چلا سکتے؟ —— اگر اس ملک میں کوئی دیانت دار حکومت قائم ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ بیرونی قرضوں

کی بہت کم ضرورت باقی رہے گی۔ تاہم اگر ناگزیر ضرورت کے لئے بیرونی قرضے سود پر لینے بھی پڑیں تو اس کا جواز کہاں سے نکلتا ہے کہ ہم ملک کے اندر بھی سودی نظام کو جاری رکھیں۔ سود کو بہر حال اسلام نے حرام قرار دیا ہے اور ہمیں اپنے دائرہ اختیار میں تو اسے حرام قرار دینا چاہیے۔

سوال: ''علم حاصل کرو خواہ تمھیں چین جانا پڑے''____ کہا جاتا ہے کہ حضورؐ کی حدیث ہے اور پھر اس سے بعض حضرات نئے نئے معنیٰ اخذ کرتے ہیں؟

جواب: مجھے جہاں تک تلم ہے یہ حضورؐ کی حدیث نہیں ہے۔ قدیم زمانے میں اگر یہ بات کسی نے کہی تھی تو اس لئے کہ چین عرب سے بہت دور تھا اور یہ بتانا مقصود تھا کہ علم اتنی قیمتی چیز ہے کہ اگر تمھیں اس کو حاصل کرنے کے لئے چین بھی جانا پڑے تو جاؤ لیکن آج لوگوں نے اس کا یہ مطلب نکال لیا ہے کہ ''علم حاصل کرنا ہو تو صرف چین جاؤ''۔ یہ وہی لوگ ہیں جو کبھی انگلستان کو علم کا منبع قرار دیتے تھے اور انگریز کی نقالی کرنا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ پھر امریکہ آیا تو اس کے گن گانے لگے اور اب چین کا چرچا ہوا ہے تو اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

سوال: سوشلسٹ عناصر پاکستان میں خفیہ طریقے سے اپنے آپ کو منظم کر رہے ہیں اور اپنے کارکنوں کو فوجی تربیت دے رہے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں ہمارے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم بھی اسی طریقے سے اپنے آپ کو منظم کریں۔

جواب: یہ سوال پچھلے دنوں بھی مجھ سے کیا گیا تھا اور میں نے کہا تھا کہ ہمارا کام خفیہ تحریک چلانا نہیں بلکہ کھلم کھلا اپنے نظریے کو پھیلانا ہے۔ کمیونسٹ کھلے طریقے سے عوام میں کام نہیں کر سکتے۔ ان کا مزاج ہی یہ ہے کہ خفیہ طریقوں سے کام کرتے ہیں اور عوام کی مرضی کے خلاف ان پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ کسی خفیہ تحریک کے ذریعے کوئی صالح انقلاب

نہیں آ سکتا۔ اس تحریک میں جو خرابیاں پرورش پاتی ہیں ان کا کسی کو پتہ نہیں چلنے پاتا۔ اور جب وہ تحریک کامیاب ہو جاتی ہے تو یہ خرابیاں ایکا ایکی اُبھر کر پورے ملک کے لئے آزمائش کا سبب بن جاتی ہیں۔ اسی خفیہ تحریک کا نتیجہ تھا کہ اسٹالن جیسا ظالم آدمی روس میں برسر اقتدار آ گیا اور روس کے عوام نے ایک زار سے چھٹکارا حاصل کیا تو دوسرے زار نے ان کی گردن دبوچ لی۔

خفیہ تحریک اس طریقہ سے چلتی ہے کہ اگر کسی شخص کے بارے میں یہ شبہ بھی ہو جائے کہ وہ پارٹی کا وفادار نہیں ہے تو اسے بلا تکلف قتل کر دیا جاتا ہے اور یہ قتل و غارت گری اس تحریک کا عام مزاج بن جاتا ہے۔

بہرکیف یہ ایک بلا ہے جو ہمارے ملک میں پرورش پا رہی ہے۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ ہم بھی ایک جوابی بلا بننے کی کوشش کریں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ کھلے بندوں لوگوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کریں۔ گاؤں گاؤں جا کر ایک ایک کسان کو بتائیں کہ یہاں سوشلسٹ انقلاب آ گیا تو ایک بیگھہ زمین بھی تمھارے پاس نہیں رہے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسان یہ بات سمجھ جائیں تو کوئی کمیونسٹ بھی ان کے گاؤں میں داخل نہیں ہونے پائے گا۔ اور یہ لوگ کمیونسٹوں کی وہ خبر لیں گے کہ ان کے حواس درست ہو جائیں گے۔

جہاں تک ہتھیار بند ہونے کا تعلق ہے اگر آپ کو لائسنس کا ہتھیار مل سکتا ہو تو ضرور رکھیے اور نشانہ بازی کی مشق بھی کیجیے، لیکن غیر قانونی اسلحہ نہ رکھیے۔ مدافعت کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا کوئی اخلاقی، شرعی، یا قانونی جرم نہیں ہے بلکہ اس کی اجازت ہے۔ لیکن خفیہ طریقے سے کوئی مسلح انقلاب برپا کرنا اسلام کے مزاج کے بھی خلاف ہے اور انجام کے لحاظ سے خطرناک بھی۔

سوال: کیا تحریک اسلامی اپنے خصوصی اجتماعات میں فوٹوگرافی پر پابندی عائد نہیں کر سکتی؟

جواب: جن لوگوں نے فوٹوگرافروں سے لڑ کر انکے کیمرے تک چھینے ہیں وہ بھی اس

بات میں کامیاب نہ ہو سکے کہ ان کے فوٹو اخبارات میں نہ آئیں۔ دراصل یہ برائی کی شاخیں ہیں۔ اگر ہم انھیں کاٹنے میں لگ جائیں گے تو جڑ کی اصلاح نہ ہو سکے گی۔ پہلے جڑ کی فکر کیجیے۔ انشاء اللہ یہ شاخیں خود بخود درست ہو جائیں گی۔

سوال: آپ زیادہ تر تعلیم یافتہ اور شہری آبادی میں جاتے ہیں لیکن دیہاتی آبادی آپ کے فیض سے محروم رہتی ہے۔ حالانکہ دیہات میں عوام کی اکثریت ہے۔ بارہ کروڑ دیہی آبادی کو بھی اپنے پروگرام سے آگاہ کریں۔

جواب: ان کے لئے میرے پاس یہ پروگرام ہے کہ میں تعلیم یافتہ آبادی میں پیغام پہنچاؤں اور تعلیم یافتہ حضرات اسے دیہی علاقے میں پھیلائیں۔ اگر گاؤں گاؤں پہنچنے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لوں تو شاید میں پاکستان کے سو دیہاتوں میں سے ایک دیہات تک بھی نہ پہنچ پاؤں گا۔ جب سے میں رہا ہوں۔ آپ لوگ ہفتے میں تین دن تو میرے لے لیتے ہیں۔ اور صرف چار دن مجھے اپنے تحریری کام کے لئے ملتے ہیں۔ اب آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ میں تفہیم القرآن لکھوں۔ دوسرا علمی کام بھی کروں اور گاؤں گاؤں بھی پھروں۔ میرے لئے آخر یہ کیسے ممکن ہے؟

سوال: اگر حکومت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں آ جائے تو آپ کی خارجہ پالیسی کیا ہو گی؟

جواب: میں مفروضات پر کلام نہیں کیا کرتا۔ آپ نے پہلے سے یہ مفروضہ قائم کر لیا ہے کہ حکومت میرے ہاتھ میں آئے گی تو پھر میں کیا پالیسی اختیار کروں گا ____ میں نہ حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کا خواہش مند ہوں اور نہ اس کا امکان ہے۔ مجھ سے یہ پوچھیے کہ اسلامی حکومت کی خارجہ پالیسی کیا ہو گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ غیر مسلم حکومتوں کے ساتھ ہمارا رویہ مصالحانہ ہونا چاہیے۔ نہ ہم کسی کے دوست بنیں، نہ دشمن۔ ہاں مسلمان ملکوں کے ساتھ ہمیں ایک متحدامت کی صورت اختیار کرنی چاہیے۔ ان سے قریبی اور گہرے تعلقات قائم کریں اور اس بات کی کوشش کریں کہ تمام مسلمان حکومتوں کا

"Federation of Muslim Status" عمل میں آ جائے۔

سوال: اسلام میں سرمایہ داری کا وجود کس حد تک جائز ہے؟

جواب: اسلام میں سرمایہ داری نہ حلال ہے نہ حرام۔ اصل چیز یہ ہے کہ سرمایہ کس راستے سے حاصل کیا جاتا ہے، اور کس راستے میں خرچ کیا جاتا ہے۔ اگر سرمایہ اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق حاصل کیا جائے اور ان راستوں میں خرچ کیا جائے جن کی اسلام نے اجازت دی ہے تو ایسا سرمایہ اسلام میں جائز ہے۔ لیکن اگر اس کے برعکس سرمائے کا حصول ناجائز اور حرام طریقوں سے عمل میں آئے تو وہ سرمایہ سارے کا سارا ناجائز اور حرام ہے۔ اصل مشکل یہ ہے کہ معاشی معاملات میں لوگ اسلام کے نظریے کو نہیں اپناتے بلکہ دنیا میں چلنے والے معاشی نظام میں سے کسی کو اپنے ذہن میں رکھ کر یہ سوچتے ہیں کہ اسلام کس نظام کا حامی ہے۔

سوال: امریکہ کے ناپاک عزائم پر کبھی آپ نے کھل کر اظہار خیال نہیں کیا، کیا وجہ ہے؟

جواب: کیا وجہ ہے؟ ______ کا جواب تو میں اس وقت دوں جب کہ میں نے واقعی امریکہ کے ناپاک عزائم پر اظہار خیال نہ کیا ہو۔ ”ترجمان القرآن“ کے پچھلے کئی ماہ کے اشارات اس بات پر گواہ ہیں کہ امریکہ پر شدید نکتہ چینی کی گئی ہے لیکن ہمارے ہاں اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جو لوگ اشتراکیت کے حامی ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ہم روس اور چین کا قصیدہ گائیں اور دوسری طرف جو لوگ سرمایہ داری نظام کے حامی ہیں وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم اندر سے اشتراکی نظام کے طرفدار ہیں۔ دراصل یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ پاکستان ایک عورت کا نام ہے جسے لازماً ایک شوہر ملنا چاہیے۔ اگر امریکہ سے طلاق مل گئی ہے تو اب ضرور اس کا نکاح چین سے پڑھا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ بھائی مرد بنو۔ کب تک اپنے آپ کو دوسروں کے نکاح میں دیتے رہو گے۔

سوال: جو لوگ انگریز نوازی کی وجہ سے یا دیگر ناجائز ذرائع کی بدولت آج بڑی بڑی جاگیروں، کارخانوں اور ملوں کے مالک ہیں، ایک اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد ان کے متعلق کیا روّیہ اختیار کیا جائے؟

جواب: اسلامی اصول کی روشنی میں ان کے بارے میں دو رویّے اختیار کیے جا سکتے ہیں، ایک یہ کہ آئندہ ان کی تمام ناجائز مراعات کا خاتمہ کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ پہلے انھوں نے دولت جس طرح سے کما رکھی ہے اس پر ٹیکس عائد کر کے آہستہ آہستہ ان کے قبضے سے نکال لی جائے۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ اسے اشتراکیت کا آپریشن کر کے نکالا جائے، لیکن وہ اس بات کو نہیں سوچتے کہ اشتراکیت کا آپریشن کر کے ان کے قبضے سے نکالنے کے لئے حکومت کو بہت زیادہ وسیع اختیارات دینے پڑیں گے۔ کیونکہ جب تک حکومت کو اتنے وسیع اختیارات نہ حاصل ہوں کہ وہ لوگوں کی جائیدادیں ضبط کر سکے، اس وقت تک یہ سکیم عمل میں نہیں آ سکتی۔ اب اگر آپ حکومت کو اتنا طاقتور بنا دیتے ہیں تو اس کے بعد آپ کے پاس اس بات کی کیا ضمانت باقی رہ جاتی ہے کہ وہ اپنی طاقت اور غیر محدود اختیارات کو عوام کے خلاف استعمال نہیں کرے گی۔ حکومت کا انتظام بہر حال انسان چلائیں گے، آسمان سے فرشتے نہیں آئیں گے، اور انسانوں کو وہی اختیارات دیے جا سکتے ہیں جن کو وہ آسانی سے ہضم کر لیں۔ جہاں بھی انسانوں کو وسیع اختیارات دیے گئے ہیں وہاں بالعموم انھیں اختیارات کی بدہضمی لاحق ہو گئی ہے، اور انھوں نے لوگوں پر بے پناہ ظلم و ستم ڈھایا ہے۔ اسلام ظلم و ستم کا یہ دروازہ کھولنے کا قائل نہیں اور اسی لئے وہ حکمرانوں کو وسیع اختیارات دینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی حکومت اسلام کی قائم کی ہوئی حدود اور اسلام کے طے کئے ہوئے اصولوں کے مطابق تمام حالات اور معاملات کی اصلاح کرے گی۔ نہ کہ قوانین اسلامی کے حدود سے باہر جا کر اس طرح کے ظالمانہ قوانین بنائے گی۔ جس طرح سے اشتراکی حکومت میں بنائے جاتے ہیں۔ یہ صحیح طریقۂ کار نہیں ہے۔ اس کے نقصانات بہت زیادہ ہیں۔ سرمایہ داروں سے دولت چھینتے چھینتے پھر غریبوں سے بھی سب کچھ چھین لیا جاتا ہے اور ملکیت ختم کرتے کرتے آزادی کا

بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

سوال: اگر اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد آج کل کے بڑے بڑے کارخانے، ملیں اور جاگیریں جوں کی توں بحال رکھیں گئیں تو معاشی وطبقاتی تفاوت کس طرح دور ہوگا؟ اور معاشی مسائل حل کیسے ہوں گے؟ کیا اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد آسمان سے من وسلویٰ برسنے لگے گا؟

جواب: نہیں بلکہ من وسلویٰ انشاءاللہ زمین سے اُگے گا۔ اسلامی حکومت خدا کی بنائی ہوئی زمین کی برکات کو خدا کے بندوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنے گی۔ انشاءاللہ۔

اس سوال کے پہلے حصے کا جواب میں ابھی دے چکا ہوں۔ یعنی اسلامی حکومت ان چیزوں کو اسلامی قوانین کی حدود میں حل کرے گی، ان حدود کو توڑ کر نہیں۔ جاننا چاہیے کہ انسان کے معاشی مسائل حل کرنے کے لئے اسلام اپنا ایک مزاج رکھتا ہے۔ اس میدان میں اس کا نظام چودہ سو سال پہلے سے مکمل ہے۔

سوال: حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اپنے دورِ خلافت میں اچھے مکان بنوانے والوں، بہترین لباس پہننے والوں اور بہترین خوراک کھانے والوں پر سختیاں کرتے تھے اور سخت سزائیں دیتے تھے۔ آج اسلام کا نعرہ لگانے اور دعویٰ کرنے والوں کے لئے ایئر کنڈیشنڈ بنگلے، کوٹھیاں اور ہوٹل تعمیر کرنے، کاروں میں سفر کرنے اور فرسٹ کلاس کے ڈبوں میں سفر کرنے اور بہترین لباس اور بہترین خوراک استعمال کرنے کے حقوق کہاں سے آ گئے ہیں؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا تھا اس کا پس منظر آپ لوگ نگاہ میں رکھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک ایسی قوم آباد تھی جو بالکل غریب اور مفلس تھی، جس میں بہت ہی کم دولتمند آدمی پائے جاتے تھے۔ اسلام کی برکت سے اس قوم کے صحرا نشین یکا یک اُٹھے اور مصر، شام، عراق اور ایران جیسے عظیم الشان ممالک کو فتح کیا اور دولت کی ریل پیل شروع ہوگئی۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی

اللہ عنہ کو وہی اندیشہ لاحق ہوا جو موجودہ زمانے میں عربوں کے معاملے میں ہمیں لاحق ہوا ہے اور ہم نے اپنے آنکھوں سے اس کے نتائج دیکھے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خطرہ محسوس فرمایا کہ یہ دولت کی ریل پیل جو یکایک شروع ہوئی ہے۔ آگے چل کر مسلمانوں میں مختلف مفاسد نہ پیدا کردے۔ حضرت عمرؓ کا یہ خدشہ بالکل صحیح تھا۔ دولت کی اچانک فراوانی جو حالات پیدا کر دیتی ہے، ان کی ایک مثال ہم حال ہی میں دیکھ چکے ہیں جبکہ عرب ممالک میں تیل نکلا۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر سعودی عرب کے معاملے کو لیجیے۔ پٹرول نکلنے سے پہلے پورے سعودی عرب کی آمدنی چالیس لاکھ ریال تھی۔ پٹرول نکلنے کے بعد یہ بڑھتے بڑھتے تین ارب ریال سے بھی آگے جا چکی ہے۔ گویا سابقہ اور موجودہ آمدنی میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ اب وہ بچہ جس کے باپ دادا نے اُونٹ کیسوا کوئی سواری نہ دیکھی تھی یکایک اس کے پاس کیڈلک کار آ جاتی ہے۔ ان کے خیموں کے اندر ریڈیو سیٹ، ٹرانزسٹر، ریفریجریٹر، وغیرہ پہنچ جاتے ہیں۔ چونکہ ابھی کوٹھیاں بنانے کی نوبت نہیں آئی اس لیے خیموں کے اندر ہی یہ ساری چیزیں انھیں مہیا ہو جاتی ہیں۔ اس کے لئے سعودی عرب میں قائم ہونے والی پٹرول کمپنی ARAMCQ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک عرب بدو جب اپنے لڑکے کو جو بالکل اَن پڑھ ہے اور ابھی صحرا سے اُٹھ کر آیا ہے آرامکو میں ملازم رکھوا دیتا ہے۔ آرامکو اسے ۹ سو ریال معاوضہ اسی وقت سے دینا شروع کر دیتی ہے چاہے وہ کوئی کام کرنے کے قابل نہ ہو اور ساتھ ساتھ اس کو انگریزی زبان سکھانی شروع کر دیتی ہے۔ ایک مہینے میں اس لڑکے کو عربی بولتے ہوئے شرم آنے لگتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جفاکشی کی زندگی سے کٹ جاتا ہے۔ جو چند ایک لفظ انگریزی کے وہ سیکھ چکا ہے انہی کو وہ اپنی زبان بنا لیتا ہے۔ خیموں میں ریفریجریٹر، ریڈیو وغیرہ پہنچ چکے ہیں۔ نغموں کا شور اُمڈا ہوا ہے ______ اس آغاز کے بعد جو عیاشی شروع ہوئی ہے آج مشرق وسطیٰ کے مختلف ممالک میں اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ دولت کی اچانک ریل پیل نے انھیں اپنی سابقہ زندگی ہی نہیں بلکہ اپنی اخلاقی اقدار سے بھی کاٹ کر رکھ دیا ہے۔

اسی چیز کا اندیشہ حضرت عمرؓ کو تھا اور اسی لئے وہ اس صورت حال کی روک تھام کر رہے تھے۔ ورنہ اچھا کھانا شریعت نے حرام نہیں کیا ہے۔ اچھے مکان میں رہنا شریعت نے حرام نہیں کر دیا ہے۔ خود قرآن مجید میں ہے کہ قل من حرم زینة اللہ التی اخرج لعبادہٖ گویا یہ حضرت عمرؓ کی ایک انتظامی اور تدبیری کوشش تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ قوم دولت کی یکا یک ریل پیل سے بگاڑ کا شکار نہ ہو جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس زمانے میں تمدّن نے جو ذرائع یا جو سہولتیں پیدا کی ہیں، اگر ان کے متعلق آپ کا روّیہ یہ ہو کہ یہ سب کفار کے لئے ہیں اور اہلِ ایمان کے لئے یہ حرام ہیں تو آپ ہی بتایئے کہ آپ کا حشر کیا ہوگا۔ آپ کہیں گے کہ ہوائی جہاز پر سفر کرنا غلط ہے۔ تم لازماً ریل سے سفر کرو۔ سوال یہ ہے کہ ریل سے سفر کرنا کیوں صحیح ہے۔ بیل گاڑی سے سفر کیوں نہ کیا جائے۔ ریل بھی تو موجودہ دور کی ایجاد ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ، کہ سائنس اور تمدّن کی ہر چیز کفار کے لئے ہے اہلِ ایمان کے لئے نہیں ہے، کفر کے کام اور گمراہی کی اشاعت کے لئے تو ہر سہولت پیدا کر دیتا ہے، لیکن اسلام کا کام کرنے والوں کے لئے کچھ باقی نہیں رہنے دیتا۔ اس لئے آپ کا نقطہ نظر یہ ہونا چاہیے کہ تمدّن نے جو ذرائع پیدا کیے ہیں اگر کوئی انھیں عیش کے لئے استعمال کرے تو غلط ہے، لیکن اگر کوئی انھیں دین کے کام میں مددگار بنائے تو بالکل صحیح ہے۔ بلکہ دین ہی کا یہ حق ہے کہ وہ اس میں مددگار بنائے جائیں اور کفر کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ خدا کی پیدا کردہ تمام قوتوں پر قابض ہو جائے۔

سوال: اسلامی ممالک میں اشتراکیوں اور قادیانیوں کی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ کیا آپ اب بھی اسلامی قیادت کے قیام کے متعلق پُرامید ہیں؟

جواب: ہم قادیانیوں اور اشتراکیوں کی سرگرمیاں بغور دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے مسلمان ملکوں میں اشتراکیوں کی سرگرمیاں زیادہ ہیں قادیانیوں کی کم ہیں۔ ہمارے ملک میں دونوں کی سرگرمیاں اچھی خاصی ہیں۔ لیکن ہم ان کو دیکھ کر کبھی اس غلط فہمی میں نہیں پڑے

کہ اب یہاں اسلامی قیادت کے لئے امکانات باقی نہیں رہے اس لئے ان کے لئے میدان خالی چھوڑ دیں ______ جہاں تک قادیانیوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں ایک مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی اصل پوزیشن کیا ہے۔ معلوم نہیں کہ آپ نے یہ منظر دیکھا ہے یا نہیں؟ مگر ہم پٹھان کوٹ کے قریب رہتے تھے۔ وہاں ہم نے یہ منظر دیکھا ہے کہ ایک درخت ہے۔ (مثلاً شہتوت کا درخت) اس کے اُوپر کسی جانور نے پیپل کی بیٹ لا کر ڈال دی، تو پیپل نے اس کے اندر جڑیں پکڑ لیں اور بڑھنا شروع ہوا۔ گویا اس کی اپنی جڑ زمین میں نہیں ہے۔ وہ شہتوت کے درخت سے غذا حاصل کر رہا ہے اور اُس کے اُوپر بڑھ رہا ہے۔ اب اگر اس درخت کو آپ بدل دیں تو طفیلی درخت خود بخود نشوونما سے محروم ہو جائے گا۔ اس وجہ سے ہم زیادہ فکر اسی بات کی کر رہے ہیں کہ اس شہتوت کے درخت کی جگہ ایک مضبوط درخت لگے۔

باقی رہی اشتراکیت ______ تو اشتراکیت ایک عالمی تحریک کی بدولت یہاں چل رہی ہے۔ اس کا اپنا زور اب بھی یہاں نہیں ہے۔ اس کو غذا باہر سے مل رہی ہے، لٹریچر باہر سے مل رہا ہے، گویا یہ بیرونی اثر سے چل رہی ہے۔ باہر اگر روسی اور چینی اشتراکیت کا تنازعہ پیدا ہوتا ہے تو یہاں بھی یہ لوگ روسی اور چینی لابی میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ الغرض اشتراکیت ہو یا کچھ اور، کوئی چیز ہمارے لئے پریشان کن مسئلہ نہیں ہے۔

الجھاؤ اس طرزِ عمل سے پیدا ہوتا ہے جب حکومت اپنے ملک کی اسلامی تحریکوں کو تو خطرناک قرار دے دیتی ہے لیکن اشتراکی اثرات کو نہ صرف یہ کہ خطرناک نہیں سمجھتی بلکہ عملاً اسے پروان چڑھانے میں خود مددگار ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں پی۔ آئی۔ اے کے جہاز باہر سے بے تحاشا اشتراکی لٹریچر لا رہے ہیں۔ یہ لٹریچر ٹنوں کے حساب سے آ رہا ہے اور برائے نام قیمت پر اور بعض صورتوں میں بالکل مفت تقسیم ہو رہا ہے۔ لیکن ہمارے کارپردازانِ حکومت اس کے خطرناک نتائج کو نگاہوں میں رکھنے سے گریز کر کے ملت سے عظیم دھوکا دہی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

سوال: روس اور چین نے زبردست مادی ترقی کی ہے اور وہ ایٹمی طاقت بن

گئے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: کسی ملک کی مادی ترقی اس بات کی دلیل نہیں کہ اس کا مسلک زندگی بھی حق ہے' اشتراکی ممالک میں تمام اختیارات ایک پارٹی کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور لوگوں کو بھوکا مار کر جنگی جنون پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ ہمہ جہتی ترقی روس میں ہوئی ہے اور نہ چین میں۔ سوشلزم میں بحیثیت مجموعی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔

روس اور چین کا ایٹمی طاقت بن جانا سوشلزم کی حقانیت کی دلیل نہیں' ورنہ امریکہ ان دونوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہے تو کیا سرمایہ داری کو برحق مان لیا جائے؟

سوال: یوں تو فلمیں ویسے بھی معاشرے کے لئے ایک ناسور کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر فلمی دنیا نے پچھلے دنوں ایک فلم ''خانہ خدا'' کے نام سے بنا کر عوام کو دکھانے کا اہتمام کیا ہے۔ آپ کے خیال میں اور شریعت کی رُو سے یہ کہاں تک درست اور مناسب بات ہے؟ اور اگر مناسب نہیں تو عوام میں سے اسلام پسند عناصر کو اس کی روک تھام کے لئے کیا تدابیر اور اقدام کرنے چاہئیں؟

جواب: پہلے تو اس بات کو آپ سمجھ لیں کہ خانہ خدا میں جو عبادت ہوتی ہے وہ لوگوں کے لیے تماشے کی حیثیت نہیں رکھتی۔ سب سے پہلی بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس کو بھی ایک تماشا بنا دیا گیا اور اس تماشے کو دکھایا بھی وہاں جارہا ہے جہاں لوگ تماشا ہی دیکھنے جاتے ہیں ____ اوّل تو خانہ خدا کی فلم بنانا ایک غلط کام ہے اور پھر اسے تماشے کی جگہ لے جا کر دکھانا اور بھی غلط ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک فلم بنائی جاسکتی ہے اور اس فلم کی اغراض وہی ہوسکتی ہیں۔ یا یہ کہ لوگوں کو عبادت کا طریقہ جو حج میں اختیار کیا جاتا ہے اور جو شریعت نے مقرر کیا ہے وہ سکھایا جائے۔ یا پھر یہ ہے کہ اس میں ایسی تبلیغ موجود ہو جو لوگوں میں حج کا شوق پیدا کرے۔ لیکن ''خانہ خدا'' کے نام سے بننے والی اس فلم میں یہ دونوں پہلو سرے سے موجود ہی نہیں ہیں' بلکہ اس کے برعکس تاثر ملتا ہے۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے وہ بتاتے ہیں کہ بعض جگہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذاق کے لئے کسی خاص

منظر کو لیا گیا ہے، اور اس پر کافی دیر تک فوکس کیا گیا ہے تا کہ لوگوں کے لئے وہ مضحکہ بنے۔ مثلاً جہاں منیٰ میں قربانی ہوتی ہے۔ اب جہاں دس بارہ لاکھ آدمی جمع ہوں اور حج کے سلسلے کا آخری کام انجام دیا جا رہا ہو، وہاں ہر آدمی کو جلدی ہوتی ہے کہ وہ قربانی سے فارغ ہو کر جا کر کپڑے بدلے۔ اس موقع پر بھاگ دوڑ اور قربانی کے جانوروں کو جلدی جلدی لانے کے مناظر کو خاص طور پر لیا گیا ہے۔ اسی طرح دیکھنے والوں نے بتایا ہے کہ ایک جگہ جہاں حجرِ اسود کو بوسہ دیتے ہیں تو اس جگہ نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لئے ایک ایسا سپاہی کھڑا ہوا تھا جس کا رنگ کالا تھا اور چہرے پر کچھ دھبے سے پڑے ہوئے تھے۔ فلم بنانے والوں نے ایک دفعہ اس سپاہی کو دکھایا۔ پھر حجرِ اسود کو دکھایا پھر اس سپاہی کو۔ یہ عمل تین مرتبہ کیا گیا۔ صرف یہ دکھانے کے لئے کہ اس کا رنگ بھی حجر اسود جیسا ہے۔ حجر اسود بھی ٹوٹا ہوا ہے اور وہاں بھی گومڑے سے پڑے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی باتوں کا مقصد حج کی تبلیغ نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کے ساتھ کوئی کمنٹری ایسی نہیں ہے جو حج کا شوق پیدا کرنے والی ہو اور مناسک بھی ترتیب کے ساتھ نہیں دکھائے گئے جس سے مناسک کی تعلیم حاصل ہو۔ صرف حج کو تماشہ بنانے کا کام سرانجام دیا گیا ہے۔ اب کیا مسلمان اس حد تک گر چکے ہیں کہ وہ اپنی عبادتوں کو تماشے بنائیں گے؟

اول تو سعودی عرب کی حکومت نے یہ فلم بنانے کی اجازت ہی کیوں دی؟ پھر ہماری حکومت کو اسے پاس نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور آخر میں لوگوں کو اس کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا کہ وہ بڑی عقیدت کے ساتھ جا جا کر دیکھیں۔

علاوہ ازیں اس کے اندر ایک چیز اور بھی ہے جو قابلِ افسوس ہے۔ وہ یہ کہ اِحرام کی حال میں عورتوں کو حکم ہے کہ وہ چہرہ کھلا رکھیں۔ نماز کی حالت میں بھی عورتوں کو لامحالہ چہرہ کھلا رکھنا پڑتا ہے، کیونکہ نماز منہ ڈھک کر نہیں ہوتی۔ اب اس فلم میں جہاں عورتیں نماز پڑھتی ہیں، اس جگہ کے بار بار فوٹو لئے گئے ہیں۔ کیا یہ دینداری کے جذبات کا مظاہرہ تھا؟ حج میں عورت کو چہرہ کھولنے کا جو حکم ہے اسی طرح مرد کو بھی یہ حکم ہے کہ وہ اپنی نگاہ نیچی رکھے اور عورت کی طرف نہ دیکھے لیکن یہاں کیمرے کے ذریعے ان خواتین کو دنیا بھر کے

مردوں کو دکھانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

سوال: پاکستان کی انتظامیہ کی یہ روش وہی ہے کہ ہڑتال اور ہنگامے کے جواب میں وہ مسائل حل کرتی ہے جبکہ یہ روش درست نہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ انگریزوں کے زمانے میں بھی اس وقت کے حکام کی روش یہی تھی کہ توجہ ان کی طرف کرو جو شور غل اور ہنگامہ برپا کرنے والے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ بس یہی وہ چیز ہے جو اہمیت رکھتی ہے۔ معقولیت اور دلیل کے ساتھ جو لوگ اپنے مطالبات منوانا چاہتے تھے وہ ان کے نزدیک قابلِ اعتناء نہ تھے کیونکہ ان لوگوں کی طرف سے انھیں کسی ہنگامے کا خطرہ نہ تھا۔ انگریز گئے تو یہ سبق ہمارے حکمرانوں کو بھی سکھا گئے اور اس سبق پر بدستور عمل ہو رہا ہے۔ آپ معقولیت اور دلیل کے ساتھ بات کریں تو حکمران اسے قابلِ قدر تو ضرور سمجھیں گے لیکن ماننے کیلئے تیار نہیں ہوں گے۔ اس کے برعکس آگ لگانے اور گھیراؤ کرنے کی اسکیم چلائی جائے تو وہ فوراً جھک جائیں گے اور ناجائز مطالبات تک کو مان لیں گے۔ بظاہر ان حالات میں ایک شخص یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ہم بھی اپنے جائز مطالبات کو منوانے کے لئے آگ لگائیں اور گھیراؤ کریں۔ لیکن در حقیقت نہ اس شخص کا یہ فیصلہ درست ہے اور نہ حکمرانوں کی یہ روش صحیح ہے ____ جب ایک شخص یہ فیصلہ کرتا ہے تو ممکن ہے کہ وہ کچھ عرصے تک پورے خلوص اور دیانتداری کے ساتھ یہ عمل کرے۔ لیکن زیادہ دیر تک وہ اس اخلاص پر عامل نہیں رہ سکتا اور اس کے اندر بھی وہی مفسدانہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے جو مفسد لوگوں کا خاصہ ہے، اور جب حکمران ہنگامہ وفساد برپا کرنے والوں کے آگے جھکتے ہیں تو وہ نہ صرف اپنے حق میں دشمنی کرتے ہیں بلکہ ملک کے حق میں بھی دشمنی کا بیج بوتے ہیں۔ گویا حکومت کی طرف سے معقولیت کی ہمت شکنی اور نامعقولیت کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور مفسدوں کے گروہ کو پالا جاتا ہے۔ جو اہلِ حکومت کے لئے بھی چیلنج بن سکتا ہے اور ملک کی سالمیت کے لئے بھی۔

مراکش میں اسلامی تحریک کے روزنامے ''العلم'' کے لئے انٹرویو، جس سے مراکشی نوجوانوں کے ذہنی رجحانات اور اندازِ فکر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے

نومبر ۱۹۶۹ء

العلم: آپ دنیا میں اس وقت سب سے نمایاں اور ممتاز اسلامی رہنما اور داعی ہیں، آپ کی رائے میں اس وقت دعوتِ اسلامی کس طرح کی صورتِ حال سے دوچار ہے اور اس کا مستقبل کیا ہے؟

مولانا محترم: دعوتِ اسلامیہ کو تمام مسلمان ملکوں میں ایک ہی صورتِ حال سے سابقہ در پیش ہے اور وہ یہ ہے کہ استعمار نے اپنے براہِ راست اور بالواسطہ اثرات سے ہر جگہ ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا ہے جو علمی اور فکری حیثیت سے اسلام سے بہت بعید اور عادات و اخلاق اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے مسلمانوں کیلئے قریب قریب بالکل اجنبی ہو گیا ہے۔ یہی طبقہ استعمار کے زمانے میں یا تو حکومت کے مناصبِ عالیہ پر قابض ہوا یا آزادی کی تحریکوں سے سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کا رہنما بنا۔ پھر جب استعمار سے مسلمان ممالک آزاد ہوئے تو اس طبقے کے ہاتھ میں ہر جگہ حکومت کی باگیں منتقل ہو گئیں۔ اور اب یہ طبقہ ہے تو مسلمان قوموں ہی کے افراد میں سے، لیکن اس کے جذبات، خیالات اور عادات سب مسلمانوں سے مختلف ہیں۔ وہ اگر مستعمرین کے نظامِ سرمایہ داری سے ہٹ کر کوئی چیز سوچ سکتا ہے تو وہ نظامِ اشتراکی ہے۔ کیونکہ جو علوم اس نے حاصل کیے اور جو عادات اُس نے اختیار کی ہیں، ان کے لحاظ سے وہ ان ہی دو مسلکوں میں سے کسی ایک مسلک کا

تصور کرسکتا ہے۔ اس کے برعکس عام مسلمان اور ان کے مذہبی طبقے' فطری طور پر ہر جگہ آزادی کے طالب اس لئے ہوئے تھے کہ اُسی نظامِ اسلامی کو تازہ کریں جس سے استعمار نے انہیں محروم کیا تھا اور آزادی کے بعد وہ قدرتی طور پر اس چیز کے متوقع تھے کہ ایسا ہو۔ لیکن عملاً ایسا نہیں ہو رہا ہے اور اسی کی وجہ سے تمام مسلمان ملکوں میں ازسرنو ایک نزاع برپا ہوگئی ہے جو استعمار کے خلاف جدوجہد کی بہ نسبت شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ عام مسلمان ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو اسلامی نظام چاہتے ہیں اور اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو یہ نہیں چاہتے۔ اگر فیصلہ بندوق کے بجائے انتخابات میں لوگوں کے ووٹوں سے ہوتا تو ہر جگہ پُرامن طریقے سے اس مسئلے کا فیصلہ ہو جاتا۔ لیکن قریب قریب ہر جگہ ووٹ کے بجائے مال اور طاقت دونوں کو فیصلہ کن بنا دیا گیا ہے اور عام باشندے آئے دن کے انقلابات کے تماشائی بن کر رہ گئے ہیں۔ اسی صورتِ حال نے عربوں کو اسرائیل کے مقابلے میں بے بس کر دیا ہے۔ اور اسی صورتِ حال نے غیر عرب مسلمان ملکوں کے اندر بھی تمام حکومتوں کو کمزور کر کے رکھ دیا ہے۔ مستقبل کا سارا انحصار اس پر ہے کہ آیا مسلمان ملکوں میں جمہوریت اپنی صحیح شکل میں نافذ ہوتی ہے یا نہیں۔ یعنی دوسرے الفاظ میں آیا مسلمان ملکوں کے عوام کو اپنی قسمت کے فیصلے کا آزادانہ حق مل جاتا ہے یا نام نہاد انقلابی آمر خود اپنی قوموں کا مستقبل طے کرتے رہتے ہیں۔ پہلی صورت میں مستقبل انشاء اللہ شاندار ہے اور اگر دوسری صورت جاری رہی تو انا للہ وانا الیہ راجعون، کوئی نہیں جانتا کہ ان ملکوں کا حشر کیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ آخرکار پھر اپنی آزادی کھو دیں۔

العلم: اسلامی تحریک کے لئے اچھے اور کارآمد داعی اور کارکن تیار کرنے کے لئے کونسے وسائل اختیار کرنا ضروری اور مفید ہے؟

مولانا محترم: سب سے زیادہ اہم چیز تو یہ ہے کہ جو لوگ بھی اسلامی دعوت کا کام کریں وہ اس دعوت کی حقیقت و ماہیت کو اچھی طرح جان لیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ علم کے بعد پورے اخلاص کے ساتھ اس دعوت کے اصول ومبادی پر ایمان لائیں۔ اور تیسری چیز یہ ہے کہ وہ تمام شرائط کو پورا کریں جو دنیا میں کسی تحریک کی کامیابی کے لئے ناگزیر ہوتی

ہیں۔ یعنی توحید صفوف، منظم کام اور حکمت و تدبر کے ساتھ اپنی دعوت کو آگے بڑھانے کے لئے حالات وظروف کے مطابق مسلسل سعی۔

العلم: جماعت اسلامی نے آج تک دعوتِ اسلامی کے بارے میں کتنے مراحل طے کیے ہیں اور پاکستان کے اندر اور پاکستان کے باہر اب تک جماعت نے کیا کیا کام سرانجام دیے ہیں؟

مولانا محترم: سب سے پہلے ہم نے اپنے خیالات وسیع پیمانے پر پھیلائے۔ پھر چند سالوں کے بعد جب ایک معتد بہ تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہوگئی جو ان خیالات کو صحیح سمجھتے تھے تو ان کی تنظیم و تربیت کا کام کیا گیا۔ اس کے بعد جیسے جیسے لوگ اس دعوت کے لئے کام کرنے کی صلاحیت کے حامل ہوتے گئے۔ ہم نے اپنی مساعی کو چار اہم شعبوں میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ ایک 'تطہیر افکار اور تعمیر افکار' دوسرے 'صالح افراد کی تلاش، تنظیم اور تربیت۔ تیسرے 'اصلاح معاشرہ'۔ اور چوتھے 'نظامِ حکومت کی اصلاح اور اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کی کوشش'۔ کئی سال گزرنے کے بعد ہم نے دنیا کی مختلف زبانوں میں اپنے لٹریچر کے تراجم اور اشاعت کا انتظام کیا۔ اس وقت ترکی، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں میں اچھی خاصی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ان کے اثرات تمام ان ملکوں میں پھیل رہے ہیں جہاں یہ زبانیں بولی یا سمجھی جاتی ہیں۔ جہاں تک نظامِ حکومت کی اصلاح کا تعلق ہے، اسلام کو پاکستان کے دستور کی بنیاد تسلیم کرایا جا چکا ہے جس سے اب ہٹنا کسی حکومت کے لئے ممکن نہیں رہا ہے۔ اب یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ ملک میں ایک دفعہ آزادنہ اور منصفانہ انتخابات ہو جائیں تاکہ عملاً اقتدار اُن لوگوں کی طرف منتقل ہونے کا کم از کم آغاز ہو جائے جو حکومت کے نظام کو اسلامی اصولوں پر چلانا جانتے بھی ہوں اور چاہتے بھی ہوں۔

العلم: آپ نے برتھ کنٹرول کے موضوع پر ایک کتاب تالیف کی ہے۔ کیا آپ اسلامی نقطہ نظر سے ابھی تک برتھ کنٹرول کی پالیسی کے مخالف ہیں؟

کیا آپ اپنی کتاب میں مزید دلائل کا اضافہ کر سکتے ہیں؟

مولانا محترم: اس مسئلے میں میرے خیالات اب بھی وہی ہیں جو میں اپنی کتاب میں بیان کر چکا ہوں۔ ان میں کسی ترمیم کی ضرورت میں نے محسوس نہیں کی ہے۔ اس مسئلے کے متعلق مزید مواد جمع کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ترتیب کے موقع پر اس کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ کتاب کی اشاعت کے بعد بہت سے مزید دلائل و شواہد سامنے آئے ہیں جو اس نقطہ نظر کو زیادہ تقویت پہنچاتے ہیں جو میں نے اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

العلم: پاکستانی عوام نے مسجد اقصیٰ کی آتشزنی پر بلاشبہ اپنے شدید غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے۔ لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ فلسطینی مجاہدین کی امداد کے لئے آپ نے مثبت طور پر کیا اقدامات کیے ہیں؟

مولانا محترم: اس وقت تو پاکستان کے لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ فلسطین کے مسئلے کو ایک عرب مسئلہ قرار دینے کی جو غلطی اب تک کی جاتی رہی ہے، اس کی اصلاح ہو۔ اور اس کو اسلامی مسئلہ قرار دے کر تمام دنیا کی مسلمان حکومتیں اور سب سے بڑھ کر پاکستان کی حکومت، فلسطین کی آزادی کے لئے جہاد پر تیار ہو جائے۔ اگر اس میں کامیابی ہو جائے تو انشاء اللہ پاکستان کے مسلمان جان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

☆

اسلامی جمعیت طلبہ، مشرقی پاکستان کی سالانہ کانفرنس ایڈن ہوٹل، ڈھاکہ میں ایک نشست ــــــ ۱۷ جنوری ۱۹۷۰ء

”میں عبدالمالک مرحوم کی شہادت کے بعد پہلی مرتبہ یہاں آیا ہوں اس لئے چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے ہم اور آپ سب فاتحہ پڑھیں اور عبدالمالک مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کریں۔

”یا اللہ! عبدالمالک کو اپنے دامنِ رحمت میں جگہ دے۔ اور جس مقصدِ عظیم کے لئے عبدالمالک نے اپنی جان دی ہے۔ اُس مقصد کو اس سرزمین میں کامیاب کر۔ یا اللہ! عبدالمالک کی قربانی کو اپنی راہ میں قبول فرما۔ عبدالمالک کی ماں اور بھائیوں کو صبر عطا فرما۔ اور تحریکِ اسلامی سے ایسے ہزاروں نوجوانوں کو تیار کر دے جو اس سرزمین میں اللہ کے کلمے کو بلند کریں۔! آمین:“

سوال: آپ کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ آپ قومیانے Nationalization کو غیر اسلامی سمجھتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کے اصل خیالات کیا ہیں؟

جواب: قومیانے کے بارے میں جو بات ہم نے کہی ہے اس کو پوری طرح سے آپ سمجھ لیتے تو یہ سوال نہ کرتے۔ ہم نے جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ مکمل طور پر قومیانا غیر اسلامی ہے۔ یعنی تمام ذرائع پیداوار حکومت کے کنٹرول میں آ جائیں۔ یہ چیز جائز نہیں۔

کیوں کہ اگر ایسا کیا جائے تو نتیجہ یہ ہو گا کہ جس کے پاس قانون کی، فوج کی اور پولیس کی طاقت ہے، اس کے پاس تجارت بھی آ جائے گی، انڈسٹری بھی آ جائے گی اور زمینیں بھی اُس کے کنٹرول میں ہوں گی۔ تجارت اور انڈسٹری اور سیاست کا ایک جگہ جمع ہو جانا ایسی ڈکٹیٹرشپ کو جنم دیتا ہے کہ جس سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ اس وجہ سے Total-nationalization کو ہم غلط سمجھتے ہیں۔ اب رہا Partial-nationalization، تو اس کے بارے میں جو بات ہم نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ جس انڈسٹری یا تجارت کے بارے میں یہ محسوس کیا جائے کہ گورنمنٹ کنٹرول میں چلائی جائے، اس کے بارے میں یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ گورنمنٹ اپنے کنٹرول میں لے لے۔ لیکن اس کو کنٹرول میں لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس بات کو ضرور دیکھنا ہو گا کہ بیوروکریسی کی جو مشہور خرابیاں ہیں وہ ان میں مبتلا نہ ہو جائیں —————— Partial-nationalization (جزئی قومیانے) کا عمل تو اس وقت بھی موجود ہے۔ ریلوے Nationalized ہے۔ کیا کسی نے کہا ہے کہ یہ اسلام کے خلاف ہے —————— اسی طرح واپڈا بھی Nationalized ہے اور کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا کہ یہ خلاف اسلام ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ قومیانے کی صورت میں کس قدر خرابیاں ان میں جنم لے چکی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کیا صورت ہے، لیکن مغربی پاکستان میں یہ پوزیشن ہے کہ جس روز لاہور میں بجلی غائب نہیں ہوتی اس روز ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اتفاق سے آج بجلی غائب نہیں ہوئی ہے۔ لاہور میں عام طور پر جب بجلی غائب ہوتی ہے تو لوگ کہتے ہیں اس کو ''واپڈا'' ہو گیا ہے۔

سوال: اگر قومیت کی بنیادیں رنگ اور علاقہ نہیں ہو سکتیں۔ تو کیا اقلیتیں قوم میں شامل نہیں اور کیا غیر مسلموں کو مسلمانوں کے برابر حقوق نہیں دیے جا سکتے؟

جواب: میں نے یہ نہیں کہا کہ حضورؐ نے تمام انسانوں کو ایک قوم بنا دیا بلکہ یہ کہا ہے کہ آپؐ نے قومیت کے لئے ایک اصول دیا ہے۔ آدمی کا رنگ، قومیت اور نسل تبدیل نہیں

ہو سکتے۔ لیکن وہ ایک اصول اختیار کر سکتا ہے۔ حضورؐ نے اسی سبب سے کلمے کو بنیاد قرار دیا۔ اب آپ یہ کہتے ہیں کہ کلمہ نہ ماننے والوں کو کلمہ ماننے والوں کے برابر حقوق دیے جائیں، تو میں نہیں سمجھتا کہ یہ مطالبہ کسی طرح سے معقول اور درست ہے۔ جو آدمی ایک اصول کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا اور نہ اس ذمہ داری کو اُٹھاتا ہے جو اس کلمے سے ایک کلمہ گو پر عاید ہوتی ہے تو وہ ان حقوق میں ان کے ساتھ کیسے شریک ہو سکتا ہے۔ اشتراکی ریاست اصولوں پر قائم کی جاتی ہے کیا اس میں اس شخص کو برابر کا درجہ دیا جاتا ہے جو اشتراکیت کے اصولوں پر ایمان نہیں رکھتا۔ ظاہر بات ہے کہ جو شخص ایک اصول کو نہیں مانتا، وہ برابر کا درجہ نہیں پا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود آپ فرق ملاحظہ فرمائیں کسی قوم نے اپنا نظریہ نہ ماننے والوں کو وہ حقوق نہیں دیے جو اسلام نے اپنی اقلیتوں کو دیے ہیں۔ دوسروں نے یہ حقوق صرف کاغذ پر دیے لیکن اسلام نے انھیں زمین پر دیے۔ ان اقلیتوں کو تمام شہری CIVAL حقوق حاصل تھے، ان کی جان، مال، آبرو مسلمان ہی کی طرح قیمتی اور محفوظ تھی۔ البتہ جو چیز کسی غیر مسلم کو نہیں دی جا سکتی، وہ سیاسی حقوق ہیں۔ یہ حقوق صرف اسی شخص کو مل سکتے ہیں جو کلمہ اسلام کا ماننے والا اور اس کی تمام ذمہ داریوں کو اُٹھانے والا ہو، باقی ہر معاملے میں غیر مسلم مسلمان کے برابر درجہ رکھتا ہے۔

سوال: عہدِ جدید میں قومی جذبات کے ذریعے جنگ میں کام لیا جا سکتا ہے۔ کیا قومی جذبات اس پہلو سے مفید نہیں ہیں؟

جواب: مسلمان کے اندر قومی جذبے کو اُبھارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مسلمان خدا کی خاطر جہاد کرتا ہے اور یہ وہ جذبہ ہے کہ جس کی گرد کو بھی قومی جذبہ نہیں پہنچ سکتا۔ ایک مسلمان جہاد کے لئے وہ قربانی دے سکتا ہے جو ایک قوم پرست اپنے قومی جذبے کے ساتھ نہیں دے سکتا اور مسلمانوں نے ہمیشہ اسی جذبے سے کام کیا ہے اور ان سے جب بھی کام لیا گیا ہے اسی جذبے سے لیا گیا ہے۔ الجزائر میں جو جنگِ آزادی لڑی گئی تھی، وہ قومی جذبے کی بنیاد پر نہیں لڑی گئی تھی بلکہ مسلمانوں کو بتایا یہ گیا تھا کہ فرانسیسی استعمار کے خلاف جنگ کفر و اسلام کی جنگ ہے۔ ترکی میں جس وقت یونانی گھس آئے اور ترکی قوم

سخت مصیبت سے دوچار تھی، تو مصطفےٰ کمال پاشا نے ہاتھ میں قرآن لے کر قوم کو پکارا تھا کہ اس کو بچانا ہو تو میرا ساتھ دو۔ مسلمان خدا کی راہ میں لڑتا ہے اسے کسی قومی جذبے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہماری نادانی ہے کہ ہم اس جذبے کو اتنا بلند سمجھ رہے ہیں۔

سوال: مشرقی پاکستان میں قومیت کی تحریک اُٹھ رہی ہے۔ تحریک اسلامی اس تحریک کا کس طرح مقابلہ کرے گی؟ جبکہ قوم پرستانہ تحریک کے حامی یہاں کے لوگوں کو اکسا رہے ہیں کہ وہ مغربی پاکستان سے آنے والے کسی شخص کی بات نہ سنیں؛

جواب: میں ۱۹۵۶ء سے مشرقی پاکستان آ رہا ہوں۔ عوام نے ہمیشہ میری بات سنی ہے۔ آپ بھی عوام ہیں۔ کیا آپ میری بات نہیں سن رہے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ یہاں کے عوام مغربی پاکستان کے کسی شخص کی بات نہیں سنیں گے۔ اسی طرح مشرقی پاکستان کے لوگ وہاں جاتے ہیں تو وہاں کے عوام بڑی خوش دلی سی ان کی بات سنتے ہیں۔ قومیت کی موجودہ تحریک ہمیں جوڑنے کے لئے نہیں پھاڑنے کے لئے چلائی جا رہی ہے۔ اس کا مقابلہ اسی طرح سے کیا جا سکتا ہے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے اسلام کو پیش فرمایا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے اسلام کو عرب دیش کے نام پر پیش نہیں کیا تھا، نہ آپؐ نے زبان کا نعرہ بلند کیا تھا۔ آپؐ نے صرف یہ دعوت دی کہ اللہ کے ماننے والے اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ایک ہو جائیں۔ عربی ابوجہل کی زبان بھی تھی لیکن ابوبکر صدیقؓ اور ابوجہل میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اُمتِ مسلمہ میں لوگ زبان اور وطن کے نام پر جمع نہیں ہوئے تھے۔ سلمان فارسیؓ اور بلالؓ حبشی غیر عربی تھے لیکن مسلمانوں نے اُنھیں اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔ کہ وہ خدا کو ماننے والے اور رسولؐ کو ماننے والے تھے۔ اُمتِ مسلمہ اسی اصول پر قائم ہوئی تھی کہ جمع کرنے والی چیز رنگ، زبان، نسل اور وطن نہیں بلکہ خدا پر ایمان اور اس کے رسولؐ پر ایمان ہے۔ اگر آپ خدا اور رسولؐ کو ماننے والے ہیں تو آپ بھائی بھائی ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اہلِ ایمان بھائی بھائی ہیں۔ آپ دینِ اسلام کی اس بنیاد کو پیش کریں گے تو غلط فہم

کی قومیت کی تحریک انشاءاللہ خود بخود ختم ہو جائے گی۔

سوال: اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں کیا فرق ہے؟

جواب: مغربی جمہوریت عوام کی حاکیت پر قائم ہے۔ اسلامی جمہوریت اس بات کا عہد کرتی ہے کہ وہ خدا اور رسولؐ کے احکام سے سرمُو انحراف نہ کرے گی۔ اس جمہوریت میں باہمی مشورے سے امور طے کیے جاتے ہیں اور عامۃ المسلمین جس کو کسی منصب پر چاہتے ہیں، مشورے سے قائم کر دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں مشورے سے معزول کر دیتے ہیں۔ یہ اسلامی جمہوریت ہے۔

مغربی اور اسلامی جمہوریت میں جو دوسرا فرق ہے وہ یہ ہے کہ مغربی جمہوریت کے پاس کلی اختیارات ہوتے ہیں کہ وہ جس چیز کو چاہے حرام قرار دے دے۔ مثلاً شراب مغربی جمہوریت کے فیصلے سے جائز اور حلال ہو سکتی ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریت میں خدا نے شراب کو حرام کر دیا ہے تو پوری قوم بھی مل کر اسے حلال نہیں کر سکتی۔

سوال: آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ جب بھی مسلمانوں نے غیر مسلموں کے کسی علم اور ثقافت کو اختیار کیا ہے تو انھوں نے ان علوم اور ثقافت کو مسلمانوں کے علوم اور ثقافت میں تبدیل کر دیا ہے۔ براہِ کرم اس کی وضاحت فرمائیے۔

جواب: دنیا میں جتنے بھی علوم ہیں، ان میں ایک چیز ہوتی ہے، فطرت کے حقائق (Realities of nature) جو امرِ واقعہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک چیز ہے انسان کا دماغ، جو ان حقائق کو ترتیب دیتا ہے اور ترتیب دے کر ایک نظریہ بناتا اور ایک تصور (Concept) اختیار کرتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے وہ عالمگیر ہیں، حقائق ہندوستانی یا پاکستانی یا روسی یا جاپانی نہیں ہو سکتے، وہ تو محض حقائق ہیں۔ لیکن روسی دماغ (اور اس سے میری مراد کمیونسٹ نظام ہے)، ان حقائق کو مارکسی ذہن کے ساتھ جمع کرتا ہے۔ آپ روسی سائنس اور اشتراکی فلسفہ وغیرہ کی

اصطلاحیں بنتے ہیں۔ یہ سب اسی بات کی مثالیں ہیں۔ کمیونزم نے کائنات اور انسان کے متعلق ایک خاص تصور اختیار کر رکھا ہے۔ اس کا اپنا ایک نظریہ تاریخ بھی ہے۔ اب جتنے حقائق بھی کمیونسٹوں کے سامنے آتے ہیں، خواہ وہ حیاتیات کے حقائق ہوں یا علم الابدان کے یا کسی اور علم کے، وہ ان سب کو ترتیب دے کر اپنے اشتراکی نظریات کے مطابق ایک سائنسی نظام بناتے ہیں ______ تاکہ اشتراکی معاشرے کا ہر بچہ سائنس کی وہ تعلیم حاصل کرلے جو اشتراکی نظریے کے مطابق ہو ______ ایسا ہی دوسرے لوگوں کا معاملہ ہے۔ مثلاً مغربی سائنسدان ہیں، انھوں نے اپنے ذہن میں کائنات، خدا اور انسان کا ایک تصور قائم کر رکھا ہے۔ وہ اپنے اس تصور کے مطابق اس کائنات کے نظام کو بغیر خدا کے چلتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کائنات کے نظام میں خدا کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جگہ اپنے گھر میں خدا کی ہستی کو مانتے بھی ہیں، لیکن سائنس اور تاریخ اور فلسفے کی دنیا میں وہ خدا کو غیر موجود فرض کر کے سارے حقائق کی توضیح وتشریح کرتے ہیں۔ اس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ ایک خاص نقطۂ نگاہ رکھنے والے کس طرح مختلف علوم اور سائنس کو اس خاص تصور کے مطابق مرتب کرتے ہیں۔

مسلمانوں نے جب مختلف علوم وفنون سیکھے تو ان سب کو انھوں نے ان معنوں میں مسلمان بنا دیا کہ مسلمان کے دماغ سے سوچا اور جتنے حقائق بھی ان کے سامنے آئے ان کے بارے میں انھوں نے وہ بنیادی تصور اپنے سامنے رکھا جو اسلام نے انھیں عطا کیا۔ اسی کے مطابق انھوں نے اس کی تشریح وتوضیح کی۔

اس بات کو آپ ایک مثال کے ذریعے دیکھیں:

یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ پانی جب ایک خاص درجے تک ٹھنڈا ہوتا ہے تو وہ سکڑتا ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر جب وہ برف بننے کے قرب ہوتا ہے تو پھیل جاتا ہے۔ برف ہلکی ہوتی ہے اس لئے پانی کے اوپر آ جاتی ہے، یہ ایک عجیب مظہر فطرت Pheomena ہے کہ جو چیز جتنی ٹھنڈی ہوتی چلی جائے گی اسی قدر سکڑتی جائے گی

لیکن پانی ایک خاص درجے پر پہنچ کر سکڑنے کے بجائے پھیل جاتا ہے اور جب برف کی شکل اختیار کرتا ہے تو اپنے سے کم ٹھنڈے کے مقابلے میں ہلکا ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کا سائنسدان جب اس حقیقت کو بیان کرے گا تو وہ کہے گا کہ ایسا ہوتا ہے کیونکہ یہ پانی کے سکڑنے اور پھیلنے کا قانون ہے۔ مسلمان جب اسی امرِ واقعہ کو بیان کرے گا تو کہے گا کہ خدا نے پانی کے اندر یہ خاصیت رکھی ہے اس لئے ایسا ہوتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص مصلحت کارفرما ہے۔ اگر پانی برف کی صورت میں ہلکا ہو کر اوپر آنے کی بجائے، بھاری ہو کر نیچے جاتا رہتا تو پورے سمندر برف بن جاتے، آبی زندگی ختم ہو جاتی اور پانی کے تمام جانور ختم ہو جاتے۔ یہ خاصیت اللہ تعالیٰ نے پانی کے اندر رکھی ہے تاکہ یہ جانور محفوظ رہیں۔ موجودہ سائنسدان بھی اس فائدے کو تسلیم کرتے ہیں' لیکن ان کے نزدیک یہ محض ایک فطری قانون ہے جبکہ مسلمان اس میں اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی حکمت دیکھتا ہے۔ یہ فرق ہے ایک مسلمان سائنس دان کے بیان کرنے میں اور ایک ملحد اور کافر سائنسدان کے نقطۂ نگاہ میں۔ مسلمان خدا کو اس کائنات کا خالق و مالک و فرمانروا سمجھتے ہوئے ہر چیز کی تشریح و توضیح کرے گا۔

☆

اسلامی جمعیت طلبہ، کراچی کے زیر اہتمام اجتماع عام میں سید مودودیؒ نے شرکت فرمائی، جہاں پر یہ نشست منعقد ہوئی ____ ۱۶ جون ۱۹۷۰ء

عزیز نوجوانو!

میں آپ کے سوالات کے جوابات دینے سے پہلے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ابھی آپ کے محترم رفیق نے آپ سے یہ کہا تھا کہ اس شخص سے اپنا پورا پورا حق وصول کرو۔ بلاشبہ آپ کا مجھ پر حق ہے لیکن آپ کو اپنا فرض بھی تو یاد رکھنا چاہیے۔ آپ کو یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ آپ ایک بیمار آدمی سے اپنا حق وصول کر رہے ہیں۔

سوال: وہ کون سے عوامل ہیں جو طلباء کو اور عام لوگوں کو اسلامی تحریک سے قریب تر کرنے میں مدد دے سکتے ہیں؟

جواب: سب سے پہلا عامل تو یہ ہے کہ طلباء بھی اور اس ملک کے عوام بھی خدا کے فضل سے مسلمان ہیں۔ یہ ان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اسلامی نظام کے لئے جو کام ہو رہا ہو وہ اس کے قریب آئیں، اس سے تعاون کریں اور اس میں حصہ لیں۔ لیکن تعاون کا یہ جذبہ ان کے اندر اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب انہیں یہ اعتماد ہو جائے کہ اسلامی نظام کے لئے جو گروہ اس ملک میں کام کر رہا ہے وہ واقعی مخلص اور دیانت دار لوگوں پر مشتمل ہے اور غلبہ اسلام کے سوا اس کی کوئی اور نیت نہیں ہے۔ اگر آپ طلباء میں اور عام لوگوں میں یہ اعتماد پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ تحریک اسلامی کے بہت قریب آ سکتے ہیں بلکہ اس

کا دست و بازو بن سکتے ہیں۔

دوسرا عامل مسلمانوں کا جذبۂ ایمانی ہے۔ جن لوگوں کے اندر ایمان کی کچھ رمق بھی موجود ہے، وہ موجودہ حالات میں چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ اگر انھیں بتایا جائے کہ جاہلانہ افکار و نظریات ان کے ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے تیزی سے بڑھ رہے ہیں، ملحدانہ تحریکیں اس ملک میں اسلام کے خلاف انتہائی گھناؤنی سازش کر رہی ہیں اور اسلامی تہذیب، اسلامی تمدّن اور اسلامی طرزِ زندگی کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا ہے تو مسلمانوں کے لئے حق و باطل کی اس کشمکش میں غیر جانبدار رہنا محال ہے۔ وہ ضرور ان لوگوں کا ساتھ دیں گے جو اسلامی نظام کے لئے کام کر رہے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ان کے اندر یہ احساس پیدا کیا جائے۔

بس یہی دو عامل لوگوں کو اسلامی تحریک سے قریب تر کرنے کے لئے کافی ہیں۔

سوال: اسلامی تحریک کے کارکن میں کون سے اوصاف ہونے ضروری ہیں؟

جواب: اس موضوع پر میں اس سے پہلے مدلل مضامین لکھ چکا اور تقریریں کر چکا ہوں۔ میرے لئے مشکل ہے کہ اب پھر ان تفصیلات کو دہراؤں۔ تاہم چند باتیں مختصراً عرض کرتا ہوں:

کسی بھی تحریک کا کارکن ہونے کے لئے انفرادی حیثیت سے آدمی کے اندر اوّلین خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ جس عقیدے پر ایمان رکھتا ہے اور جس نظریے کو برحق سمجھتا ہے اس کے مطابق زندگی کو بھی ڈھالے اور اپنے عمل سے اس نظریے کی سچائی کا ثبوت پیش کرے۔ آدمی کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ مانتا تو کسی عقیدے کو ہو اور عمل اس کا کسی دوسرے عقیدے پر ہو۔ قول و عمل کا یہ تضاد خرابی کی جڑ ہے۔ آدمی کے اندر اپنے عقیدے سے خلوص کم اور منافقت بڑھتی چلی جائے تو یہ چیز بالآخر اسے تباہ کر کے چھوڑتی ہے۔ اس لئے اوّلین خصوصیت تو آپ کو اپنے اندر یہ پیدا کرنی چاہیے کہ آپ کے عقیدے اور عمل میں کوئی تضاد نہ ہو، مضبوط سیرت و کردار کے حامل افراد ہی تحریک اسلامی کے بہترین کارکن ثابت ہو سکتے ہیں۔

دوسری اہم خصوصیت آپ کے اندر یہ ہونی چاہیے کہ جس مقصد و نصب العین کے لئے آپ کام کر رہے ہیں اسی مقصد و نصب العین کے لئے دوسرے کام کرنے والوں کے ساتھ آپ کا تعاون و اتحاد قائم رہے۔ خود قرآن کریم میں آتا ہے۔ اِنما المؤمنون اِخوۃ یعنی جو لوگ ایمان کے رشتے سے منسلک ہیں انھیں آپس میں بھائی بھائی ہونا چاہیے، انھیں ایک دوسرے کا رفیق و غمگسار اور ہمدرد ہونا چاہیے۔ ان کے درمیان کینہ، حسد اور چھین جھپٹ کے جذبات نہ پیدا ہونے پائیں۔ انھیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنا چاہیے۔ وہ یہ طے کرلیں کہ بیٹھیں گے تو مل کر بیٹھیں گے اور چلیں گے تو قدم سے قدم ملا کر چلیں گے۔ اس طرح تھوڑی تعداد میں ہونے کے باوجود آپ ایک بڑی تعداد کی سی قوت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ان اوصاف کی عدم موجودگی میں اگر آدمیوں کی بڑی سے بڑی بھیڑ بھی اکٹھی ہو جائے تو وہ کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتی۔

مضبوط سیرت و کردار کے حامل افراد کی تنظیم کی مثال اس عمارت کی سی ہے جس کی ایک ایک اینٹ اپنی جگہ پختہ ہوتی ہے اور آپس میں جڑی رہتی ہے۔ ایسی عمارت کو ڈھانا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کچی اینٹوں سے کوئی خوبصورت عمارت بنالی جائے تو وہ ذرا سی کوشش سے ڈھائی جاسکتی ہے۔

سوال: آپ کے اندر احیائے اسلام کے لئے ایک تحریک برپا کرنے کا خیال کیوں کر پیدا ہوا۔ براہ کرم ان حالات کی نشان دہی کیجیے؟

جواب: میرے عزیزو! آپ میری تقریریں سنتے رہتے ہیں اور میری تحریریں بھی آپ نے پڑھی ہیں، میں نے کبھی اپنی ذات کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس بات کو سمجھ لیجیے کہ قرآن و حدیث کے مطالعے کے بعد میرے ذہن میں اسلام کا جو صحیح تصور اُبھرا، اس کے مطابق میرے دل نے کہا کہ تمھیں اس کے لئے کوشش کرنی چاہیے۔ میں اللہ کا نام لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور آج تک اسی کام میں لگا ہوا ہوں۔

سوال: کیا تحریکِ اسلامی کے لئے ضروری ہے کہ وہ حالات کے مطابق بدلتی رہے

یا پھر اسے ایک ہی راہ پر گامزن رہنا چاہیے؟

جواب: اس سلسلے میں دو چیزوں کو ملحوظ رکھیے۔ ایک چیز تو اصول اور مقصد ہے اور دوسری چیز طریقِ کار ہے۔ اصول ہمیشہ ناقابل تغیر و تبدل ہونے چاہئیں۔ لیکن اصولوں کو روبہ عمل لانے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ موجودہ حالت میں کون سا طریقِ کار مناسب رہے گا؟ ہم خلا میں کام نہیں کر رہے ہیں کہ آنکھ بند کیے ایک لگے بندھے راستے پر چلتے چلے جائیں۔ ہمیں حالات کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا پڑے گا اور اس کے مطابق اپنے کام کرنے کے طریقے میں تبدیلی لانی پڑے گی۔ اگر ہم نے طریقِ کار میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ اپنے اصول اور مقصد میں بھی تبدیلی کر ڈالی تو تحریک ہی فنا ہو کر رہ جائے گی۔

سوال: ان دنوں اسلامی جمعیت طلبہ کی طرف طلباء بڑی کثرت سے رجوع کر رہے ہیں۔ ہمارے لئے ان کی تربیت کا مسئلہ پریشان کن بن گیا ہے۔ بتائیے کیا کریں؟

جواب: اصل میں معاملہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی تحریک کامیابی کی منزلوں کے قریب پہنچتی ہے تو عام لوگوں کی توجہ کثرت سے اس کی طرف مبذول ہو جاتی ہے اور وہ اس میں شامل ہونے لگتے ہیں۔ یہ ایک فطری بات ہے اور ہمیشہ ایسا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی تربیت کا انداز ان لوگوں سے مختلف ہوتا ہے جو پہلے سے اس تحریک کو چلانے والے ہوتے ہیں۔ یہی لوگ تحریک کا اصل جوہر ہیں، اگر ان کی تربیت صحیح بنیادوں پر ہوئی ہو، اور وہ اپنی اصول پرستی کے لحاظ سے بے لچک کردار کے مالک ہوں تو جو لوگ بھی ان کے گرد جمع ہوتے ہیں وہ آپ سے آپ ان کے کردار سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ان میں بھی وہی سپرٹ پیدا ہو جاتی ہے جو تحریک کو چلانے والوں میں پائی جاتی ہے۔

عام لوگوں کی یہ خاصیت ہے کہ وہ جس اپیل یا تحریک سے متاثر ہوتے ہیں اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے میں کوئی وقت نہیں لگاتے۔ مثال کے طور پر ابھی چند دن پیشتر شوکتِ اسلامؒ کے عظیم الشان مظاہرے میں شریک ہوئے۔ انھیں چونکہ اسلام کی شوکت کا مظاہرہ کرنے اور اللہ کا علم بلند کرنے کے نام پر جمع کیا گیا تھا، اس لئے یک لخت

لوگوں میں ایک ایسی اخلاقی سپرٹ پیدا ہو گئی، جس کی مثال اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ ان لاکھوں آدمیوں کی تربیت کسی کے بس کی بات نہ تھی، لیکن کلمہ طیبہ کی اپیل میں جو اخلاقی تربیت پوشیدہ تھی اس نے خود بخود انھیں اسلامی اخلاق کے پیکر بنا دیا تھا۔ پاکستان کے کسی گوشے سے بھی یہ شکایت سننے میں نہیں آئی کہ شوکتِ اسلام کے مظاہرے میں کوئی خلاف اسلام نعرہ لگایا گیا ہو۔ کسی کو گالی دی گئی یا کسی کی جان و مال کو کوئی خطرہ لاحق ہوا ہو۔

بس یہی وہ چیز ہے جو آپ کے ساتھ شامل ہونے والوں کو بھی متاثر کر سکتی ہے۔ آپ اپنے عمل کو درست رکھیں، کسی ناروا کام کو نہ خود کریں نہ اس کی حوصلہ افزائی کریں۔ اس طرح جو دوسرے طلباء آپ سے ملیں گے وہ بھی اسی رنگ کو اپنا لیں گے۔

سوال: کراچی کی بعض درس گاہوں میں اشتراکی اساتذہ نئی نسل کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اس کا کیا علاج کیا جائے؟

جواب: یہ مسئلہ صرف کراچی تک ہی محدود نہیں ہے پورے پاکستان میں یہی صورت ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں ہر جگہ ایک گروہ ایسا ہے جو نہ صرف غیر اسلامی نظریات رکھتا ہے بلکہ اسے اسلام سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ وہ اپنے نظریات جہاں دوسرے ذرائع سے پھیلا رہا ہے وہاں تعلیم گاہوں کے ذریعے سے نوجوانوں کو گمراہ کرنے اور ان کا اخلاق بگاڑنے میں مصروف ہے۔

بلاشبہ طلبہ اپنے اساتذہ کا احترام کریں۔ لیکن اگر کلاسوں میں نظریاتی بحثیں چھیڑی جائیں تو آپ بھی معقول دلائل کے ساتھ اپنے خیالات پیش کر سکتے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ کثرت سے طلبہ میں اسلامی خیالات پھیلاتے جائیں۔ اشتراکی اساتذہ جب یہ محسوس کریں گے کہ طلبہ کی اکثریت ان کے خیالات کی ہمنوا نہیں ہے بلکہ سختی سے اسلامی نظریات پر قائم ہے۔ اور وہ ان نظریات کا دفاع کرنا بھی جانتی ہے تو ان کی کمر ہمت ٹوٹ جائے گی اور ان کے ساتھ صرف وہی طلبہ رہ جائیں گے جنھیں اشتراکی اصول اپیل نہیں کرتے بلکہ اشتراکیت کا اخلاقی بگاڑ اپیل کرتا ہے، اللہ کا فضل ہے کہ ہمارے طلبہ کی

عظیم اکثریت اخلاقی بگاڑ کو پسند نہیں کرتی۔

سوال: نظریاتی ریاستوں میں آزادیٔ صحافت کا کیا مفہوم ہے؟

جواب: جو غیر اسلامی نظریاتی ریاستیں ہیں ان میں تو صحافت کی آزادی کا سرے سے کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ پریس پوری طرح حکومت کے قبضے میں ہے، کوئی ادنیٰ سی بات بھی حکومت کی منشاء کے خلاف پریس میں نہیں آ سکتی۔ اگر کوئی شخص چالاکی کے ساتھ اختلاف رائے کا اظہار کر جاتا ہے تو ان نام نہاد نظریاتی ریاستوں میں اس کی جگہ پاگل خانہ قرار پاتی ہے۔

اسلام کی نظریاتی ریاست میں اس جبر کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس میں پریس پوری طرح آزاد ہو گا اور ہر شخص کو معقولیت کے ساتھ اظہار رائے کی آزادی ہو گی ہاں گالی دینے کی اجازت نہیں ہو گی، نہ مخالفینِ اسلام کو اور نہ ان لوگوں کو جو اسلام کے علمبردار ہیں۔

سوال: اسلامی نظامِ تعلیم کب آئے گا اور یہ انتظار کی گھڑیاں آخر کب ختم ہوں گی؟

جواب: نظامِ تعلیم میں اسلامی انقلاب تو اُسی وقت آ سکتا ہے جب حکومت کی تبدیلی عمل میں آئے اور ریاست میں انقلاب برپا ہو۔ حکومت کی تبدیلی کے لئے یہ موقع آ گیا ہے۔ چار پانچ ماہ میں عام انتخابات ہونے والے ہیں۔ ان انتخابات میں یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ ملک کے معاملات کن لوگوں کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں۔ جو لوگ بھی برسرِ اقتدار آئیں گے وہ ملک کے معاشی، سیاسی، تعلیمی غرضیکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اپنے نظریات کے مطابق تبدیلی کریں گے۔ اگر ان کے نظریات کے مطابق معاملات پہلے سے چل رہے ہوں گے تو وہ انھیں جوں کا توں برقرار رکھیں گے۔

میں نے طلبہ کو ہمیشہ یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنی تعلیم کی طرف توجہ دیں اور عملی سیاسیات میں حصہ نہ لیں، لیکن یہ مشورہ عام حالت کے لئے ہے۔ بعض حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جن میں قوم کے ہر فرد کو اپنے جان لڑا دینا پڑتی ہے۔ خود قائداعظمؒ طلبہ کا

عملی سیاست میں حصہ لینا پسند نہیں فرماتے تھے لیکن جب مطالبہ ٔ پاکستان کی تحریک اُٹھی اور انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اس وقت تحریکِ پاکستان میں مسلمان قوم کے ایک ایک فرد کو کام کرنے کی ضرورت ہے تو انھوں نے طلباء کو بھی مدد کے لئے پکارا اور انھیں تلقین کی کہ وہ تحریک پاکستان کے لئے قریہ قریہ، بستی بستی جا کر کام کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کے قیام میں طلبہ کی قربانیاں بے مثال ہیں۔

سوال: تحریکِ جمہوریت کے بعد طلبہ میں سیاسی رسائل اور اخبارات پڑھنے اور سیاسی مسائل پر گفتگو کرنے کا شوق بڑھ گیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اپنے بنیادی لٹریچر سے بے تعلقی پیدا ہوگئی ہے۔ ہمیں اپنا یہ ذائقہ (Taste) کیسے بدلنا چاہیے؟

جواب: آپ یہ Taste نہ بدلیئے ہاں اپنے مطالعہ میں توازن برقرار رکھیے۔ ایک وقت ایسا ہوتا ہے جب ملک کے حالات سے باخبر رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضرورت آپ کی اس ذمہ داری کو ساقط نہیں کرتی کہ آپ اپنے بنیادی افکار ہی سے بے خبر ہو جائیں اگر ایسا کریں گے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ آپ کی تحریک کسی غلط راستے پر چل پڑے گی اور آپ ملک کے حالات سے باخبر ہوتے ہوئے بھی کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے پائیں گے۔

سوال: ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ اسلام کا نام بھی لیتے ہیں اور مخلوط تعلیمی اداروں میں تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں کیا آپ کا اسلام آپ کو یہی سکھاتا ہے؟

جواب: معاشرے کے حالات بگڑے ہوئے ہوں تو جو لوگ بھی اس کی اصلاح کرنے کھڑے ہوں گے وہ لازماً اسی معاشرے میں رہ کر کام کریں گے اس سے بے تعلق ہو کر نہیں رہ جائیں گے۔

تعلیم یافتہ طبقے میں اصلاح کا کام کرنے کے لئے آپ کا تعلیم یافتہ ہونا بھی

ضروری ہے اور اعلیٰ تعلیم آپ انہیں اداروں ہی میں حاصل کر سکتے ہیں جو اس وقت ہمارے ہاں موجود ہیں اور بدقسمتی سے جن میں مخلوط تعلیمی نظام رائج ہے اب یہ ذمہ داری آپ کی ہے کہ آپ جس حد تک بھی اپنے آپ کو بگاڑ سے بچا سکتے ہوں، بچائیں۔ شریعت جس چیز کو دیکھنا پسند نہیں کرتی اسے نہ دیکھیے خواہ وہ کتنی ہی جاذب نظر کیوں نہ ہو۔ غض بصر سے کام لیجیے۔ اس کے معنی اگرچہ نگاہ جھکائے رکھنے کے ہیں لیکن موجودہ حالات میں اس سے نگاہ بچانے کا مفہوم بھی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تقویٰ کی بہت بڑی ورزش ہے جو حجرے میں بیٹھ کر نہیں کی جا سکتی۔ اس زمانے میں اگر کوئی شخص صرف نظر کو بچانے کا کام کر رہا ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس آدمی سے بڑا متقی ہے جو حجرے میں بیٹھ کر یاد اللہ میں مصروف ہو۔ جو لوگ آپ پر اعتراض کرتے ہیں انھیں بتائیے کہ اس بگڑے ہوئے معاشرے میں اسلام ہمیں یہ سبق دیتا ہے۔

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ چین میں سوشلزم قائم ہونے کی وجہ سے حکومت نے ترقی کی ہے اگر ہمارے ہاں پاکستان میں بھی سوشلزم آ جائے تو ملک خوب ترقی کرے گا۔!

جواب: اگر کسی ملک کی ترقی ہی اس کے نظام کو اپنانے کی دلیل بن سکتی ہے تو ہم کیوں نہ چین کے بجائے جاپان کے نظام کو اختیار کریں کہ جاپان چین سے زیادہ ترقی یافتہ ہے، اسی طرح امریکہ چین سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے اس کے نظام کو کیوں نہ اپنا لیں!

اس قسم کی باتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جن کا اپنا نظریۂ حیات اور نظامِ زندگی کوئی نہیں ہوتا، پہلے یہ لوگ انگریز کی نقل کیا کرتے تھے، پھر امریکہ آیا تو اس کی پیروی کرنے لگے اور اب چین کی تقلید پر کمربستہ ہیں۔ انھیں سوچنا چاہیے کہ وہ کوئی دُم کٹی قوم نہیں ہیں، خدا کے فضل سے ہم مسلمان ہیں، قرآن جیسی بے مثال کتاب ہمارے پاس ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا اُسوۂ حسنہ ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے اور اسلام جیسا مکمل دین ہمارا سرمایہ ہے۔ اگر ہم نے اس کے مطابق دنیا میں کام کیا ہوتا تو آج چین میں اسلام ہوتا ''ماؤزیت'' نہ ہوتی!

سوال: ملک کے اندر بڑھتے ہوئے تشدد کے رجحان سے طلبہ متاثر ہو رہے ہیں اور ان کے اندر یہ غلط خیال پروان چڑھ رہا ہے کہ تشدد ہی سے ان کے مسائل حل ہو سکتے ہیں اس غلط رُجحان کا کیسے ازالہ ہو سکتا ہے؟

جواب: یہ صورتِ حال بڑی حد تک حکومتوں کی غلط روش سے پیدا ہوئی ہے۔ حکومتوں کی روش یہ رہی ہے کہ آپ معقول بات معقول دلیل سے پیش کریں تو اسے کوئی اہمیت نہیں دی جائے گی اور یہ خیال کیا جائے گا کہ یہ امن پسند لوگ ہیں ان سے حکومت کے نظم ونسق کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا اس لئے ان کی بات قابل اعتناء نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر کچھ لوگ توڑ پھوڑ اور تشدد پر اُتر آئیں تو حکومت سمجھتی ہے کہ ہاں یہ لوگ وزن رکھتے ہیں۔ ان کے طرزِ عمل سے ملک کا امن وامان خطرے میں پڑ سکتا ہے اس لئے ان کے معقول مطالبے تو الگ رہے غیر معقول مطالبوں کو بھی مان لو تا کہ جان چھوٹے۔ یہ روش حکمرانوں کی نا اہلی اور ان میں تدبر کی کمی کی دلیل ہے۔ اگر وہ معقول باتوں کو معقول طریقوں سے مان لیں تو غیر معقول باتوں کے اُبھرنے کی نوبت ہی نہیں آ سکتی۔ غیر معقول باتوں کے اٹھانے والے قوم کی اخلاقی تائید سے محروم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

موجودہ حالات میں اگرچہ جبر وتشدد کے راستے کامیاب ہوتے نظر آ رہے ہیں لیکن میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ معقولیت کے راستے کو بالکل نہ چھوڑیں کیونکہ بالآخر یہی چیز پوری قوم اور ملک کو تباہ کر دینے والی ہے۔ اگر آپ ملک کے مستقبل کو تباہ نہیں کرنا چاہتے تو غیر معقول راستے پر بالکل نہ چلیں۔ انشاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ اگر ملک میں ایک گروہ معقول راستے پر چلتا رہا اور اُس نے کبھی اس راستے کو نہ چھوڑا تو وہ ضرور کامیاب ہو کر رہے گا۔ غیر معقولیت اسی وقت کامیاب ہوتی ہے جب معقولیت متحرک نہ ہو۔ لیکن معقولیت حرکت میں آ جائے تو معقول اور نامعقول لوگوں کا تضاد کھل کر سامنے آ جاتا ہے اور قوم جان لیتی ہے کہ کون سا راستہ اسے اختیار کرنا چاہیے اور کون سا چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ راستہ اگرچہ صبر آزما ہے لیکن یہی خیر وفلاح کی منزل کی طرف جاتا ہے۔

سوال: جب اسلام تمام انسانوں کو برابر کہتا ہے تو پھر غلام رکھنے کی کیوں اجازت دیتا ہے؟

جواب: اصل میں اسلام کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں عیسائی مشنریوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ یورپ کے یہ عیسائی افریقہ کے غلاموں کی تجارت خود کرتے رہے ہیں اور مطعون کر رہے ہیں اسلام کو۔ اصل میں ان کی یہ ساری باتیں اپنی چوری کو چھپانے کے لئے ہیں۔

حضورؐ کی بعثت سے قبل عرب کی پوری معاشی زندگی غلاموں پر چل رہی تھی۔ آپؐ نے آتے ہی جو انقلابی کام کیا وہ یہ تھا کہ غلام کو آزاد کرنا ایک نیکی قرار دیا۔ اگر کسی شخص کو کوئی کفارہ ادا کرنا تھا تو اسے بتایا گیا کہ غلام کو آزاد کرنا بہترین کفارہ ہے۔ چونکہ عرب کے وہ لوگ سچے دل سے ایمان لائے تھے۔ اس لئے اسلام لانے والوں نے غلاموں کو دھڑا دھڑ آزاد کرنا شروع کر دیا۔ تنہا عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے تیس ہزار غلام آزاد کیے۔ اسی طرح تمام صاحبِ حیثیت مسلمانوں نے سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں اپنے اپنے غلام خرید خرید کر آزاد کر دیے۔ یہاں تک کہ جاہلیت کے زمانے کا ایک غلام بھی قیدی نہ رہا تھا۔

اب غلاموں کے متعلق فی نفسہ اسلام کا قانون سمجھ لیجیے۔ اسلام نے جن غلاموں کو قید رکھنا جائز قرار دیا' وہ جنگی قیدی تھے۔ ان کے بارے میں تین ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا تبادلہ کر لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ ان کا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ تیسری صورت ذرا پیچیدہ ہے۔ وہ یہ کہ اگر انھیں کوئی نہیں چھڑاتا، تو پھر ان کے انتظام کی کیا شکل ہو؟ اس کی جو عملی شکلیں ممکن ہیں وہ دو ہیں۔ یا تو Concentration Camps مشقتی کیمپ) بنائے جائیں اور انھیں ان میں گلنے سڑنے کے لئے چھوڑ دیا جائے یا پھر انھیں خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اب آپ خود غور کیجیے ان میں سے کونسا راستہ بہتر ہے۔ انھیں مشقتی کیمپوں کے حوالے کرنے کا یا انسانوں میں تقسیم کر دینے کا۔ پچھلی جنگ عظیم میں جو جرمن قیدی پکڑے گئے تھے' ان کا اب تک کوئی حساب نہیں کیا گیا اور نہ یہ

ٹھیک ٹھیک معلوم ہو سکا کہ کس شخص کا کیا حشر ہوا۔ یہی معاملہ جاپانی قیدیوں کے ساتھ بھی ہوا اور یہی کچھ روس اور جرمنی بھی کرتا رہا ہے۔ جو لوگ اسلام پر غلامی کا طعن کرتے ہیں، ان سے پوچھیے کہ کیا آج انسان انسان کو غلام بنا رہا ہے یا نہیں؟

سوال: اسلام دوست جماعتوں میں عموماً اختلاف و افتراق پایا جاتا ہے، ان حالات میں ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے؟

جواب: اس سلسلے میں پہلا کام آپ کا یہ ہونا چاہیے کہ جو اختلاف و افتراق اسلام دوست جماعتوں میں پایا جاتا ہے وہ آپ کے طرزِ عمل سے اور نہ بڑھنے پائے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ پر چوٹیں ہوں۔ آپ کے خلاف طرح طرح کی باتیں کی جائیں اور نئے نئے الزامات آپ کے خلاف گھڑے جائیں۔ اگر آپ نے بھی چوٹوں کے جواب میں چوٹیں شروع کر دیں۔ باتوں کے جواب میں باتیں کرنے لگے اور نئے نئے الزامات کے جوابات میں آپ نے بھی دوسروں کے خلاف الزامات گھڑنے شروع کر دیے تو آپ افتراق و اختلاف کو اور پھیلانے کا سبب بنیں گے۔ آپ کا حال اس بچے کا سا نہیں ہونا چاہیے جو پھٹے ہوئے کپڑے میں اُنگلی ڈال کر اسے اور پھاڑتا چلا جاتا ہے۔

آپ خاموشی اور خلوص کے ساتھ اپنا کام کرتے چلے جایئے اور پلٹ کر کسی کو جواب نہ دیجیے، آپ کے طرزِ عمل سے لوگوں میں دین سے جتنا زیادہ خلوص پیدا ہوگا توقع ہے کہ اختلاف و افتراق اسی قدر کم ہوتا چلا جائے گا۔

سوال: بعض لوگ یہ پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ اسلامی جمعیت طلبہ، جماعت اسلامی کی شاخ ہے، ہم اس کا کیا جواب دیں؟

جواب: اصل معاملہ یہ ہے کہ ایک مقصد کے لئے کام کرنے والوں کو ایک دوسرے سے پھاڑنے اور کاٹنے کے لئے مخالفین کی طرف سے جو چالیں چلی جاتی ہیں ان میں سے ایک چال یہ بھی ہے کہ انھیں ایک دوسرے کی شاخ اور دم چھلے قرار دے دیا جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ نکلتا ہے کہ بعض لوگ الزام سے جھنجھلا کر اپنے اصل کام ہی سے دستبردار ہو

جاتے ہیں۔

اگر کچھ لوگ آپ کو جماعت اسلامی کو شاخ قرار دیتے ہیں تو آپ خاموشی سے اپنا کام کرتے جایئے آپ کو ان سے اُلجھنے اور تردید میں وقت کھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت تو حالت یہ ہوگئی ہے کہ جس شخص نے بھی اسلام کا نام لیا اسے ''مودودیہ'' قرار دے دیا جاتا ہے اور جو پرچہ اپنے اندر اسلام کا ذکر کرتا ہے وہ بلاتوقف جماعت اسلامی کا آرگن قرار دیا جاتا ہے۔ وہ کون عقلمند ہے جو میری اور جماعت اسلامی کی حمایت کے الزام سے بچنے کے لئے اسلام سے دستبردار ہو جائے گا۔

سوال: اسلامی حکومت میں جرائم کا خاتمہ ہوگیا تو وکلاء کیا کریں گے؟ جب قانون کی تعلیم ہمارے روزگار کا بندوبست نہیں کرسکتی تو ہم تعلیم کیوں حاصل کریں؟

جواب: یہ سوال بہت دلچسپ ہے اگر اسے اُلٹ کر بات کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وکلاء کی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے جرائم کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔ ایک مہذب معاشرے میں رہنے کے لئے قانون سے واقف ہونا ضروری ہے، اسلامی اصطلاح میں اسے ''فقہ'' کہتے ہیں۔ اسلامی حکومتوں میں فقہ کی تعلیم لاکھوں افراد حاصل کرتے تھے۔ آپ بھی قانون کی تعلیم حاصل کیجیے لیکن اس نیت سے نہیں کہ جرائم نہ ہوئے تو آپ کی روزی بند ہو جائے گی۔ ہمارے فقیہہ بھی خدا کے فضل سے بھوکے نہیں مرتے تھے!

☆

اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے بیسویں سالانہ اجتماع (ستمبر-اکتوبر ۱۹۷۱ء ملتان) میں شرکت کے لئے مشرقی پاکستان سے آخری وفد نے سیّد مودودیؒ سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی۔ ۱۴، اکتوبر ۱۹۷۱ء

”رات کے ساڑھے نو بج رہے ہوں گے کہ ہم ۵، اے ذیلدار پارک پہنچے، مولانائے محترمؒ کو اطلاع ہوئی تو وہ علالت و نقاہت کے باوجود خود برآمدے تک تشریف لائے اور ہمیں اپنے کمرے میں لے گئے۔

ہم نے عرض کیا: ”مولانا! ہم واپس میدان جہاد کو جا رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم آپ کی دعاؤں کے سائے میں مشرقی پاکستان پہنچیں۔“ جہاں ہندوستان نے اپنے حواریوں اور مسلح افواج کے ذریعے Undeclared جنگ مسلط کر رکھی ہے۔“

مولانا نے فرمایا: ”اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو____“ پھر فرمایا ”جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ اس ابتلاء اور سالمیت پاکستان کے وقت میں، میں بھی آپ کے درمیان محاذ پر ہوتا، لیکن عمر کے اس حصے میں جسمانی کمزوری نے مجھے درماندہ کر کے رکھ دیا ہے۔“

ہم نے مولاناؒ کو زیادہ تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا۔ ان کے آرام کا خیال کر کے ہم اجازت لے کر اٹھنے لگے تو مولاناؒ نے فرمایا: صبح تشریف لایئے گا۔ پھر تفصیل سے باتیں ہوں گی“____ ہم اگلے روز صبح حاضر ہوئے تو مشرقی پاکستان کی صورتِ حال پر گفتگو کرتے ہوئے۔

مولانائے محترمؒ نے فرمایا: یہ بات پہلے روز سے طے تھی کہ جغرافیائی اعتبار سے اتنی دُور پاکستان کے دوسرے حصے کو صرف اور صرف اسلام کے رشتے سے جوڑ کر رکھا جا سکتا

ہے، لیکن اوّل روز سے کسی حکمران نے اس رشتہ کو مضبوط بنانے کی فکر نہ کی، بلکہ ہر برسرِ اقتدار آنے والی حکومت نے اس رشتہ کو کمزور تر کرنے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش کی۔ ملک کی سیاسی جماعتوں نے بھی اِلّا ماشاءاللہ، اس رشتہ کو کمزور کرنے میں بقدرِ توفیق حصہ لیا اور اب ملک کے دونوں حصوں میں سوشلزم اور نیشلزم کی علمبردار دو جماعتوں نے جھوٹے وعدوں کے بل بوتے پر انتخابات میں اکثریت حاصل کی ہے۔ انتخابات کے ان نتائج نے پاکستان کو متحد و مضبوط رکھنے والے اس رشتے پر کاری ضرب لگائی ہے۔ پھر رہی سہی کسر صدر یحییٰ خان کے اندھے آرمی ایکشن نے پوری کردی ہے۔ حالات جس رخ پر جارہے ہیں، ان میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ بھارت کھلم کھلا مشرقی پاکستان پر جارحیت کر گزرے۔ اور اس کی پشت پر روس کی فوجی امداد اور امریکہ و یورپ کی پشت پناہی ہوگی۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو اندیشہ ہے کہ دشمن مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے کاٹ ڈالنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ویسے بھی مغربی ذرائع ابلاغ پاکستان کے کیس کو پوری طرح مسخ کرنے میں مصروف ہیں۔ ادھر کمیونسٹ گوریلے مشرقی پاکستان میں بھرپور تخریبی کارروائیوں میں لگے ہوئے ہیں۔”

پھر مولاناؒ نے فرمایا ——

مشرقی پاکستان میں اس عرصے میں اس قدر نقصان ہو چکا ہے کہ اگر یہ حصہ علیحدگی کے سانحے سے بچ بھی گیا تو آئندہ پچاس برس تک نہ سنبھل سکے گا۔ باہمی اعتماد کی فضا بحال کرنے کے لئے ایک طویل عرصہ درکار ہوگا۔ بشرطیکہ ملک کی باگ ڈور محبِ وطن اور سیاسی بصیرت رکھنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں آئے۔ بصورتِ دیگر یہ المیہ مسلم تاریخ میں اندلس (اسپین) کے المیے سے کم روح فرسا نہ ہوگا۔”

پاک آرمی کے ساتھ اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنوں کا ”البدر“ کی صورت میں وطن کے دفاع و سالمیت کے لئے تعاون کا ذکر آیا، تو مولاناؒ کے چہرے پر گہرے تفکر کے آثار نمایاں ہوگئے۔

فرمانے لگے ”ایک بات ہمیشہ یاد رکھئے، فوج زیادہ دیر تک کسی پر اعتماد نہیں کیا کرتی، یہ اس کی نفسیات ہے کہ اندرونِ ملک جو قوت اس کے ساتھ تعاون کرتی ہے، مشکل وقت

گزرنے کے بعد یہ سب سے پہلے اسی پر حملہ آور ہوتی ہے۔" اس سلسلے میں مولانا نے اخوان المسلمون کی مثال بھی دی کہ کس طرح مصر میں بادشاہت کا خاتمہ کرنے کے لئے جنرل نجیب اور کرنل جمال عبدالناصر نے الاخوان المسلمون کا تعاون حاصل کیا اور کامیابی کے بعد کس طرح جمال عبدالناصر نے اخوان المسلمون ہی کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد مولانا نے نصیحت فرمائی کہ جس وقت بھی وہاں حکومت آپ سے ہتھیار واپس مانگے تو ایک لمحہ کی تاخیر کئے بغیر واپس کر دیجیے گا۔" ملاقات کے آخر میں ہم نے مولانا سے البدر کے کارکنوں کے لئے پیغام کی درخواست کی تو مولانا نے فرمایا:

"باطل کے سامنے سر نہ جھکائیے، حق کی آواز کو صرف سربلند ہی نہ کیجیے، بلکہ عملاً اپنی زندگیوں کو بھی اس کے مطابق ڈھالئے۔ آپ پر بڑی نازک ذمہ داری آن پڑی ہے۔ کسی سے زیادتی نہ کیجیے، لوگوں کی عزت و آبرو کے تحفظ کے لئے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کیجیے۔ یاد رکھیے! اصل طاقت ہتھیار میں نہیں، بلکہ ایمان، حکمت اور تنظیم میں ہے۔ پاکستان کا وجود، بقا اور استحکام بھی انہی تین اصولوں سے عبارت ہے اور پاکستان کو بچانے کی کوشش کرنے والے خدا کے بندوں کو بھی یہی اصول مدنظر رکھنے ہوں گے۔"

مولانائے محترمؒ لمحہ بھر کے لئے رکے اور پھر ہمارے چہروں پر ایک بھرپور نگاہِ شفقت ڈالتے ہوئے فرمایا:

"مجھے اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکن اپنے حقیقی بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ جمعیت کے کسی بھی کارکن کی تکلیف یا شہادت کی خبر کا اثر بڑی دیر تک میرے ذہن اور اعصاب پر رہتا ہے، لیکن آپ فریضۂ اقامت دین کی جس راہ پر گامزن ہیں، شہادت ہجرت اور عسرت تو اس راہ کے سنگ میل ہیں۔ ایسی کسی صورتِ حال سے سابقہ پیش آئے تو عزیمت کی راہ کو نہ چھوڑیئے اور حق کے پرچم کو کبھی سرنگوں نہ ہونے دیجیے۔"

ہم نے مولانا سے دعا کی درخواست کی، مولانا نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے ـــــ اس دعا کی تاثیر، کیفیت اور حلاوت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ یوں لگا جیسے سکینت ہمارے دلوں پر نازل ہو رہی ہے ـــــ

☆

سوالات کے جواب میں سیّد مودودیؒ اپنی زندگی کے کچھ واقعات بیان کرتے ہیں۔

سوال: عرصۂ اسیری میں کسی جیل یا شاہی قلعہ لاہور کا کوئی دلچسپ واقعہ؟

مولانا مودودی: دو دلچسپ تجربے مجھے اپنی جیل کی زندگی میں ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں جب مجھے فیصل آباد (لائل پور) کی ایک جیل میں نظر بند کیا گیا تو ایک روز اچانک پتھری پیشاب کی جگہ آ کر رُک گئی اور ۱۶‘ ۱۸ گھنٹے تک پیشاب بند رہا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ”میں ان ظالموں سے علاج کی درخواست نہیں کرنا چاہتا، تو اسے نکال دے یا ہٹا دے۔“ وہ ہٹ گئی۔ یہی وہ پتھری ہے جو بیس سال بعد (۱۹۶۸ء) ایک آپریشن کے ذریعہ برآمد ہوئی اور ان بیس سالوں میں اس نے مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی تنگ نہیں کیا۔ ڈاکٹر حیران تھے کہ تم اتنی بڑی پتھری مثانے میں لے کر کیسے چلتے پھرتے رہے ۲۰ سال تک ____!

اسی طرح جن دنوں میری پنڈلیوں پر زخم آئے اور یہ زخم اگزیما (EGzema) کی صورت اختیار کر گئے۔ سب علاج کرا لیے‘ ڈاکٹر‘ طبِ یونانی‘ جونکیں بھی لگوائیں۔ جب میں گرفتار ہوا تو اُن دنوں پاجامے کے پائنچے زخموں سے اُوپر بندھے ہوئے تھے۔ مجھے لاہور کے شاہی قلعہ (جس کا ایک حصہ جیل کے طور پر استعمال ہوتا ہے) میں قید رکھا گیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ”میں ان ظالموں سے کوئی درخواست کرنا نہیں چاہتا، تو خود ہی اس کا علاج فرما دے۔“ چنانچہ ربِ کریم کے فضل سے یہ زخم رفتہ رفتہ

سوکھتے چلے گئے اور ان کا نشان تک ختم ہو گیا۔ کوئی خاص وقت ہوتا ہے جب وہ دعا اللہ کے ہاں تیر کی طرح پہنچتی ہے۔“

سوال: مولانا! تقسیم ہند کے موقع پر اپنے ساتھ پیش آنے والی کوئی ناقابلِ فراموش صورتِ حال بیان فرمائیے؟

جواب: دارالاسلام (پٹھان کوٹ، ہندوستان) میں ہم کل ۲۵ آدمی تھے۔ تب ہمارے سفر کا آغاز تھا اور ہم نے دارالاسلام کو اپنا پہلا مستقر (Base) بنایا تھا، ہمارے چاروں طرف دور دور تک سکھوں اور ہندوؤں کے گاؤں تھے۔ جن میں مسلمان مقابلۃً آٹے میں نمک کے برابر تھے اور جو مسلمان رہ رہے تھے وہ ہر لحاظ سے کمزور تھے، اِلّا ماشاءاللہ۔ ان کا کوئی معاشی یا مجلسی مقام نہ تھا۔

ہندوستان کی تقسیم کے عبوری دنوں میں ملک کی جو صورتِ حال تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جہاں فسادات یا ان کے اثرات موجود نہ ہوں۔ پٹھانکوٹ بھی متاثر تھا اور اس کی فضا میں بھی نیزے اور برچھیاں گھنگھور گھٹاؤں کی طرح تُلی کھڑی تھیں۔ ان برافروختہ حالات میں بھی ہم نے مئی ۱۹۴۷ء کو دارالاسلام میں ایک جلسۂ عام منعقد کیا۔ جس میں گردوپیش کے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کو مدعو کیا گیا۔ انھیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں برطانوی سامراج کی غلامی سے آزادی کی جو نعمت دی ہے، اس میں فساد کرنا کفرانِ نعمت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کرۂ ارضی پر فساد کرنے والوں سے ناخوش ہو کر آزادی کی نعمت چھین لیتا اور زمین کی وُسعتیں فسادیوں کے لئے تنگ کر دیتا ہے۔ (یہ تقریر بعد میں ”بناؤ اور بگاڑ“ کے نام سے شائع ہوئی)۔ اس تقریر اور اجتماع کا یہ نتیجہ نکلا کہ فساد کچھ دنوں کے لئے ٹل گیا اور حالات کی جس برہمی کا اندیشہ تھا وہ رُک گئی ____!!

ہمارے ساتھی اردگرد کے دیہات میں جاتے، وہاں لوگوں کو سمجھاتے اور جو مسلمان اقلیت میں ہونے کے باعث مالدار ہندوؤں، سکھوں کی اکثریت میں محصور تھے، ان کے لئے مددگار ثابت ہوتے، اس طرح دیر تک خون خرابہ ٹلا رہا۔ پھر ایک دن پورے ہندوستان کے ہمہ گیر فسادات نے اس علاقے کو بھی مشتعل و مجروح کیا۔ ریل بند، ڈاک

موقوف، تاریں منقطع، آگ بھڑکی، اور پھیل گئی۔ نتیجتاً وہ مسلمان جوان علاقوں میں اونے پونے زندگی گزار رہے تھے، ’’ہمسایوں‘‘ کی سنگ دلی سے خوف زدہ ہو گئے۔ آوازیں آنے لگیں ’’دارالاسلام والو! ہمیں بچاؤ!‘‘ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم تھا کہ ہمارا کوئی بھی رفیق جہاں جاتا وہاں سے محصور لوگوں کو نکال لاتا۔ اور وہ بحفاظت دارالاسلام پہنچ جاتے۔ اس طرح دو ڈھائی ہزار لوگ یکجا ہو گئے۔ اِدھر ہم پچیس آدمی، ان سب کے گارڈ (Guard) تھے۔ اور آنے والے سب اس قدر بدحواس تھے کہ انھیں اپنے دست و بازو یا دل و دماغ پر کوئی اعتماد نہ تھا، وہ اس حالت میں تھے جیسے شل ہو گئے ہوں۔ ہم نے ان کے لئے کھانے پینے کا انتظام کیا، لیکن ان بے چاروں کے حواس کی ویرانی کا حال یہ تھا کہ وہ کسی مزاحمت یا مدافعت کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ اِدھر ہم نے اللہ کے بھروسے پر ہر خطرہ سے نمٹنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

جب حالات اور زیادہ بگڑے اور یہ بات کھل گئی کہ گورداسپور کا ضلع ہندوستان میں جا رہا ہے تو ہم نے طے کر لیا کہ جان دے دیں گے لیکن اس طرح مرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ جس طرح عام لوگ مر رہے ہیں۔ کہ نہتوں اور عاجزوں پر ’’سورماؤں‘‘ اور ’’سادھوں‘‘ کی ٹولیاں یلغار کرتیں اور انھیں موت کے گھاٹ اتار دیتی ہیں۔

ہمارے پاس کل تین بندوقیں (Rifiles) تھیں۔ جن میں سے ایک ناکارہ تھی۔ ہم نے خندقیں وغیرہ کھود کے مورچے بنا لیے۔ وہیں بھالے اور نیزے تیار کئے۔ اور اس طرح پچیس ۲۵ آدمی ہر مقابلہ کی ٹھان کر تیار ہو گئے۔ خبر ملی کہ آج رات حملہ ہو گا۔ ہم نے مزاحمت کا پورا سامان کر لیا۔

۲۵ کے اس قافلہ میں بعض رفقاء کا پورا خاندان ساتھ تھا۔ ہم نے تمام عورتوں کو ایک مکان میں اکٹھا کیا اور انھیں بتا دیا کہ ہماری لاشوں سے گزر کر ہی حملہ آور ان تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھیں مٹی کا تیل اور بانسوں پر کپڑے باندھ کر دے دیئے کہ دشمن ان پر حملہ آور ہو تو وہ انھیں جلا کر پامردی سے ان کا مقابلہ کریں اور عفت و آبرو کے ساتھ شہید ہو جائیں۔ اس حالت میں دشمن انھیں صرف قتل کر سکتا ہے۔ لیکن وہ رات بخیریت

گزر گئی۔ اگلی صبح بستی کا تھانیدار آیا' وہ سکھ تھا۔ ہم نے دارالاسلام کے راستہ پر جو ریک کے پل کو کراس Cross کرتا تھا وہاں ایک پہریدار کی ذمہ داری لگا رکھی تھی۔ اس کو ہدایت تھی کہ کوئی غیر اندر نہ آئے اور دارالاسلام آنے کا یہی ایک راستہ تھا۔ پہرے دار نے سکھ تھانیدار کو روک لیا اور کہا کہ آپ اندر نہیں جا سکتے۔" اُس نے کہا" ان (یعنی مولانا مودودی) سے پوچھ لو"۔ غرض میں نے اسے بلوالیا۔ لیکن یہ تہیہ کر لیا کہ اس نے ہیر پھیر کیا تو میں اس کھڑے کھڑے شوٹ کر دوں گا۔ میں اس وقت بندوق لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ خندقوں پر نگاہ کی۔ میری بندوق دیکھتا اور سوچتا رہا۔ اُس نے اسلحہ کی واپسی کا مطالبہ کیا نہ کچھ اور کہا۔ صرف اتنا کہا۔ "آپ نے مدافعت کا پورا انتظام کر رکھا ہے۔"

میں نے جواب دیا "سو فیصد! ہم کسی پر حملہ کرنے والے نہیں لیکن حملہ آوروں سے دبنے والے بھی نہیں۔ ہم مریں گے بھی تو اس وقت جب دو دو ختم کر لیں گے۔"

وہ یہ سن کر لوٹ گیا۔ شاید اس جواب ہی کا نتیجہ تھا کہ ہم پر اُن کا حملہ سہل نہ رہا۔ بہرحال یہ دن ایسے تھے کہ ہر لحظہ کشت و خون کی خبریں آ رہی تھیں۔ باؤنڈری کمیشن، (Boundary Commission) نے ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء کو گورداسپور کا ضلع بھارت کے حوالے کر دیا تو "دارالاسلام" بھی اسی میں ہندوستان کو چلا گیا۔ اب حالات اتنے خراب تھے کہ ہم دور دراز تک "غنیم" کے نرغے میں تھے۔ ہر سمت ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ بارہ دن تک یہی حالت رہی۔ ۳۰ اگست کو باؤنڈری فورس کا ایک کنوائے Convey آیا تو اس نے ہمیں نکالنے اور لے جانے کا انتظام کیا۔ ہم نے سب سے پہلے عورتوں اور بچوں کو بھجوایا۔ اس کے بعد ۳۰ اگست کو ہم وہاں سے روانہ ہوئے اور پاکستان پہنچے۔

اس زمانہ میں میں نے محسوس کیا کہ فرشتے ہماری حفاظت کر رہے ہیں۔ کئی دفعہ خیال آیا کہ درمیان میں کوئی پردہ ہے۔ ہٹے تو ان فرشتوں کو دیکھ لوں جو ہمیں کشت و خون کے طوفان سے محفوظ کیے ہوئے ہیں۔

سوال: قرآن سے آپ کے ربط اور لگاؤ پیدا کرنے میں، کن عوامل کا دخل

ہے؟ اور اس تعلق کی نشو و نما کیسے ہوئی؟

جواب: جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے یہ احساس ہوا کہ ’’یہ مذہب تو کچھ نہیں کہ میں مسلمان کے گھر پیدا ہوا اس لئے مسلمان ہوں ــــــ ہندو، ہندو کے گھر پیدا ہوا اس لئے وہ ہندو ہے۔ اگر آدمی کسی چیز کو مانے تو تحقیق کر کے مانے نہیں تو نہ مانے۔‘‘ اس احساس کی بنا پر ایک وقت مجھ پر ایسا گزرا کہ خدا، آخرت، رسالت، وحی ہر چیز میں شک سا محسوس ہونے لگا، اور نماز، جس کی بچپن میں والدین نے عادت ڈالی تھی وہ بھی اس وجہ سے چھوٹ گئی کہ وہ سب کچھ تقلیدی عمل تھا ــــــ اس کے بعد میں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔ اس مطالعہ کی بدولت میں نے یہ تسلیم کیا کہ دینِ حق صرف اسلام ہے۔ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ محمدؐ اللہ کے آخری رسول ہیں۔ آخرت یقینی ہے ــــــ اسی بنا پر میں کہتا ہوں کہ میں دراصل ایک نومسلم ہوں ــــــ‘‘

سوال: مولانا! آپ اکثر کونسی قرآنی سورتیں تلاوت کرتے ہیں؟

جواب: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق سورۃ الکافرون، سورۃ اخلاص، سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پابندی ساتھ پڑھا کرتا ہوں۔ باقی قرآن مجید کی کسی خاص سورہ کو دوسری سورتوں پر ترجیح دینا میرے لئے ناممکن ہے کیونکہ یہاں

؎ کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا ایں جا است

کا معاملہ ہے ــــــ!‘‘

سوال: مولانا! اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایئے؟

مولانا: ’’والدِ محترم میری تربیت پر خصوصی توجہ دیا کرتے تھے۔ وہ میری زبان اور اخلاق کو معیاری، ستھرا اور پاکیزہ بنانے کی انتہائی کوشش کرتے تھے۔ وہ راتوں کو مجھے پیغمبروںؑ کے قصے، تاریخِ اسلام اور تاریخِ پاک و ہند کے واقعات اور سبق آموز کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ وہ میری عادات پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اپنی ملازمہ کے ایک بچے کو مارا تو انہوں نے اس بچے کو بلا کر کہا کہ تو بھی اسے مار۔ مجھے اس سے ایسا سبق ملا کہ پھر تمام عمر میرا ہاتھ کسی زیردست پر نہیں اٹھا۔

عربی میں نے گھر پر پڑھی۔ سکولوں اور کالجوں میں مختلف علوم زیرِ مطالعہ رہے۔ انگریزی زبان میں استعداد تعلیمی دور کے بعد حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانے کا مجھے کوئی خاص واقعہ یاد نہیں۔ میں ایک اوسط درجے کا طالب علم تھا اور میرے ذہن نے کبھی بھی مستقبل کا کوئی حسین خاکہ نہیں بنایا، البتہ اس دور میں مجھے یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ مجھ میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔

جب میں کالج کی تعلیم سے فارغ ہوا تو اس وقت میری عمر سولہ سترہ برس کی تھی۔ اس کے بعد میں نے ''آوارہ خوانی'' شروع کی جو کچھ ملا پڑھ ڈالا۔ ہر موضوع اور ہر عنوان پر ہر قسم کی کتابیں پڑھیں۔ اس آوارہ خوانی کا نہایت ہی خطرناک نتیجہ برآمد ہوا۔ خدا اور آخرت پر سے یقین اٹھتا چلا گیا۔ تشکیک و ارتیاب سے ایمان و ایقان کی بنیادیں منہدم ہو گئیں۔ خدا کا وجود سمجھ میں نہ آتا تھا۔ تمام دینی عقائد غیر منطقی اور نا قابلِ فہم نظر آتے تھے۔ ایک ڈیڑھ سال تک یہی کیفیت رہی لیکن خدا کے فضل و کرم سے یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔ عربی پر خاصا عبور حاصل تھا۔ میں نے قرآن و حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا براہِ راست مطالعہ شروع کیا۔ حقائق و معارف کھلتے چلے گئے، بے یقینی کا غبار دھلتا چلا گیا۔ اسی دوران میں شرح و بسط کے ساتھ دوسرے ادیان کے تقابلی مطالعہ سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔ دراصل اب میں نے اسلام کو خوب سوچ سمجھ کر قبول کیا تھا۔ مجھے اس کی حقانیت پر کامل یقین تھا اور اس مطالعہ کے دوران میں، میرے ذہن کو پختہ بنانے میں امام ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

☆☆☆

اسلامی جمعیت طلبہ، صوبہ پنجاب کے ایک ہفت روزہ تربیتی کیمپ کے اختتام پر
---۲۳ اگست ۱۹۷۲ء

سوال: اسلامی تربیت کے تقاضے کیا ہیں؟ اس سلسلے میں کچھ ہدایات فرمایئے۔

جواب: یہ تو ایک تفصیل طلب سوال ہے تاہم اتنا سمجھ لیجئے کہ اسلام ہمیں جس منبع اور جس سرچشمے سے ملتا ہے اس کی طرف رجوع کرنا ہی اسلامی تربیت ہے۔ اسلام ہمیں سب سے پہلے جس سرچشمے سے ملتا ہے وہ قرآن مجید ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہماری ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ جتنا زیادہ ہم اس کو سمجھیں گے، جتنا زیادہ ہم اس کے معنیٰ کا فہم حاصل کریں گے، اتنا ہی زیادہ ہمارا ایمان بھی مضبوط ہو گا۔ ہمارے عقائد بھی درست ہوں گے۔ ہمارے اخلاق کی بھی اصلاح ہو گی اور ہمیں خوب کام کرنے کا طریقہ بھی آئے گا۔ اس کے بعد اسلام کا دوسرا اہم ترین سرچشمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک ہے۔ آپؐ کی سنّت ہے، آپؐ کا طریقِ کار ہے اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل ہے، یہ چیز ہے جو آپ کو ہدایت کی روشنی دے گی۔ اس کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ مختلف حالات میں ایک مسلمان کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے، مسلمان کی زندگی کیسی ہونی چاہئے۔ کیا چیزیں ہیں جن سے مسلمان بچے اور کیا چیزیں ہیں جن کو مسلمان اختیار کرے۔ کون سی خوبیاں ہیں جن کو مسلمان اپنے اندر نشوونما دے اور کون سی برائیاں ہیں جن سے اپنے آپ کو پاک کرے۔ اسلامی تربیت اگر مل سکتی ہے تو انہی دو ذرائع سے مل سکتی ہے۔ جتنا کچھ بھی آپ ان سے فائدہ اٹھا سکیں، فائدہ اٹھانے کی کوشش کیجئے۔

سوال: ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے نتائج کے بعد کچھ لوگ تحریکِ اسلامی کے مستقبل سے مایوس نظر آتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ جمہوریت کا طولانی راستہ طے کرنے کے بجائے کوئی ایسا شارٹ کٹ اختیار کیا جائے کہ ملک میں فوری طور پر اسلامی انقلاب برپا ہو جائے؟

جواب: شارٹ کٹ اگر کوئی اختیار کرنا چاہے تو وہ جماعت اسلامی کو چھوڑ کر کوئی اور جماعت بنائے اور اپنے شارٹ کٹ پر چل کر دیکھ لے۔ جماعت اسلامی نادانی کے ساتھ کوئی کام نہیں کر سکتی۔ جس راستے پر ہم چل رہے ہیں اس میں کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے۔ یہ بہرحال ایک لمبا راستہ ہے، محنت طلب ہے، جان مار کے کام کرنے کا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم متوسّط تعلیم یافتہ طبقے کے خیالات کو بدلنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں۔ اب ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ عوام کے خیالات کی اصلاح ہے۔ جن کے اندر بڑے پیمانے پر جہالت پھیلی ہوئی ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں اب پہلے سے زیادہ جان مار کے کوشش کرنا پڑے گی۔ گزشتہ عام انتخابات میں جو نتائج نکلے وہ اس وجہ سے نہیں نکلے کہ پڑھے لکھے تعلیم یافتہ لوگوں نے اپنا ووٹ غلط استعمال کیا۔ سبب ان نتائج کا یہ تھا کہ ان پڑھ اور نادان لوگوں نے اپنے ووٹ کا غلط استعمال کیا۔ (اس موقع پر ایک صاحب نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا کہ عوام میں کام کرنے کے لئے اب جماعت اسلامی کو عوامی جماعت اسلامی ہونا چاہئے۔ اس پر مولانا محترم نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا) جتنی عوامی جماعت اسلامی ہے اتنی ہی رہے گی۔ اس سے زیادہ عوامی نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ اسے عوامی جماعت اسلامی ہی بنانا چاہتے ہیں تو پھر اسے جماعت اسلامی کا نام دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بہتر ہے کہ اسے مسلم لیگ کا نام دے دیجئے۔ یہ جماعت اسلامی کے نظم کا ہی نتیجہ ہے کہ اصلاحِ احوال کا کام ایک مؤثر طریقے سے ہو رہا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا، تو آپ اس جماعت میں بھی وہی بھانت بھانت کی بولیاں سنتے جو دوسری جماعتوں میں آپ سنا کرتے ہیں اور آپ کو ایک ہی جماعت کا نام لے کر لوگ طرح طرح کے راستوں پر چلتے ہوئے نظر

آتے۔ آخر آپ نے مسلم لیگ کا حشر دیکھ لیا۔ اس میں سے عوامی لیگ نکلی۔ اس میں سے تین تین لیگیں بن گئیں۔ اسی کے اندر سے ری پبلکن پارٹی اور نہ جانے کون کون سی پارٹیاں نکلیں۔ یہ سب اس کے عوامی پن ہی کا نتیجہ ہے۔ ہم جماعت اسلامی کو ہرگز اس طرح کی عوامی جماعت نہیں بنائیں گے۔ جماعت اسلامی جس مقصد کے لئے کام کر رہی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ صرف وہ لوگ اس کے اندر کام کریں جو خوب سوچ سمجھ کر اسلام کو شعوری طور پر مانتے ہوں۔ اگر جماعت اسلامی کا دروازہ چوپٹ کھول دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر شخص مسلمان کے نام سے اس کے اندر آ کھڑا ہو گا اور وہی کچھ کرے گا جو دوسرے مسلمان دنیا میں کر رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ جو شخص جماعت اسلامی میں شامل ہو وہ شعوری مسلمان ہو۔ سوچ سمجھ کر ایمان لایا ہو اور پھر اس کے بعد وہ کسی نظم کے تحت کام کرے۔ اس جماعت میں جس شخص کو بھی کام کرنا ہے اسے Personal Ambitions کو دل سے نکال دینا چاہئے۔ آدمی کو اس کے لئے تیار ہونا چاہئے کہ وہ ذاتی مفاد، اپنی شخصیت کا کبر، یہ ساری چیزیں قربان کر دے اور اپنے مقصد کے لئے ایک نظم کے تحت کام کرے۔ نظم کو خراب کرنے والی کسی قسم کی حرکت، درحقیقت اس جماعت میں گناہ ہے اگر نظم اور ضبط کے ساتھ ہم کام کریں گے تو انشاء اللہ آخر کار حالات بدل جائیں گے۔ خواہ کتنی ہی خرابیاں پیدا ہو گئی ہوں۔

سوال: تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کو شکایت ہے کہ جماعت اسلامی خوداعتمادی سے میدان میں کیوں نہیں آتی۔ وہ دوسری جماعتوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کیوں کرتی ہے؟ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جدوجہد جماعت کے کارکن کرتے ہیں اور کریڈٹ دوسرے لے جاتے ہیں؟

جواب: لوگوں کو بلاشبہ یہ بات ناگوار گزرتی ہے اور گزرنی چاہئے کہ ہم سیاسی معاملات میں دوسری جماعتوں کے ساتھ سٹیج پر آتے ہیں اور مظاہروں میں شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح کے معاملات میں یہ بات سمجھ لیجئے کہ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جن میں دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی کا اپنا

نصب العین ہے، اپنا طریقِ کار ہے۔ اس کے مطابق ہم اپنے ہی اجتماعات کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے، اگر کوئی مظاہرہ کرنا ہوگا تو خود ہی مظاہرہ کریں گے۔ لیکن ملک کے مختلف معاملات میں بعض اوقات آپ کو دوسری پارٹیوں سے بھی ملنا پڑے گا، ایسا نہیں ہے کہ ان معاملات میں اپنے آپکو ایک خول میں بند کر لیا جائے اور سب سے تعلقات کو ختم کر دیا جائے، البتہ ہم پہلے بھی احتیاط برتتے رہے ہیں اور آئندہ بھی احتیاط برتیں گے کہ کوئی ایسی مشترکہ جدوجہد نہ کی جائے جو ہمارے مقصد کے خلاف نتائج پیدا کرے۔ لیکن ہم بہرحال انسان ہیں اور انسان سے بسا اوقات غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ پہلے بھی ہماری احتیاط کے باوجود بعض اوقات غلط نتائج نکلے ہیں اور آئندہ بھی اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ تاہم اپنی حد تک ہم پوری احتیاط سے کام کر رہے ہیں۔”

سوال: بعض لوگ آپ کو گالیاں دیتے ہیں اور آپ ہمیں جواب میں گالی دینے سے روکتے ہیں۔ ہم گالی نہ سہی، گھونسے سے تو جواب دے سکتے ہیں؟

جواب: (مولانا محترم نے اس دلچسپ سوال کے جواب میں متبسّم ہو کر فرمایا) قرآن کریم میں ہدایت یہ ہے کہ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا تمہارے ساتھ جتنی برائی کی جائے اتنی ہی تم کر لو۔ آپ اس سے دس گنا برائی کرنا چاہتے ہیں...... نہیں،” گالی کے مقابلے میں مسلمان کا کام یہی ہے کہ وہ صبر سے کام لے۔ میں نے تو کچھ بھی گالیاں نہیں کھائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مکہ کے لوگوں نے جو گستاخیاں کی تھیں۔ ابوجہل نے، یہود نے، منافقین نے اور مشرکینِ عرب نے آپؐ کے ساتھ جو زیادتیاں کی تھیں۔ ان کے مقابلے میں بھی حضورؐ نے صبر سے کام لیا۔ اسی صبر نے آپؐ کی اخلاقی برتری لوگوں پر ثابت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں ہمیں بھی بہرحال صبر سے کام لینا چاہئے۔ یہی وہ چیز ہے جو ہمارے اور گالیاں دینے والوں کے درمیان فرق کو واضح کرتی ہے۔

سوال: آدھا ملک بین الاقوامی سازشوں اور اپنوں کی غداریوں سے گیا اور اب بچے کھچے ملک میں بھی بین الاقوامی سازشیں اپنا کام کر رہی ہیں، ان حالات میں نوجوانوں کو کیا کرنا چاہئے؟

جواب: اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ کسی ملک اور کسی قوم میں کوئی بین الاقوامی سازش اس وقت تک کارگر نہیں ہو سکتی جب تک کہ خود اس ملک اور اس قوم میں ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو اس سازش کے آلۂ کار بنیں۔ اگر ایسے لوگ اندر نہیں ہیں تو باہر کی سازشوں سے کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ ہمارے اندر جو غلطیاں اور خامیاں ہیں وہی دراصل موجب ہوئی ہیں اس بات کی کہ یہاں بین الاقوامی سازشیں بھی کارگر ہوں۔ اگر ہم کوشش کریں، اپنی قوم کے خیالات کو درست کریں، اس کے طرزِ عمل کو بدلیں، اس کو اس قابل بنائیں کہ وہ اپنے رہنماؤں اور اپنے حکمرانوں کا صحیح انتخاب کر سکے تو اس صورت میں بین الاقوامی سازشیں کچھ نہیں کر سکیں گی۔ ہمیں اب اپنی ساری توجہ اس بات پر صرف کرنی چاہئے کہ اس ملک کے مسلمانوں کے اندر اور غیر مسلموں کے اندر بھی اپنے خیالات پھیلائیں۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف مسلمان قوم تک محدود رہیں۔ پھر اس ملک میں جو جو بھی اسلام کو ماننے والے ہیں ان کے طرزِ انتخاب کو بدلنے کی کوشش کریں۔ اس کام میں جتنی بھی دیر لگے پروا نہیں، لیکن اصل کام کرنے کا یہی ہے۔

سوال: ہمارے مدارسِ عربیہ کے بعض اساتذہ کرام تحریکِ اسلامی سے وابستگی کو برا مانتے ہیں، بسا اوقات ان سے تکرار ہو جاتی ہے تو وہ بددعائیں بھی دینے لگتے ہیں اور تحریک کا کام بسا اوقات اسباق میں مخل ہو جاتا ہے تو وہ ہم پر ناراض بھی ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا ہم شرعاً ان کی مخالفت سے ماخوذ ہوں گے اور کیا ہم اس سے خلاصی پانے کے لئے ان کی رضا کو تحریک پر فوقیت دینے سے عنداللہ ماخوذ ہوں گے؟

جواب: آپ اس سوال کو تین حصوں میں تقسیم کر لیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر تحریک کا کام آپ کے اسباق میں مخل ہوتا ہے تو اس صورت میں آپ کے استادوں کا

آپ سے ناراض ہونا بالکل بجا ہے۔ اس لئے کہ کوئی استاد بھی یہ پسند نہیں کرتا ہے کہ اس کا شاگرد تعلیم کے معاملے میں کوتاہی دکھائے۔ آپ کا فرض یہ ہے کہ تحریک کا کام بھی کریں اور تعلیم کے سلسلے میں بھی اپنا فرض بحُسن وخوبی پورا کریں اگر آپ تحریک کے کام سے اپنی تعلیم کو نقصان پہنچائیں گے تو ظاہر بات ہے کہ استاد آپ سے ناراض ہونے میں حق بجانب ہوں گے۔

سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ "بات بات میں اساتذہ سے تکرار ہو جاتی ہے جس سے وہ بددعائیں دینے لگتے ہیں۔" سوال یہ ہے کہ آپ ان سے تکرار کریں ہی کیوں؟ ایسا کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر آپ کے کوئی استاد آپ سے یہ سمجھنا چاہیں کہ آپ کی تحریک کیا ہے تو آپ بتا دیجئے کہ آپ اور آپ کی تحریک کس مقصد کے لئے سرگرمِ عمل ہیں۔ اگر وہ اس کے خلاف کچھ کہیں تو اسے خاموشی سے سن لیجئے۔ اگر ان کی بات غلط فہمی پر مبنی ہو اور وہ اسے سمجھنا چاہتے ہوں تو آپ اصل حقائق سامنے لے آیئے۔ لیکن اگر وہ سمجھنے کی کوشش نہ کریں اور خواہ مخواہ آپ سے بگڑ کر آپ کو الٹی سیدھی سنانا شروع کر دیں تو صبر کے ساتھ سن لیجئے لیکن تکرار ہرگز نہ کیجئے۔ تکرار ایک اسلامی تحریک کا طریقہ نہیں ہے۔

تیسرا حصہ یہ ہے کہ بعض اساتذہ کرام ایسے ہیں جن کو یہ تحریک سرے سے ہی ناگوار ہے اور وہ اس کام کو ہی برا سمجھتے ہیں، تو میں آپ سے یہ کہوں گا کہ آپ ان سے بس تعلیم حاصل کریں۔ لیکن جو چیز آپ کے نزدیک حق ہے اور جس کے حق ہونے کو آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور جس کے حق ہونے پر آپ کا ضمیر مطمئن ہے، اسے جاری رکھیں۔ آپکو ایسے حضرات سے بگڑنے کی ضرورت نہیں۔ آپ خاموشی کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہیں۔ فی الحقیقت یہ آپ کا نہیں، خود اس قسم کے اساتذہ کا مسئلہ ہے کہ وہ اپنے اس طرزِ عمل کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب پیش کرتے ہیں۔

سوال: کیا موجودہ صورتِ حال میں آئینی ذرائع سے انقلاب لانا مشکل

نہیں ہو گیا۔ کیونکہ جن لوگوں سے ہم کو سابقہ درپیش ہے وہ خود غیر آئینی ذرائع استعمال کر رہے ہیں؟

جواب: فرض کیجئے کہ بہت سے لوگ مل کر آپ کی صحت بگاڑنے میں لگ جائیں تو کیا آپ ان کی دیکھا دیکھی خود بھی اپنی صحت بگاڑنے کی کوشش میں لگ جائیں گے؟ بہت بُرا کیا گیا کہ غیر آئینی طریقوں سے کام لیا گیا ہے اور بہت برا کریں گے اگر ہم بھی ایسا ہی کریں گے۔ غیر آئینی طریقوں کو اختیار کرنے کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک اعلانیہ اور دوسری خفیہ۔ آپ دیکھیں کہ دونوں صورتوں میں کیا نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

اعلانیہ طور پر غیر آئینی طریقوں سے جو تغیر پیدا ہوگا وہ زیادہ برا ہوگا۔ اس طرح کی کوششوں سے پوری قوم کو قانون شکنی کی تربیت ملتی ہے اور پھر سو سال تک آپ اسے قانون کی اطاعت پر مجبور نہیں کر سکتے۔ ہندوستان میں تحریکِ آزادی کے دوران قانون شکنی کو ایک حربے کی حیثیت سے جو استعمال کیا گیا تھا، اس کے اثرات آپ دیکھ رہے ہیں، آج پچیس سال بعد بھی لوگوں کو قانون کا پابند نہیں بنایا جاسکا۔

اگر خفیہ طریقے سے غیر آئینی ذرائع کو اختیار کیا جائے تو نتائج اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوں گے۔ خفیہ تنظیموں میں چند افراد مختارِ کل بن جاتے ہیں اور پھر ساری تنظیم یا تحریک ان ہی کی مرضی پر چلتی ہے۔ ان سے اختلاف رکھنے والوں کو فوراً ختم کر دیا جاتا ہے۔ ان کی پالیسی سے اظہارِ بے اطمینانی سخت ناگوار اور ناپسندیدہ قرار دیا جاتا ہے۔ اب آپ خود سوچیں کہ یہی چند افراد جب برسر اقتدار آئیں گے تو کس قدر بدترین ڈکٹیٹر ثابت ہوں گے۔ اگر آپ ایک ڈکٹیٹر کو ہٹا کر دوسرے ڈکٹیٹر کو لے آئیں تو خلق خدا کے لئے اس میں خیر کا پہلو کون سا ہے؟

میرا مشورہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ خواہ آپ کو بھوکا رہنا پڑے، گولیاں کھانی پڑیں۔ مگر صبر کے ساتھ، تحمل کے ساتھ، کھلم کھلا اعلانیہ طور پر اپنی اصلاحی تحریک کو قانون، ضابطے اور اخلاقی حدود کے اندر چلاتے رہیے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقِ کار بھی اعلانیہ

اور کھلم کھلا تبلیغ کا طریقہ تھا۔ ہم نے ہمیشہ اسی طریقے کو اپنایا ہے۔ پہلے چند سال میں ہمارے اوپر مسلسل غیر قانونی حملے ہوتے رہے ہیں، مگر ہم نے کبھی کوئی غیر قانونی ذریعہ اختیار نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ خود انہی کا منہ کالا ہوا کہ جنہوں نے غیر قانونی، غیر اخلاقی، اور غیر انسانی طریقے روا رکھے مگر خدا کے فضل و کرم سے ہمارے اوپر کوئی دھبہ ثابت نہ کر سکے۔ اس چیز کا زبردست اخلاقی اثر مرتب ہوا۔ خود ان لوگوں کا پیمبر بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ غلط کام کر رہے ہیں۔ آپ سے میری درخواست یہ ہے کہ آپ اپنی اخلاقی ساکھ کو کبھی نقصان نہ پہنچنے دیں اور غیر آئینی طریقوں کے بارے میں سوچنے والوں کی قطعاً حوصلہ افزائی نہ کریں۔ حالات جیسے کچھ بھی ہیں، ہمیں ان حالات کو درست کرنا ہے اور غلط طریقوں سے حالات درست نہیں ہوتے بلکہ اور بگڑ جاتے ہیں۔

☆☆☆

اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے تربیتی کیمپ برائے ناظمین منعقد
۴-اے ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور میں --- ۲۷ جنوری ۱۹۷۳ء

سوال: آج کل عام طور پر لوگ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں مایوس ہیں کہ پاکستان کا مستقبل تاریک ہے، یہ خیال عام ہے کہ آئندہ چند سال بعد پاکستان صفحۂ ہستی پر نہ رہے گا۔ اس صورت میں آئندہ تحریکِ اسلامی کا لائحہ عمل کیا ہوگا اور نوجوانوں کی ذمہ داریاں کیا ہونی چاہئیں؟

جواب: یہ احساس جو لوگوں میں اب پیدا ہوا ہے کہ ملک کا مستقبل تاریک ہے۔ ۲۵ سال سے پیدا کیا جا رہا تھا۔ لوگ پھر بھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک ایک بچہ اس ملک کے مستقبل کے تاریک ہونے کے بارے میں شبہ کا اظہار کرنے لگا، ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا سامان برسوں سے کیا جا رہا تھا۔ جب ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تب لوگوں کو احساس ہوا۔ حالانکہ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ ٹکڑے کرنے کا سامان ہو رہا ہے اور یہ ملک کسی نہ کسی وقت ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس ملک کا مستقبل کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ اس کا جواب یا تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا اس کا جواب دینے کی جرأت کوئی منجم کر سکتا ہے۔ میرا کام مستقبل کے فیصلے کرنا نہیں۔ مستقبل کے بارے میں میرا کام آپ سے یہ کہنا ہے کہ اس بات پر ڈٹ جائیں کہ اس ملک کے مستقبل کو تاریک کرنے کی جو کوشش کی جائے گی اس کے مقابلے میں آپ جان لڑا دیں گے لیکن کسی کو یہ کام نہیں کرنے دیں گے۔

اس ملک کے مستقبل اور اس کی آفرینش کا انحصار ایک ہی چیز پر ہے کہ اللہ تعالیٰ

ہے جو وعدہ تحریکِ پاکستان کے دوران میں کیا گیا تھا اسے ایمان داری کے ساتھ پورا کیا جائے۔ وعدہ یہ تھا کہ اس سرزمین کو اسلام کا گہوارہ بنایا جائے گا۔ اس میں اسلام کا قانون نافذ کیا جائے گا۔ یہی وعدے تھے کہ جن کی بناء پر رحمت الٰہی متوجہ ہوئی۔ انہی دعووں کی وجہ سے ایک معجزے کے طور پر پاکستان وجود میں آیا۔ ورنہ ۱۹۴۷ء کے آغاز تک کسی کو یہ توقع نہ تھی کہ پاکستان بن جائے گا۔ لیکن پاکستان بنا تو اس کے ساتھ ہی ان وعدوں کو فراموش کر دیا گیا۔ خدا سے باندھا گیا عہد توڑا گیا۔ قانونِ فطرت ہے کہ خدا سے بے وفائی کر کے آج تک اس کی سزا سے کوئی نہیں بچ سکا تو ہم کیسے بچ سکتے تھے۔ اب اگر اس سزا سے بچنا ہے تو اس عہد کو تازہ کرنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ جتنا اس سے انحراف کریں گے اتنا ہی ملک کا مستقبل تاریک ہوتا جائے گا۔

پاکستان کے قیام کے وقت کسی شخص نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم پنجابی کی حیثیت سے آزادی چاہتے ہیں یا بنگالی، بلوچ، پٹھان یا سندھی کی حیثیت سے، اس وقت سب کے سب مسلمان تھے اور مسلمان بن کر ایک مسلم مملکت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد تمام تر کوششیں اس بات کی کی گئیں کہ مسلمانوں کی اسلام کے اوپر وحدت نہ ہو اور وہ اسلام کے نام پر جمع نہ ہونے پائیں' بلکہ بنگالی، پنجابی، بلوچی اور پٹھان میں تقسیم ہو جائیں۔ یہ کوششیں اب بھی ہو رہی ہیں اور کہا جا رہا ہے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر لو کیونکہ وہ اپنی مرضی سے الگ ہوا ہے۔ حالانکہ وہ الگ نہیں ہوا بلکہ زبردستی الگ کیا گیا ہے۔ کہا جا رہا ہے 'مان لو کہ مغربی پاکستان میں چار قومیں آباد ہیں جبکہ ہندوستان میں پچیس سے بھی زیادہ قومیں آباد ہیں لیکن وہاں انہیں ماننے پر زور نہیں دیا جاتا'۔ بلوچستان کی کل آبادی ۳۰ لاکھ ہے۔ یہاں بھی کئی قومیں بلوچ، پٹھان اور بروہی آباد ہیں اگر اسی طرح قومیت کا نعرہ بلند کیا جاتا رہا تو ایک بلوچستان کے بھی چار پانچ حصے بن جائیں گے اور ایسا ہی حشر باقی حصوں کا بھی ہوگا۔ اب رہا ملک کے بارے میں سوال کہ اس کا مستقبل کیا ہے تو ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ جو مستقبل بنایا جا رہا ہے اسے ہرگز نہیں بننے دیں

گے۔ مسلمان کی حیثیت سے فیصلہ کیجئے کہ اس کا مستقبل خراب نہیں ہونے دیں گے، جس کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

> سوال: موجودہ سائنسی اور مادہ پرستی کے دور میں مادہ پرستوں کا غلبہ ہے۔ تحریکِ اسلامی کے کارکن کی حیثیت سے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں رہنمائی فرمائیے کہ میں جماعت اسلامی کا باقاعدہ کارکن بنوں یا سائنس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دنیا میں غلط سائنسی نظریات کا ابطال پیش کر کے اسلام کی فوقیت ثابت کروں؟

جواب: یہ دونوں کام اپنی اپنی جگہ اہم ہیں اور برابر اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ جب تک تعلیم حاصل کر رہے ہیں، خواہ کسی شعبے میں ہوں اس میں کمال پیدا کیجئے۔ مقلّدوں کا سا کمال نہیں بلکہ مجتہدوں کا سا کمال پیدا کیجئے۔ اس علم کو بھی حاصل کیجئے لیکن آنکھیں بند کر کے نہیں۔ ان کا تنقیدی نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں۔ خواہ سائنس ہو، خواہ سوشل سائنسز ہوں، انہیں تنقید کی نگاہ سے دیکھیں کہ حق کیا ہے؟ اور باطل کیا؟ حق کو الگ کریں اور باطل کو الگ۔ اعلیٰ درجے کے سائنسدان بنیئے لیکن وہ سائنس دان نہیں جو خدا کا انکار کرتے ہیں بلکہ وہ سائنس دان بنیں جن کے علم سے خدا پر اور زیادہ یقین پیدا ہو جائے۔ سوشل سائنسز میں بھی حقائق کو حاصل کیجئے، مگر مغربی نظریات کو آنکھیں بند کر کے قبول نہ کیجئے۔ اجتماعی زندگی کے طریق مغرب سے سیکھنے کی ضرورت نہیں، بلکہ انہیں سکھانے کی ضرورت ہے۔ معاشرتی زندگی کے اصولوں کے بارے میں ان پر واضح کریں کہ تمہارے اصول تباہی کی طرف لے جانے والے ہیں اور اسلام کے اصول سلامتی کے ضامن ہیں۔ اسی طرح سے آپ عالم بنیں اور مجتہد عالم بنیں۔ لیکن چونکہ وقت ایسا ہے کہ سکون کے ساتھ محض تعلیم حاصل نہیں کی جا سکتی بلکہ ساتھ ساتھ اس ملک کے اندر جو بے دینی جڑ پکڑ رہی ہے، اسے اکھاڑنے کی بھی کوشش ضروری ہے۔ جس دینداری کو دم توڑنے پر مجبور کیا جا رہا ہے اسے زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی نظامِ زندگی کے قیام کی جدوجہد اور علم کا حصول دونوں وقت کی اہم ضرورت ہیں۔ ہم

جس دور سے گزر رہے ہیں وہ ایسا نہیں ہے کہ آپ سکون کے ساتھ صرف علم ہی حاصل کریں۔ اس کے ساتھ آپ کو اپنے دین کو قائم کرنے کی کوشش بھی کرنی ہوگی۔ دونوں ضرورتیں آپ کی سعی کی یکساں طالب ہیں اور آپ کو ان کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا۔

سوال: کیا موجودہ دور میں کسی بیرونی طاقت کی مدد کے بغیر کوئی انقلاب لایا جا سکتا ہے؟ اور اگر نہیں تو تحریکِ اسلامی کیوں کسی بیرونی طاقت کی مدد حاصل نہیں کرتی؟

جواب: اس سوال کا پہلا حصہ غلط ہے۔ اس لئے دوسرے حصے کا جواب بھی کوئی معنیٰ نہیں رکھتا لیکن ایک بات یاد رکھئے کہ کسی ملک میں انقلاب بیرونی طاقتوں کی مدد سے برپا نہیں کیا جا سکتا' بلکہ ملک کے رہنے والوں کے عزم اور ارادے سے انقلاب برپا ہوتا ہے۔ اگر ان کے اندر کسی چیز کے بارے میں عزم پیدا ہو جائے' خواہ وہ وطنیت کا عزم ہو، خواہ خدا پرستی کا عزم ہو، خواہ قوم پرستی کا عزم ہو، تو وہ قوم اس مقصد کے لئے لڑنے' مرنے اور کٹنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے اور انقلاب برپا ہو کر رہتا ہے۔ خواہ بیرونی طاقتیں انقلاب روکنے کی کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کریں۔

جب یہ حقیقت ہے تو تحریکِ اسلامی کو کسی طاقت سے معاہدہ، معاملہ اور مدد طلب کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں اور اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ آخر وہ کون سی بیرونی طاقت ہے جو کسی ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے تحریکِ اسلامی کی مدد کرے گی۔ کیا امریکہ اس سلسلے میں مدد کرے گا جس پر یہودی سوار ہیں۔ کیا روس اس سلسلے میں مدد دے گا جو پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی اس کے خلاف نفرت کا اظہار کرنے لگا تھا اور جو پاکستان کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ کیا ہندوستان اس سلسلے میں مدد کرے گا؟ ان ساری بڑی طاقتوں سے بھی بڑی طاقت اللہ کی ہے ہم اگر اس کے ساتھ معاہدہ اور اس کی مدد طلب کریں تو خواہ امریکہ، روس، ہندوستان اور چین بھی مزاحمت کریں گے تو پھر بھی اسلامی انقلاب برپا ہو کر رہے گا۔ انشاء اللہ

سوال: ہم کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عورتوں کے ساتھ مل کر تعلیم حاصل کرتے ہیں، لیکن ہمارے دل اسے ناگوار سمجھتے ہیں۔ کیا ہم ایسی حالت میں ان سے مل جل کر تعلیم حاصل کریں یا نہ کریں؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ آپ اس مخلوط تعلیم کے خلاف مسلسل آواز اٹھاتے رہیں اور آئینی حدود میں یہ مطالبہ کرتے رہیں کہ اس غلط تعلیمی نظام کو ختم کیا جائے اور لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے الگ الگ انتظام کیا جائے۔ لیکن جب تک آپ کو اس میں کامیابی نہیں ہوتی اور یہ لوگ مخلوط تعلیم کو درس گاہوں میں جاری رکھتے ہیں، اس وقت تک آپ یوں سمجھیں کہ جیسے آپ ریل میں یا کسی جہاز میں سفر کر رہے ہیں۔ اس میں عورتیں بھی ہوتی ہیں اور مرد بھی ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں آپ کے لئے شریعت کا یہ حکم ہے کہ آپ نظریں بچا کر رکھیں، اسی طرح آپ اپنے تعلیمی اداروں میں بھی اس حکم شرعی کی تعمیل کریں...... غضِ بصر، جس کا حکم قرآن مجید میں دیا گیا ہے، ایسے ہی حالات کے لئے ہے۔ آپ حتی الامکان نظریں بچائیں، غضّ بصر کے معنے نظر نیچے رکھنے کے نہیں ہیں لوگ غلطی سے اس کا ترجمہ نگاہیں نیچی رکھنا کرتے ہیں۔ شریعت کا مقصود ہر وقت زمین کو دیکھتے رہنا نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ آپ نگاہ جما کر انہیں دیکھنے کی کوشش نہ کریں۔ اپنی نظر کو انہیں دیکھنے سے بچائیں۔ اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور اگر آپ اپنے کالجوں میں یہ رویّہ اختیار کریں گے تو انشاء اللہ ہر روز آپ کو اس کا ثواب ملتا رہے گا۔

سوال: بعض والدین جمعیت کے کام کے مخالف ہوتے ہیں اور اپنے بچوں پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ اسے چھوڑ دیں، ایسے طالب علموں کا کیا فرض ہے کہ جنہیں ایسی مزاحمت اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

جواب: ان کا فرض ہے کہ والدین کی اطاعت بھی کریں اور جمعیت کا کام بھی کریں۔ میں کسی طالب علم یا طالبہ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ وہ اپنے والدین کی

نافرمانی کرے یا انہیں چھوڑ دے۔ اسلام نے ہمیں اس بات کا پابند کیا ہے کہ اولاد والدین کی اطاعت کرے، انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرے اور ان کی نافرمانی نہ کرے۔ دوسری طرف جہاں تک میں نے جمعیت کے مقاصد کا مطالعہ کیا ہے، وہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جو کوئی گناہ یا برائی ہو۔ بلکہ ایک صحیح مقصد کے لئے، جو ہر مسلمان کا مقصد ہے، وہ ایمانداری کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ والدین اگر کسی طالب علم کو روکتے ہیں تو کسی غلط فہمی کی بنا پر روکتے ہیں۔ ان کے علم میں نہیں ہوتا کہ یہ جمعیت کیا ہے اور کیا کام کر رہی ہے اور اس میں خود ان کے بچوں کی کیا بھلائی مضمر ہے۔ وہ یہ حقائق نہ جاننے کی وجہ سے اپنے بچوں کو روکتے اور مخالفت کرتے ہیں۔ آپ کا کام یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے آپ اپنے والدین کو سمجھائیں اور بتائیں کہ ہماری جمعیت کیا ہے؟ انہیں بتائیے کہ ہم کوئی ایسا کام نہیں کرتے ہیں جو آپ کی ناراضی کا سبب بنے۔ ہم خدا کا کام ایمانداری کے ساتھ کر رہے ہیں اور دین پر عمل کر رہے ہیں ...... اگر بعض والدین اس کے باوجود نہ سمجھیں تو جاننا چاہئے کہ کچھ انسانی تعلقات ایسے ہوتے ہیں جنہیں قانون کنٹرول کرتا ہے اور کچھ انسانی تعلقات وہ ہوتے ہیں جو قانون سے بالاتر ہوا کرتے ہیں۔ آخر بعض والدین ایسے بھی تو ہیں جن کی اولاد چوری کی عادت میں مبتلا ہوگئی ہے، یا آوارہ ہوگئی ہے۔ سینماؤں میں بھٹکتی پھرتی ہے، جوئے کھیلتی ہے، آخر ان کے والدین بھی تو اپنی اولاد کو برداشت کر رہے ہیں، تب آپ کو کیوں برداشت نہیں کیا جائے گا۔ آپ مضبوطی کے ساتھ اپنا کام بھی جاری رکھیں اور والدین کو راضی رکھنے کی کوشش بھی کریں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ والدین جھڑکیں گے تو جھڑکی کھا لیجئے، ماریں گے تو پٹ لیجئے۔ انشاء اللہ آپ کبھی نہ کبھی ان کا دل جیت ہی لیں گے۔ آپ کی راست روی اتنا کام ضرور کر دکھائے گی۔

سوال: اگر اخلاقی بدحالی اسی رفتار سے بڑھتی رہی اور زیادہ سے زیادہ لوگ برائیوں میں ملوث ہو گئے تو کیا کچھ عرصہ بعد لوگ اسلامی نظام سے خائف نہ ہونے لگیں گے؟

جواب: میں خود بھی اپنی تقریروں میں بار بار یہ کہتا رہا ہوں کہ معاشرے میں اخلاقی فساد اگر اسی رفتار سے بڑھتا رہا تو وہ اسلامی نظام کے لئے غیر موزوں ہو جائے گا۔ لیکن جو بات یہاں سمجھ لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ جس حد تک آپ کے بس میں ہو آپ اصلاحِ خلق کی کوشش کرتے رہیں۔ جو چیز آپ کے بس میں نہیں ہے، آپ اس کے بارے میں جوابدہ بھی نہیں ہیں۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ ملک کی دولت اور وسائل اور اقتدار جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ بگاڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ یہاں بھلائی نہ پھیلے برائی ہی پرورش پائے۔ اب ظاہر ہے کہ ہم ...... جن کے پاس نہ دولت ہے اور نہ وسائل و اختیارات ...... ان کو کیسے روک سکتے ہیں؟ جو ہمارے بس میں نہیں ہے ہم پر اس کی جوابدہی بھی نہیں ہے، ہم جوابدہ اس بات کے ہیں کہ جو چیز ہمارے امکان میں تھی اس کے انجام دینے میں ہم نے کہاں تک اس کا حق ادا کیا ہے یا اس میں کمی کی ہے؟ چنانچہ آپ اپنی جدوجہد جاری رکھیں اور مسلسل اصلاحِ احوال اور اصلاحِ خلق کے لئے کام کرتے رہیں۔

یہ تو تھی اصولی بات لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین کے لئے اسلامی نظام کا گھوارہ بننا مقدر فرما دیا ہے۔ گزشتہ ۲۵ سال کے حالات کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہاں اسلامی نظام نافذ ہو کر رہے گا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی ہرگز یہ طاقت نہیں تھی کہ وہ پاکستان بنا سکیں۔ حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کا انعام اور معجزہ تھا کہ اس نے ہندوستان کے ایک حصے کو پاکستان بنایا اور ایسی شکل میں بنایا جو کسی سکیم میں نہیں تھا۔ سکیم تو یہ تھی کہ ملک تقسیم ہو گا اور ہندو اکثریت کے علاقے ہندوستان میں اور مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے۔ نقل آبادی کسی کے تصور میں بھی نہیں تھا۔ اگر ایسی شکل ہی قائم رہتی تو یہاں اسلامی نظام کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا تھا۔ مگر یہ اللہ کی مشیت تھی کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو ہجرت کرنا پڑی اور اس طرح یہ علاقہ واضح مسلم اکثریت کا علاقہ بنا۔ گویا فسادات کے شر سے اللہ نے خیر کا یہ پہلو اسلامی نظام کے لئے مقدر فرمایا، اور اسلامی نظام کے امکانات واضح

فرمائے۔

دوسرے یہ کہ آپ نے خود دیکھ لیا کہ یہاں جو بھی اسلامی نظام کی راہ میں مزاحم بنا ہے وہ ذلیل و خوار ہوا ہے۔ نہ اس سے پہلے اسلامی نظام کے راستے میں رکاوٹ بننے والے زیادہ دیر تک ٹھہر سکے ہیں اور نہ انشاء اللہ آئندہ ٹھہر سکیں گے۔ میرا دل اس پر پوری طرح مطمئن ہے اور میں یہ سوچ کر کبھی پریشان نہیں ہوتا کہ یہ لوگ جو اس قدر بگاڑ پیدا کر رہے ہیں تو شاید یہاں اسلامی نظام قائم نہ ہو سکے۔

بہر حال یہ صورتِ حال قوم کے لئے آزمائش کا درجہ رکھتی ہے خدا کرے کہ ہم اس آزمائش پر پورا اتریں۔

پھر میرا مشاہدہ یہ ہے کہ جتنی کوششیں اس قوم کو بگاڑنے کے لئے ہو رہی ہیں ان کے تناسب سے لوگوں میں برائی نہیں پھیل رہی۔ اس قوم میں خیر اب بھی موجود ہے۔ اب جس حد تک خیر موجود ہے آپ اس سے استفادہ کریں اور اس کی حفاظت کریں۔ کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ آج بھی جب آپ لوگوں کو خدا کے دین کی طرف بلانے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو لوگ آپ کی بات سنتے ہیں وہ آپ سے نفرت نہیں کرتے بلکہ غلط راستے پر چلنے والوں اور چلانے والوں کو ہی برا سمجھتے ہیں۔ اصل میں مسلمانوں کی قدریں نہیں بدلیں، ان کی عادتیں بگڑی ہوئی ہیں اور یہ مرض لاعلاج نہیں ہے۔

☆☆☆

''ہم قدم'' اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کا مرکزی ترجمان ہے۔ ''تربیتی کانفرنس نمبر'' کے لئے یہ گفتگو مجلے کے مدیر سید متقین الرحمان نے مرتب کی --- مارچ ۱۹۷۴ء

ہمقدم: مولانا محترم، اس برعظیم پاک و ہند میں آپ کی برپا کی ہوئی تحریکِ اسلامی آج دوسری تمام تنظیموں اور تحریکوں کے مقابلے میں فرداً فرداً جہاں تنظیمی لحاظ سے مؤثر ترین تحریک ہے، وہیں افرادی قوت کے لحاظ سے بھی بہت مال دار ہے۔ اس کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ آپ نے ایک زبردست انقلابی لٹریچر تیار کیا ہے۔ ایسا لٹریچر جو دل و دماغ کو اپیل کرتا ہے اور جس کے مطالعے کے بعد ہر باشعور اور صاحبِ عقل آدمی اس تحریک سے متاثر ہو کر رہتا ہے اور پھر بتدریج اس کا اثر قبول کرتا چلا جاتا ہے۔

آپ یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دینے سے پہلے خود آپ کو کیا ذہنی سفر درپیش ہوا؟

مولانا محترم: میری حیثیت اس انجینئر کی سی نہیں جو پہلے ایک عمارت کا نقشہ بناتا ہے اور پھر اس کے مطابق سامانِ تعمیر جمع کر کے کوئی عمارت تعمیر کرتا ہے۔ بلکہ میرے اندر خود بھی اسی طرح سے ایک ارتقائی عمل ہوا ہے۔ جس طرح ایک ارتقائی عمل کے نتیجے میں تحریک ابھری اور اس نے نشوونما پائی۔ جیسے جیسے میں قرآن و حدیث کو سمجھتا گیا اور ان کو حالات پر منطبق کرتا گیا' اسی طرح سے میرے سامنے ایک تحریک کا نقشہ آپ سے آپ بنتا گیا...... اور اسی طرح میں اسے پیش کرتا گیا۔ اور اس پر لوگ لبیک کہتے ہوئے

آتے چلے گئے۔

ہمقدم: ہم تفصیل سے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ قرآن اور حدیث کا مطالعہ کرنے کے لئے آپ نے کیا طریقہ اختیار فرمایا؟

مولانا محترم: میں نے جب دنیا میں آنکھیں کھولیں، تو ایک خاص مذہبی ماحول میرے سامنے تھا جس کی بہت سی چیزیں مجھ کو اپیل نہیں کرتی تھیں۔ خوش قسمتی سے میری ابتدائی تعلیم عربی زبان ہی میں ہوئی تھی اور اسلامی علوم کی ابتدائی کتابیں میں پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ اس سے مجھے احساس ہوا کہ جب میں قرآن اور حدیث کو پڑھ کر سمجھ سکتا ہوں تو مجھے جاننا چاہئے کہ وہ اصل اسلام کیا ہے جو قرآن و حدیث پیش کرتے ہیں۔

اس مطالعے کے دوران میں میں نشان بھی لگاتا گیا اور نوٹس بھی لیتا گیا، جس سے معلوم ہوا کہ اسلام فی الواقع کیا ہے جو قرآن و حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ اس مطالعے نے تفصیلی اور تحقیقی شکل اس وقت اختیار کی جب میں نے "الجہادِ فی الاسلام" لکھنی شروع کی۔

ہمقدم: مولانا محترم، اردو تو خیر آپ کے گھر کی زبان تھی اور عربی اور فارسی بھی ابتداءً گھر ہی میں سیکھی ...... لیکن انگریزی میں آپ نے کس طرح دسترس حاصل کی؟

ہم یہ اس لئے بھی جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں اکثر طلبہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پہنچ جانے کے بعد بھی انگریزی میں کمزور اور اس بناء پر اس سے متوحش رہتے ہیں۔

مولانا محترم: انگریزی میں نے باقاعدہ استاد سے تو بہت ہی کم پڑھی ہے۔ اس کے بعد خود میں نے مطالعے سے اسے Improve کیا ہے۔ چونکہ صحافت کا پیشہ اختیار کیا تھا، اس وجہ سے انگریزی اخبارات پابندی سے پڑھنے پڑتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ الفاظ کا ذخیرہ ذہن میں مجتمع ہوتا گیا۔ ابتداءً کچھ ڈکشنری سے مدد لے کر سمجھنے کی کوشش

کرتا تھا، بعد میں دوسرے علوم کی کتابیں ...... انگریزی کی، ہر طرح کے موضوعات پر پڑھنی شروع کردیں۔

ہمقدم: شروع شروع میں انگریزی کا مطالعہ کرتے وقت آپ تلفظ اور معنیٰ جاننے کے لئے کیا صورت اختیار کرتے تھے؟ کیا ہر مشکل لفظ کے لئے بار بار لغت کا استعمال کرتے تھے؟

مولانا محترم: اس کا جواب تو پہلے آ ہی گیا ہے ...... بعض اوقات تو گویا سیاق و سباق سے معنیٰ خود معلوم ہو جاتے تھے، بعض اوقات ڈکشنری سے مدد لیتا تھا۔ چونکہ ملک میں کثرت سے انگریزی بولنے والے موجود تھے اس وجہ سے ان سے خود بخود ہی تلفظ اخذ کرتا چلا گیا۔ بعد میں ریڈیو سے بھی اس میں مدد ملی۔

ہمقدم: کسی بھی شعبۂ علم سے متعلق کسی ایک موضوع پر آپ کی تحریر پڑھ کر فوری طور پر احساس ہوتا ہے کہ بس آپ کی تمام تر مہارتِ علمی اسی شعبہ سے تعلّق رکھتی ہے۔ یوں جو شخص مختلف موضوعات پر آپ کی تمام تحریریں پڑھتا ہے اس کے ذہن میں بدیہی طور پر آپ کے بارے میں ایک عظیم مفسر و محدث، باریک بین فقیہہ و قانون دان، علومِ قدیمہ و جدیدہ کے جیّد عالم، ادبیات و لسانیات، تاریخ و سیرت، معیشت و معاشرت اور حکومت و سیاست کے مسائل پر گہری نظر رکھنے والے مفکّر و رہنما کا تصور اُبھرتا ہے ...... بے شک خدائے علیم و خبیر ہی نے آپ کو اس خزینۂ علمی سے نوازا ہے، لیکن ہم یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ کس طرح سے آپ کو خدا کا یہ عظیم انعام ملا؟ اتنے بہت سے علوم و فنون میں آپ نے مہارت حاصل کرنے کے لئے مطالعہ و تحقیق کا کیا طریقہ اختیار فرمایا؟ کس طرح اس کے حصول کے لئے پلاننگ کی؟

مولانا محترم: میں جب کسی مسئلے پر لکھتا ہوں تو اس کے متعلق اپنی حد تک جتنی تحقیق کر سکتا ہوں وہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جب میرا اطمینان ہو جاتا ہے کہ میں

نے ضروری معلومات جمع کر لی ہیں، تب میں اس پر قلم اٹھاتا ہوں۔ کسی موضوع پر میں نے آج تک محض سرسری مطالعے کی بنا پر قلم نہیں اٹھایا۔

ہمقدم: مولانا! ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ مختلف موضوعات پر آپ بیک وقت کس طرح تحقیق کرتے ہیں؟

مولانا محترم: جو موضوع پیشِ نظر ہوتا ہے، اس موضوع سے متعلق جو مواد فراہم کرنا ضروری ہوتا ہے، وہ سب میں فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ہمقدم: کسی موضوع پر لکھنے سے پہلے آپ کے ذہن میں مرکزی خیال کی آمد ہوتی ہے یا آورد؟

مولانا محترم: زیادہ تر تو مرکزی خیال کی آمد ہوتی ہے لیکن بعض اوقات کوئی خاص مسئلہ سامنے آتا ہے تو اس پر سوچنا پڑتا ہے اور سوچنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں مرکزی تصور یہ ہے۔

ہمقدم: مولانا! ہم آپ کے دن بھر کے پروگرام کی تفصیل جاننا چاہتے تھے۔

مولانا محترم: مصروفیات اتنی مختلف نوعیت کی رہی ہیں، کہ بعض اوقات کسی مسئلے پر میں اپنے خیالات کو مرکوز کر کے لکھ رہا ہوتا تھا، کہ یکایک کوئی صاحب ملاقات کے لئے آگئے یا کوئی اور مسئلہ پیش آگیا اور پہلے مسئلے کی طرف سے توجہ ہٹا کر ملاقاتیں کرنے اور اس دوسرے مسئلے سے نمٹنے میں مصروف ہو جاتا ...... اس کی وجہ سے ذہن پر اتنا شدید اثر ہوتا تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اسی نے میری قوتیں آہستہ آہستہ ختم کر دیں۔

کبھی مجھے سکون اور اطمینان کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں ملا اور نہ اب اس بیماری کے زمانے میں مل رہا ہے۔

ہمقدم: امیرِ جماعت اسلامی کی حیثیت سے جب آپ کو بے شمار سیاسی اور تنظیمی کام بھی کرنے پڑتے تھے تو آپ مطالعہ و تحقیق کے لئے اوقاتِ کار

کی پلاننگ کس طرح کرتے تھے؟

مولانا محترم: میں خود بعض اوقات حیران ہوتا ہوں کہ اتنی ساری مصروفیتوں کے ساتھ میں ایک طرف تحریک کی پلاننگ اور دوسری طرف مطالعہ وتحقیق اور تصنیف و تالیف کا کام کیسے کرتا رہا۔ بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی قوت دے رکھی تھی کہ اتنے سارے کام میں ایک ساتھ کرتا رہا...... اور اس وقت تک کرتا رہا جب مجھے یہ محسوس ہوا کہ اب ساری طاقتیں جواب دیتی جارہی ہیں۔

ہمقدم: ہمیں مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ مطالعہ کی ہوئی چیزیں کچھ عرصے کے بعد ہی ذہن سے محو ہو جاتی ہیں۔ ایک دو کی بات نہیں، ہمارے اکثر ساتھی اس کی شکایت کرتے ہیں۔ ہم نے یہ محسوس کیا ہے کہ آپ کے لئے یہ مسئلہ کبھی "مسئلہ" نہیں بنا۔ اس لئے خاص طور پر آپ سے اس کا حل جاننا چاہتے ہیں......

مولانا محترم: بات یہ ہے کہ جو کچھ آدمی پڑھتا ہے وہ سارا یاد نہیں رہا کرتا' بلکہ اس کا ایک خلاصہ ذہن میں رہ جاتا ہے، جیسے شہد کی مکھی کام کی چیز چوس لیتی ہے اور جس وقت پھر اس مسئلے سے سابقہ پیش آتا ہے...... بحث کرنے کے لئے، تحقیق کرنے کے لئے۔ پھر خیال رہتا ہے یہ چیز فلاں جگہ ہے تو پھر اصل کتابوں کو نکال کر دیکھنا ہوتا ہے۔

ہمقدم: کیا آپ ہر کتاب پڑھنے کے ساتھ ساتھ یا اس کے بعد اس کے نوٹس بھی لیتے ہیں؟ اگر لیا کرتے ہیں تو ان کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟

مولانا محترم: بعض کتابوں پر میں نشان لگا لیتا ہوں تا کہ کام کی چیز تلاش کرنے میں آسانی ہو اور بعض اہم چیزیں نوٹ بھی کر لیا کرتا ہوں۔

ہمقدم: اپنے تجربات کی روشنی میں مطالعہ کرنے میں ہماری رہنمائی کے لئے آپ کے گراں قدر مشورے......؟

مولانا محترم: بس میں آپ کو اس بارے میں جو مشورہ دے سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ

جو چیز بھی پڑھیے کھلی آنکھوں سے پڑھیے، تنقیدی نگاہ سے پڑھیے۔ جو چیز کام کی ہو اسے چھانٹ لیجئے۔ جو چیز قابل قبول ہو اسے قبول کیجئے۔ جو چیز قابل قبول نہ ہو اسے الگ نوٹ کر لیجئے کہ اس کے متعلق مزید تحقیق کرنی ہے۔

ہر مصنف اور ہر کتاب کی ہر بات نہ ردّ کرنے کے قابل ہوتی ہے' اور نہ قبول کرنے کے......اور کام کی باتیں ہر جگہ مل جاتی ہیں!

ہمقدم: مولانا نوجوان نسل کی موجودہ اٹھان سے کیا آپ مطمئن ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں اسلام کی نشاۃٔ ثانیہ کا کام ہو سکے گا؟

مولانا محترم: میں کچھ مطمئن بھی ہوں اور کچھ غیر مطمئن بھی۔ مطمئن اس لحاظ سے کہ نوجوان نسل کی اکثریت میں اسلام سے انحراف نہیں پایا جاتا' اور بے اطمینانی کی وجہ یہ ہے کہ جو تعلیم ان کو مل رہی ہے' اور جو تربیت ان کو مل رہی ہے' اور سارا اخلاقی ماحول جو اثر ان پر ڈال رہا ہے اس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلام سے جذباتی وابستگی اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی کہ ان کے ہاتھوں سے اسلام کی نشاۃٔ ثانیہ کا کام ہو سکے۔ جب تک یہ نئی نسل اسلام سے اچھی علمی واقفیت نہ رکھتی ہو اور اس میں گہرے دینی جذبات نہ پیدا ہو جائیں اور ان کے ساتھ اس میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی موجود نہ ہو جو اپنی دماغی قابلیتوں کو پتہ مار کر تحقیقاتی کام کرنے کے لئے تیار کرے۔ اس وقت تک نشاۃٔ ناممکن۔

ہمقدم: اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس وقت ملک کے اکثر تعلیمی اداروں میں جمعیت کی یونینز ہیں، ان یونینز کو نظریاتی بنیادوں پر مفید بنانے کے لئے کیا کچھ کیا جانا چاہئے؟

مولانا محترم: جہاں تک یونینز کو نظریاتی بنیادوں پر مفید بنانے کا تعلق ہے' اس کا سارا انحصار اس پر ہے کہ جمعیت کے اپنے کارکن جو یونینز میں ہیں' وہ طلبہ میں اپنے نظریات کو زیادہ سے زیادہ پھیلائیں۔ انتخابات میں آپ کے جیتنے کے اندر بہت سے

عوامل کام کر رہے ہیں۔ صرف یہ بات نہیں ہے کہ آپ کے نظریات طلبہ میں زیادہ مقبول ہیں اس لئے آپ جیت رہے ہیں۔ بلکہ اب آپ کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ آپ سب سے زیادہ مضبوط Factors اپنے نظریات کو بنائیں۔ انہیں طلبہ میں زیادہ سے زیادہ پھیلائیں۔ جن کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آپ کی یونینز کامیاب ہوتی ہیں، ان کی لائبریریوں میں دیکھیں کہ آپ کا لٹریچر ہے یا نہیں، نہ ہو تو اسے فراہم کرنے کی کوشش کریں۔ طلبہ کو پڑھوائیں بھی اور گفتگوؤں میں بھی اپنے خیالات پھیلائیں، اور ان کو یہ احساس بھی دلائیں کہ اگر پاکستان اسلامی ریاست نہیں بنتا تو یہ سرے سے باقی ہی نہیں رہ سکے گا۔ اس کے الگ وجود کا کوئی جواز ہی نہیں رہتا۔ اس کے ساتھ یہ کوشش بھی کرنی چاہئے کہ اخلاقی حیثیت سے طلبہ کی حالت بہتر بنائی جائے اور جو بداخلاقی پھیلانے والے اسباب ہیں، ان کی روک تھام کی جائے۔

ہمقدم: ملک کے حالات ہمیں آگے بڑھنے پر مجبور کر رہے ہیں، جب کہ تربیتی معاملات ہمیں آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں۔ اس صورت میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ نیز تربیتی اور عمومی سرگرمیوں میں توازن پیدا کرنے کی کیا سبیل ہو......؟

مولانا محترم: ملک کے حالات آپ کو بے شک آگے بڑھنے پر مجبور کر رہے ہیں لیکن تربیتی کمزوریوں کے ساتھ اگر آپ آگے بڑھے تو فائدے کے بجائے نقصان کا زیادہ اندیشہ ہے۔ اس لئے عمومی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ تربیت کا اہتمام ضروری ہے۔

اس معاملے میں توازن پیدا کرنے کے لئے کوئی خاص نسخہ تو میں نہیں بتا سکتا، کیونکہ یہ ایسی چیز تو ہے نہیں جس کو ناپ تول کر آدمی کہے، کہ اتنے کلو عمومی سرگرمیاں ہوں اور اتنے کلو تربیتی ہوں۔ اعتدال کا انحصار آپ کے اپنے احساس پر ہے۔ جب آپ محسوس کریں کہ تربیت کی کمزوری اپنا اثر دکھا رہی ہے، تو اپنی عمومی سرگرمیوں کو روک کر تربیت کی طرف توجہ کریں۔ جب آپ دیکھیں کہ تربیتی سرگرمیوں پر کوئی خاص اثر نہیں پڑ رہا، تو عمومی سرگرمیاں بھی ساتھ ساتھ جاری رکھیے۔

☆☆☆

اسلامی جمعیت طلبہ کے کل پاکستان تربیتی کیمپ

منعقدہ لاہور میں ---۲۱ مارچ ۱۹۷۴ء

سوال: تحریکی مزاج کیا ہے اور اسے کن ذرائع کی مدد سے پیدا کیا جا سکتا ہے؟

جواب: مزاج کی خاص قسم کو لفظ ”تحریکی“ نے خود ہی واضح کر دیا ہے۔ تحریکی مزاج یہ ہے کہ آپ جس تحریک کو لے کر اٹھے ہیں اس تحریک میں آپ پوری طرح سے پختہ ہوں، اس کے اندر مستغرق ہوں، اس کے لئے آپ کے دل میں لگن پیدا ہو جائے، اس کو آپ دنیا کی تمام چیزوں سے عزیز رکھنے لگیں، اور اپنے ذہن کی، اپنے جسم کی اور اپنی ساری طاقتیں ...... جو کچھ بھی آپ کو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں، اس کے راستے میں استعمال کرنے پر تل جائیں۔ آپ میں یہ عزم پیدا ہو جائے، کہ آپ اپنا سب کچھ اس کام میں لگا دیں۔ یہ ہے تحریکی مزاج۔

اسے پیدا کس طرح کیا جائے؟ اس کے بہت سے ذرائع ہیں۔ ان میں سے ایک مثلاً یہ ہے کہ آپ نے تربیت گاہ قائم کی ہے۔ دوسرا یہ کہ آپ اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کریں۔ لیکن سب سے زیادہ جو چیز مددگار ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ جس تحریک کو آپ لے کر اٹھے ہیں، اس تحریک میں عملاً کام کریں! ....اس تحریک میں جب آپ عملاً کام کریں گے تو آپ کو ہر طرح کی مخالفتوں اور مزاحمتوں سے سابقہ پیش آئے گا۔ آپ کو اپنا مستقبل بھی خطرناک نظر آئے گا۔ آپ کو بعض اوقات پٹنے کی نوبت بھی آئے گی اور جیل جانے کی بھی، آپ کے اوپر ظلم و ستم بھی ہو گا۔ اس طرح اس کام سے آدمی کی وابستگی بڑھ جائے گی۔ جس کام میں آدمی آرام سے لیٹا رہے، اور کوئی دوڑ دھوپ اور کوئی

تکلیف، کوئی محنت نہ کرے، اس کام سے آدمی کی وابستگی کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آتا ہے کہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس شخص کا اس کام سے کوئی تعلق ہے بھی کہ نہیں!

سوال: موجودہ حالات میں جمعیت کو کن میدانوں میں خاص طور پر کام کرنا چاہیے؟

جواب: موجودہ حالات میں آپ کے لئے کام کا جو اصل میدان ہے وہ درسگاہیں ہیں۔ کسی موقع پر اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے کہ آپ درس گاہوں سے باہر دوسرے میدانوں میں داخل ہوں، ان میدانوں میں آئیں، ان کے اندر قربانیاں پیش کریں، لیکن بہرکیف آپ کا جو اصل میدانِ کار ہے' وہ درس گاہیں ہیں۔ ان درسگاہوں ہی میں آپ کو سب سے زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر نئی نسل بگڑ گئی تو کوئی چیز اس قوم کو تباہ ہونے سے نہیں بچاسکتی۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے پیشِ نظر اسلام ہے۔ قوم نہیں ہے۔ ہمارے پیشِ نظر دنیا میں اسلام کا غلبہ ہے، ہمارے پیشِ نظر دنیا میں اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔ لیکن چونکہ خدا نے ہمیں اس قوم کے اندر پیدا کیا ہے، اس ملک کے اندر پیدا کیا ہے' اس لئے قدرتی طور پر ہمارے لئے کام کی جگہ یہی ہے۔ اور ہم دنیا میں یہ کام اس وقت تک کامیابی سے نہیں کر سکتے جب تک کہ پہلے اس جگہ کو اسلامی نظام کا مسکن اور اسلامی نظام کا مرکز نہ بنالیں۔ اب یہ نئی نسل اگر بگڑ گئی، اس کے نظریات خراب ہو گئے' اس کے اخلاق خراب ہو گئے تو گویا اس ملک کے اندر ...... جو آپ کے لئے (Base) کی حیثیت رکھتا ہے ...... اس ملک کا اسلامی مستقبل ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا آپ کا جو اصل دائرہ کار ہے وہ یہ درس گاہیں ہیں۔ ان کے اندر زیادہ سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ کام کریں۔ ان کے اندر جو طلبہ ہیں جن سے بھی آپ کو سابقہ پیش آتا ہے' ان کے اندر زیادہ سے زیادہ اسلامی تعلیمات کو پھیلائیں، ان کو اپنا ہم خیال بنائیں۔ ان کو اپنے قریب لائیں' یہاں تک کہ وہ آپ کی تنظیم سے وابستہ ہو جائیں۔ یہ سب کچھ آپ کو کرنا

ہے۔

سوال: جماعت اسلامی تیس چالیس سال کی مسلسل کوششوں اور قربانیوں کے باوجود اقتدار حاصل نہ کر سکی، اور پاکستان پیپلز پارٹی چند سال کے اندر ہی اندر اقتدار تک پہنچ گئی، اور آج وہ ملک کے سیاہ وسفید کی مالک ہے۔ کیا یہ بات تحریکِ اسلامی کی غیر مقبولیت کا ثبوت نہیں ہے؟ کارکنان اس کے نتیجے میں بددل ہو رہے ہیں۔

جواب: اگرچہ اب اس طرح کے سوالات کا تعلق موجودہ امیرِ جماعت سے ہے لیکن چونکہ ذکر پچھلے ''تیس چالیس سال'' کا ہے، اور ایک طویل مدت تک میں ہی اس کام کو چلاتا رہا ہوں، اور اس وقت بھی میں ہی اس کام کو چلاتا رہا ہوں جس وقت یہ ''انقلاب'' واقع ہوا...... اس لئے میں اس سوال کا ایک مختصر جواب دوں گا کہ جماعت اسلامی کو سچائی نے شکست نہیں دی ہے۔ جھوٹ نے شکست دی ہے۔ جماعت اسلامی اگر سچائی سے شکست کھاتی تو فی الواقع اس کے لئے شدید ندامت کا مقام تھا۔ لیکن چونکہ اس نے جھوٹ سے شکست کھائی ہے اس لئے اس کا سر فخر سے بلند ہے۔ وہ جھوٹ کے مقابلے میں جھوٹ نہیں لائی، وہ بداخلاقی کے مقابلے میں بداخلاقی نہیں لائی، اس نے سڑکوں پر رقص نہیں کیا، اس نے غنڈوں کو منظم نہیں کیا، اس نے سڑکوں پر ناچ نہیں ناچے، اس نے برسرِ عام گالیاں نہیں دیں اور اس نے لوگوں سے جھوٹے وعدے نہیں کئے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ جھوٹے وعدوں کے فریب میں لوگ مبتلا ہو رہے ہیں۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ کچھ نہ کچھ آپ کو بھی ''کرنا'' چاہئے۔ لیکن میں اس زمانے میں برابر لوگوں سے کہتا رہا، کہ چاہے آپ کو ایک نشست بھی نہ ملے لیکن آپ سچائی کے راستے سے نہ ہٹیں۔ وہ غلط وعدہ جس کو آپ پورا نہ کر سکتے ہوں وہ آپ نہ کیجئے، کوئی ایسا کام نہ کیجئے کہ جس سے آپ کے اوپر ذمہ داری خدا کے ہاں آجائے کہ آپ بھی اس قوم کے اخلاق کو بگاڑ کر آئے ہیں، آپ اس قوم کو لفنگا بنا کر آئے ہیں، آپ بھی اس قوم کو جھوٹ اور گالی گلوچ اور دوسری اخلاقی برائیوں میں مبتلا کر کے آئے ہیں۔ جو ذمہ

داری آپ پر آتی ہے وہ یہ ہے کہ جو اللہ اور رسول کا بتایا ہوا راستہ ہے اس کے اوپر آپ کام کریں۔ آپ نے کوئی ٹھیکہ نہیں لیا ہے کہ اس ملک کے اندر ضرور ہی اسلامی نظام قائم کریں گے۔ اسلامی نظام کا قیام تو اللہ کی تائید اور توفیق پر منحصر ہے اور اس قوم کی صلاحیت اور استعداد پر منحصر ہے جس کے اندر آپ کام کر رہے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ اس قوم کو اس قابل سمجھتا ہے یا نہیں سمجھتا کہ اس کو اسلامی نظام کی برکتوں سے مالا مال کرے یا اس کو ان تجربوں کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دے، جن تجربوں کی ٹھوکریں وہ آج کھا رہی ہے۔

……………آپ کا کام اللہ اور رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقے پر چل کر محنت کرنا ہے، جان کھپانا ہے۔ اس میں اگر آپ کوتاہی کریں گے تو ماخوذ ہوں گے، اس میں آپ کوتاہی نہیں کرتے تو خدا کے ہاں کامیاب ہیں، دنیا میں خواہ کامیاب ہوں یا نہ ہوں۔

☆☆☆

گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن، کراچی یونیورسٹی کے ایک طالب علم صبا حسنی نے مقالے کے لئے مخلوط تعلیم کے موضوع پر چند سوالات دریافت کیے---۱۹۷۴ء

سوال: کیا اسلامی تعلیمات کی رُو سے بالغ مرد وزن کا ایک جگہ پر اور بے پردہ ہو کر تعلیم حاصل کرنا درست ہے؟

جواب: بالغ یا قریب البلوغ مرد وزن جو ایک دوسرے کے لئے غیر محرم ہوں، ان کا تعلیم یا کسی دوسرے مقصد کے لئے بے پردہ ایک جگہ جمع ہونا اسلام کی رُو سے ناجائز ہے۔

سوال: قرآن وسنت میں اس حوالے سے کون سی شہادت ہے؟

جواب: اس عدمِ جواز کے دلائل کتاب ''پردہ'' اور ''تفہیم القرآن'' میں تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں۔

سوال: مخلوط تعلیم کی شکل میں معلّم یا معلّمہ کی حیثیت سے ذمہ داری کا کام انجام دینا شرعاً کس درجے میں آتا ہے؟

جواب: مخلوط تعلیم کی شکل میں معلّمہ کے فرائض انجام دینا شرعاً جائز نہیں۔ معلّم اگر سن رسیدہ اور متقی ہو اور متعلّمات باپردہ الگ بیٹھی ہوں تو ایسی صورت میں تعلیم کے جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

سوال: کیا مرد استاد سے عورتوں یا عورتوں سے مردوں کا بے حجاب پڑھنا

صحیح ہے؟

جواب: عورت سے مرد اور مرد سے عورت کا بے حجاب پڑھنا جائز نہیں۔

سوال: کیا یہ دلیل درست ہے کہ اس ضمن میں اسلام کا مقصد صرف حیا کا برقرار رکھنا ہے؟

جواب: بلاشبہ اسلام کا مقصد حیا کو برقرار رکھنا ہے لیکن اسلام نے اس مقصد کے حصول کا عملی طریقہ اور ذریعہ بھی بتا دیا ہے۔ بے پردگی کے ساتھ حیا قائم رکھنا ایک امر محال ہے۔

سوال: اگر آنکھوں میں حیا ہو تو کیا مخلوط تعلیم جائز ہو گی؟

جواب: اسلام کی رُو سے آنکھوں میں حیا کا اطلاق غضِ بصر (نگاہیں نیچی رکھنے) پر ہو سکتا ہے۔ مگر غضِ بصر کا سوال اور امکان صرف وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اچانک آمنا سامنا ہو جائے اور ایک لمحے یا تھوڑی دیر بعد یہ صورت ختم ہو جائے۔ جو آنکھیں مسلسل اور بار بار ملتی ہیں، ان میں حیا، بے حیائی اور ناز و ادا کی سرحدیں الگ الگ نہیں رہ سکتیں۔

سوال: کیا شرعاً اس دلیل میں وزن ہے کہ دونوں جنسوں کے مل کر پڑھنے سے مسابقت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور معیارِ تعلیم بلند ہوتا ہے؟

جواب: مخلوط تعلیم سے دونوں جنسوں میں تعلیمی مسابقت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ غیر تعلیمی اور غیر اخلاقی موانست و ملامست کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جو علم و اخلاق کے لئے سمِ قاتل ہے۔

سوال: کیا اس دلیل کی بنا پر مخلوط تعلیم درست ہے کہ اگر عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ نظم قائم کیا جائے تو ہمارا ملک اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا؟

جواب: یہ دلیل ہی غلط ہے کہ مخلوط تعلیم پر اخراجات کم اٹھتے ہیں اور بالفرض ایسا ہو تب بھی اس استدلال سے کوئی ناجائز کام جائز نہیں ہو سکتا۔

سوال: کیا تربیتِ اساتذہ کے پیشہ ورانہ اداروں میں مخلوط تعلیم کو برقرار رہنا چاہئے؟

جواب: کسی تعلیمی و تربیتی ادارے میں بھی مخلوط تعلیم جائز نہیں۔

سوال: کیا ماضی کے کسی دور میں مسلمانوں کے تعلیمی نظام میں مخلوط تعلیم کو روا رکھا گیا؟

جواب: مسلمانوں کی تاریخ کے کسی دور میں بھی مخلوط تعلیم کو روا نہیں رکھا گیا۔

سوال: کیا یہ صحیح ہے، چونکہ معاشرہ تغیّر پذیر ہے اور اب زمانہ بہت تبدیل ہو چکا ہے، لہٰذا موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق مخلوط تعلیم اختیار کرنے میں ہرگز مضائقہ نہیں؟

جواب: اگر معاشرے کے تغیّر کی بنا پر مخلوط تعلیم جائز ہو سکتی ہے تو پھر ہر حرام کو حلال کیا جا سکتا ہے۔ تغیّرِ زمانہ سے صرف ان احکام میں تبدیلی ہو سکتی ہے جو نصِ قطعی سے ثابت نہ ہوں، جن میں اجتہاد کی گنجائش موجود ہو یا جن پر عمل کرنے سے خاص حالات میں ایسی قباحت رونما ہوتی ہو جس کا ازالہ شریعت کی نگاہ میں تعمیلِ حکم سے زیادہ ضروری ہو۔

سوال: چونکہ مسلمان خواتین نے قرنِ اوّل میں مردوں کے ساتھ جنگوں میں حصہ لیا ہے، جس سے مخلوط جدوجہد کا جواز ثابت ہوتا ہے، اس لئے کیا تعلیم، بالخصوص فنی تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم دی جا سکتی ہے؟

جواب: یہ بات غلط ہے کہ مسلمان خواتین نے قرنِ اوّل میں مردوں کے ساتھ جنگوں میں حصہ لیا ہے۔ کچھ عورتیں بعض اوقات ساتھ ہو جاتی تھیں اور اپنے محرم مردوں کی مرہم پٹی اور تیمارداری کرتی تھیں۔ ان میں سے بعض نے ناگزیر حالات میں حرب و

ضرب میں بھی حصہ لیا ہے، مگر یہ سب استثنائی صورتیں ہیں اور حالاتِ جنگ پر عام تعلیمی مشاغل کو قیاس کرنا صحیح نہیں۔

سوال: ان مخلوط تربیتی اداروں میں طلبہ و طالبات مشترکہ طور پر مختلف کھیلیں بھی کھیلتے ہیں، آپس میں ہنسی مذاق بھی کرتے ہیں، سٹیج ڈراموں میں حصہ بھی لیتے ہیں، طالبات بسا اوقات اساتذہ سے ان کے کمروں میں تنہائی میں جا کر مشورے اور ہدایات بھی حاصل کرتی ہیں۔ کیا یہ چیزیں گوارا کی جا سکتی ہیں؟

جواب: مخلوط مجالس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”جہاں دو غیر محرم مرد اور عورت ہوں وہاں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔“

سوال: اگر اسلام مخلوط تعلیم کی اجازت نہیں دیتا تو اصلاح کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

جواب: اصلاح کی صورت یہی ہے کہ مخلوط تعلیم و تربیت کو بالکل ہی ختم کر دیا جائے اور دونوں کے لئے الگ الگ ادارے قائم کئے جائیں۔ اس کی اوّلین ذمہ داری تو حکومت پر ہے، لیکن حکومت جن عوام کی نمائندگی کا دعویٰ رکھتی ہے، ان کا بھی فرض ہے کہ وہ حکومت سے اصلاحِ حال کا مطالبہ کریں اور دباؤ ڈالیں تا کہ اس ناپسندیدہ صورت کا خاتمہ ہو۔

سوال: علمائے کرام کی اس سلسلے میں کیا ذمہ داری ہے؟

جواب: علمائے کرام کو بھی عوام الناس کی دینی رہنمائی کا منصب حاصل ہے، اس لئے ان کی بھی ذمہ داری ہے کہ اس سلسلے میں وہ آواز اٹھائیں، اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے عوام اور حکمرانوں کے سامنے اصلاحی احکام پیش کریں اور ان کے مطابق عمل کرنے کا مطالبہ کریں۔

☆☆☆

ایسٹ پاکستان ہاؤس، لاہور میں مشرقی پاکستان جمعیت اور البدر کے ہجرت کر کے آنے والے نوجوانوں کے ساتھ نشست---۱۱ اکتوبر ۱۹۷۴ء

سوال: مشرقی پاکستان میں اس وقت تحریکِ اسلامی کس حال میں ہے؟ جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ کی تنظیمیں کس طرح کام کر رہی ہیں؟

جواب: میرے پاس براہِ راست معلومات کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ مختلف ذرائع سے جو خبریں ملی ہیں وہ یہ ہیں کہ خدا کے فضل سے وہاں جماعت اور جمعیت کے جو لوگ بچ گئے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ بہت بڑی تعداد میں بچ گئے ہیں، وہ سب ازسرِ نو منظم ہو چکے ہیں۔ اور اتنے Devotion کے ساتھ کام کر رہے ہیں کہ چاہے کھانے یا پہننے کو نصیب نہ ہو، لیکن تحریکِ اسلامی کا کام نہایت تندہی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اپنی تنظیم کی شکل انہوں نے دوسری بنا لی ہے، کیونکہ جماعت اسلامی وہاں ممنوع ہو چکی ہے اور اس نام سے جماعت وہاں کام نہیں کر سکتی۔ اسی طرح اسلامی جمعیت طلبہ کا نام بھی اب ان کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے، جو حیثیت سپین کے سانڈوں کے لئے سرخ* رومال رکھتا ہے۔ اس لئے اسلامی جمعیت طلبہ بھی اپنے نام سے کام نہیں کر رہی ہے۔ لیکن لوگ وہی ہیں، مقصد حیات وہی ہے، چنانچہ کام وہی ہے اور اس کام کے لئے ان کا جذبہ وہی ہے...... اور جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، جو لوگ پہلے ان تنظیموں سے وابستہ تھے ان میں سے کوئی بھی پیچھے نہیں ہٹا ہے۔ کوئی کسی خطرے سے نہیں ڈرا ہے۔ وہ لوگ برابر اپنے ایمان پر، اپنے عزم پر اور اپنے مقصد پر قائم ہیں۔

---

* Red Rage یہ ایک انگلش محاورہ ہے، جس کا مطلب دوسرے کے لئے وجہ اشتعال بننا ہے، لیکن اس میں مشتعل ہونے والا ہی نقصان میں رہتا ہے۔

سوال: کیا آپ کے خیال کے مطابق مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان کے ساتھ مل سکتا ہے؟ اس کا ملنا ممکن ہے تو کس طرح؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان مل کر ایک ریاست اور ایک ملک ایک معاہدے Agreement کی بنا پر بنے تھے۔ انگریزوں کی حکومت رخصت ہونے کے وقت برطانوی حکومت، مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ایک معاہدہ قرار پایا تھا جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان مل کر ایک ملک اور ایک ریاست ...... (State) بنے تھے۔ اب یہ صورت پیش آئی ہے کہ ہندوستان نے موقع پا کر اس معاہدے کو توڑ دیا ہے جسے توڑنے کی خواہش قیام پاکستان کے وقت سے وہ رکھتا تھا۔ یہ کام اس نے ملک کے اندر موجود غداروں کے ساتھ سازش کر کے انجام دیا ہے۔ ملک کے اندر غدار موجود تھے، باہر ایک عہد شکن طاقت موجود تھی۔ اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان الگ ہوا...... میں نے بارہا اس بات کا اظہار کیا کہ مشرقی پاکستان کو کسی نے فتح کر کے مغربی پاکستان کے ساتھ نہیں ملایا ہے بلکہ وہ اپنی رضامندی سے ملا ہے۔ فوج اس ملک کو ملا کر ایک نہیں رکھ سکتی۔ آخری مرتبہ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں میں نے سنت نگر لاہور کی تقریر میں یہ بات کہی تھی کہ فوج کے ذریعے سے بھی اس کو ایک نہیں رکھا جا سکتا...... فوج کی مدد سے کبھی سیاسی مسائل حل نہیں ہو سکتے...... بہت احمق تھے وہ لوگ جنہوں نے یہ سمجھا تھا کہ ہم فوج کی طاقت سے اس کو ملا کر رکھ سکتے ہیں۔ حالانکہ فوجی طاقت استعمال کرنے کا آخری نتیجہ اس کی قطعی علیحدگی ہوتا، اور وہ ہو گیا...... اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ دونوں حصے مل کر ایک ملک بن سکتے ہیں تو میرا جواب یہ ہے کہ جب تک دونوں جگہ، مشرقی پاکستان میں بھی اور مغربی پاکستان میں بھی، تحریکِ اسلامی کامیاب نہ ہو جائے، دونوں جگہ ایک صحیح اسلامی ریاست نہ بن جائے، اس وقت تک ان کے ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کو لکھ کر رکھ لیجئے کہ چاہے کوئی سیکولر طاقت ہو یا سوشلسٹ طاقت ہو، وہ ان دونوں کو ملا کر ایک ملک نہیں بنا سکتی۔ نہ پہلے یہ سیکولرازم اور سوشلزم کی بنیاد پر ایک ملک تھے، نہ یہ چیزیں انہیں جوڑ کر

رکھ سکیں اور نہ آئندہ وہ ان کے ذریعے سے ایک ملک بن سکتے ہیں۔ پہلے بھی یہ اسلام کا نام لے کر ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ آئندہ بھی یہ اسی طرح ایک ملک بن سکتے ہیں، البتہ آئندہ صرف اسلام کے نام سے کام نہیں چلے گا بلکہ اس کے کام سے کام چلے گا۔ اگر دونوں جگہ اسلام کا کام کیا جائے تو مشرقی اور مغربی پاکستان ایک ہو سکتے ہیں، اور اگر اسلام سے وہی غداری جاری رکھی جائے جو اس سے پہلے کی گئی ہے تو ان دونوں کے ملنے سے ہاتھ دھو لیجئے۔

سوال: جماعت اسلامی ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا گال آگے کرنے والی پالیسی کب ختم کرے گی؟

جواب: جماعت اسلامی کوئی عیسائی جماعت تو ہے نہیں جو ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا گال آگے کر دے۔ لیکن اس بات کا خیال رکھیے کہ صبر اور حکمت سے کام لینا اور مضبوط ارادے اور کردار سے کام لینا، زیادہ مفید ہے بہ نسبت اس کے کہ آدمی بے صبر ہو کر غلط قدم اٹھائے۔ طاقت کا استعمال صحیح موقع پر جتنا مفید ہوتا ہے، غلط موقع پر اتنا ہی نقصان دہ ہوتا ہے۔ ہماری یہ کوئی پالیسی نہیں ہے کہ ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا گال پیش کر دیا جائے، بلکہ ہماری پالیسی یہ ہے کہ ہم صبر اور مضبوطی کے ساتھ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کریں گے۔ جب لوگوں کی رائے کو اتنا ہموار کر لیں گے کہ اس مسلمان معاشرے میں جمہوری طریقے سے نظام کو تبدیل کر سکیں ......اور ہم انشاء اللہ ایسا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی اور اس کی طرف سے توفیق شاملِ حال رہی تو انشاء اللہ ایک دن ہم کامیاب ہوں گے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتنی مدت لگے گی لیکن بہر حال یہ کام اسی طرح ہونا ہے جس طرح کل سورج کو نکلنا ہے۔

سوال: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگ عام طور پر مایوسی اور ذہنی خلفشار کے شکار ہو رہے ہیں۔ انہیں اس Frustration سے نکالنے کے لئے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: مایوسی اور (Frustration) ذہنی خلفشار ہمیشہ ایسی حالت میں پیدا ہوا کرتا ہے، جب لوگ غلط توقعات لے کر چل رہے ہوں اور نتائج ان کی توقعات کے خلاف برآمد ہوں۔ ہمارے ہاں بھی فرسٹریشن اسی طرح ہوا ہے۔ عوام نے تو کچھ ان لوگوں سے دھوکہ کھایا جو روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا رہے تھے۔ اب ظاہر بات ہے کہ جس وقت یہ نعرہ لگایا گیا تھا، یہ اسی وقت سے فریب تھا لیکن لوگوں نے اس کی حقیقت کو نہیں سمجھا، اب جبکہ ان کا سابقہ اس نعرے کے برعکس حالات سے پڑ رہا ہے تو وہ فرسٹریشن کے شکار ہو رہے ہیں، پھر کچھ اور عناصر بھی دھوکا دینے والے یہاں موجود تھے۔ تو جہاں جہاں ایسے لوگ موجود ہوں گے وہاں فرسٹریشن لازماً پیدا ہوگا۔ مگر ہمیں کوئی فرسٹریشن نہیں ہے کیونکہ ہم کوئی غلط توقع نہیں لئے بیٹھے تھے۔ ہم ایک ایک قدم سوچ سمجھ کر اٹھا رہے تھے۔ ایک ایک چیز جو ہو رہی تھی اس کے نتیجے کو سمجھتے تھے اور اس ملک کے لوگوں کو بتا بھی رہے تھے کہ اس کا نتیجہ یہ ہونا ہے۔ چنانچہ جب وہ نتیجہ برآمد ہوا تو ہمیں کوئی فرسٹریشن لاحق نہیں ہوا۔ ہمیں پورا اندازہ تھا کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے اور جس قسم کی سیاست یہاں چلائی جا رہی ہے اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان الگ ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ ہمیں جو رنج ہوا اور ہمارا جو حال ہوا، اسے وہ علیم وخبیر ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن ہمیں Frustration نہیں ہوئی۔ ہم مایوس نہیں ہوئے۔ اسی طرح ہم یہاں کے متعلق بھی جانتے تھے کہ جس طرح کے لوگوں کو برسرِ اقتدار لایا جا رہا ہے۔ یہ آخرکار ملک کو تباہ کر کے چھوڑیں گے۔ چنانچہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مگر چونکہ ہمیں پہلے سے اندازہ تھا اس لئے جو تباہی نازل ہو رہی ہے اس سے ہم غمزدہ ہیں۔ ہمارے دل زخمی ہیں، لیکن ہم مایوس نہیں ہیں۔ فرسٹریشن میں مبتلا ہونے کے بجائے تباہی کو روکنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ فرسٹریشن اور مایوسی ہمیشہ غلط توقعات لے کر بیٹھ جانے سے ہوتی ہے۔ وہ توقعات پوری نہیں ہوتیں تو مایوسی ہوتی ہے...... اب فرسٹریشن کی یہ کیفیت جو لوگوں کے اندر پائی جاتی ہے، دور کرنے کی براہ راست کوئی کوشش نہیں ہو سکتی، بالواسطہ کوشش ہی ہو سکتی ہے یعنی ان کو بتایا جائے کہ

بھائی! تم لوگ اس عادت کو چھوڑو کہ جب کوئی دھوکے باز آتا ہے تم اس کے دھوکے میں آ جاتے ہو اور جب کوئی ایمانداری کے ساتھ تمہارے سامنے کوئی مخلصانہ پروگرام رکھتا ہے تو تم اس پر توجہ نہیں دیتے۔ جب تک تم اپنی اس روش سے باز نہیں آؤ گے، ایک ایک سوراخ سے ڈسے جاؤ گے اور بار بار پھر اسی سوراخ میں ہاتھ ڈالتے رہو گے۔ اگر ہم لوگوں کو یہ بات سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں اور وہ یہ سمجھ لیں کہ ان کے لئے اخلاص کے ساتھ کام کرنے والے کون ہیں اور ان کو دھوکا دینے والے کون ہیں' تو انشاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ ان کو اس طرح کی مایوسیوں سے سابقہ پیش نہیں آئے گا۔

سوال: کیا اسلامی ریاست قائم کرنے کا مقصد زیر زمین کام کرنے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا؟

جواب: یہ بات میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ جب تک ہمت اور جرأت اور عزم و استقلال کے ساتھ Openly (کھلے عام) کام نہیں کیا جائے گا اسلامی ریاست قائم نہیں ہو سکتی۔ Under-ground (زیر زمین) کام کے نتیجے میں اسلامی ریاست نہیں بن سکتی۔

خاص قسم کے حالات میں زیر زمین کام عارضی طور پر اور کچھ مدت کے لئے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جیسے حالات اس وقت مشرقی پاکستان کے ہیں وہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ایک حد تک زیر زمین کام کیا جائے' لیکن یہ ایک عارضی مدت کے لئے ہے۔ کیونکہ درحقیقت جب تک برسر زمین کام کر کے عام لوگوں کے خیالات کو تبدیل نہیں کیا جائے گا' ان کو پوری طرح ہم خیال نہیں بنایا جائے گا اور معاشرے کو اسلامی نظام کے لئے تیار نہیں کیا جائے گا' اس وقت تک اسلامی ریاست کے قیام کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اسلامی ریاست پہلے بھی جب قائم ہوئی تھی تو وہ برسر زمین کام سے ہی قائم ہوئی تھی۔ زیر زمین کام صرف تھوڑی مدت کے لئے کیا گیا کہ کچھ سرفروش اور جانباز آدمی Devotees فراہم ہو گئے۔ اس کے بعد سارا کام برسر زمین کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگوں نے ماریں کھائیں۔ پتھر کھائے، تپتی ہوئی ریت

پر گھسیٹے گئے، دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹائے گئے، سب کچھ ہوا۔ اس سے جو لوگ نکلے وہ ایسے نکلے کہ پھر ان کے مقابلے میں پورے عرب کی کوئی طاقت کھڑی نہ ہو سکی۔ اس طرح سے برسرِ زمین کام کیے بغیر آپ نہیں چل سکتے۔ آپ کھلم کھلا اپنا کام کیجیے۔ آپ کے سر پھٹیں گے، آپ کو قید کیا جائے گا، آپ کو ننگا کیا جائے گا، آپ کے ساتھ بدتمیزیاں کی جائیں گی، ہر قسم کی مصیبتیں بھگتنی پڑیں گی۔ پھر جب ہر قسم کی مصیبتیں بھگتنے کے بعد آپ اپنے عزم پر قائم رہیں گے تو وہ جو مصیبتیں ڈالنے والے ہیں ان کے اوپر الٹی مصیبت پڑ جائے گی کہ وہ اپنی جان کہاں بچائیں ...... ایک وقت ایسا آنے والا ہے۔ ان شاء اللہ۔

☆☆☆

اسلامی جمعیت طالبات پاکستان کے چوتھے سالانہ اجتماع (۲۲-۲۵ نومبر)
لاہور کے دوران طالبات کے نمائندہ وفد نے سیّد مودودیؒ سے
اپنی اس ملاقات کو ریکارڈ کر لیا--- ۲۳ نومبر ۱۹۷۴ء

(وفد نے بتایا کہ کن کن مقامات سے طالبات اجتماع میں شرکت کے لئے آئی ہیں)

سیّد مودودی: تو اس کا مطلب ہے کہ پشاور سے صادق آباد تک کی طالبات شریک ہیں۔ صوبہ سندھ سے کوئی نہیں آئیں۔

وفد: دراصل سندھ کی تین روزہ تربیت گاہ ایک ہی ہفتہ قبل ہوئی تھی۔ اس طرح وہاں کے لوگوں کے لئے یہاں شرکت مشکل تھی۔ کوئٹہ میں جمعیت کا حلقہ ہے لیکن وہاں سے بھی شرکت نہیں ہو سکی۔

سیّد مودودی: آپ کی جمعیت میں کالج کی ہی طالبات ہیں یا سکولوں میں بھی کام ہو رہا ہے؟

وفد: ویسے ایک آدھ سکول میں بھی کام کی ابتداء ہوئی ہے لیکن زیادہ تر کام کالجوں اور جامعات ہی میں ہے۔ سکول میں کام کرنا کچھ مشکل معلوم ہو رہا ہے۔

سیّد مودودی: سکولوں میں بھی کام شروع ہونا چاہئے۔ سکول کی طالبات کو تیار کر کے ہی آپ جمعیت کے لئے کارکن تیار کر سکتی ہیں۔ آپ ان سے بات چیت کے

ذریعے اپنی دعوت پہنچا سکتی ہیں۔ وہاں اسلامی لٹریچر سے دلچسپی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ بات آپ نگاہ میں رکھیں کہ سکولوں ہی سے ابتدا کر دی جائے۔

وفد: مشکل یہ ہے کہ سکولوں میں کبھی کبھار ایک آدھ لڑکی رجحان رکھتی ہے۔ اب سکول بھی سارے گورنمنٹ کے ہیں، کسی ٹیچر سے ہم تعاون نہیں لے سکتے۔

سیّد مودودی: دیکھئے ٹیچرز میں ایک اچھا خاصا عنصر ایسا موجود ہے جو تحریکِ اسلامی کا ہم خیال ہے، لیکن اس کے اوپر خوف غالب ہے۔ اگر آپ ہوشیاری سے کام لیں تو آہستہ آہستہ کچھ ٹیچرز ایسی مل جائیں گی جو آپ کی ہم خیال ہوں گی۔ پھر ان سے رابطہ قائم کر کے کام لیا جا سکتا ہے۔ اساتذہ احتیاط سے کام کریں اوز اپنی ملازمت بھی خطرے میں نہ ڈالیں تو اس طرح ان کو کام کے لئے آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ اب آخر لڑکوں کے جو مدرسے ہیں، ان میں ٹیچرز تحریکِ اسلامی کے بہت کافی ہم خیال ہیں، اور ان کے مثبت اثرات ہیں، اور انہوں نے بات کو چھپانے کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھی کہ ہمیں تحریکی کاموں سے کچھ دلچسپی ہے اور ان کا Organization (تنظیم اساتذۂ پاکستان) قائم ہے جو اچھا خاصا چل رہا ہے۔ اب چونکہ مردوں میں پہلے سے کام ہو رہا ہے اس لئے وہ یہاں تک پہنچ گیا۔ آپ لوگوں نے دیر سے شروع کیا۔ ابھی آپ کے کام کی ابتدا ہے۔ ابتدائی کام میں دشواریاں زیادہ ہوا کرتی ہیں۔ یہ اسلامی جمعیت طلبہ بھی یہاں تک پچیس چھبیس سال میں پہنچی ہے۔ آپ کی جمعیت طالبات کو قائم ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟

وفد: ابھی تو چار سال ہوئے ہیں۔

سیّد مودودیؒ: چار سال ہوئے، اب چھبیس سال اور چار سال کا فرق تو آپ کو سمجھ میں آتا ہو گا۔ اسلامی جمعیت طلبہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں قائم ہوئی تھی۔

وفد: یہ خوش قسمتی تھی کہ اس وقت قائم ہوگئی۔

سید مودودی: اللہ کا شکر ہے اور یہ اللہ کا فضل ہے کہ بروقت کام ہوگیا۔ یہ اُس وقت قائم ہوگئی اور اس کا نتیجہ آپ دیکھ ہی رہی ہیں۔ ہر جگہ یونین انتخابات میں ان کو زبردست کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں، ابھی میرے پاس سرگودھا سے لڑکے آئے تھے۔ سرگودھا کے گورنمنٹ کالج میں یہ لوگ جیتے ہیں اور پوری پارٹی آئی تھی۔ یہ میرے پاس آتے ہیں اور بعض دفعہ مٹھائی کھائے بغیر نہیں مانتے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ بھئی جیتے تم ہو اور مٹھائی مجھ سے مانگ رہے ہو۔ مٹھائی لے کر آنی چاہئے آپ کو۔

وفد: ایک بات یہ ہے کہ لڑکوں اور مرد اساتذہ میں ہمت زیادہ ہوتی ہے۔ انتقامی کارروائیاں خاص طور پر ٹرانسفرز اور تبادلوں سے خواتین ٹیچرز بہت خوفزدہ ہوتی ہیں۔

سید مودودی: ہاں اسی مسئلہ کے لئے میں نے کہا کہ انہیں احتیاط زیادہ کرنی چاہئے۔ آپ کو خود بھی کہنا چاہئے کہ وہ احتیاط کریں، لیکن اپنے فرض کو تو نہ بھولیں، جب آپ کو محسوس ہو جائے کہ یہ ہمارا فرض ہے۔ آخر عورت کو چھپ کر نماز پڑھنے کے لئے کہا گیا ہے، نماز اس کی ساقط نہیں کی گئی تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ ان کو کوشش کرنی چاہئے کہ لڑکیوں میں اس وقت عقائد کی خرابی، اخلاق کی خرابی اور عادتوں کی خرابی کی جو نئی ہوا چل رہی ہے، یہ پوری ملت اسلامیہ کے لئے لڑکوں کی خرابی سے زیادہ تباہ کن ہے۔ یہ تباہی بالکل جڑ ہی کاٹ دے گی۔ یعنی اگر ہماری عورتیں بگڑ گئیں تو ہماری جڑ ہی کٹ جائے گی اور جو آئندہ نسل پیدا ہوگی تو ان کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بتانے والا کوئی نہ ہوگا۔ یہ نسل جس نے ملحد بنانے والی درسگاہوں میں تعلیم پائی ہے۔ اس نسل کے اندر آخر وہ لوگ کہاں سے آگئے جو خدا کے ماننے والے ہیں اور رسول کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ صرف اس لئے کہ انہوں نے ان ماؤں کی گود میں پرورش پائی ہے جو خدا اور رسول کو ماننے والی ہیں۔ سب سے پہلی درس گاہ ماں کی گود ہے۔ اب اگر ماں کی گود بھی اس چیز سے خالی ہو جائے تو پھر سمجھ لیجئے کہ جڑ کٹ

جائے گی۔ اس وجہ سے اس میدان میں آپ کو خاص طور پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ عورت بھی عجیب آفت ہے۔ جس طرف جاتی ہے انتہاء پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں گویا الحاد کی طرف اس کا میلان ہوا ہے تو وہ مرد سے زیادہ ملحد ثابت ہوئی ہے، اور جب اس پر مغرب پرستی کا غلبہ ہوا تو مرد اتنا مغرب پرست نہیں ہوا، جتنی وہ ہوگئی ہے۔ ایسی عورتیں بھی اس جدید طبقے میں موجود ہیں جن کے چہرے پر قرآن سن کر ناگواری کے آثار ابھر آتے ہیں۔

> وفد: ہم لوگ کالج میں جہاں تقریباً ہر روز قرآن کلاسز کے دوران باقاعدہ تفہیم القرآن کا اجتماعی مطالعہ کرتی ہیں۔ ایک مرتبہ آخری پارے کو پڑھنا شروع کیا۔ اس میں قیامت کا ذکر بار بار ہوتا ہے، تو ایک دو لڑکیوں کو جب دو تین دفعہ بلایا اور انہوں نے سنا تو ایک دن تنگ آ کر آخر انہوں نے کہا کہ یہ کیا تم روز جنت دوزخ کا ذکر لے کر بیٹھ جاتی ہو؟

سیّد مودودی: اس آخری جلد میں آپ غور سے پڑھیں تو اس کے اندر میں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اس میں جو بیشتر سورتیں ہیں وہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئیں اور اہلِ مکہ توحید کے معاملے میں بھی اس قدر الرجک نہیں تھے اور رسالت کے بارے میں بھی اس قدر الرجک نہیں تھے جتنے آخرت کے معاملے میں تھے۔ اس لئے قرآن کی جو ابتدائی سورتیں ہیں ان کے اندر آخرت کے تصور کو زیادہ زور سے پیش کیا گیا ہے۔ اب اگر یہ بات ان (طالبات) کو سمجھائی جاتی کہ بھئی قرآن کی جو ترتیب ہے وہ ان سورتوں کے اعتبار سے نہیں ہے تو اس وجہ سے تم لوگوں کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تمہیں اس وجہ سے آخری سورتیں سناتے ہیں کہ نماز میں عام طور پر جو سورتیں پڑھی جاتی ہیں وہ آخری ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے ہم لوگ ان سے شروع کر رہے ہیں، ورنہ اگر آپ چاہیں تو ہم پہلی سورتیں بھی لے سکتے ہیں۔ یعنی اس میں ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر مقدمہ (تفہیم القرآن) ان کو پہلے پڑھا دیا جائے تو ان کی سمجھ میں آ جائے گا کہ یہ کتاب ہے کس قسم کی؟ اس طرح ان کے ذہن میں یہ بات بھی آ

جائے گی کہ یہ کتاب ان دوسری عام دنیا کی کتابوں کی طرح کی نہیں ہے بلکہ یہ ایک تحریکی کتاب ہے اور اس تحریک کے ساتھ ساتھ نازل ہوتی رہی ہے۔ جس وقت یہ کتاب نازل ہوتی رہی ہے اس وقت لوگوں کی ضروریات کچھ اور تھیں۔ مسلم سوسائٹی قائم ہونے کے بعد ضروریات کچھ اور ہو گئیں جن میں مدنی سورتوں کی ضرورت تھی۔ اس لئے وہ شروع میں رکھ دی گئی تھیں۔ یہ چیز ایک مرتبہ ان کی سمجھ میں آ جائے تو ان کی گھبراہٹ ختم ہو جائے گی۔

> وفد: فلموں کی کثرت سے اور ٹی وی کے جو پروگرام ہیں، ان کی کثرت سے یہ باتیں اوّل تو سننے کو جی نہیں چاہتا اور اگر جی چاہے بھی تو دھیان نہیں ہوتا۔ دھیان اگر بمشکل ہو بھی جائے تو اس میں بھی یہی سوچ رہے ہوتے ہیں کہ کتنے اعتراض کئے جا سکتے ہیں؟ یہ ذہنوں کے اپ سیٹ ہونے کا سبب ہے؟

سیّد مودودی: جی ہاں، اس میں آپ لوگوں کو جدید لٹریچر پر بھی اچھی طرح سے نگاہ ڈالنی چاہئے۔ ابھی میں کل ہی پڑھ رہا تھا۔ ریڈرز ڈائجسٹ میں مضمون آیا ہے کہ اس ٹیلی ویژن نے امریکہ کے کمسن لڑکوں کے ذہنوں پر اتنا زیادہ اثر ڈالا کہ قتل تک کے واقعات میں اضافہ کر دیا۔ انہوں نے تمام معاملہ اعداد و شمار کے ساتھ دکھایا ہے۔ ماہر نفسیات ٹرسٹ نے کہا کہ (ان لڑکوں کو جن کو زیادہ تر ایسے مناظر دکھائے گئے، ٹی وی کے جن میں Violence (مار پیٹ، قتل) کے واقعات تھے اور جو دوسری سوشل قسم کے گرہوں پر مشتمل تھے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ پہلے گروپ کے اندر کئی فیصد لڑکے آخر کار مجرم بن کر رہے، اور دوسرے گروپ کے اندر (مجرم بننے والوں کا اتنا) کم Percent فیصد ہے تو ان کو بتائیے کہ یہ ٹیلی ویژن جس پر آپ مری جا رہی ہیں، اس پر یورپ اور امریکہ کے لوگ صحیح کہتے ہیں۔ وہاں کے لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ کیا بلا آتی ہے۔) میں جس زمانے میں انگلینڈ علاج کے لئے گیا تو بستر پر ہسپتال میں وقت گزارنے کے لئے وہاں کے اخبارات پڑھتا رہتا تھا۔ میں نے ایک روز اخبار میں

پڑھا کہ پانچ سال کے بچے نے ایک چار سال کی بچی کو قتل کر دیا۔ جس وقت اس بچے سے پوچھا گیا کہ تم نے کیوں قتل کیا تو اس نے کہا کہ ''میں نے ٹی وی میں آدمی کو قتل کرنے کا منظر دیکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں ذرا دیکھوں کہ قتل ہونے والے کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور مارنے والے کا کیا حال ہوتا ہے؟'' ان سے کہیے کہ یہ چیز جسے تم نعمت سمجھ رہی ہو، اس سے وہ ملک چیخ اٹھے ہیں جنہوں نے اسے جاری کیا ہے۔ وہاں شور مچ رہا ہے کہ یہ کیا آفت برپا ہو گئی ہے۔ یہ درست ہے کہ معاشرے میں لذت پرستی بڑھ گئی ہے، مگر ہمیں تو Reason سے اپیل کرنا ہے۔ ہمیں تو ان سے کہنا ہے کہ تم یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ تمہاری بھلائی کس چیز میں ہے یا یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ تم کو مزہ کس چیز میں آتا ہے۔

وفد: ویسے ذہن اس چیز میں کچھ اس قدر غرق ہو گئے ہیں کہ ان میں Reason سننے کا موڈ ہی نہیں رہتا۔

سیّد مودودی: نہیں! سب کا یہ حال نہیں ہوتا۔ ہمیں یہ طریقہ بتایا گیا ہے اصلاح کا۔ کہ قرآن مجید میں آتا ہے فذکر ان نفعت الذکری۔ ''نصیحت کرو اگر تمہیں نصیحت مفید ہوتی نظر آئے۔'' جس کو آپ دیکھیں کہ اپنے خیالات میں مستغرق ہے اور کوئی نصیحت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے پیچھے پڑنے کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں۔ جو سننے کے لئے تیار ہو اس کو سنائیے...... آہستہ آہستہ جو سننے کے لئے تیار ہیں، ان کی تعداد بڑھتی جائے گی اور وہ اثرات قبول کرتے چلے جائیں گے، تو آپ کی اتنی زیادہ Strenght (قوت) بڑھے گی کہ پھر نہ سننے والے بھی آخرکار سننے پر آجائیں گے۔ پہلے اپنا زور نہ سننے والوں پر صرف نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان پر کرنا چاہئے جو سننے کے لئے تیار ہوں۔

وفد: بعض مقامات پر لڑکیوں کے کالج کی پرنسپل اگرچہ سوشلسٹ بھی نہیں ہوتیں لیکن خوف کی وجہ سے وہ اتنا بھی برداشت نہیں کرتیں کہ ہمیں قرآن

پڑھنے کی اجازت دیں۔ عام طور پر اس کی وجوہات جو ہوتی ہیں وہ یہی کہ آپ جو تفہیم القرآن پڑھتی ہیں، مولانا مودودی کی لکھی ہوئی ہے تو ہم خواہ مخواہ پکڑے جائیں گے، تم لوگوں کو درس کی اجازت دی گئی تو تم سیاست میں حصہ لوگی۔ اس طرح قرآن کو بھی سیاست قرار دے دیا جاتا ہے۔

سیّد مودودی: فرض کیجئے کہ آپ کسی ایسے کالج میں ہیں جہاں اس طرح کی رکاوٹ ڈالی جاتی ہے تو آپ اپنے اجتماع کے لئے اپنی ساتھیوں میں سے کسی کے گھر کو تجویز کر لیجئے۔

وفد: اس میں یہ بات ہے کہ کالج میں ہم جتنی لڑکیوں سے Contact (رابطہ) کر سکتی ہیں اتنا گھروں میں آنا جانا مشکل ہے۔

سیّد مودودی: نہیں، کالج میں آپ جتنی لڑکیوں سے Contact کریں اس میں زبانی بات چیت کریں، یہاں تک کہ جب وہ اس سطح پر آ جائیں کہ وہ اس بات کو پسند کرنے لگیں۔ تو ان سے کہیے کہ بھئی یہ کالج کے لوگ اس کو بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں مفید کام ہیں، تو ہم نے فلاں جگہ تجویز کی ہے جہاں ہم سب جمع ہوتی ہیں، اگر تم چاہو تو بڑی خوشی سے آؤ۔

وفد: لیکن یہ پوچھنے کی چیز تو نہیں، پتہ چل جاتا ہے کہ کہاں اجتماع ہوگا؟

سیّد مودودی: پتہ چل جائے تو اس کی پرواہ نہ کریں۔ یہ کوئی خفیہ کام تو نہیں ہے۔

وفد: تو پھر جو ہوسٹل کی لڑکیاں ہیں تو ان کے لئے اور رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

سیّد مودودی: ہوسٹل کی لڑکیوں کے لئے رکاوٹ کیا پیدا ہو جائے گی؟ یعنی ہوسٹل سے نکال دیا جائے گا۔

وفد: نکال نہ دیا جائے گا، لیکن وارڈن ان پر بے جا سختیاں کرتی ہیں۔

سیّد مودودی: بے جا سختیوں کو برداشت کرنا پڑے گا آپ کو۔

وفد: مثلاً جو جگہ ہم مخصوص کریں اجتماع کے لئے، وہاں وہ جانے ہی نہ دیں؟

سیّد مودودی: دیکھئے، خدا کا نام لینے کے لئے آپ کا سختیوں سے بچ جانا، یہ تو اس زمانے میں ممکن نہیں۔ آپ کو سختیاں اٹھانی پڑیں گی لیکن آپ Resist کریں۔ آپ ان سے کہیے کہ آپ نے ہوسٹل سے نکالا تو ہم آپ کے اوپر عدالت میں دعویٰ کریں گے۔ ایک دفعہ دھمکی دے دیجئے۔ ان سے کہیے کہ ہم رٹ داخل کر دیں گے۔

وفد: ایک اعتراض یہ ہے کہ قائدِ تحریکِ اسلامی نے جو اسلام کی یہ دعوت دے اور پھیلا رہے ہیں، انہوں نے پاکستان بننے کی مخالفت کی تھی۔

سیّد مودودی: جن لوگوں نے مخالفت کی تھی، ان لوگوں کو تو پاکستان میں وزارتیں تک دی گئیں۔ ڈاکٹر خان صاحب، جن کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ وہ پاکستان کے آخر وقت تک مخالف رہے۔

وفد: لیکن آپ کا نام نمایاں طور پر کیوں آتا ہے؟

سیّد مودودی: جی! وہی تو بتا رہا ہوں کہ اصل قصہ کیا ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ میری کتاب (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم) تھی جواب "تحریک آزادئ ہند اور مسلمان" حصہ دوم کے نام سے) موجود ہے، جس پر وہ ساری بنیاد رکھتے ہیں۔ وہ کتاب آپ پڑھ لیجئے۔ دیکھ لیجئے جو باتیں میں نے اس وقت کہی تھیں ان میں سے کوئی ایک بات ایسی نہیں جو پوری نہ ہوئی ہو۔ وہ تو بالکل ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی آنکھوں دیکھ کر کہہ رہا ہو کہ ایسا ہونے والا ہے۔

وفد: ان لوگوں کی طرف آپ نے دوستانہ ہاتھ بڑھایا تھا جن لوگوں کی آپ نے مخالفت کی تھی یا سمجھانے کی کوشش کی تھی، پاکستان بننے سے

پہلے؟

سیّد مودودی: بھئی پاکستان بننے سے پہلے یہ کچھ سننے کے موڈ میں تھے کب؟ ان پر تو ایک جنون سوار تھا۔ ہم ان سے کہہ رہے تھے کہ آپ کن Elements (عناصر) کو جمع کر رہے ہیں۔ سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کو بھی آپ جمع کر رہے ہیں جو جاگیردار اور سرمایہ دار ہیں۔ اور اسی طرح کے بڑے بڑے لوگوں کے گھر آپ جائیں تو ان کے گھر سے جائے نماز تک نہ ملے جن کے گھر میں کوئی بتانے والا نہیں ملتا کہ قبلہ کا رُخ کدھر ہے۔ کیا ان کے ہاتھ سے اسلامی حکومت قائم ہوگی؟

میں نے ان لوگوں کو واضح طور پر کہا تھا کہ اگر پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کرنی ہے تو اس تحریک (آزادی) کو اس طرح چلایئے جس سے پاکستان میں واقعی اسلامی حکومت قائم ہو سکے۔ اس طرح یہ لوگ ملک تو حاصل کر لیں گے لیکن اسلامی حکومت نہیں چلا سکیں گے۔ اب اگر ایک آدمی یہ سمجھائے کہ جس طریقے سے تم کام کر رہے ہو وہ طریقہ اس مقصد کے لئے مفید نہیں ہے جسے تم حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہو تو اس کو یہ کہنا کہ تم پاکستان کی ہی مخالفت کر رہے ہو۔ یہ سراسر زیادتی ہے لیکن جو پاکستان کے واقعی مخالف تھے ان کو تمہارے ہاں وزارتیں اور سفارتیں دی گئیں۔

وفد: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بڑھتی ہوئی مخالفتوں اور مخالفین کے متشدّدانہ طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے ہم اپنی طالبات کو دفاعی طرز کی تربیت دیں۔ طالبات کو دفاعی طرز کی تربیت دینا کس حد تک درست قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

سیّد مودودی: (حیرت زدہ لب ولہجہ میں) دفاعی تربیت؟

وفد: جیسے سول ڈیفنس، رائفل ٹریننگ اور جوڈو قسم کی چیزیں۔

سیّد مودودی: اس کا انتظام کرنا اس وقت تو آپ کے لئے مشکل ہوگا۔ آگے چل کر شاید کچھ ہو سکے۔ جماعت نے اب تک خود مردوں کے لئے کچھ نہیں کیا۔ اس لئے

اگر اس طرح کے ہم کچھ بھی انتظامات کرتے تو ہمارے اوپر فوراً یہ الزام لگا دیا کہ یہ لوگ Violence (تشدّد) کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے سرِدست آپ اس معاملے کو چھوڑ دیں۔ اس کا وقت بعد میں آئے گا۔ مشرقی پاکستان میں جب (۱۹۷۱ء کا) انقلاب برپا ہوا تو فوراً ہمارے رضا کار (البدر) تیار ہو گئے اور (ان کو خود حکومتِ پاکستان نے) تمام ہتھیار اور فوجی ٹریننگ دی اور آخر کار ہندوستان سے لڑائی میں انہوں نے پوری طرح بلکہ فوج سے بھی آگے بڑھ کر (ملکی دفاع اور سالمیت پاکستان کے لئے) کام کیا۔

وفد: ہماری طالبات بہنیں تعلیم میں بھی بہتر ہیں اور کالج میں جمعیت کے لئے سٹوڈنٹس یونین کا کام بھی کرتی ہیں۔

سیّد مودودی: بالکل یہ ضروری ہے کہ تعلیم میں بھی آپ لوگ ان سے آگے رہیں، تاکہ انہیں معلوم ہو کہ یہ مُلّا قسم کی لڑکیاں نہیں ہیں اور جن علوم کے اوپر لوگوں کو ناز ہے ان علوم میں بھی یہ فائق ہیں۔

وفد: کئی طالبات آپ کا نام دیکھ کر کتاب چھوڑ دیتی ہیں تو اس وقت بہت افسوس ہوتا ہے کہ وہ آپ سے بہت خار کھاتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ یہ کتاب نہیں پڑھیں گے اور کتاب پڑھ لیں گے؟

سیّد مودودی: آپ انہیں میرے نام کا ٹائیٹل پھاڑ کر کتاب دیجئے اور ان سے کہیے ذرا دیکھو تو کچھ کام کی چیز ہے یا نہیں؟ جس وقت وہ معترف ہو جائیں تو کہیے کہ یہ اسی نالائق آدمی کی کتاب ہے۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ یہی کیا گیا ہے۔

وفد: ٹیچرز سٹاف عموماً ان لوگوں کی حمایت کرتا ہے جو ہمارے مخالف ہوتے ہیں، مگر اللہ کا شکر ہے پھر بھی ہمیں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔

سیّد مودودی: جی ہاں! ہر جگہ یہی ہوتا ہے، اس کی پروا نہ کیجئے، ابھی آپ کا کام شروع ہوا ہے، اگر آپ کو کامیابیاں حاصل نہ ہوں تو اس پر گھبرانا نہیں چاہئے۔

☆☆☆

۱-اے ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور میں ارکان کے تربیتی کیمپ میں یہ سوال و جواب ہوئے ----- ۲۰ مارچ 1975ء

سوال: ۸۰ فیصد ان پڑھ لوگوں کو دعوتِ اسلامی سے کیسے روشناس کرایا جائے؟

جواب: اسلام کی دعوت جب عرب میں پیش کی گئی تھی، اس وقت اس کی مخاطب آبادی تقریباً سو فیصدی ان پڑھ تھی۔ قریش جیسے ترقی یافتہ قبیلے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں صرف سترہ افراد پڑھے لکھے تھے۔ مدینے میں اس سے بھی کم لوگ تعلیم یافتہ تھے۔ اور باقی عرب کی حالت کا اندازہ آپ ان دو بڑے شہروں کی حالت سے کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید اس ملک میں لکھ کر نہیں پھیلایا گیا تھا، بلکہ وہ لوگوں کو زبانی سنایا جاتا تھا۔ صحابہ کرامؓ اس کو سن کر ہی یاد کرتے تھے اور پھر زبانی ہی اسے دوسروں کو سناتے تھے۔ اسی ذریعہ سے پورا عرب اسلام سے روشناس ہوا۔ درحقیقت لوگوں کا ان پڑھ ہونا کوئی ایسی دشواری نہیں ہے جس کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ نہ ہو سکتی ہو۔ آغازِ اسلام میں اس دین کی تبلیغ ان پڑھ لوگوں ہی میں کی گئی تھی اور یہ محض زبانی تبلیغ و تلقین ہی تھی جس سے ان کو اس قدر بدل دیا گیا، ایسا زبردست انقلاب ان کے اندر برپا کر دیا گیا کہ وہ دنیا کے مصلح بن کر کھڑے ہو گئے۔ اب آپ کیوں یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ۸۰ فیصد ان پڑھ آبادی میں اسلام کی دعوت نہیں پھیلائی جا سکتی؟ آپ کے اندر ۲۰ فیصد تو پڑھے لکھے لوگ موجود ہیں۔ وہ پڑھ کر اسلام کو سمجھیں اور پھر باقی ۸۰ فیصد لوگوں کو زبانی تبلیغ و تلقین سے دین سمجھائیں۔ پہلے کی بہ نسبت اب یہ کام زیادہ آسان ہو گیا ہے، البتہ فرق جو کچھ

ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس وقت جو شخص بھی اسلام کی تعلیمات کو سن کر ایمان لاتا تھا وہ ایمان لا کر بیٹھ نہیں جاتا تھا' بلکہ آگے دوسرے بندگانِ خدا تک ان تعلیمات کو پہنچانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کی تمام حیثیتوں پر مبلغ ہونے کی حیثیت غالب آ جاتی تھی۔ وہ ہمہ تن ایک تبلیغ بن جاتا تھا۔ جہاں جس حالت میں بھی اسے دوسرے لوگوں سے سابقہ پیش آتا تھا وہ ان کے سامنے اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہدایات بیان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ وہ ہر وقت اس تلاش میں لگا رہتا تھا کہ کس طرح اللہ کے بندوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم کی روشنی میں لائے۔ جتنا قرآن بھی اسے یاد ہوتا اسے لوگوں کو سناتا اور اسلام کی تعلیمات جتنی کچھ بھی اسے معلوم ہوتیں ان سے وہ لوگوں کو آگاہ کرتا تھا۔ وہ انہیں بتاتا تھا کہ صحیح عقائد کیا ہیں جو اسلام سکھاتا ہے اور باطل عقیدے اور خیالات کون سے ہیں جن کی اسلام تردید کرتا ہے۔ اچھے اعمال اور اخلاق کیا ہیں جن کی اسلام دعوت دیتا ہے، اور برائیاں کیا ہیں جن کو وہ مٹانا چاہتا ہے۔ یہ سب باتیں جس طرح پہلے سنائی اور سمجھائی جاتی تھیں اسی طرح آج بھی سنائی اور سمجھائی جا سکتی ہیں۔ ان کے لئے نہ سنانے والے کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے نہ سننے والے کا۔ یہ ہر وقت بیان کی جا سکتی ہیں اور ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتی ہیں۔ اسلام نے کوئی ایسی نرالی چیز پیش ہی نہیں کی ہے جس سے انسانی طبائع مانوس نہ ہوں۔ اور جن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بڑے فلسفے بگھارنے کی ضرورت ہو۔ یہ تو دینِ فطرت ہے۔ انسان اس سے بالطبع مانوس ہے۔ اسے پڑھے لکھے لوگوں کی بہ نسبت ان پڑھ لوگ زیادہ آسانی سے قبول کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ فطرت سے قریب تر ہوتے ہیں اور ان کے دماغ میں وہ پیچ نہیں ہوتے جو جاہلیت کی تعلیم نے ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کے دماغوں میں ڈال دیئے ہیں۔ لہٰذا آپ ان پڑھ آبادی کی کثرت سے ہرگز نہ گھبرائیں۔ ان کی ناخواندگی اصل رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ آپ کے اندر جذبۂ تبلیغ کی کمی اصل رکاوٹ ہے۔ ابتدائے اسلام کے مسلمانوں کی طرح ہمہ تن مبلغ بن جائیے اور تبلیغ کی وہ لگن اپنے اندر پیدا کر لیجئے جو ان کے اندر تھی۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اسلام کی دعوت

پھیلانے کے بے شمار مواقع آپ کے منتظر ہیں جن سے آپ نے آج تک اس لئے فائدہ نہیں اٹھایا' کہ آپ اپنے ملک کی آبادی میں سو فیصد خواندگی پھیل جانے کے منتظر رہے۔

سوال: آئندہ عام انتخابات میں جماعت اسلامی کی انتخابی پالیسی کیا ہونی چاہیے؟

جواب: اس سوال کا جواب میں آپ کو یہاں نہیں دے سکتا۔ اس کے متعلق اگر مجھے کچھ کہنا ہو گا تو امیرِ جماعت سے کہوں گا، یا جماعت اسلامی کی مجلسِ عاملہ مجھ سے دریافت کرے گی تو اس کے سامنے بیان کروں گا، یا مجلسِ شوریٰ مجھ سے پوچھنا چاہے گی تو اس کے اجلاس میں پیش کروں گا۔ میں ایک عام رکنِ جماعت ہوں۔ نہ امیرِ جماعت ہوں، نہ مجلسِ عاملہ کا رکن ہوں، نہ مجلسِ شوریٰ کا رکن، میرا یہ کام نہیں ہے کہ یہاں بیٹھ کر جماعت کی پالیسی طے کروں۔ پالیسی طے کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو دستور کی رو سے اس کے مجاز ہیں۔ کسی معاملہ میں میری جو رائے بھی ہو گی اسے ان تک پہنچا دوں گا، پھر یہ ان کی صواب دید پر موقوف ہے کہ جو پالیسی چاہیں بنائیں۔

اس موقع پر ایک صاحب نے کہا: ''لیکن مولانا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آپ سب کچھ ہیں۔''

جواب: میں اس تصور کی جڑ کاٹ دینا چاہتا ہوں۔ یہ جماعت ایک دستور اور ایک نظام پر قائم ہے۔ اس میں مجھ سمیت کوئی شخص بھی اپنی ذاتی حیثیت میں ''سب کچھ'' نہیں ہو سکتا۔ جس روز جماعت کی تاسیس ہوئی تھی اسی روز میں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ دعوت تو بلاشبہ میں نے دی ہے، مگر یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ جو شخص داعی ہے اسی کو آپ سے آپ امیرِ جماعت بھی ہونا چاہیے۔ میرا کام آپ کو اقامتِ دین کے لئے جمع کر دینا تھا سو وہ میں نے کر دیا۔ اب یہ طے کرنا آپ کا کام ہے کہ یہ ذمہ داری کس کے سپرد کریں۔ اُس وقت چونکہ ارکانِ جماعت نے امارت کا بار میرے اوپر ہی رکھ دیا اس لئے میں نے اسے اٹھا لیا۔ اب میری خرابیٔ صحت نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا ہے

کہ اس ذمہ داری کا حق ادا کر سکوں، اس لئے میں نے ایمانداری کے ساتھ اپنے آپ کو اس سے سبکدوش کرا لیا ہے۔ اس کے بعد پھر وہی ذمہ داری میں اپنے سر کیسے لے لوں جبکہ نظام جماعت کی رُو سے اب میں اس کا حامل نہیں رہا ہوں؟ البتہ خادمِ جماعت ہونے کی حیثیت سے میرا جو فرض ہے اسے جب تک زندہ ہوں انشاء اللہ ادا کرتا رہوں گا۔

سوال: کیا اقامتِ دین ایک فرض ہے جسے ہر زمانے اور ہر حال میں ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے؟ اور کیا قرآن وحدیث میں کہیں یہ بات ملتی ہے کہ ظہورِ مہدی سے قبل اسلامی نظام قائم ہو سکے گا؟

جواب: قرآن میں تو خیر ظہورِ مہدی کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا گیا ہے، البتہ احادیث میں اس کا ذکر ضرور آیا ہے، مگر وہ بس اسی حد تک ہے کہ مہدی آئیں گے اور دنیا کو، جو ظلم سے بھر چکی ہوگی، عدل سے بھر دیں گے۔ اس خوشخبری سے آخر یہ مطلب کیسے نکل آیا کہ جب تک وہ نہ آئیں اس وقت تک دنیا ظلم سے بھرتی رہے اور ہم اس کا تماشا دیکھتے رہیں۔ شیاطین کے نظام قائم ہوتے رہیں اور اللہ کا دین قائم کرنے کے لئے ہم امام مہدی کی تشریف آوری کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔ یہ تعلیم نہ اللہ نے دی ہے نہ اللہ کے رسول نے اور قرآن وحدیث میں یہ بھی کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ امام مہدی کی آمد سے پہلے اللہ کا دین کبھی قائم نہ ہو سکے گا، یا اسے قائم کرنے کی کوشش کا فریضہ مسلمانوں کے ذمہ سے ساقط رہے گا۔ یہ بات ایک بشارت تو ضرور ہو سکتی ہے کہ آئندہ کسی زمانے میں کوئی ایسی عظیم شخصیت اٹھے گی جو تمام عالم میں اسلام کا جھنڈا بلند کر دے گی، مگر یہ شخصیت کوئی حکمِ امتناعی نہیں ہو سکتی کہ ہم دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے کچھ نہ کریں۔ رہا یہ سوال کہ اقامتِ دین فرض ہے یا نہیں، تو کوئی ایسا شخص جو قرآن وحدیث کو جانتا ہے، اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے لے کر سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء بھی بھیجے ہیں، اپنا دین قائم کرنے ہی کے لئے بھیجے ہیں۔ کوئی ایک نبی بھی لوگوں کو یہ سکھانے کے لئے نہیں بھیجا

کہ وہ غیر اللہ کا دین قائم کرنے والوں کے ماتحت بن کر رہیں۔ سورۂ شوریٰ دیکھئے، اس میں حضورؐ سمیت تمام انبیاء کا فرض یہ بیان کیا گیا ہے کہ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ۔ ''اس دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔'' سورۂ توبہ، سورہ فتح اور سورۂ صف میں دیکھئے۔ تین مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ''وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ پورے دین پر اسے غالب کر دے۔'' اب کون یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہے کہ اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود نبیؐ برحق کی مقصدیت سے مختلف بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

سوال: پاکستان کے موجودہ حالات میں عوام کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے تحریکِ اسلامی کی سیاسی حکمتِ عملی کیا ہونی چاہئے؟

جواب: پاکستان کے موجودہ حالات میں عوام کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے ہماری سیاسی پالیسی کیا ہونی چاہئے، میں اس کا ایک اصولی جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ ہمارے رفقاء کسی غلط طرزِ فکر میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم جس ملک میں، جس قوم میں، جس زمانے میں اور جن حالات میں کام کر رہے ہیں، ہمیں کوئی پروگرام بناتے ہوئے ان سب کو ملحوظ رکھنا پڑے گا لیکن ہماری اصولی دعوت لازماً ایک ہی رہے گی۔ ہمارا بنیادی مقصد بھی قطعاً ناقابلِ تغیر ہو گا اور اپنا عملی پروگرام بناتے ہوئے ہم ان چیزوں کو صرف اس حیثیت سے ملحوظ رکھیں گے کہ اس ملک میں اس زمانے کے حالات میں ہم اپنی دعوت کو کس طریقے سے فروغ دیں اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس قوم کے اچھے رجحانات سے کس طرح فائدہ اٹھائیں اور اس کے بُرے رجحانات کو کس طرح بدلیں کہ وہ ہمارے مقصد کی راہ میں کم از کم رکاوٹ تو نہ بن سکیں۔ اس نقطۂ نظر سے ان چیزوں کو ملحوظ رکھنا تو عین تقاضائے حکمت ہے۔ لیکن اگر ہم زمان و مکان کے حالات اور لوگوں کے رجحانات کو دیکھ کر اپنی دعوت اور اپنے مقصد ہی پر نظرِ ثانی کرنے بیٹھ جائیں تو یہ سراسر گمراہی ہے جس کا خیال تک ہمارے ذہن میں نہ

آنا چاہئے۔ طریقِ کار حالات کے لحاظ سے بدلا جا سکتا ہے۔ حکمتِ عملی میں لوگوں کے اچھے یا برے رجحانات کے لحاظ سے تغیر کیا جا سکتا ہے۔ مگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام اور اس کی دعوت کے جو اصول مقرر کر دیئے ہیں، ان میں ذرہ برابر کوئی ردّوبدل لوگوں کے رجحانات یا زمانے کے حالات کو دیکھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جس چیز کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ ہمیں ہر حال میں اسی کو قائم کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم جس ملک میں کام کر رہے ہوں اس کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم اس مقصد کے لئے سعی وجہد کے ایک طریقے کو موزوں پا کر اختیار کر لیں اور دوسرے طریقے کو ناموزوں سمجھ کر ترک کر دیں۔ اسی طرح جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ مٹانا چاہتے ہیں ان کو مٹانا ہی ہماری کوششوں کا ہمیشہ مقصود رہے گا، یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی استطاعت اور ملک کے حالات اور عوام کی مزاجی کیفیات کو دیکھ کر یہ طے کریں کہ کن چیزوں کو مٹانے کی کوشش مقدم اور کن کے مٹانے کی کوشش مؤخر رکھی جانی چاہئے۔ نیز یہ کہ اس غرض کے لئے ہم کون سی تدابیر اختیار کر سکتے ہیں اور کن تدابیر کا اختیار کرنا غیر ممکن، غیر مفید، یا غیر مناسب ہے۔

> سوال: اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق کاذب، ظالم اور خبیث قسم کے حکمرانوں[1] کو شریف اور خدا ترس لوگوں پر زیادتیاں کرنے، دینِ حق کا راستہ روکنے، عوام کو ذلیل وخوار کرنے اور قومی وسائل کو اپنی ذات کے مفاد میں استعمال کرنے کا موقع کس حد تک عطا فرماتا ہے۔ بچے کھچے پاکستان میں ایسے حالات جاری رہنے کے کس حد تک امکانات ہیں اور نظامِ اسلامی کے غلبہ کے بارے میں یہاں کیا توقعات ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتوں اور اپنی حکمتوں کو خود ہی جانتا ہے۔ ہمارے پاس ان کو جاننے اور سمجھنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس نے مختلف جباروں اور مختلف ظالم

---

[1] ان دنوں پاکستان پر پیپلز پارٹی کی فسطائی حکومت (۱۹۷۱-۱۹۷۷ء) نے سیاسی اختلاف رکھنے والوں پر ظلم وتشدد کا بدترین بازار گرم کر رکھا تھا۔

قوموں کی رسی جتنی چاہی دراز کی ہے اور جب چاہا ہے ان کو اٹھا کر اس طرح پھینکا ہے کہ وہ عبرت بن کر رہ گئے ہیں۔ بہر حال اپنی زمین کا مستقل پٹہ اس نے کسی شخص یا قوم یا مجموعۂ اقوام کو کبھی لکھ کر نہیں دے دیا ہے۔ یہ معاملہ چونکہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ اس لئے خدا کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتے ہوئے ہمیں اس فکر میں نہیں پڑنا چاہئے کہ جو طاقتیں اس راہ میں مزاحم ہیں ان کی رسی خدا نے کتنی دراز یا کتنی کوتاہ رکھی ہے۔ ہمیں اپنا فرض صبر و حکمت کے ساتھ بہر صورت ادا کئے چلے جانا چاہئے۔ خواہ اس کے نتائج ہماری آنکھیں دیکھ سکیں یا نہ دیکھ سکیں۔

باطل کے لئے کام کرنے والوں کی طرح حق کے لئے کام کرنے والوں کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ مختلف رہا ہے۔ کبھی ان کے حصے میں صرف جان و مال اور وقت و محنت کی قربانی ہی آتی ہے۔ دنیوی کامیابی انہیں عطا نہیں کی جاتی۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ اللہ ان سے ناراض اور ظالموں سے راضی ہوتا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جس قوم میں وہ کام کر رہے ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق نہیں بناتی کہ اللہ اسے نیک رہنما اور عادل فرمانروا دے، بلکہ اس کے برعکس اس کی شقاوت اور دنایت اپنے رب سے گمراہ کن رہنما اور جابر و ظالم فرمانروا ہی مانگتی ہے اور وہی اسے دیئے جاتے ہیں۔ مگر اس صورت میں اہلِ حق کا کیا ہوا کام ضائع ہرگز نہیں ہوتا۔ آخرت میں تو ان کا اجر بہر حال محفوظ ہے ہی، دنیا میں بھی جو بیج وہ بو جاتے ہیں وہ کبھی نہ کبھی پھل لا کر رہتے ہیں، خواہ ان کے بارآور ہونے میں صدیاں لگ جائیں۔

پھر کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اہلِ حق کو کامیابی نصیب ہوتی ہے، مگر آسانی کے ساتھ نہیں بلکہ بڑی تکلیفیں اٹھا کر اور ہر طرح کے ظلم و ستم کی چکی میں پس کر ہوتی ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال آپ کے سامنے خود ان بندگانِ حق کی موجود ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر حضورؐ کی رہنمائی میں وہ دین قائم کیا جسے قائم کرنے کے لئے آج آپ اٹھے ہیں۔ ان کے ساتھ یہ معاملہ تو نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے خوب دل لگا کر فرائض و نوافل ادا کئے ہوں اور ایک روز فرشتوں نے آ کر ان سے کہا ہو کہ اللہ

تعالیٰ آپ کی عبادت اور ذکر و فکر سے بہت خوش ہوا ہے، چلیے اب تخت سلطنت آپ کے لئے تیار ہے۔ یا کفر و فسق کے زیرِ سایہ وہ ٹھنڈی ٹھنڈی تبلیغ کرتے رہے ہوں اور ایک وقت اچانک ایسا آ گیا ہو کہ کفار و فساق آپ ہی آپ ان کے حق میں اقتدار سے دستبردار ہو گئے ہوں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مکہ معظمہ میں (ابتدائی خفیہ دعوت کا زمانہ چھوڑ کر) مسلسل دس سال تک حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں پر سخت سے سخت ظلم کئے گئے۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر گھسیٹا گیا۔ کسی کو آگ کے انگاروں پر ڈال کر اوپر سے پتھر رکھ دیئے گئے۔ کسی کو الٹا لٹکا کر اور چٹائی میں لپیٹ کر دھونی دی گئی۔ کسی کو مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا۔ کسی کو پانی میں غوطے دیئے گئے۔ حتیٰ کہ بہت سے لوگوں کو گھر بار چھوڑ کر بے سروسامانی کے عالم میں حبش کی طرف نکل جانا پڑا۔ پے در پے مصائب کے یہ دس سال گزارنے کے بعد جب مدینے میں پناہ کی ایک جگہ اور حامیوں کی ایک جماعت ملی تو وہاں بھی کوئی پھولوں کی سیج تیار نہ تھی۔ ۹ سال تک وہاں گھر کے منافقوں، پڑوس کے یہودیوں اور پورے عرب کے مشرکوں سے ایک شدید جانگسل کشمکش برپا رہی؛ جس میں کبھی ایک دن کے لئے بھی چین نصیب نہ ہوا۔ غارِ ثور کی انتہائی خطرناک پناہ گزینی سے لے کر غزوۂ تبوک کے جیشِ عسرت تک سارا زمانہ ایسی حالت میں گزرا جس کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۔ ”ہم ضرور تمہیں آزما کر رہیں گے۔ کچھ خوف سے، کچھ بھوک سے اور کچھ مال اور جان اور پیداوار کے نقصانات سے۔“ یہ مراحل جب صبر و استقامت کے ساتھ گزار لئے گئے تب کہیں دینِ حق کے علمبردار اور اس کے مجاہد ساتھیوں کی آنکھیں يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کا منظر دیکھ کر ٹھنڈی ہو سکیں۔

یہ سب کچھ کس لئے تھا؟ کیا ظالموں کے ظلم سے اللہ راضی تھا؛ اس وجہ سے وہ ان کو اپنے نیک بندوں پر زیادتیاں کرنے کی کھلی چھوٹ دیئے جا رہا تھا؟ کیا اللہ رحیم و رحمٰن کو یہ پسند تھا کہ اس کے باغی عیش کریں اور اس کے وفادار بھوکے مریں؟ مار

کھائیں؟ گھر سے بے گھر کیے جائیں؟ اور میدانِ جنگ میں صرف قتل ہی نہ کیے جائیں، بلکہ ان کے کلیجے تک چبا ڈالے جائیں؟ اگر آپ یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ اصل بات یہ نہیں ہے، تو پھر خوب سمجھ لیجیے کہ اللہ جل شانہٗ اسلام کی دعوت لے کر اٹھنے والوں کے لئے آزمائشوں کی بھٹی ضرور گرم کرتا ہے، تاکہ کوئی بودا اور خام آدمی اس میدان میں قدم نہ رکھنے پائے۔ اور جو لوگ بھی ایمان کا اقرار کرکے اس راہ پر آئیں وہ لازماً اسی بھٹی سے گزارے جائیں، تاکہ حق وصداقت کے ساتھ ان کا عشق اور دین کی سربلندی کے لئے ان کا عزم اور اقامتِ دین کے لئے ان کا کردار پختہ اور قابل اعتماد ہو جائے۔ اس کے بغیر ان کو اللہ اور اس کے دین کے نام پر دنیا میں حکومت وفرمانروائی کا موقع دے دیا جاتا، تو نتیجہ یہ ہوتا، کہ کافروں کی جگہ مسلمان خلق خدا پر ظلم کرتے اور ان کی خیانتیں اور بدکرداریاں دیکھ کر دین اور اہلِ دین کی ساکھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی۔

اس حقیقت کو اگر آپ اچھی طرح سمجھ لیں تو کبھی آپ کے ذہن یہ سوچ سوچ کر پریشان نہ ہوں کہ اللہ کب تک ظالموں کو ظلم کی چھوٹ دیئے رکھے گا؟ اور ان حالات میں اسلامی نظام کے قائم ہونے کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے؟ خوب جان لیجیے کہ اس سرزمین میں اسلام کا غلبہ اگر ہوسکتا ہے تو اسی طرح ہوسکتا ہے کہ اس مقصد کے لئے کام کرنے والے اسی بھٹی سے گزریں جس سے دورِ اوّل کے اہلِ ایمان گزرے تھے۔ اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ ہر قربانی دینے، ہر مشقت اٹھانے، ہر نقصان بھگتنے اور ہر خطرہ برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ جب تک یہ امتحان وہ پاس نہ کرلیں گے، ان پر ایک دارالاسلام کے انتظام کی ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈالا جائے گا، کیونکہ وہ اس بوجھ کو سہار نہ سکیں گے۔ اسلام کے نام پر کسی نیم پختہ گروہ کو اگر حکومت دے دی جائے اور پھر اس کے لائے ہوئے حاکم خائن نکلیں، اختیارات کا ناجائز استعمال کریں، اپنی اغراض وخواہشات کے بیجا تقاضوں سے مغلوب ہو کر انصاف اور امانت کا خون کرنے لگیں، قوم کے مال میں ناروا تصرّف کریں، اپنے آپ کو قانون سے بالاتر قرار دے لیں اور اقتدار کا بار پڑتے ہی ان کے اخلاق جواب دے جائیں۔ تو پھر ہمیشہ کے لئے

یہاں اسلام کے غلبے کا امکان ختم ہو جائے گا۔ اس ملک ہی کی آبادی نہیں بلکہ پوری دنیا اسلام سے مایوس ہو جائے گی۔ اس لئے اس کو اللہ کی رحمت سمجھیے کہ وہ آپ کو پختہ کرنے کے لئے آزمائشوں کی بھٹی سے گزار رہا ہے اور قبل از وقت آپ پر ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈال رہا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ ہوگا کہ یہاں ایک ایسی جماعت بن گئی ہے جس میں کھرا سونا ہی پایا جاتا ہے اور کھوٹ سے وہ صاف ہو گئی ہے، جس کی دیانت وامانت اور خدا ترسی قابل اعتماد ہے، جو کبر ونخوت اور انانیت ونفسانیت سے پاک ہے، جو اپنی بڑائی کے لئے نہیں اٹھی ہے بلکہ فی الواقع اللہ کے دین ہی کی بالاتری قائم کرنا چاہتی ہے، تب اللہ کے فضل سے یہ پوری امید ہے کہ وہ ایسی جماعت کو دُنیوی کامیابی بھی عطا فرمائے گا، جس طرح اس کے پیشرووں کو وہ عطا کر چکا ہے۔ اس لئے صبر اور ہمت و استقامت کے ساتھ آزمائشوں سے گزریے اور اللہ سے دعا مانگتے رہیے کہ وہ آپ کو اقامتِ دین کے کام کی اہلیت وصلاحیت عطا فرمائے۔ یہی بات ہے جو حضرت خبابؓ بن ارت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔ جب انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے تو آپ کا چہرۂ مبارک تمتما اٹھا اور آپؐ نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو اہلِ ایمان گزر چکے ہیں ان پر اس سے زیادہ سختیاں توڑی گئی تھیں۔ یقین جانو کہ اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا جب ایک شخص صنعا سے حضرموت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اسے کسی کا خوف نہ ہوگا، مگر تم لوگ جلد بازی کرتے ہو۔

سوال: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلبۂ اسلام سے پہلے تمام صحابہ کرامؓ سے رضا کارانہ تعاون حاصل فرمایا اور صرف اسلامی نظام کے قیام کے بعد ہی کارکنوں کو فارغ کیا گیا تو کیا جماعت اسلامی اس سنت کی خلاف ورزی تو نہیں کر رہی ہے؟

جواب: دراصل اس کے لئے لفظ سنت کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ یہ تو تدبیر کا معاملہ ہے جس میں حالات اور ضروریات کے لحاظ سے کوئی مناسب طریقِ کار اختیار کیا

جا سکتا ہے۔ مکہ معظمہ میں جب تک حضورؐ رہے، طریقِ کار یہ تھا کہ جو لوگ کچھ مال رکھتے تھے وہ ان لوگوں کی مدد کرتے تھے جو اپنا بار آپ نہ اٹھا سکتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود وہ سارا مال اللہ کی راہ میں صرف فرمایا جو نبوت سے پہلے آپ کے پاس تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے خوشحال مسلمانوں نے بھی اپنی دولت اس کام میں صرف کی۔ اسلام قبول کرنے والوں میں ایسے اصحاب بھی تھے جن کے ذرائع معیشت ظالموں نے ختم یا تنگ کر دیئے تھے، اور ایسے نوجوان بھی تھے جنہیں ان کے گھر والوں نے نکال دیا تھا اور وہ بے سہارا رہ گئے تھے۔ ان سب لوگوں کے لئے چاہے باقاعدہ مشاہرے نہ مقرر کئے گئے ہوں، لیکن ان کی کفالت کسی نہ کسی طرح کی جاتی تھی، ورنہ ظاہر بات ہے کہ وہ خوراک اور لباس کے بغیر تو نہیں رہ سکتے تھے۔ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں بھی ایک مدّت تک یہ صورت رہی کہ جو لوگ کفالت کے محتاج تھے، اور خود اپنی روزی نہ کما سکتے تھے، ان کی کفالت دوسرے اصحابؓ اپنی استطاعت کے مطابق کرتے رہتے تھے۔ سورۂ بقرہ میں انفاق فی سبیل اللہ کا بہترین مصرف مسلمانوں کو یہ بتایا گیا کہ ان غریب لوگوں کی مدد کی جائے جو ”اللہ کی راہ میں ایسے گھر گئے ہیں جو اپنے ذاتی کسبِ معاش کے لئے زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔“ (اَلَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ) ان غریبوں کے اللہ کی راہ میں گھر جانے کا مطلب دین کے کام میں ان کا اس طرح مشغول ہو جانا تھا کہ وہ چل پھر کر اپنی روزی کمانے کی فرصت نہ رکھتے تھے اور ایسے ذرائع بھی ان کو حاصل نہ تھے کہ وہ گھر سے کھا کر خدا کا کام کر سکیں۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے غنیمت اور فَے کے اموال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرما دیئے تو ان کا ایک مصرف ایسے خادمانِ دین کی کفالت بھی تھا۔ پھر جن لوگوں کو حضورؐ نے امیر یا عامل، یا محصّل زکوٰۃ وغیرہ مناصب پر مقرر کیا تو ان کے باقاعدہ مشاہرے بھی مقرر فرمائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے مختلف زمانوں میں مختلف حالات کے لئے جو تدبیر موزوں سمجھی وہ اختیار فرمائی۔ ان میں سے کسی تدبیر کو بھی ایسی سنّت قرار نہیں دیا جا سکتا جس کی پابندی ہر حال میں لازم

ہو۔ جماعت اسلامی میں فارغ کارکن صرف اسی صورت میں مقرر کیے جاتے ہیں جبکہ جز وقتی کارکنوں کی رضا کارانہ خدمات سے باقاعدگی کے ساتھ کام نہ چل سکتا ہو، اور ہمہ وقتی خدمات کے لئے ایسے کارکن بھی نہ مل سکتے ہوں جو گھر سے کھا کر اپنا سارا وقت خدا کے کام میں صرف کر سکیں۔

> سوال: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ کی جماعت جن کے ہاتھوں اسلامی انقلاب برپا ہوا، ان کے تقویٰ، قناعت، کفایت شعاری، جانی و مالی ایثار، توکل علی اللہ اور شوقِ شہادت کا معیار اتنا اونچا تھا کہ جس کا نمونہ موجودہ تحریکِ اسلامی کے کارکنوں میں پایا جانا تو درکنار اس کا سواں حصہ بھی نایاب ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ وہ مہم سر کی جا سکے جو صحابہؓ نے سر کی تھی۔ پھر ایسے بلند مرتبہ رہنماؤں اور کارکنوں کے ہاتھوں جو اسلامی انقلاب برپا ہوا' وہ بھی معیاری صورت میں ۳۰ سال ہی چل سکا۔ صرف اس لئے کہ بعد میں آنے والے لوگوں کے درمیان پہلے صحابہؓ جیسے لوگ نہ تھے۔ اب جس معیار کے رہنما اور کارکن تحریکِ اسلامی میں ہیں ان کے ہاتھوں وہ انقلاب برپا ہونا اوّل تو سخت مشکل ہے اور اگر وہ برپا ہو بھی جائے تو شاید ۳۰ دن بھی نہ چل سکے گا۔"

جواب: یہ سوال تو ایک پورا خطبہ ہے' تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کو اپنے نصب العین سے مایوس کر دینے کے لئے۔ اگر اس کا مقصد خود مایوس ہونا اور دوسروں میں مایوسی پیدا کرنا نہیں ہے' تو اس معاملے پر اچھی طرح سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جتنے اعلیٰ درجے کے مربی تھے اور جیسا بلند ترین نمونہ حضورؐ نے اپنی زندگی کا لوگوں کے سامنے پیش کیا، اس طرح کا کوئی رہنما قیامت تک مسلمانوں کو میسر نہیں آ سکتا۔ اسی طرح حضورؐ کی تعلیم و تربیت کی بدولت جیسے اعلیٰ درجے کے کارکن دعوتِ اسلامی کی خدمت انجام دینے کے لئے اس وقت تیار ہوئے تھے، اس پائے کے کارکن بھی تیار کر لینا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ اب کیا اس کے معنی

یہ ہیں کہ ہم دینِ حق قائم کرنے کی کوشش ہی نہ کریں؟ اگر اس کام سے رک جانے کے لئے یہی دلیل استعمال کی جائے، تو اس کے دو ہی نتیجے نکل سکتے ہیں۔ یا تو دینِ باطل دنیا میں قائم ہو اور ہم اس کے تابع بن کر رہیں یا پھر خود بھی دین باطل کے قائم کرنے میں لگ جائیں تاکہ دنیوی لذات اور فوائد و منافع سے تو اچھی طرح شادکام ہو سکیں۔ اس کے لئے کسی قسم کی بھی اخلاقی بلندی درکار نہیں ہے۔ صرف پستی کی طرف گرنا ہی ہے جو کسی محنت اور کوشش کے بغیر بآسانی ہو سکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ نیک نیتی کے ساتھ وہ غلط طرزِ فکر اختیار کرتے ہیں جو اس سوال کے اندر مضمر ہے۔ انہوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ یہ طرزِ فکر آخر کار ہمیں کہاں پہنچا کر چھوڑتا ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ صحیح طور پر سوچتے تو سیدھی راہ ان کے سامنے خود بخود واضح ہو جاتی۔ ایک مومن کے لئے سیدھی راہ یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ جس بلندی پر پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں، اس کی طرف چڑھنے کے لئے وہ جتنی کوشش کر سکتا ہے کرے، اور عمر بھر کرتا چلا جائے اور اپنی طرف سے اس میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔ اس بلندی پر چڑھتے ہوئے اگر کوئی شخص تھک کر راستے میں گر جائے اور وہیں مر جائے، تو وہ کامیاب ہے۔ لیکن اگر ایک آدمی یہ دیکھ کر کہ چڑھائی بہت اونچی ہے، کھڈ کی طرف جانا شروع کر دے، تو جائے گا بڑی آسانی سے لیکن گرے گا بھی ایسی جگہ جہاں اس کا پرزہ پرزہ بکھر کر رہ جائے گا۔ قرآن پاک کو آپ غور سے پڑھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ انسان کو سیرت و اخلاق کی بلندیوں پر چڑھنے سے مایوس نہیں کرتا بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰی ”جس نے راہِ خدا میں مال دیا اور خدا کی نافرمانی سے پرہیز کیا اور بھلائی کو سچ مانا اس کو ہم آسان راستے کی سہولت دیں گے۔“ بلکہ اللہ تعالیٰ کا صریح وعدہ ہے کہ وَالَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۔ ”جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کریں گے ان کو اپنے راستوں کی ہدایت ہم خود دیں گے۔“ لہٰذا آپ اللہ کی راہ میں جان لڑائیں اور اس سے توفیق مانگتے

رہیں۔ اپنی ایک ایک کمزوری کو سمجھیں اور اسے دور کرنے کی کوشش کریں۔ اپنے اندر جو بہتر صلاحیتیں پائیں ان کو بھی اچھی طرح سمجھیں اور ان کو ترقی دینے کی کوشش کریں۔

اس تزکیۂ نفس میں قرآن و حدیث اور سیرتِ پاک اور صحابہؓ و اخیارِ امت کی سیرتیں پڑھنے سے بھی بڑی مدد مل سکتی ہے، اور اگر جماعت کے سب افراد اس کوشش میں لگے ہوئے ہوں تو وہ سب بھی ایک دوسرے کے مددگار بن سکتے ہیں۔ اس طرح اپنے آپ کو پستیوں سے اٹھانے اور بلندیوں کی طرف لے جانے کی جتنی کوشش بھی آپ اللہ کے بھروسے پر کریں گے، اتنے ہی بلند مراتب پر اللہ تعالیٰ آپ کو پہنچا دے گا، کیونکہ یہ اس کا وعدہ ہے اور وہ اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کرنا بجائے خود بھی انسان کی اصلاح و ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسلام میں جو اخلاقی بلندی مطلوب ہے وہ باطل کے مقابلے میں لڑنے اور حق قائم کرنے کی کوشش میں جان لڑانے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ صحابۂ کرام کی جس بلندئ مدارج کو دیکھ کر آپ پر حیرت اور مایوسی کا عالم طاری ہونے لگتا ہے، وہ کسی گوشۂ عزلت میں چلے کاٹنے کا ثمرہ نہ تھی، بلکہ اللہ کی راہ میں مار کھانے، اذیتیں سہنے، قیدیں برداشت کرنے، بھوکے مرنے، نقصانات اٹھانے، خطرات کا سامنا کرنے اور جان و مال کی قربانیاں دینے سے حاصل ہوئی تھی۔ آدمی کو اللہ اور اس کے دین سے عشق نہ ہو تو وہ اس وادئ پُرخطر میں اتر ہی نہیں سکتا اور جب وہ اس میں اترتا ہے تو ہر چوٹ کھا کر اس کا عشق بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہی عشق ان بندگانِ حق کو اتنی بلندیوں پر اٹھا لے گیا۔ آپ باطل سے لڑنے اور اس کی جگہ حق قائم کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائیں گے تو اللہ آپ کے ساتھ کسی بخل سے کام نہ لے گا۔

اب رہا یہ خیال کہ ہم جیسے کمزور لوگوں کے ہاتھوں اسلامی نظام کا برپا ہو جانا ہی سخت مشکل ہے، اور اگر وہ ہو بھی جائے تو تیس سال کجا، تیس دن بھی قائم نہ رہ سکے گا، تو اس کے متعلق میں بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے اوپر اسلامی نظام برپا کر دینے کی

ذمہ داری نہیں ڈالی گئی ہے، بلکہ اس کے لئے جان لڑانے کی ذمہ داری ہی ڈالی گئی ہے۔ اس کا برپا ہونا نہ ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیّت پر موقوف ہے اور یہ بھی اللہ کی مشیّت ہی پر منحصر ہے کہ وہ قائم ہو تو کب تک چلے اور کب تک نہ چلے۔ لہٰذا ان باتوں کو سوچ سوچ کر تھڑدلی میں مبتلا ہو جانا درست نہیں ہے۔ آپ کے کرنے کا جو کام ہے اسے اپنی حد تک زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے کرنے کی کوشش کریں اور اللہ کے کرنے کا جو کام ہے اسے اللہ پر چھوڑ دیں۔

سوال: جماعت اسلامی کے فارغ کارکن بالعموم اس الجھن کو محسوس کرتے ہیں کہ ان کے روز مرہ کے کام کا نتیجہ محسوس طور پر ظاہر نہیں ہوتا۔ بعض اوقات دن بھر میں ایک ہی ملاقات ہوتی ہے یا سفر کر کے دور دیہات میں جانے کے بعد مجوزہ پروگرام نہیں بنتا یا آدمی نہیں ملتا۔ تحریک کے رفقاء توقع رکھتے ہیں کہ جب ایک کارکن فارغ کر دیا گیا ہے تو کام کا نتیجہ محسوس طور پر اعداد و شمار میں آنا چاہئے۔ اس الجھن کا علاج کیا ہے؟

جواب: اس الجھن کے دو پہلو ہیں اور دونوں پہلوؤں کا علاج ہونا چاہئے۔ ایک پہلو تو ہے اس شخص کی الجھن کا جو فارغ کارکن ہے اور ایک پہلو ہے ان لوگوں کی الجھن کا جو اس کارکن کو تحریک کا کام کرنے کے لئے فارغ کرتے ہیں، اس کی کفالت کے لئے مال فراہم کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کام کر رہا ہے یا نہیں، اور اگر کر رہا ہے تو کس طرح کر رہا ہے؟

جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے سب سے پہلے ہر فارغ کارکن کو خود اپنا بے لاگ محاسبہ کر کے دیکھنا چاہئے کہ جب میں اسلام کے کام کے لئے فارغ کیا گیا ہوں اور میری ضروریات کا بوجھ جماعت نے اپنے ذمے لے لیا ہے تو کیا میں اس کا حق ادا کر رہا ہوں؟ یہ محاسبہ اسے عنداللہ اپنی جواب دہی کا احساس کرتے ہوئے کرنا چاہئے۔ اگر اس کا اپنا ضمیر یہ محسوس کرے کہ ادائے حق میں وہ کوتاہی کر رہا ہے تو اسے خود اپنی اصلاح کرنی چاہئے، خواہ جماعت اس کا محاسبہ کرے یا نہ کرے۔ کیونکہ کوئی اور جانے یا

نہ جانے، وہ خدا تو اس کی کوتاہی کو جانتا ہے جو عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ جماعت کو وہ بڑے معقول دلائل دے کر مطمئن کر سکتا ہے، مگر خدا کو تو کسی طرح دھوکا نہیں دے سکتا۔ اسے اس سارے معاملہ پر اس لحاظ سے سوچنا چاہئے کہ اس وقت وہ کیا جواب دے گا۔ جب اس سے پوچھا جائے گا کہ اللہ کے بندے تیرے لئے ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کا انتظام بھی کر دیا گیا تھا اور ہمارے کام کے لئے تجھے فکر معاش سے بھی فارغ کر دیا گیا تھا، پھر بھی تو نے اس کام میں جان نہ لڑائی! اس طرح اپنا محاسبہ کر کے ہر فارغ کارکن اپنی الجھن کو خود دور کر سکتا ہے۔

رہی ان لوگوں کی الجھن جو اسے فارغ کرتے ہیں تو ان کو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ کوئی معمار کا کام تو ہے نہیں کہ روز آپ آ کر گن لیں کہ آج کتنی اینٹیں رکھی گئیں۔ اس حساب سے اگر آپ نے دیکھنا شروع کیا تو ظاہر بات ہے کہ کوئی فارغ کارکن بھی، امیرِ جماعت سمیت، اس قابل نہیں رہے گا کہ اپنے کام سے آپ کو مطمئن کر سکے۔ آپ کو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ فارغ کارکن اپنا وقت اور اپنی محنت فرض شناسی اور دل کی لگن کے ساتھ اسی کام میں صرف کر رہا ہے یا نہیں جس کے لئے اسے فارغ کیا گیا ہے؟ وہ فضول کاموں میں تو اپنا وقت ضائع نہیں کر رہا ہے؟ وہ جماعت سے معاوضہ لے کر اپنے ذاتی مقاصد کے لئے دوڑ دھوپ کرنے میں تو لگا نہیں رہتا؟ ایسی کوئی شکایت اس سے نہ ہو تو آپ اس لحاظ سے اس کے کام کو نہ جانچیں کہ اس کی کوششوں سے نتائج کس قدر برآمد ہوئے ہیں۔ یہ کام تو ایسا ہے کہ بسا اوقات ہفتوں اور مہینوں ہی نہیں، برسوں ایک شخص اپنی جان کھپاتا رہتا ہے اور پھر بھی ایسے نتائج برآمد نہیں ہوتے جنہیں ناپ کر اور تول کر دیکھا جا سکے۔ دعوت ہزارہا آدمیوں تک پہنچائی جاتی ہے مگر صرف چند آدمی اسے قبول کرتے ہیں، اور ان کے بارے میں بھی یہ ضمانت کسی کے پاس نہیں ہوتی کہ وہ کتنے مخلص ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے انبیاء کو بھی ان کی مساعی کے نتائج اور ماحصل کے لحاظ سے نہیں جانچا ہے، بلکہ صرف اس لحاظ سے جانچا ہے کہ انہوں نے اپنا فرض کما حقہ ادا کر دیا ہے یا نہیں۔ نتائج کے لحاظ سے جانچا جاتا تو معاذ اللہ وہ انبیاء

تک ناکام قرار پاتے جن کی کوششوں سے کوئی ایک شخص بھی ایمان نہ لایا۔ حضرت لوطؑ ہی کی مثال دیکھ لیجئے جن کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ فَمَا وَجَدْنَا فِیْهَا غَیْرَ بَیْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ ''ہم نے وہاں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔'' اور یہ گھر خود حضرت لوطؑ کا تھا جس میں ان کی بیوی تک عذاب کی مستحق پائی گئی۔

سوال: ایک طرف تحریکِ اسلامی پورے عالم میں تیزی کے ساتھ متعارف ہو رہی ہے حتیٰ کہ کمیونسٹ ممالک میں بھی اس کی گونج سنائی دے رہی ہے، دوسری طرف پاکستان میں یہ بات بہت بری طرح کھٹکتی ہے کہ یہاں جماعت کے لوگوں اور خصوصاً ارکان کے اندر جمود کی کیفیت طاری ہے اور اکثر حضرات کی کیفیت بالکل ویسی ہو چکی ہے جیسی نسلی مسلمانوں کی ہے۔ یہ بات تحریک کے مستقبل کے بارے میں کسی لحاظ سے حوصلہ افزا نہیں ہے۔ اس رجحان کو بروقت روکنے کی کوشش نہ کی گئی تو خدانخواستہ آج تک کی تمام کوششوں پر پانی پھر جانے کا خطرہ ہے۔ آپ کے نزدیک اس کیفیت کے طاری ہونے کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں اور اس کے مداوا کے لئے کون سی تدبیر مؤثر ہو سکتی ہے؟

جواب: اس سوال میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں جو باہم متناقض ہیں۔ ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ تحریکِ اسلامی پورے عالم میں تیزی کے ساتھ متعارف ہو رہی ہے اور دوسری بات یہ کہ پاکستان میں جماعت پر جمود طاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہاں جمود طاری ہے تو سارے عالم میں تحریکِ اسلامی تیزی کے ساتھ کیسے پھیل رہی ہے اور کون پھیلا رہا ہے۔ میں آغاز ہی میں اس تناقض کی طرف اس لئے توجہ نہیں دلا رہا ہوں کہ آپ کو کسی غلط قسم کی خود اعتمادی میں مبتلا کروں، بلکہ میرا مدعا آپ لوگوں کو صرف یہ احساس دلانا ہے کہ اپنے کام کا جائزہ لیتے وقت نہ مثبت پہلو میں مبالغہ سے کام لینا چاہئے اور نہ منفی پہلو میں۔ بسا اوقات آدمی خود جامد ہوتا ہے اور اپنا جمود اسے ساری جماعت میں نظر آنے لگتا ہے۔ بسا اوقات آدمی بہت زیادہ پر جوش ہوتا ہے اور جماعت

کو جب وہ اپنی توقعات اور تمناؤں کے مطابق تیز رفتار نہیں پاتا تو کہتا ہے کہ اس پر جمود طاری ہے۔ بسا اوقات ایک شخص اپنے ذہن میں کام کا کوئی خاص نقشہ یا تصور رکھتا ہے اور جب جماعت اس نقشے یا تصور پر کام کرتی نظر نہیں آتی تو وہ خیال کرتا ہے کہ جماعت کوئی کام نہیں کر رہی ہے۔

اس طرح کے مبالغوں سے بچتے ہوئے جماعت کے ہر فرد کو بھی اور پوری جماعت کو بھی بے لاگ جائزہ لینا چاہئے کہ کیا فی الواقع وہ جمود میں مبتلا ہے؟ اور اگر ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟ اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ جماعت کے لوگ اس عہد ہی کو فراموش کر گئے ہوں جو جماعت میں داخل ہوتے وقت انہوں نے اپنے خدا سے کیا تھا۔ یہ سبب اگر خدانخواستہ واقعی موجود ہے تو ہم سب کو اور ہم میں سے ہر ایک کو سوچنا چاہئے کہ اپنے رب کے ساتھ یہ عہد ہم نے کسی مجبوری سے کیا تھا یا برضا و رغبت؟ بے سوچے سمجھے کیا تھا یا خوب سوچ سمجھ کر پورے شعور کے ساتھ؟ کسی دنیوی غرض کے لئے کیا تھا یا اپنے ایمان کا تقاضا سمجھ کر خالص اللہ کی رضا کے لئے؟ میں نہیں سمجھتا کہ ہم میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا ہوگا جس نے برضا و رغبت، پورے شعور کے ساتھ اور محض اللہ کی رضا کے لئے اپنے ایمان کا تقاضا سمجھ کر یہ عہد نہ کیا ہو۔ پھر جب واقعہ یہی ہے تو اس راہ میں جمود کیسا؟ کیا ہمارے ایمان کے تقاضے اب بدل گئے ہیں؟ کیا اللہ کی رضا ہمیں اب مطلوب نہیں رہی؟ یا ہماری رائے اب یہ نہیں رہی کہ اللہ کی زمین پر اس کے دین کو قائم کرنا ہمارا مقصد ہے؟ ان سوالات کو اپنے ذہن میں رکھ کر ہم میں سے ہر شخص اگر روزانہ ایک مرتبہ بھی اپنے نفس کا جائزہ لیتا رہے تو جمود تو درکنار، اس کا تصور اور اس کا اندیشہ تک باقی نہ رہے گا۔

جمود کا دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ جماعت کو درست رکھنے کے لئے ابتداء سے محاسبہ و تنقید اور اصلاح و تطہیر کا جو طریقہ رکھا گیا تھا اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس طریقے کو مقرر کرنے کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ جماعت میں جہاں بھی کوئی خرابی پیدا ہو رہی ہو اس کا بروقت نوٹس لیا جائے اور اسے رفع کئے بغیر نہ چھوڑا جائے۔ جو شخص بھی

سست پڑ رہا ہو یا غلط روش پر چل پڑا ہو، بلا تاخیر اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے اور اصلاح نہ ہو سکے تو اسے رخصت کر دیا جائے۔ اگر یہ کام برابر ہوتا رہے تو جماعت میں ہمیشہ تطہیر کا عمل جاری رہے گا اور اس کے اندر غلط قسم کے آدمی نہ رہنے پائیں گے۔ غلط قسم کے آدمیوں کا جماعت میں موجود ہونا بہر صورت نقصان دہ ہے۔ وہ اگر فعّال نہ بھی ہوں تو ان کی چھوت رفتہ رفتہ دوسروں کو لگتی چلی جاتی ہے اور اگر غلط ہونے کے ساتھ فعّال بھی ہوں تو ان کی ساری سرگرمیاں اس کام میں صرف ہوتی ہیں کہ جس بیماری میں خود مبتلا ہیں اسے ساری جماعت میں پھیلا دیں۔ اس طرح کے آدمی جہاں بھی موجود ہوں فوراً ان کا محاسبہ کیجئے۔ پھر یا تو وہ ٹھیک ہو جائیں گے یا انہیں جماعت سے نکلنا پڑے گا۔ جماعت کو صحت مند رکھنے کے لئے یہ عمل جاری رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس میں آپ تساہل سے کام لیں گے تو آئے دن آپ کو پریشان کن مسائل سے سابقہ پیش آتا رہے گا۔

> سوال: قانونِ قدرت ہے کہ اصلاح کا کام کرنے والوں کو عذاب سے بچا لیا جاتا ہے، مگر مشرقی پاکستان میں تحریکِ اسلامی کا سب سے زیادہ جانی اور مالی نقصان ہوا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ اقامتِ دین کے لئے کام کرنے والے کبھی زخمی نہیں ہوں گے، کبھی شہید نہیں ہوں گے اور کبھی انہیں کسی قسم کی زک نہ اٹھانی پڑے گی۔ اگر ایسا وعدہ اللہ تعالیٰ کر چکا ہوتا تو اس کے دین کا کام کرنے کے لئے لاکھوں کروڑوں آدمی بڑے اطمینان کے ساتھ کھڑے ہو جاتے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ حق و باطل کی کشمکش میں اگر اہلِ حق کو جان و مال کا نقصان اٹھانا پڑے، یا وہ شکست کھا جائیں اور اہلِ باطل کو غلبہ نصیب ہو جائے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اہلِ حق پر عذابِ الٰہی نازل ہوا ہے۔ تحریکِ اسلامی کے جو لوگ مشرقی پاکستان میں تھے انہوں نے جب دیکھا کہ ان کا ملک صریحاً کفر کی گود میں جا رہا ہے تو انہوں نے اسے روکنے کے لئے اپنی جانیں لڑا دیں، ہزاروں شہید ہوئے، ہزاروں زخمی ہوئے۔ کثیر

تعداد گرفتار ہوئی جسے سخت اذیتیں برداشت کرنی پڑیں اور مالی مصائب سے تو کوئی بھی نہ بچا۔ اس کے باوجود وہ کفر کے غلبے کو نہ روک سکے۔ یہ ان کے حق میں ہرگز عذابِ الٰہی نہیں ہے، بلکہ ان کا اجر خدا کے ہاں ثابت ہے اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ ان کا عمل خدا کے ہاں ضائع نہیں ہوا، بلکہ اپنی محنتوں اور قربانیوں سے انہوں نے جو بیج بوئے ہیں وہ دنیا میں بھی ضائع نہیں ہوئے۔ وہ پھل لا رہے ہیں اور آگے جانے والوں کے پیچھے جو لوگ بچ رہ گئے ہیں وہ خدا کے فضل سے اس فصل کو کاٹنے اور مزید فصل بولنے میں لگے ہوئے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ وہاں لوگوں کی آنکھیں کھلنی شروع ہو گئیں اور بڑے بڑے پرجوش بنگلہ دیشیوں کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اب وہ تحریکِ اسلامی کے لوگوں سے مل کر صاف صاف یہ اعتراف کر رہے ہیں کہ ہم دھوکا کھا گئے اور صحیح بات وہی تھی لیکن آج بھی تحریکِ اسلامی کے لوگ موجود ہیں اور وہ برابر اپنا فرض انجام دیئے جا رہے ہیں۔ آج وہاں کے لوگوں کا رجوع ان کی طرف پہلے سے زیادہ ہے کیونکہ تجربے نے ان کو کھوٹے اور کھرے کا فرق اچھی طرح بتا دیا ہے۔

میں مشرقی پاکستان کے بارے میں یہ باتیں صرف آپ کے اطمینان کے لئے بیان نہیں کر رہا ہوں، بلکہ اس سے بڑھ کر میرا مقصد عذابِ الٰہی کے اس غلط تصور کو آپ کے ذہن سے مٹانا ہے جو اس سوال میں پایا جاتا ہے۔ خدانخواستہ اگر کبھی ایسا وقت آ جائے کہ کفر کے ہجوم کا خطرہ پاکستان کے اس حصے کو بھی لاحق ہو جائے تو آپ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ اصلاح کا کام کرنے والے تو عذابِ الٰہی سے بچا ہی لئے جاتے ہیں، پھر جہاد کی کیا ضرورت؟ اور یہ غلط فہمی بھی آپ کو لاحق نہ ہو کہ اس سرزمین کو کفر کی گود میں جانے سے بچانے کے لئے اگر تحریکِ اسلامی کو اپنے مشرقی پاکستانی رفقاء کی طرح قربانیاں دینی پڑیں تو یہ گویا خدا کے عذاب میں مبتلا ہونا ہو گا۔ یہ دونوں باتیں سراسر غلط ہیں۔ اسلام کے گھر کو بچانے کے لئے ہمیں اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینا ہو گا اور یہ یقیناً جہاد فی سبیل اللہ ہو گا جس میں جان دینا شہادت ہے نہ کہ عذاب

اور ہمیں خدا کے فضل سے پورا اطمینان ہے کہ اگر اس راہ میں پوری تحریکِ اسلامی بھی کٹ مرے تو خدا پرستی کے جو بیج یہاں بوئے گئے ہیں وہ ہرگز ضائع نہ ہوں گے۔

> سوال: موجودہ حالات میں جب کہ جمہوریت کے نام پر تمام جمہوری اداروں کی مٹی پلید کر دی گئی ہے، ہر قسم کی آزادی سلب کر لی گئی ہے، بنیادی حقوق کچل کر رکھ دیئے گئے ہیں، جماعت اسلامی محض جمہوری طریقوں سے اسلامی نظام کیسے قائم کر سکے گی؟ کیا اس کے سوا اور کوئی طریقہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اختیار نہیں کیا جا سکتا؟

جواب: جن حالات کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، ان کو دیکھ کر فی الواقع بکثرت لوگ اس الجھن میں پڑ گئے ہیں کہ آیا جمہوری طریقوں سے یہاں کوئی تبدیلی لائی جا سکتی ہے یا نہیں، اور ایک اچھی خاصی تعداد یہ سمجھنے لگی ہے کہ ایسے حالات میں غیر جمہوری طریقے اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ بجائے خود ہمارے حکمرانوں کی بہت بڑی نادانی ہے کہ انہوں نے لوگوں کو اس طرح سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن ہم اس پوری صورت حال کو دیکھتے ہوئے اور اس کی پیدا کردہ تمام صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے بھی اپنی اس رائے پر قائم ہیں کہ اسلامی نظام جسے برپا کرنے کے لئے ہم اٹھے ہیں، جمہوری طریقوں کے سوا کسی دوسری صورت سے برپا نہیں ہو سکتا، اور اگر کسی دوسرے طریقے سے برپا کیا بھی جا سکے تو وہ دیرپا نہیں ہو سکتا۔

اس معاملے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے آپ جمہوری طریقوں کا مطلب واضح طور پر جان لیں۔ غیر جمہوری طریقوں کے مقابلے میں جب جمہوری طریقوں کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ نظامِ زندگی میں جو تبدیلی بھی لانا ہو اور ایک نظام کی جگہ جو نظام بھی قائم کرنا مطلوب ہو، اسے زور زبردستی سے لوگوں پر مسلط نہ کیا جائے، بلکہ عامۃ الناس کو سمجھا کر اور اچھی طرح مطمئن کر کے انہیں ہم خیال بنایا جائے، اور ان کی تائید سے اپنا مطلوبہ نظام قائم کیا جائے۔ اس کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ عوام کو اپنا ہم خیال بنا لینے کے بعد غلط نظام کو صحیح نظام

سے بدلنے کے لئے ہر حال میں صرف انتخابات ہی پر انحصار کیا جائے۔ انتخابات اگر ملک میں آزادانہ و منصفانہ ہوں اور ان کے ذریعے سے عام لوگوں کی رائے نظام کی تبدیلی کے لئے کافی ہو تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں۔ لیکن جہاں انتخابات کے راستے سے تبدیلی کا آنا غیر ممکن بنا دیا گیا ہو وہاں جباروں کو ہٹانے کے لئے رائے عامہ کا دباؤ دوسرے طریقوں سے ڈالا جا سکتا ہے اور ایسی حالت میں وہ طریقے پوری طرح کارگر بھی ہو سکتے ہیں، جبکہ ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی بھاری اکثریت اس بات پر تل جائے کہ جباروں کا من مانا نظام ہرگز نہ چلنے دیا جائے گا اور اس کی جگہ وہ نظام قائم کر کے چھوڑا جائے گا جس کے صحیح و برحق ہونے پر لوگ مطمئن ہو چکے ہیں۔ نظامِ مطلوب کی مقبولیت جب اس مرحلے تک پہنچ جائے تو اس کے بعد غیر مقبول نظام کو عوامی دباؤ سے بدلنا قطعاً غیر جمہوری نہیں ہے، بلکہ ایسی حالت میں اس نظام کا قائم رہنا سراسر غیر جمہوری ہے۔

اس تشریح کے بعد آپ کے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہ رہے گا کہ ہم اسلامی نظام برپا کرنے کے لئے جمہوری طریقوں پر اس قدر زور کیوں دیتے ہیں۔ کوئی دوسرا نظام مثلاً کمیونزم لوگوں پر زبردستی ٹھونسا جا سکتا ہے بلکہ اس کے قیام کا ذریعہ ہی جبر اور جباریت ہے اور خود اس کے ائمہ علانیہ یہ کہتے ہیں کہ انقلاب بندوق کی گولی ہی سے آتا ہے۔ استعماری نظام سرمایہ داری نظام اور فسطائی نظام بھی رائے عام کی تائید کے محتاج نہیں ہیں، بلکہ رائے عام کو طاقت سے کچل دینا اور اس کا گلا گھونٹ دینا ہی ان کے قیام کا ذریعہ ہے۔ لیکن اسلام اس قسم کا نظام نہیں ہے۔ وہ پہلے لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ کیونکہ ایمان کے بغیر لوگ خلوص کے ساتھ اس کے بتائے ہوئے راستوں پر نہیں چل سکتے۔ پھر وہ اپنے اصولوں کا فہم اور ان کے برحق ہونے پر اطمینان بھی عوام کے اندر ضروری حد تک اور خواص (خصوصاً کارفرماؤں) میں کافی حد تک پیدا کرنا لازم سمجھتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر اس کے اصول و احکام کی صحیح تنفیذ ممکن نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہ عوام و خواص کی ذہنیت، اندازِ فکر اور سیرت و کردار میں بھی

اپنے مزاج کے مطابق تبدیلی لانے کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ یہ نہ ہو تو اس کے پاکیزہ اور بلند پایہ اصول و احکام اپنی صحیح روح کے ساتھ نافذ نہیں ہو سکتے۔ یہ جتنی چیزیں میں نے بیان کی ہیں، اسلامی نظام کو برپا کرنے کے لئے سب کی سب ضروری ہیں' اور ان میں سے کوئی چیز بھی جبراً لوگوں کے دل و دماغ میں نہیں ٹھونسی جا سکتی، بلکہ ان میں سے ہر ایک کے لئے ناگزیر ہے کہ تبلیغ، تلقین اور تفہیم کے ذرائع اختیار کر کے لوگوں کے عقائد و افکار بدلے جائیں، ان کے سوچنے کے انداز بدلے جائیں، ان کی اقدار (Values) بدلی جائیں، ان کے اخلاق بدلے جائیں۔ اور ان کو اس حد تک ابھار دیا جائے کہ وہ اپنے اوپر جاہلیت کے کسی نظام کا تسلّط برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ جمہوری طریقوں کے سوا اس کے حصول کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام کو عملاً برپا کر دینے کے لئے کوئی اقدام اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا' جب تک اس مقصد کے لئے کام کرنے والوں کو اس نوعیت کی عوامی تائید حاصل نہ ہو جائے۔

شاید آپ میری یہ باتیں سن کر سوچنے لگیں گے کہ اس لحاظ سے تو گویا ابھی ہم اپنی منزل کے قریب ہونا تو درکنار، اس کی راہ کے صرف ابتدائی مرحلوں میں ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ آپ افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اپنے آج تک کے کام کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں۔ جمہوری طریقوں سے کام کرتے ہوئے آپ پچھلے ۳۳ سال میں تعلیم یافتہ طبقے کی بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہیں اور یہ لوگ ہر شعبۂ زندگی میں موجود ہیں۔ نئی نسل، جو اب تعلیم پا کر اٹھ رہی ہے اور جسے آگے چل کر ہر شعبۂ زندگی کو چلانا ہے، وہ بھی جاہلیت کے علمبرداروں کی ساری کوششوں کے باوجود زیادہ تر آپ کی ہم خیال ہے۔ اب آپ کے سامنے ایک کام تو یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے میں اپنے ہم خیالوں کی تعداد اسی طرح بڑھاتے چلے جائیں' اور دوسرا کام یہ ہے کہ عوام کے اندر بھی نفوذ کر کے ان کو اسلامی نظام برپا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ تیار کرنے کی کوششیں کریں۔ پہلے کام کے لئے لٹریچر کا پھیلانا آج تک جتنا مفید ثابت ہوا ہے اس سے

بدر جہا زیادہ آئندہ مفید ثابت ہو سکتا ہے، اگر آپ اپنے ہم خیال اہلِ علم کے حلقے منظم کر کے مختلف علوم کے ماہرین سے مسائلِ حیات پر تازہ ترین اور محققانہ لٹریچر تیار کرانے کا انتظام کریں اور دوسرے کام کے لئے تبلیغ و تلقین کے دائرے وسیع کرنے کے ساتھ اصلاحِ خلق اور خدمتِ خلق کی ہر ممکن کوشش کریں۔ آپ صبر کے ساتھ لگاتار اس راہ میں جتنی محنت کرتے چلے جائیں گے، اتنی ہی آپ کی منزل قریب آتی چلی جائے گی۔

رہا یہ سوال کہ جب تمام جمہوری اداروں کی مٹی پلید کر دی گئی ہے، شہری آزادیاں سلب کر لی گئی ہیں اور بنیادی حقوق کچل کر رکھ دیئے گئے ہیں، تو جمہوری طریقوں سے کام کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کا کام کرنے کے لئے کھلی ہموار شاہراہ تو کبھی نہیں ملی ہے۔ یہ کام تو جب بھی ہوا جبر و ظلم کے مقابلے میں ہر طرح کی کڑیاں جھیل کر ہی ہوا۔ اور وہ لوگ کبھی یہ کام نہ کر سکے جو یہ سوچتے رہے کہ جاہلیت کے علمبرداروں کی اجازت، یا ان کی عطا کردہ سہولت ملے تو وہ راہِ خدا میں پیش قدمی کریں۔ آپ جن برگزیدہ ہستیوں کے نقشِ پا کی پیروی کر رہے ہیں، انہوں نے ایسے ماحول میں یہ کام کیا تھا جہاں جنگل کا قانون نافذ تھا، اور کسی شہری آزادی یا بنیادی حق کا تصور تک موجود نہ تھا۔ اس وقت ایک طرف دل موہ لینے والے پاکیزہ اخلاق، دماغوں کو مسخر کر لینے والے معقول دلائل اور انسانی فطرت کو اپیل کرنے والے اصول اپنا کام کر رہے تھے، اور دوسری طرف جاہلیت کے پاس ان کے جواب میں پتھر تھے، گالیاں تھیں، جھوٹے بہتان تھے اور کلمۂ حق کہتے ہی انسانوں کی شکل میں درندے خدا کے بندوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ یہی چیز درحقیقت اسلام کی فتح اور جاہلیت کی شکست کا ذریعہ بنی۔ جب ایک معقول اور دل لگتی بات کو عمدہ اخلاق کے لوگ لے کر کھڑے ہوں، اور سخت سے سخت ظلم و ستم سہنے کے باوجود اپنی بات ہر حالت میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے چلے جائیں، تو لازمی طور پر اس کے تین نتائج رونما ہوتے ہیں۔ ایک نتیجہ یہ کہ اس صورتِ حال میں بہت سے باہمت اور اولو العزم لوگ ہی اس دعوت کو علانیہ قبول کرتے ہیں، اور وہ اس کے لئے ایسا قیمتی سرمایہ ثابت ہوتے ہیں جو کسی دوسری صورت

میں بہم نہیں پہنچ سکتا۔ دوسرا نتیجہ یہ کہ ظالموں کی پیدا کردہ اس خوفناک فضا میں بکثرت، بلکہ بے اندازہ لوگ اس دعوت کو دل میں مان لیتے ہیں مگر آگے بڑھ کر اس میں شامل نہیں ہوتے۔ مخالف طاقت آخرکار اس کا خود نقصان اٹھاتی ہے۔ اسے قطعی اور حتمی شکست ہونے تک کبھی یہ پتہ ہی نہیں چلنے پاتا کہ جس دعوت کو مٹا دینے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے، اس کے حامی کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ اس کی اپنی صفوں تک میں موجود ہوتے ہیں اور وہ ان سے بے خبر رہتی ہے۔ تیسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخلاقی برتری اور دعوت کی معقولیت و صداقت اپنی فطری طاقت سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کے دشمن اس کے پیروؤں پر جتنا زیادہ ظلم کرتے ہیں اتنے ہی وہ ہر شریف النفس اور نیک طبع انسان کی نظر سے گرتے جاتے ہیں۔ اس کے پیرو جتنی ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ ظلم برداشت کرتے چلے جاتے ہیں اور اپنی حق پرستی سے بال برابر بھی نہیں ہٹتے، اتنی ہی ان کی قدر و منزلت عام دیکھنے والوں ہی میں نہیں، بلکہ خود دشمنوں کی صفوں میں بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور پھر جب فیصلہ کن مقابلوں کا وقت آتا ہے تو قدم قدم پر اُن لوگوں کی ہمدردیاں طرح طرح سے کام آتی ہیں جو دشمنوں کے جبر کی وجہ سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے مگر دل سے اس دعوت کے حامی تھے، یہاں تک کہ آخرکار چند مٹھی بھر ہٹ دھرم دشمن ہی میدان میں رہ جاتے ہیں، جن کا ساتھ دینے والا تو درکنار ان کے پیچھے رونے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ ظلم و جور کا ماحول جہاں بھی ہو اس کے مقابلے میں حق پرستی کا علم بلند کرنے اور بلند رکھنے سے یہ تینوں نتائج لازماً رونما ہوں گے۔ اس لئے یہ تو حق کی کامیابی کا فطری راستہ ہے۔ آپ اسلامی نظام برپا کرنے کے لئے جمہوری اداروں کی مٹی پلید ہونے اور شہری آزادیاں سلب ہو جانے اور بنیادی حقوق کچل دیئے جانے کا رونا خواہ مخواہ روتے ہیں۔

(اس نشست میں صرف جماعت اسلامی کے ارکان شامل تھے۔ مرتب)

☆☆☆

قائدِ اعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، سٹوڈنٹس یونین کا وفد سیّد محترم کی قیام گاہ پر ملاقات کے لئے حاضر ہوا، جہاں سیّد مودودیؒ مہینہ بھر تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے گئے ہوئے تھے---۲۰ اپریل ۱۹۷۵ء

سوال: ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے والے مشکلات میں گرفتار ہیں، ان کے راستے میں بے پناہ رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہیں، ان رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے کام کو کیسے جاری رکھا جا سکتا ہے؟ اور کیا ان حالات میں کامیابی کی امید کی جا سکتی ہے؟

جواب: نامساعد حالات میں قرآن مجید اور سیرتِ نبویؐ سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے عزمِ صمیم کے ساتھ پیہم جدوجہد کرتے چلے جانے سے ہی بالآخر وہ حالات پیدا ہو کر رہیں گے جن کے نتیجے میں اسلامی نظام عملاً قائم ہو گا۔ جہاں تک رکاوٹوں کا تعلق ہے، تو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ رکاوٹیں ہماری حقیقی کامیابی کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہ رکاوٹیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہم حق پر ہیں اور یہی رکاوٹیں ہماری تربیت میں بھی حصہ لیتی ہیں، اگر ان رکاوٹوں کے بغیر ہی ہم اپنے مقصد میں بظاہر کامیاب ہو گئے تو ہمارے پاس اعلیٰ اخلاق کے حامل، باصلاحیت اور ایسے تربیت یافتہ کارکنان نہیں ہوں گے جو معاملات کو صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق نبھا سکیں۔ ہمارا کام رکاوٹوں سے بددل ہونا نہیں بلکہ خدا کے بتائے ہوئے راستے پر خلوصِ نیت کے ساتھ جدوجہد جاری رکھنا ہے۔ اور ہمارے نزدیک صحیح راستے پر چلتے ہوئے جان دے دینا اس سے بہتر ہے کہ غلط راستے پر چلتے ہوئے اعلیٰ ترین دنیاوی مناصب پر فائز ہو جائیں...... اسلامی نظام صرف رسول

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فلسفۂ انقلاب پر عمل کرنے سے ہی قائم ہو سکتا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ مصائب و آلام کی بھٹی سے نکلنے کے بعد ہی اسلامی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

سوال: ہم طلبہ کے درمیان اپنی دعوت کو مختصر ترین الفاظ میں کس طرح سمجھا سکتے ہیں؟

جواب: آپ انہیں سمجھائیں کہ اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے کام کرنا بحیثیت مسلمان ہم سب پر فرض ہے اور اسی میں ہماری اور اس ملک کی فلاح بھی ہے۔

سوال: کیا شرقِ اوسط میں اسلامی تحریک کی کامیابی کے امکانات ہیں؟

جواب: شرقِ اوسط کے مسلمان گزشتہ چند برسوں میں جن حالات سے گزرے ہیں ان حالات نے انہیں بیرونی نظریات اور غیر ملکی چالوں سے بیزار کر دیا ہے۔ امریکہ اور روس دونوں پر سے عربوں کا اعتماد ختم ہو چکا ہے۔ تقریباً تمام عرب ممالک میں نیشنلزم کی تحریک کمزور پڑ چکی ہے۔ علاقائی اور نسلی بنیادوں پر قومیت کے نعروں کی حقیقت ان پر کھلتی جا رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں وہاں اسلامی اتحاد کی تحریک فروغ پا رہی ہے جس کے لئے شاہ فیصل شہیدؒ نے قابلِ قدر کام کیا ہے اور گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ کسی قوم کی زندگی میں وہ دور بڑا مبارک ہوتا ہے جب وہ بھلے بُرے کے درمیان تمیز کرنے لگتی ہے۔ بعض باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرقِ اوسط میں بہر حال اس دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ مصر کے سابق صدر ناصر کی متشددانہ پالیسیوں پر اب خود مصر میں علانیہ تنقید کی جا رہی ہے۔ وہاں کی عدالتیں اخوان المسلمین سے تعلق رکھنے والوں کو رہا کر رہی ہیں۔ شرقِ اوسط میں تحریکِ اسلامی از سر نو منظم ہو رہی ہے۔ اس کی تنظیم کے بعد کامیابی کے امکانات کا جائزہ لینا مشکل نہیں رہے گا۔

سوال: دورِ جدید میں کسی ملک کا اقتصادی ڈھانچہ سود کے بغیر چلتا ہوا دکھائی

نہیں دیتا۔ حکومتوں کے اخراجات اور بینکنگ کے سارے سسٹم کی بنیاد سود پر ہے۔ خود غیر ملکی قرضے سود کی بنیاد پر ملتے ہیں۔ اس صورت میں اسلامی حکومت کا نظام کیسے چلے گا؟

جواب: حقیقت یہ ہے کہ جب اسلامی حکومت قائم ہوگی تو حکومت کے اخراجات میں اتنی کمی ہو جائے گی کہ آج اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جو حکومت خلقِ خدا کے ایک ایک پیسے کے لئے خود کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھے، وہ قوم کے خزانے سے اس قسم کا سلوک کر ہی نہیں سکتی' جیسا سلوک اس دور میں ہو رہا ہے۔ اسلامی حکومت اخراجات میں زبردست کمی کے ساتھ ساتھ سود کا لین دین بھی ختم کر دے گی۔ جس کے نتیجے میں ایک طرف تو سرمایہ داری پر کاری ضرب لگے گی اور دوسری طرف اخراجات کم ہونے سے غیر ملکی قرضوں کا بوجھ بھی ختم ہو جائے گا۔ غیر ملکی اقوام سے تجارتی لین دین کرتے وقت بہت جلد ہماری پوزیشن برابری کی سطح پر آ جائے گی اور ہم ان سے بھی یہ شرط منوا سکیں گے کہ باہمی تجارت سود کے بغیر ہوگی۔

☆☆☆

اسلامی جمعیت طالبات، راولپنڈی کے ایک مقامی اجتماع کے دوران میں---۲۱ اپریل ۱۹۷۵ء

سوال: آپ عورتوں کی آزادی کے کس حد تک قائل ہیں؟
مولانا مودودیؒ: جتنی آزادی اسلام عورتوں کو دیتا ہے۔

سوال: اسلام عورتوں کو کس حد تک آزادی دیتا ہے؟
مولانا مودودیؒ: اس کے جواب کے لئے تفسیر سورۂ نور اور سورۂ احزاب کا مطالعہ کریں۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء کی تفسیر پڑھیں۔ ان سورتوں میں عورتوں کو زندگی گزارنے کے لئے اسلام ایک مکمل سکیم دیتا ہے۔

سوال: مولانا، کیا آپ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے حق میں ہیں؟
مولانا مودودیؒ: بالکل، انتہائی اعلیٰ تعلیم کے سختی سے حق میں ہیں اور ہمارا برسوں سے یہ مطالبہ ہے کہ عورتوں کے لئے تعلیمی میدان مردوں سے علیحدہ ہونا چاہئے۔

سوال: موجودہ پاکستان کی بقاء کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟
مولانا مودودیؒ: موجودہ پاکستان کی بقاء کی یہی ایک صورت ہے کہ ٹھیک اسلام کے قوانین پر چلیں اور یہاں مکمل اسلامی نظام نافذ کریں۔

سوال: مولانا محترم اسلامی جمعیت طالبات کی دعوت کو عام کرنے کے لئے ہم کیا کچھ کر سکتے ہیں؟

مولانا مودودیؒ: آپ تمام دنیا کے بجائے صرف طالبات کے سرکل میں ہم خیال بنائیں۔ اگر طالبات کے خیالات بدل جائیں تو آئندہ نسل ٹھیک ہوگی۔ اگر نئی نسل بگڑ جائے تو جان لیجئے کہ ہمارا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔

سوال: عورتوں کی ملازمت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

مولانا مودودیؒ: عورتوں کو جب گھر سے باہر کے کاموں میں لگا دیا جائے تو سارا نظام بگڑ جاتا ہے۔ اس کی زندہ مثال مغربی ممالک ہیں۔ ان کی ابتداء بھی یہی تھی کہ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کریں اور آج ان کی انتہا دیکھیں کہ وہاں کا ہر تیسرا شخص پاگل ہے۔ انہوں نے اور بیماریوں کے علاج تو دریافت کر لئے ہیں لیکن پاگل پن کا کوئی علاج نہیں۔ سکونِ قلب وہاں سے مفقود ہو چکا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک میم صاحبہ کتا ہاتھ میں اٹھائے اور اپنے پیچھے بچے کو زنجیر سے باندھے جا رہی تھیں۔ آپ خود بتائیں کیا وہ بچہ اپنے ماں باپ کی محبت حاصل کر سکتا ہے اور پھر وہی بچہ اپنے والدین کو بڑھاپے کی حالت میں چھوڑ دیتا ہے۔ والدین مر چکے ہوتے ہیں۔ ان کی لاش خراب ہو رہی ہوتی ہے اور اولاد یہ سب کچھ جاننے کے باوجود انہیں سپرد خاک کرنا گوارا نہیں کرتی۔ عورت کو بے لگام آزادی دینے کی انتہا مغربی معاشرہ ہے۔

سوال: کیا ہمارا تعلیمی نظام مغرب کے اصولوں پر بنایا گیا ہے؟

مولانا مودودی: جی ہاں! بالکل ہمارا تعلیمی نظام مغرب کے تعلیمی نظام کی طرح بنایا گیا ہے اور ہم لوگ شروع ہی سے اس نظام کو بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میری کتاب ‘‘تعلیمات’’ کا مطالعہ کریں جس میں صحیح اسلامی نظامِ تعلیم کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ اسلام ہی مسلمانوں کو جوڑنے والی ایک طاقت ہے۔ اب حیدرآباد یونیورسٹی میں بھی وہی حالات ہیں جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں تھے، اور اس بات کو خود بھٹو صاحب نے تسلیم کیا ہے، لیکن اس کی اصلاح کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا جا رہا اگر خدانخواستہ سندھ ہمارے ہاتھ سے چلا جاتا ہے تو سمجھیں پاکستان ختم ہو گیا۔ اس کے بعد

افغانستان صوبہ سرحد پر قبضہ کرلے گا اور پنجاب اور بلوچستان کا تعلق ٹوٹ جائے گا۔

سوال: یہ جو عورتوں کو اشتہارات کی زینت بنا کر ذلیل کیا جا رہا ہے، ہم نے اس کے خلاف اخباروں کے ذریعہ کافی احتجاج کیا لیکن اس کے کوئی مثبت نتائج برآمد نہیں ہوئے؟

مولانا مودودیؒ: کوئی نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ عورتیں سمجھ رہی ہیں یہ ہماری عزت ہو رہی ہے، حالانکہ یہ ان کی تذلیل ہے۔

سوال: عورتوں کو اپنے حدود کے اندر رہتے ہوئے تبلیغ کس طرح کرنی چاہیے؟[1]

مولانا محترم: تبلیغ کے لئے کوئی مصنوعی طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل تبلیغ یہ ہے کہ انسان جس اصول اور مسلک پر ایمان رکھتا ہو اس کا نمونہ خود اپنی زندگی میں پیش کرے اور اپنے کسی قول وعمل سے اس کے خلاف شہادت نہ دے۔ اس کے ساتھ اگر آدمی زبان اور قلم سے دوسروں کو سمجھانے اور نصیحت کرنے کی کوشش کرے تو وہ مفید ہوسکتی ہے۔ انسانی فطرت کا خاصہ یہی ہے کہ وہ کسی اصول سے اُسی قدر متاثر ہوتی ہے جس قدر پختہ اس کے علمبرداروں کا اس پر ایمان ہو۔ اپنے اصول کے معاملہ میں کسی سے کوئی مصالحت نہ کیجئے۔ اگر آپ دوسروں کے اثر سے دباؤ قبول کرنے لگیں گی تو پھر دوسرے آپ کو دباتے ہی چلے جائیں گے۔ اصول پرستی اور مصالحت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اپنے اصول کے معاملہ میں ہم کسی رواداری کے قائل نہیں۔ اگر دوسروں کو ہماری حق پرستی اور راست روی پسند نہیں تو آخر ہم ان کی غلط کاری کا کیوں لحاظ کریں۔ غلط رو اور غلط کار لوگوں سے مصالحت رواداری نہیں بلکہ کمزوری اور دینی بے

---

[1] ٹونک (ہندوستان) میں خواتین کے ایک اجتماع (۱۸۔ اپریل ۱۹۴۷ء) سے خطاب کے بعد سید مودودیؒ نے خواتین کے تحریری سوالات کے یہ جواب دیئے تھے۔ خواتین کی عملی میدان میں مشکلات و مسائل کے حوالے سے یہ حصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

غیرتی ہے۔ البتہ یہ لحاظ رہے کہ اپنے اصول کی پابندی میں آپ جس قدر سخت ہوں، اسی قدر آپ کو اپنے اصولوں کے پیش کرنے اور مخالفین و معترضین کو جواب دینے میں نرم اور شیریں ہونا چاہیے۔

سوال: عورت کو شادی سے پہلے والدین اور بھائیوں کی اور شادی کے بعد شوہر اور سسرال کے بزرگوں کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔ اگر ہم اپنی زندگی کو بالکل بدل لیں اور غلط راہوں پر چلنے سے انکار کر دیں اور اصلاح کی عملاً کوشش کرنے لگیں تو ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ ہماری مزاحمت کریں۔ ایسے حالات میں ان کے ساتھ ہمیں کیا سلوک کرنا چاہیے؟ والدین اور شوہر کے حقوق پر تو اسلام نے بہت زیادہ زور دیا ہے۔

مولانا محترم: حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی کسی پر کوئی اصلی اور ذاتی حق نہیں رکھتا۔ انسان پر اور اس کائنات کی دوسری سب چیزوں پر اصل حقوق صرف اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ دوسروں کو جو حقوق بھی حاصل ہیں وہ اصلی حقوق نہیں ہیں بلکہ وہ خدا کے عطا کیے ہوئے حقوق ہیں۔ والدین، بھائی، بہن، شوہر، بیوی اور تمام دوسرے رشتہ داروں کے حقوق بس وہی اور اسی قدر ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیے ہیں۔ ان سے زیادہ وہ کوئی حق نہیں رکھتے اور ان کے یہ حقوق اللہ کے حقوق کے تحت اور اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہی ادا کیے جاسکتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی اپنے قول یا فعل سے یہ مطالبہ کرے کہ خدا کی مرضی اور اُس کا قانون خواہ کچھ ہو، تم کو میری بات ماننی پڑے گی، تو اس کی اطاعت کیا معنی، اُس سے بغاوت شرعاً لازم ہو جاتی ہے۔ اگر خدا کی نافرمانی میں آپ نے کسی کی اطاعت کی تو آپ کا ایمان ہی سرے سے مشتبہ ہو جائے گا۔

ہاں اللہ اور رسول نے والدین، شوہر اور دوسرے حق داروں کے جو حقوق مقرر کر دیے ہیں وہ ایک مسلمان عورت کو دوسری عورتوں سے زیادہ اچھی طرح ادا کرنے

چاہئیں اور اس بات کی پروا کیے بغیر ادا کرنے چاہئیں کہ دوسرا خود ان کے حقوق کو کہاں تک ادا کر رہا ہے۔ حتی الوسع کوئی بدمزگی نہ پیدا ہونے دی جائے، اپنی زبان اور جذبات پر پورا قابو رکھا جائے اور اپنے اصولوں میں پوری سختی، لیکن کلام اور اخلاق میں انتہائی نرمی برتی جائے۔

سوال: ہمیں تقریر کس طرح کرنی چاہئے تا کہ زیادہ سے زیادہ بہنیں متاثر ہوں؟

مولانا محترم: جن مستورات کو اللہ تعالیٰ نے تقریر کی صلاحیت بخشی ہے ان کو چاہئے کہ ہمارے لٹریچر کو غور سے پڑھیں۔ جب خیالات اور ذہن صاف ہو جائیں گے تو تقریر کا ڈھنگ خود بخود بنتا جائے گا۔ ''خطبات'' سے اس سلسلے میں خاص طور پر مدد لی جا سکتی ہے۔ اندازِ بیان آسان سے آسان اور صاف ہو، تا کہ کم سے کم لیاقت کا آدمی بھی آپ کی بات سمجھ سکے۔ مخاطب لوگوں کے ذہن اور خیالات کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔ ابتداء کچھ غلطیاں ہوں تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ دوسرے سارے کاموں کی طرح یہ کام بھی کرنے سے ہی آتا ہے۔

سوال: سینما جو آج کل وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے اسے دیکھنا کہاں تک جائز ہے؟ کیونکہ بعض کھیل اصلاحی اور سبق آموز بھی ہوتے ہیں۔

مولانا محترم: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سینما دیکھنا کسی حد تک بھی جائز نہیں۔ اس سے بالکل پرہیز کیا جائے۔ جن فلموں کو عام طور پر تعلیمی اور اخلاقی کہا جاتا ہے، ان میں بھی بداخلاقی کے جراثیم موجود ہوتے ہیں۔ جب تک یہ فن ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کے نزدیک اخلاق کی سرے سے کوئی قدر و قیمت ہی نہیں۔ اس وقت تک کہیں کوئی لکیر نہیں کھینچی جا سکتی کہ اس حد تک تو آپ اس سے فائدہ اٹھائیں اور فلاں مقام سے آگے نہ بڑھیں۔ میں نے آج تک نہیں دیکھا کہ سینما سے کسی نے کوئی اخلاقی سبق سیکھا ہو بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ جس شخص کے اندر کوئی اخلاقی حس موجود ہو وہ ان

مناظر کو نہیں دیکھ سکتا' اور نہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں، بھائیوں اور بہنوں کا انہیں دیکھنا گوارا کرسکتا ہے جو سینما میں عام طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ کوئی وقت لایا اور اقتدار ہمارے ہاتھ میں منتقل ہوا تو ہم انشاء اللہ دوسرے فنون کے ساتھ اس فن کو بھی مسلمان بنائیں گے اور پھر یہ دیکھنے کے قابل ہوگا۔ اگر سینما کا فی الواقع صحیح استعمال کیا جائے تو اس کے ذریعے سے عوام کو موجودہ زمانے کے عام کالجوں کی تعلیم کے برابر معلومات بہت آسانی سے دی جاسکتی ہیں۔ وقت آنے پر ہم انشاء اللہ دنیا کو یہ کرکے دکھائیں گے لیکن اس وقت جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں سینما بینی کو قطعاً ترک کردینا چاہیے۔

سوال: عورتوں کا لباس کس قسم کا ہونا چاہیے؟ برقع اوڑھ کر باہر نکلنا کس حد تک اور کن حالات میں جائز ہے؟

مولانا محترم: ''پردہ'' میں اس کی تفصیلات موجود ہیں وہاں سے دیکھ لی جائیں۔ دہلی، یوپی اور بھوپال میں عورتیں جیسے چست لباس عام طور پر پہنتی ہیں وہ جائز نہیں ہیں، خواہ وہ موٹے کپڑے کے ہی بنے ہوئے ہوں۔ ضرورت کے وقت برقع پہن کر گھر سے باہر نکلنا درست ہے' لیکن شوخ رنگ کے ریشمی برقعے جو آج کل رائج ہیں ان کا استعمال درست نہیں۔ برقعے اور چادر جسم اور زینت کو چھپانے کے لئے ہیں نہ کہ انہیں نمایاں کرنے کے لئے۔ پردے کی شرعی حدود معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک گروہ نے تو اس قدر آزادی اختیار کرلی کہ اپنی عورتوں کو نیم برہنگی کی حد تک لے گئے۔ اور دوسرے گروہ نے انہیں گھر کی چار دیواری میں اس طرح قید کردیا کہ صوبہ بہار میں مسلمانوں کے قتلِ عام کے وقت بھی ان کی عورتیں ڈولی کے بغیر گھر سے نہ نکل سکیں۔ یہ دونوں طریقے غلط ہیں۔ اس وقت تو ملک میں ایسے حالات پیدا ہورہے ہیں کہ عورتوں کو اس کے لئے تیار ہونا چاہیے کہ بوقتِ ضرورت اپنی حفاظت خود کرسکیں' ایک جگہ سے دوسری جگہ خود منتقل ہوسکیں' اور مصیبت کے وقت مردوں کے لئے بار اور رکاوٹ بننے کے بجائے ان کی قوت میں اضافہ کرنے کا موجب ہوں۔ میں تو یہ بھی

مشورہ دوں گا کہ بھائی اپنی بہنوں کو اگر ممکن ہو سکے تو گھروں کے اندر سائیکل کی سواری بھی سکھا دیں تا کہ ضرورت کے وقت اس سے کام لیا جا سکے۔

سوال: کیا عورت پردے میں رہ کر ضرورت کے وقت غیر مرد سے بات کر سکتی ہے؟

مولانا محترم: ہاں ضرورت کے وقت عورت پردے میں رہ کر دوسرے مرد سے بات کر سکتی ہے لیکن لہجے میں لوچ اور ملائمت نہیں ہونی چاہئے مبادا کہ شیطان اس کے دل میں کوئی غلط توقعات پیدا کر دے۔ حضرت عائشہؓ نے تو مردوں کو درس بھی دیا ہے۔ ایک موقع پر خطبہ بھی دیا اور فوجوں کو احکام بھی دیئے۔ دوسرے مسائل کی طرح اس میں بھی اعتدال کی راہ ہی صحیح ہے کہ عام آزادی بھی نہ ہو اور یہ بھی نہیں کہ ضرورت کے وقت بھی کسی سے بات نہ کی جائے۔

سوال: حدیث شریف میں آیا ہے کہ آنکھوں کا زنا غیر مرد کو دیکھنا ہے اور اکثر غیر مرد پر نگاہ پڑ جاتی ہے، یہ گناہ قابل معافی ہے یا نہیں؟

مولانا محترم: اس مسئلے پر ''پردہ'' میں بحث کی گئی ہے وہاں دیکھ لی جائے۔ دراصل مردوں کے عورتوں کو دیکھنے پر جو پابندی ہے، وہ پابندی عورتوں کے مردوں کو دیکھنے پر نہیں ہے۔ اگر عورت پردہ کر کے نکلے گی تو ظاہر ہے کہ اسے راستہ دیکھنا ہو گا اور اس سے اس کی نظر مردوں پر بھی پڑے گی۔ عوت کا جو دیکھنا منع اور زنا ہے وہ بُری نظر سے دیکھنا ہے۔

سوال: شادی بیاہ کے موقع پر اکثر گانا مع ساز کے گایا جاتا ہے، اور ان تقاریب میں شریک ہونا پڑتا ہے، اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ اور ساز کس قسم کا سننا جائز ہے؟

مولانا محترم: ساز بجز دف کے اور کسی قسم کا جائز نہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر اگر

لڑکیاں بالیاں آپس میں بیٹھ کر کچھ گا بجا لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی اجازت دی ہے، لیکن پیشہ ور ڈومنیوں اور طوائفوں کا گانا اور ساز کے ساتھ گانا کسی طرح جائز نہیں۔ ایسی محفلوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔ جہاں شادی میں اس کا انتظام کیا گیا ہو وہاں آپ صرف نکاح اور ولیمہ کے موقع پر شریک ہوں اور باقی تقریبات سے الگ ہو جائیں۔ آپ کا طرزِ عمل یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے عزیزوں اور بھائی بندوں کے سب جائز کاموں میں شریک ہوں گے اور ناجائز کاموں سے الگ رہیں گے۔

☆☆☆

ڈگری کالج، تھانہ (مالاکنڈ ایجنسی) صوبہ سرحد سے طلبہ کا ایک وفد لاہور آیا تو ملاقات کے لئے یہ طلبہ سیّد کے ہاں گئے --- ١١ مئی ١٩٧٥ء

س: پاکستان میں قومیتوں کے مسئلہ کو بنیاد بنا کر جس انداز میں اشتراکیت نواز اور برہمن نواز عناصر کام کر رہے ہیں، ان کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟

ج: اس ملک میں دینِ حق کی سربلندی کا جذبہ رکھنے والے طلبا کا فرض ہے کہ وہ یہاں علاقائی تعصبات کا قلع قمع کرنے اور ملک کے مختلف حصوں کے درمیان اسلام کے رشتے کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کے لئے طلبہ میں بھی کام کریں اور عوام میں بھی۔ اگر ملک کا آدھا حصہ ٹوٹ کر الگ ہو جانے کے بعد بھی ہماری آنکھیں نہ کھلیں اور ہم اسلام کے رشتے کو مستحکم کرنے سے غفلت ہی برتتے رہے تو خدانخواستہ ایک ایک کر کے ہمارے بچے کھچے ملک کے ٹکڑے بھی الگ الگ ہو کر بھارت کی گود میں چلے جائیں گے۔ ہمیں حقائق کو اپنے سامنے رکھنا چاہئے۔ ہندوستان ہم سے دس گنا بڑا ملک ہے۔ اس کا صرف ایک صوبہ (اتر پردیش) ہمارے باقی ماندہ پاکستان سے بڑا ہے۔ ہماری کل آبادی سات آٹھ کروڑ رہ گئی ہے، جبکہ بھارت ساٹھ کروڑ آبادی کا ملک ہے۔ مدراس سے لے کر مشرقی پنجاب تک اور مغربی بنگال سے لے کر گجرات کاٹھیاواڑ تک بہت وسیع علاقے اس میں شامل ہیں۔ جن میں نسل، زبان، رنگ، لباس، تہذیب، ثقافت، طرزِ زندگی، کوئی چیز بھی مشترک نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہاں کوئی پچاس پچاس قومیتوں کی بات نہیں کرتا۔ سب اس کو ایک ہی ملک بنا کر رکھنے پر متفق ہیں۔ ایک ہی دستور نے ملک کے تمام حصوں کو جمع کر رکھا ہے اور کوئی علیحدگی کی بات کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا، کیونکہ حکومت سے پہلے ملک کے عوام ہی اس کا تیا پانچا کر کے

رکھ دیں گے۔ حالانکہ ''ہندوستانیت'' کے سوا کوئی دوسری چیز ان کو جمع کرنے والی نہیں ہے۔ اب آخر یہ کیا مسخرہ پن ہے کہ اتنے بڑے ملک کے پہلو میں ہم چھ سات کروڑ کی ایک قلیل آبادی کا ملک لئے بیٹھے ہیں، اور اس میں چار چار پانچ پانچ قومیتوں کی باتیں کر رہے ہیں، حالانکہ ہمیں جمع اور متحد کرنے والی سب سے بڑی طاقت اسلام ہے۔ اگر ہم اپنی مسلم ہونے کی حیثیت کو یاد رکھیں تو صرف پاکستان کے چند کروڑ مسلمان ہی نہیں، دنیا بھر کے ستر اسی کروڑ مسلمان متحد ہو کر ایک عظیم طاقت بن سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں اپنا مسلمان ہونا تو یاد نہیں رہا، صرف بنگالی، پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچی ہونا یاد رہ گیا۔ اس حماقت کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان ''بنگلہ دیش'' بن کر ہماری آنکھوں کے سامنے جوع الارضی کے مریض ہندوستان کی خوراک بن گیا اور بارہ تیرہ کروڑ کے ایک ملک کی جگہ چھ سات کروڑ کا ایک چھوٹا سا ملک باقی رہ گیا۔ اس پر بھی ہمارے ہاں کے لوگوں کو شرم نہیں آئی اور وہ اب تک ہندوستان کے مختلف علاقوں کی الگ قومیتوں اور الگ ثقافتوں کا ڈھول پیٹے جا رہے ہیں۔ بلکہ یہاں سندھ کے بارے میں دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہ تو ہمیشہ سے ایک الگ ملک رہا ہے۔ حالانکہ یہ دعویٰ سراسر غلط اور تاریخ کے خلاف ہے۔ ہمارا کوئی صوبہ الگ الگ نہیں رہا ہے۔ اس غلط دعوے پر مزید دعووں کے ردّے پر ردّے چڑھائے جا رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ داہر سندھ کا ہیرو تھا اور محمد بن قاسم ڈاکو۔ اس کے معنیٰ صاف صاف یہ ہیں کہ یہ لوگ تیرہ سو برس کے اسلامی دور کو پھلانگ کر اپنے اس دور کی طرف پلٹنا چاہتے ہیں جب یہ ہندو تھے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ سندھ کی نجات اس میں ہے کہ یہ پاکستان سے الگ ہو کر ایک آزاد ملک بنے۔ حالانکہ اگر خدانخواستہ انگریز اکھنڈ بھارت بنا کر چلا گیا ہوتا تو یہ لوگ سندھ کے الگ ملک ہونے اور آزاد ملک بننے کی باتیں زبان سے نکالنے کی کبھی ہمت نہ کر سکتے اور ہمت کرتے تو ان کا نام ونشان مٹا کر رکھ دیا جاتا۔ ایسی ہی حماقت کی باتیں کچھ دوسرے لوگ ہمارے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی کر رہے ہیں۔ یہ اپنی شامتِ اعمال کو خود پکار پکار کر بلانا ہے۔ جہاں حال یہ ہے کہ چھ سات کروڑ کی آبادی کا پورا پاکستان اور اپنے طاقتور ہمسائے اور اس کے طاقت ور مددگاروں سے اپنی آزادی کی حفاظت کرنے میں سخت مشکل محسوس کر رہا ہے وہاں سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب

الگ الگ ملک بن کر کتنے دن زندہ رہ سکتے ہیں۔ یہ تو پکے ہوئے پھلوں کی طرح ہندوستان کی گود میں جا گریں گے اور ان کا انجام اس سے زیادہ بدتر ہوگا، جو ہندوستان کے مسلمان ۲۷ برس سے اور ”بنگلہ دیش“ کے مسلمان تین چار برس سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ملک کا ہر نوجوان، جسے آگے چل کر اس ملک کی باگیں اپنے ہاتھ میں لینی ہیں۔ اچھی طرح سمجھ لے کہ علاقائی تعصبات کا یہ کھیل جو لوگ کھیل رہے ہیں وہ اس ملک کے مستقبل کو تباہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

ان کا ہاتھ اگر ابھی اور فوراً نہ پکڑا گیا اور طوفان کا بند ٹوٹ جانے کے بعد آپ کو ہوش آیا بھی تو آپ کے لئے صرف اپنے حالِ زار پر ماتم کرنے کا موقع بھی باقی نہ رہے گا اور اس وقت دنیا میں کوئی آپ کی فریاد سننے والا بھی نہ ہوگا۔

س: موجودہ استحصالی نظام میں اجتماعی عدل کے لئے عام آدمی کو کس بنیاد پر ہم اپنے پروگرام پر متفق کر سکتے ہیں؟

ج: اجتماعی عدل کے لئے ہمیں اسلام سے باہر کسی دوسرے نظام کی رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، سوشلزم، کمیونزم یا دوسرے جو بھی ازم ہیں سب عدل کا فریب دے کر اجتماعی ظلم قائم کرتے ہیں۔ صرف اسلام ہی ہے جو حقیقی عدل قائم کرتا ہے، بشرطیکہ اس کا نام لینے والے سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ اس کے مطابق عمل کریں۔ آج تک جس غلطی کا خمیازہ ہم بھگت رہے ہیں وہ یہی دورنگی ہے جو ہمارے کارفرماؤں نے اوّل روز سے اختیار کر رکھی ہے۔ کہ اسلام کا نام تو بڑی بلند آہنگی سے لیتے ہیں مگر کام اس کے خلاف کرتے ہیں، بلکہ اب معاملہ اس سے آگے نکل گیا ہے۔ پہلے کم از کم نام تو صرف اسلام ہی کا لیا جاتا تھا مگر اب اسلام کے ساتھ سوشلزم کا کلمہ بھی بلند کیا جا رہا ہے۔ اب مخلوط خوراک جب مسلمان، ضم کریں گے تو خالص سوشلزم کی خوراک بآسانی دی جا سکے گی۔ کیونکہ شرکتِ غیر کو جب توحید پر ایمان کا دعویٰ کرنے والے لوگ گوارہ کر لیتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان کو راندۂ درگاہ کر کے اسی غیر کے حوالے کر دیا جاتا ہے جس کی شرکت کو انہوں نے قبول کر لیا ہوتا ہے۔

☆☆☆

اسلامی جمعیت طلبہ، صوبہ پنجاب، کی تربیت گاہ منعقدہ لاہور کے اختتام پر --- ۲۵ مئی ۱۹۷۵ء

سوال: ایک طرف بے حیائی، غنڈہ گردی اور اسلام کے مخالف نظریات کے طوفان اٹھ رہے ہیں، دوسری طرف ہم اسلامی انقلاب کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں جب کہ مخالف قوتیں زیادہ قوی ہیں تو اسلامی انقلاب فوری طور پر کیسے آئے گا؟

جواب: یہ آپ سے کس تے کہہ دیا کہ اسلامی انقلاب بہت جلد آ رہا ہے۔ آپ اس قسم کی غلط توقعات قائم نہ کریں۔ بے جا توقعات سے مایوسی ہوتی ہے۔ پاکستان کی تشکیل سے پہلے بھی اخلاقی حالت بگڑی ہوئی تھی۔ پاکستان کے بعد اس بگاڑ میں اور اضافہ ہوا۔ اس ساری مدت میں اصلاح کی طرف کما حقہ توجہ نہ ہوئی۔ ہمارے بس میں جو کچھ ہے وہ ہم کر رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ نوجوان نسل سے جو افراد دین کی حقیقت سے واقف ہو چکے ہیں، وہ سرگرمی کے ساتھ اصلاح کے کام کا بیڑا اٹھائیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس تمام تر مساعی کے نتیجے میں حالت کب بدلے گی۔ ایک طرف شیطان اپنا کام کر رہا ہے، دوسری طرف ہم اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ہمارے کرنے کی جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنی کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ باقی معاملات اللہ کے اختیار میں ہیں۔ لیکن ہمیں یقین واثق ہے کہ اللہ کا دین غالب ہو کر رہے گا۔

سوال: متواتر ہنگامی کاموں سے ذہن سیاسی زیادہ ہو گیا ہے، اس کو دعوت پر مرکوز کرنے کے لئے کیا کیا جائے؟

جواب: اس کے لئے سب سے پہلی تدبیر کے طور پر ذہنوں میں یہ بٹھایا جائے کہ مسلمان کی زندگی متوازن زندگی ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ ایک طرف لگ گئے تو اسی کے ہو کر رہ گئے۔ اپنے اخلاق و سیرت کو بھی درست کیجئے، اور اپنے علم کے مطابق اپنی عملی زندگی کو بھی ڈھالیے، ایک طرف اپنی اصلاح کیجئے، دوسری طرف اپنے ساتھیوں میں تبلیغ دین کریں اور ان میں دین کی منشاء کے مطابق جدوجہد کریں۔ اپنی اصلاح اور دوسروں کی اصلاح کا کام بیک وقت اور یکساں ہونا چاہئے' اگر اسے کوئی سیاسی کہتا ہے تو کہتا رہے۔ سیاست کی اصلاح بھی تو دین ہی کا کام ہے۔

سوال: کیا ہمیں قادیانیوں کے ساتھ دوستی رکھنی چاہئے' اگر وہ ہمیں کھانے پر مدعو کریں تو کیا ان کی دعوت قبول کر لینی چاہئے؟[1]

جواب: مولانا نے فرمایا "ایک آدمی کو محض کافر سمجھ لینے اور قرار دے لینے سے کام ختم نہیں ہو جاتا' ہمیں اس کی اصلاح کی فکر اور اس کو راہِ صواب کی طرف لانے کی تدبیر بھی کرنی چاہئے۔ آپ قادیانیوں سے میل جول دوستی کے لئے نہ کریں، بلکہ تبلیغِ دین کے لئے کریں، ان کو دلائل سے دین کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کریں۔ آپ ان کے مذہب کا بھی اچھی طرح سے مطالعہ کریں اور یہ معلوم کریں کہ انہوں نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے، اور وہ کس طرح مغالطہ انگیز باتیں کرتے ہیں۔ مثلاً آپ ان سے ختمِ نبوت کی بات کریں گے تو وہ کہیں گے کہ ہم بھی ختمِ نبوت کے ماننے والے ہیں، لیکن ان کا ختمِ نبوت پر ایمان بالکل مختلف قسم کا ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ جب تک مرزا پر ایمان نہ لایا جائے، ایمان مکمل نہیں ہوتا، آپ ان ساری چیزوں کا مطالعہ کر کے ان کو

---

[1] تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے دوران سید مودودیؒ کو سزائے موت سنائی گئی تھی، جو دنیا بھر میں مسلمانوں کے احتجاج کے باعث عمر قید میں تبدیل ہو گئی۔ (اس کی تفصیلات خود سید مودودیؒ کی زبانی اسی کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیے) لیکن ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت کا آغاز اسلامی جمعیت طلبہ، نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلبہ پر قادیانیوں کے حملے سے ہوا، پھر اسی تحریک کے نتیجے میں وہ غیر مسلم اقلیت قرار پائے۔ (تحریک ختم نبوت کی تفصیلات کے لئے دیکھئے "طلبہ تحریکیں" جلد دوم مؤلف: سلیم منصور خالد۔ البدر پبلی کیشنز، لاہور)

دلائل کے ساتھ سمجھائیں کہ حقیقت کیا ہے، لیکن ان کے ساتھ دوستی محض دوستی کے لئے نہیں، بلکہ تبلیغ دین کے لئے ہونی چاہئے۔"

سوال: اسلامی نظام کے لئے جماعت سازی کی ضرورت کیوں ہے؟ اس کا کام بغیر جماعت کے کیوں نہیں ہو سکتا؟

جواب: جو خرابیاں اجتماعی طور پر پھیلتی ہیں، ان کا مقابلہ انفرادی سعی سے نہیں ہو سکتا۔ ان کے مقابلے کے لئے متحدہ کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے، اجتماعی خرابیاں معاشرے کو اس طرح گھیرے میں لے لیتی ہیں کہ ایک فرد کے لئے اپنے ایمان پر قائم رہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے کے لئے اجتماع و تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر یہ دین معاشرے میں کام کرنے کے لئے آیا ہے۔ گوشوں میں بیٹھ کر کام کرنے کے لئے نہیں آیا۔

سوال: معاشرے میں ہر طرف برائی پھیل رہی ہے، جب تک معاشرے میں اصلاح نہیں ہوگی، اسلامی انقلاب نہیں آ سکتا، ہمارا معاشرہ کب سدھرے گا؟

جواب: ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی معاشرہ سو فیصد درست ہوا ہو۔ اصل چیز یہ ہے کہ معاشرے کی غالب اکثریت درست ہو جائے، جب یہ ہو جائے گا تو بگاڑ دب جائے گا۔ اصلاح کی طاقتیں قوی اور بگاڑ کی طاقتیں کمزور ہو جائیں گی۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ معاشرہ سو فیصد درست ہو گیا ہو۔ بعض لوگوں سے اس زمانے میں بھی جرائم سرزد ہوئے تھے، لیکن اس زمانے میں اصلاح اتنی ہو چکی تھی کہ جرم کرنے والے اپنے آپ کو سزا کے لئے خود پیش کرتے تھے۔ صالح معاشرے کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ اس کے مجرم ازخود تائب ہو جاتے ہیں، اور اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ غنڈے قوی اور نیک کمزور ہوں۔ اس صورتِ حال کی اصلاح کے لئے درحقیقت ہمیں کام کرنا ہے کہ نیکی

اور اصلاح کی قوتیں غالب آئیں اور فساد اور بگاڑ کی قوتیں مغلوب ہوں۔

سوال: جمعیت کے رفقاء کو اکثر اپنے گردوپیش سخت مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جب لوگ جانتے ہیں کہ جمعیت حق لے کر اٹھی ہے پھر اس کی مخالفت کیوں؟

جواب: جو فرد بھی اللہ کے دین کے لئے کام کرنے اٹھے گا' لازماً مخالفتوں کا سامنا کرے گا۔ اگر کسی کی مخالفت نہیں ہوتی تو وہ سوچے کہ وہ راہِ صواب پر چل رہا ہے یا نہیں، مخالفتوں سے گھبرانا نہیں چاہئے، مخالفتیں ہوتی ہیں تو آدمی مجاہد بنتا ہے۔ پہلوان مقابلہ کرکے ہی پہلوان بنتا ہے۔ آپ کی اسی سے تربیت ہوگی۔ آپ مقابلے میں ثابت قدم رہے تو مضبوطی پیدا ہوگی۔ اس لئے مخالفتوں سے ہرگز نہیں گھبرانا چاہئے۔

سوال: عام طلبہ اور عام لوگوں میں دین کی دعوت کس طرح پیش کی جائے؟

جواب: ہر گروہ کے لئے اس کی علمی اور اخلاقی حالت پیشِ نظر رکھ کر بات کرنی چاہئے۔ عوام سے بات کرنے سے پہلے ان کی علمی سطح دیکھ لی جائے۔ ان سے علمی باتیں نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے ان کو عام فہم انداز میں اپنی بات سمجھائیں، اسی طرح طلبہ کے جس طبقے سے آپ بات کریں ان کی ذہنی سطح کا بھی اندازہ کرلیں۔ اس طرح آپ کو ہر سطح اور ہر گروہ سے بات کرنے کے لئے صلاحیت پیدا کرنی چاہئے۔ عوام میں دعوت پیش کرنے کے لئے انہیں سب سے پہلے دین کی بنیادی باتیں سمجھائیں، توحید کیا ہے؟ پھر ان پر وہ گمراہیاں واضح کریں جو علم نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، لیکن ان کی غلطیوں پر براہِ راست چوٹ نہ کیجئے، اس سے ضد پیدا ہوگی۔ جو بات کیجئے ذہنی حالت کا جائزہ لے کر کیجئے اور حکمت کے ساتھ کیجئے۔ حکیم مریض کے مرض کی تشخیص کرکے دوا دیتا ہے۔ ہر مریض کو ایک ہی دوا نہیں دیتا۔

سوال: ہمارے بعض رفقاء مطالعہ کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں، ان کو

مطالعہ کی طرف کیسے راغب کیا جائے؟

جواب: جہاں تک ان کو سمجھانے کا تعلق ہے وہ تو آپ کر ہی رہے ہیں۔ مطالعہ پر جو چیز ایک آدمی کو مجبور کرتی ہے وہ دعوت و تبلیغ کا کام ہے۔ یہ لوگوں میں دعوت، تبلیغ کا کام کریں گے تو خود بخود مجبور ہوں گے کہ مطالعہ کریں۔ اب اس کی ضرورت کا آپ انہیں احساس دلا رہے ہیں۔ پھر وہ اس کی ضرورت از خود محسوس کرنے لگیں گے۔ جب عوام کی الجھنیں اور دعوت کے مختلف پہلوؤں پر سوالات ان کے سامنے آئیں گے تو وہ خود بخود مجبور ہوں گے کہ اپنی علمی کمزوری کو دور کرنے کے لئے مطالعہ کریں۔

سوال: تحریک کے بعض مخالفین بڑے تند مزاج ہوتے ہیں ان کو جواب کیسے دیا جائے؟

جواب: اعتراضات کا جواب دینے کے لئے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے' جو لوگ غلط باتیں کہیں آپ ان کو دلائل سے سمجھائیں۔ لیکن جو شخص جھگڑالو ثابت ہو اس سے سلام کر کے الگ ہو جائیں، مذاکرہ اس سے کرنا چاہئے جو معقولیت اور دلیل سے بات کرے اور اخلاص سے سمجھنا چاہے۔ جو محض الزام تراشی کرتا ہے، اس کے مقابلے میں ہمیں الزام تراشی نہیں کرنی چاہئے۔ ہمیں ہر بحث میں، اپنی زبان کو قابو میں رکھنا چاہئے۔ اور ہم پر یہ احساس ہر آن غالب رہنا چاہئے کہ ہمیں اپنے ہر ہر لفظ کی آخرت میں بھی جوابدہی کرنی ہے۔ جب بھی بحث کریں علم، عقل اور دلیل کے ساتھ کریں اور آپ کی زبان حدِ احتیاط سے ہرگز تجاوز نہ کرنے پائے۔

سوال: اسلامی نظامِ تعلیم کے قیام کے لئے ہمیں کن خطوط پر جدوجہد کرنی چاہئے؟

جواب: اسلامی نظامِ تعلیم، نظامِ حکومت میں تبدیلی کے بغیر نہیں آ سکتا، آپ مسلسل جدوجہد کرتے رہیے اور حکومت پر دباؤ ڈالتے رہیے کہ وہ نظامِ تعلیم کو اسلام کے خطوط پر استوار کرے، ہم جو کچھ کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اسی غلط نظامِ

تعلیم سے ایسے افراد نکال رہے ہیں جو اسلام کو دل سے چاہنے والے اور اس کے لئے کام کرنے والے ہیں۔ ہماری کوشش اسی بگڑے ہوئے ماحول سے صالح افراد تلاش کرنے کی ہے لیکن پورا نظامِ تعلیم اسلام کے خطوط پر قائم کرنا تو صرف اختیارات ہی سے ہوسکتا ہے۔

سوال: ایک سوال بڑا عجیب وغریب لیکن بڑا دردمندانہ تھا۔ وہ یہ تھا کہ ہم روس اور چین کے مسلمانوں کی دینی مدد کیسے کر سکتے ہیں؟

جواب: ہم ان کے لئے اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتے، جب تک پہلے اپنے گھر میں کچھ نہ کرلیں۔ جب یہاں صحیح اسلامی نظام قائم ہوگا تو اس کے اثرات وہاں بھی پہنچ جائیں گے۔ سب سے پہلے ہمیں اپنے گھر کی فکر کرنی چاہئے اور ان بھائیوں کے لئے دردمندانہ دعا کرتے رہنا چاہئے۔

سوال: کیا مذہب اور سیاست جدا جدا ہیں؟

جواب: ہم اس غلط فہمی کو بڑی حد تک دور کر چکے ہیں کہ مذہب اور سیاست الگ الگ ہیں۔ لیکن جو چیز مدّتوں سے ذہنوں میں جمی ہوئی ہے وہ تدریج کے ساتھ ہی صاف ہوگی۔ ہمارے نزدیک وہ سیاست لعنت ہے جو مذہب سے آزاد ہو اور وہ مذہب غیر مطلوب ہے جو انسانی زندگی پر سب سے زیادہ اثرانداز ہونے والی سیاست کی اصلاح کئے بغیر چھوڑ دیتا ہے۔ اسلام اس دوئی کو ختم کرنا چاہتا ہے اور اسلامی نظام اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتا، جب تک اس غلط تقسیم کو ختم نہ کیا جائے۔

سوال: اپنے ملک کی حالت کو دیکھ کر دل سخت رنجیدہ ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے ملک کی اصلاح کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

جواب: میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کے بڑے ہونے تک ملک کے حالات درست ہوجائیں، لیکن ہمارا کام یہ ہے کہ ہم جس کو حق سمجھتے ہیں اس کو قائم کرنے کے لئے اپنی

تمام طاقت صرف کر دیں۔ دنیا میں لوگ مکان تعمیر کرتے ہیں، زلزلہ آتا ہے، مکان گر جاتے ہیں لیکن لوگ تعمیر کے کام میں پھر سے مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہمیں صرف اپنے کام کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ جن لوگوں کے دلوں میں نورِ ایمان ہے وہ کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ اسلام کا یہ گھر کفر کا گھر بن جائے۔ وہ اس کو اسلام کا گھر قائم رکھنے کے لئے اپنی تمام توانائیاں لگا دیں گے۔

سوال: کیا اسلام ایسے راگ اور گانے کی اجازت دیتا ہے جس میں فحاشی نہ ہو؟

جواب: اگر فحاشی نہ ہو اور اس کے ساتھ مزامیر (ساز کی موسیقی) نہ ہو تو محض گانے سے اسلام منع نہیں کرتا۔ مزامیر کے ساتھ یا اس میں بُرے مضامین ہوں یا یہ کہ دونوں چیزیں جمع کر دی جائیں تو اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

سوال: اگر ایک جگہ جمعہ کی نماز ہو رہی ہو لیکن وہاں امام مشرک ہو تو کیا اس صورت میں وہاں جمعہ الگ پڑھا جائے؟

جواب: لفظ ''مشرک'' کا استعمال ہمارے ہاں جتنا سستا ہو گیا ہے، یہ اتنا ست نہیں ہے۔ لوگ بے جا زیادتیاں کر کے کسی کا نام مشرک رکھتے ہیں، کسی کا خارجی، کسی کا معتزلی اور کسی کا کچھ اور، یہ سب زیادتیاں ہیں۔ مشرک اس آدمی کو کہتے ہیں کہ جس نے شرک کو بطورِ عقیدہ اختیار کیا ہو، اور جو توحید کا قائل نہ ہو۔ جن لوگوں کو یہاں مشرک کہا جا رہا ہے وہ ان معنوں میں مشرک نہیں ہیں، اگر ان معنوں میں انہیں مشرک قرار دیا جاتا ہے تو میں ایسے لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ جب تم قرآن و حدیث سے استدلال کر کے ایک شخص کو یہ کہتے ہو کہ تمہارے عقیدے میں یہ خرابی ہے تو کیا سمجھ کر کہتے ہو؟ کیا کبھی تم نے کسی ہندو یا سکھ کو بھی قرآن و حدیث سے حوالے دے کر عقیدے کی خرابی بتانے کی کوشش کی ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم کسی کے سامنے قرآن و حدیث سے دلائل لاتے ہو تو اسے مسلمان ہی سمجھتے ہوئے لاتے ہو اور یہ سمجھتے ہوئے لاتے ہو کہ وہ

قرآن کو بھی مانتا ہے اور حدیث کو بھی، پھر تم اسے مشرک کیوں کہتے ہو؟ مشرکانہ عقائد میں مبتلا ہو جانا اور بات ہے اور مشرک ہو جانا اور چیز ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اگر کسی شخص کو آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے خیال کے مطابق وہ مشرکانہ عقائد میں مبتلا ہے تو کسی نے آپ پر یہ فرض نہیں کیا ہے کہ آپ ضرور اس کے پیچھے نماز پڑھیں۔ اگر آپ کراہت محسوس کرتے ہیں اور نہیں پڑھنا چاہتے تو نہ پڑھیے، اس صورت میں یہ شور مچانے کی کیا ضرورت ہے کہ فلاں آدمی کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ خواہ مخواہ ایک جھگڑا کھڑا کرنے کے سوا اس سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔

سوال: کیا سینما کی ملازمت جائز ہے؟

جواب: اب غالباً کل کوئی صاحب یہ سوال کریں گے کہ کیا شراب خانے کی ملازمت جائز ہے؟ کیا فرق ہے ان دونوں میں۔ سینما فواحش کا اڈہ ہے۔ اس کی ملازمت کو کیسے جائز کہا جا سکتا ہے۔

سوال: کیا بینک کی ملازمت جائز ہے؟

جواب: اس کا بھی وہی جواب ہے بلکہ بینک کی ملازمت سینما کی ملازمت سے زیادہ خراب ہے۔ سود وہ جرم ہے جس سے زیادہ بڑا جرم غالباً شرک اور قتل ہے۔

سوال: اگر کوئی جاہل بحث میں الجھائے تو حکم ہے کہ آدمی سلام کر کے گزر جائے۔ لیکن اگر وہ ضدی ہو اور پیچھا بھی کرے اور دلیل سے بات بھی نہ مانے اور بس اپنی ہانکتا جائے تو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: ”صبر کرنا چاہیے کہ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“

☆☆☆

پشاور یونیورسٹی، (کالج آف ایجوکیشن) کے طلبہ وطالبات
سیدمودودیؒ کے ہاں ملاقات کے لئے حاضر ہوئے ----- ۲۸ مئی ۱۹۷۵ء

سوال: موجودہ غیر نظریاتی نظامِ تعلیم میں ایک مسلمان استاد اپنے فرائض کس طرح ادا کرسکتا ہے؟

جواب: ایک مسلمان استاد اگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے فرض کو پہچانتا ہو تو نظامِ تعلیم خواہ کچھ بھی ہو، وہ اسلامی نہج پر طلبہ کی دینی و اخلاقی تربیت کے سلسلے میں بہت مؤثر کردار ادا کرسکتا ہے، حتیٰ کہ ایک سراسر غیر اسلامی نظام بھی اس کے مصمم ارادے کے سامنے کسی صورت رکاوٹ نہیں بن سکتا، بشرطیکہ استاد مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنی اس نازک ذمہ داری کو خوب اچھی طرح پہچانتا ہو۔

لیکن یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ اسلام کی دعوت دوسروں کے سامنے پیش کرنے سے پہلے آدمی کو خود اس کا ٹھوس مطالعہ کرنا چاہئے اور محض روایتی طور پر نہیں بلکہ شعوری طور پر اس کی حقانیت پر سچے دل سے ایمان لاکر اپنے عمل سے، اپنے عقیدے کی صداقت پختگی اور خلوص کا ثبوت دینا چاہئے۔ اس کے بعد ہی اس کی تبلیغ و دعوت مؤثر ہوسکتی ہے۔ اگر اسے اسلام کا صحیح علم نہ ہوگا تو وہ اسلام کی صحیح نمائندگی نہ کرسکے گا۔ اور اگر اس کا عمل اس کے قول کے خلاف ہوگا تو کوئی شخص بھی اس کی سچائی کا قائل نہ ہوسکے گا۔

علاوہ ازیں دوسروں کے سامنے اسلام کو پیش کرنے کا کوئی ایک ہی لگا بندھا طریقہ نہیں ہے، کہ جو ہر جگہ ہر حال میں ہر شخص کے لئے یکساں استعمال کیا جاسکتا ہو۔

یہ کام حکمت اور دانائی چاہتا ہے۔ جس طرح ایک طبیب ہر بیمار کی حالت دیکھ کر اس کے لئے علاج تجویز کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک مبلغ کو بھی اپنے مخاطب لوگوں کی صلاحیت اور ذہنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ کر ان کے سامنے دین کو ایسے طریقے سے پیش کرنا چاہئے جو ان کے لئے موزوں ترین ہو۔

آپ لوگ چونکہ مستقبل کے استاد ہیں۔ اس لئے یہ بات ذہن نشین رکھیے کہ ایک استاد تو یہ صلاحیت اپنے اندر بدرجۂ اتم رکھتا ہے کہ وہ اپنے مخاطب طلبہ کے ساتھ کس ترتیب، کس پیرائے اور کس مناسبت سے بات کرے، کیونکہ اسے طلبہ کی نفسیات کا نہ صرف علم ہوتا ہے بلکہ اس کی عملی مشق بھی ٹریننگ کے دوران کرائی جاتی ہے۔

سوال: ان پڑھ آبادی میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کو پھیلانے کے لئے کیا حکمت عملی اختیار کی جائے؟

جواب: اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ سے ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب ان پڑھ لوگ ہی تھے۔ ان میں دین تحریروں کے ذریعہ نہیں بلکہ زبانی تلقین سے پھیلایا گیا تھا۔ ایک مرتبہ جب ایک شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دین اچھی طرح سمجھ لیتا تھا تو دوسرے لوگوں کو بھی اسی طریقے سے سمجھانے کی کوشش کرتا تھا۔ ابتدائی دور میں یہ تبلیغ بھرے جلسوں میں نہیں بلکہ انفرادی ملاقاتوں میں ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ جب بہت سے افراد حق کے قائل ہوتے چلے گئے تو انہوں نے پوری پوری آبادیوں کو اس دین کا قائل کر دیا۔ آج تو ہمارا کام نسبتاً زیادہ آسان ہے کیونکہ پڑھے لکھے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے دین کو بخوبی سمجھ لیا ہے۔ اب یہ ان کا کام ہے کہ ان کے گرد و پیش جو لوگ ان پڑھ ہیں انہیں زبانی تلقین اور اپنے کیریکٹر سے ہم خیال بنائیں۔ اس مقصد کے لئے ضروری نہیں کہ جلسہ ہائے عام اور بڑے بڑے اجتماعات ہی منعقد کئے جائیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ انفرادی ملاقات اور انفرادی گفتگو ہی ہے۔

سوال: اسلام تمام قومیتوں کو ایک امت میں ضم کرتا ہے۔ کیا لسانی قومیت کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش موجود ہے؟

جواب: سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ قومیت کیا چیز ہے۔ آپ نے لسانی قومیت کا بھی ذکر کیا ہے جس کا مفہوم ہے کہ ایک زبان بولنے والے، ایک قوم ہیں ...... جبکہ اس کے نہ بولنے والے دوسری قوم ہیں۔ آپ خود ہی سوچیے کہ اسلام ایسی قومیت اور ایسی تقسیم کو تسلیم کر سکتا ہے؟ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دعوت لے کر کھڑے ہوئے تھے، عربی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی زبان تھی اور ابوجہل کی بھی زبان تھی۔ لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تھی کہ جو اللہ کو مانے وہ ہمارا ہے، جو نہیں مانتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اسی اصول کی بنیاد پر عربی بولنے والا ابولہب پرایا قرار پایا اور عربی نہ بولنے والا سلمان فارسیؓ عجمی ہونے کے باوجود اپنا بنا۔

اسلام کسی زبان کے حق کو سلب نہیں کرتا۔ آپ پشتو بولیے، سندھی بولیے، بلوچی یا بروہی بولیے، پنجابی بولیے، اپنی مادری زبان میں علم و ادب پڑھیے یا پیدا کیجئے، علوم و فنون کے چشمے بہائیے۔ اس کوئی ممانعت نہیں ہے، اسلام جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان فرق زبان کی بنیاد پر نہیں بلکہ کفر و اسلام کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔ یہ تصور ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ سندھی یا پشتو بولنے والے ایک ایک قوم ہیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم اور سندھی یا پشتو نہ بولنے والے الگ الگ قوموں سے تعلق رکھتے ہیں ...... ماضی قریب میں مشرقی پاکستان میں لسانیت کے اس جاہلانہ تصور کے نتیجہ میں فتنہ اٹھا، بنگالی بولنے والا ہندو اور مسلمان ایک قوم تصور ہونے لگا اور بنگالی نہ بولنے والا دوسری قوم۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دشمنی کی خلیج بڑھتی چلی گئی۔ پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔ اس روح فرسا سانحے کے بعد اب پوری طرح معلوم ہو جانا چاہئے کہ لسانی قومیت کیا ہوتی ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس قومیت کی دعوت دینے والا حقیقت میں اسلام کا دشمن ہے اور اس کی جڑ کاٹنے والا ہے۔ یاد رکھیے! لسانی قومیتوں کے بعد لازماً نسلی قومیتوں کا مطالبہ اٹھ سکتا ہے جس کے نتیجہ میں قومیتیں تو ہو سکتا ہے کہ مل جائیں لیکن مسلمان باہم نہ مل سکیں گے۔

☆☆☆

اسلامی جمعیت طلبہ، صوبہ پنجاب کے منتخب کارکنان کی پانچ روزہ تربیتی کانفرنس کے آخری روز---۱۲ اگست ۱۹۷۵ء

سوال: ''ہم جب سے دیکھ رہے ہیں، تحریک مسلسل کش مکش کے دور سے گزر رہی ہے، تحریکِ اسلامی کو کامیابی تک پہنچنے کے لئے ابھی کن مرحلوں سے گزرنا ہوگا؟''

جواب: تحریکِ اسلامی مسلسل مزاحمتوں کے مقابلے میں کام کرتی رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری مدّت ایک ہی مرحلہ ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ خلقِ خدا کو اسلام کے زیادہ سے زیادہ قریب لائیں۔ ہر گروہ پر یہ واضح کر دیں کہ اسلام قابلِ عمل ہے اور اس کے پاس زندگی کے ہر مسئلے کا حل موجود ہے اور لوگوں کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو کہ وہ دینِ حق کے لئے اپنی جان و مال صرف کر دیں۔ ۱۹۴۱ء سے یہی مرحلہ درپیش ہے، دوسرا مرحلہ وہ ہوگا جس میں ہم کامیابی کے قریب ہوں گے لیکن اس کے آثار ابھی صاف نہیں ہیں۔ ہم نے پوری زندگی جدوجہد میں گزار دی ہے۔ آپ بھی اس کے لئے تیار رہیے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں خدمتِ دین کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے۔

سوال: آپ طالب علم ہوتے تو آپ کس تنظیم میں شامل ہوتے؟

جواب: (مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا) ''ایک مرتبہ سرسیّد مرحوم سے بھی ایسا ہی سوال کیا گیا تھا۔ ان سے کسی نے پوچھا اگر آپ قرنِ اوّل میں ہوتے اور آپ کے سامنے خلافت کا مسئلہ پیش ہوتا تو آپ کس کے حق میں رائے

دیتے؟

سرسیّد مرحوم نے کہا، میں کسی کے حق میں رائے دینے کے بجائے اپنے حق میں رائے دیتا، اسی طرح میں طالب علم ہوتا تو میں کسی تنظیم میں شامل ہونے کے بجائے خود اپنی تنظیم کیوں نہ بنالیتا۔''

سوال: ٹیلی ویژن کے ضرر رساں اثرات سے ہر شخص آگاہ ہے۔ افسوس ہے کہ جماعت کے بعض ذمہ داروں کے ہاں بھی ٹیلی ویژن دیکھنے میں آیا ہے۔

جواب: ''میں خود بھی اس سلسلے میں پریشان ہوں۔ جب آدمی کسی بگڑے ہوئے معاشرے میں رہتا ہے تو اس کے لئے اپنے دامن کو ماحول کی آلودگی سے بچانا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ آدمی خود بچ جائے تو اولاد کو بچانا مشکل ہوتا ہے۔ اولاد سے زبردستی کی جائے تو بغاوت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس حالت میں آدمی کے لئے ایک ہی چارۂ کار ہے، وہ یہ کہ وہ اصلاح کی کوشش میں لگا رہے، سختی سے نہیں حکمت سے۔ کسی کے گھر پر ٹیلی ویژن کی چھتری دیکھ کر یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ صاحبِ خانہ اس پر خود بھی راضی ہے، اس فتنے سے بچنے کی یقیناً کوشش ہونی چاہئے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ آپ ٹیلی ویژن سے بچتے ہیں تو ریڈیو کے نغمے آپ کے کانوں میں زبردستی گھسے چلے جاتے ہیں۔''

سوال: ہمیں اب یوں دکھائی دیتا ہے گویا تحریکِ اسلامی میں اب بعض عناصر اپنے خاص مفادات لے کر داخل ہو رہے ہیں۔ ان سے اپنے آپ کو کیسے بچایا جائے؟

جواب: مفاد پرستوں سے جان بچانے کی ضرور کوشش کرنی چاہئے۔ جو لوگ تحریک کے اندر داخل ہو چکے ہیں ان کا احتساب کر کے تحریک کو ان سے پاک کیا جائے۔ اسی طرح اپنے حلقۂ حامیان پر بھی نگاہ رکھی جائے، ان کی تربیت بھی ہونی

چاہئے اور انہیں بھی ان کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی تدبیر کرنی چاہئے۔

سوال: تحریک کے اثرات پھیل رہے ہیں، لیکن تنظیم میں اتنا اضافہ نہیں ہوا، جتنا باہر کے حلقے میں اضافہ ہوا ہے۔ اب یہ باہر کا حلقہ (Outer-circle) تنظیم کی ذمہ داریاں لئے بغیر اثرانداز ہونے کی کوشش کر رہا ہے اس کا کیا کیا جائے؟

جواب: Outer-circle کے لوگ بعض اوقات سرسری طور پر دعوت کو سمجھ کر قریب آ جاتے ہیں لیکن تنظیم کی ذمہ داریوں سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اب اگر انہیں اسی ناپختہ حالت میں شاملِ تنظیم کیا جائے تو یہ ناپختگی تنظیم کے اندر پھیلے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تنظیم میں شامل کرنے سے پہلے اچھی طرح دیکھا بھالا جاتا ہے۔ باقی جہاں تک تنظیم سے باہرے سرکل کے پھیلنے کا تعلق ہے تو یہ ایک فطری عمل ہے۔ اس باہر کے سرکل میں دو قسم کے لوگ آئیں گے۔ ایک وہ جو ہمارے علم میں ہوتے ہیں، ہم انہیں جانتے ہیں۔ دوسرے وہ جو ہمارے علم میں نہیں ہوتے، لیکن یہ ہمارے خیالات سے متاثر ہو کر ہمارے قریب آ گئے، جو لوگ ہمارے خیالات سے متفق ہیں، وہ اس لحاظ سے مفید ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کامیابی دیتا ہے تو یہی لوگ ایک امدادی فوج کا کام دیتے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ ان کی ناپختگی اور معاملات سے ناتجربہ کاری کی وجہ سے ان کے کچھ نقصانات ہیں۔ ہمیں نقصان اور نفع دونوں پر نگاہ رکھنی چاہئے۔ نقصان سے بچنا چاہئے اور نفع کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے۔

سوال: بعض اوقات محسوس کیا گیا ہے کہ شیطان بڑے زور سے جاہلیت کی طرف کھینچتا ہے، اس سے بچنے کی کیا تدبیر ہے؟

جواب: ''شیطان اپنا کام نہیں چھوڑتا، آپ اپنا کام کیوں چھوڑیں۔ آپ شیطان سے لڑتے رہیے اور اس کو پچھاڑتے رہیے۔ آپ کا یہی کام ہے۔ آپ جب شیطان کا محسوس کریں تو اللہ سے پناہ مانگیں لیکن اس دعا کے ساتھ کوشش بھی ہونی چاہئے۔ وہ

دعا بالکل بے کار ہے جس میں دعا کرنے والا خود کوئی کوشش نہ کرنا چاہتا ہو۔ دعا وہی مؤثر ہوتی ہے جس میں دعا کے ساتھ کوشش بھی کی جائے۔

سوال: ''جماعت اسلامی بھارت پر پابندی کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں؟''[1]

جواب: مولانا نے فرمایا: ''مجھے بھارت کے تازہ حالات کے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں ہیں اور نہ مجھے کوئی اندازہ ہے کہ جماعت اسلامی ہند پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ جماعت اسلامی کے اثرات کو زائل نہیں کیا جا سکتا۔ مقبوضہ کشمیر، میں بھی جماعت کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اللہ کے فضل سے کامیابی نہیں ہوئی۔ بھارت میں جماعت اسلامی کے پہلے ادارے بند کئے گئے تھے اور بعد میں ان کے منتظمین کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ادارے تو واگزار کر دیئے گئے ہیں لیکن منتظمین کو نہیں چھوڑا گیا۔ کشمیر میں افراد بھی گرفتار ہیں اور ادارے بھی بند ہو چکے ہیں۔ بیرونی ذرائع سے ہمیں اطلاعات مل رہی ہیں کہ کون کون پکڑا گیا ہے اور کون کون سا ادارہ بند ہوا ہے۔ بھارت میں جماعت اسلامی اب BAN ہوئی ہے، جبکہ پاکستان کی جماعت ان مراحل سے گزر چکی ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان کو جب خلافِ قانون قرار دیا گیا تھا تو اس کا کام بھی بند نہیں ہوا تھا۔ امید ہے کہ جماعت اسلامی ہند کا کام بھی بند نہیں ہوگا اور کارکنانِ جماعت انفرادی طور پر خدا کا پیغام پہنچاتے رہیں گے کیونکہ انفرادی کام کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ اگر ایک مشن رکھنے والے کو جیل بھیج دیا جائے گا تو وہ جیل میں تبلیغ کرے گا، باہر رہے گا تو یہاں اپنے خیالات پھیلائے گا۔

''جماعت اسلامی پاکستان پر جیسے ہی پابندی اٹھی وہ فوراً بحال ہوگئی۔ امید ہے کہ ہند میں بھی جماعت اسلامی اسی طرح پابندی اٹھتے ہی بحال ہو جائے گی''۔

---

[1] جون ۱۹۷۵ء میں جماعت اسلامی ہند پر اندرا گاندھی کی حکومت نے پابندی عائد کر دی تھی، اس کی پوری قیادت کو گرفتار کر لیا تھا، جماعت کے دعوتی لٹریچر اور دفتری ریکارڈ کو سر مہر کر دیا تھا۔ یہ پابندی بعد میں مارچ ۱۹۷۷ء کو اس وقت ختم ہوئی جب مرار جی ڈیسائی کی جنتا پارٹی برسر اقتدار آئی۔

ایوب خاں کے مارشل لاء میں ایک افسر نے مجھ سے کہا کہ جو جماعتیں اتنی مدت سے ختم ہو رہی ہیں وہ کیسے زندہ ہوں گی! میں نے کہا جماعت اسلامی مارشل لاء ختم ہوتے ہی چوبیس گھنٹے میں بحال ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مارشل لاء کے خاتمے کا جونہی اعلان ہوا جماعت چوبیس گھنٹے میں بحال ہوگئی۔ جماعت اسلامی کا کام انشاء اللہ نہیں رک سکتا۔”

سوال: بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ناظم جو ہر طرح سے نظم یا کسی شعبے کا ذمہ دار ہے ایک حکم دیتا ہے مگر کارکن سمجھتا ہے کہ ناظم کا حکم صحیح نہیں ہے اور بعد میں ثابت بھی ہو جاتا ہے کہ ناظم کا حکم صحیح نہیں تھا اور کارکن کی رائے درست تھی۔ ایسے وقت میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: ”اس طرح کا اختلاف غیر معمولی نہیں ہے، لیکن نظم کا تقاضا ہے کہ کارکن کو وہی کرنا چاہیے جس کا ناظم حکم دے رہا ہے۔ اگر کارکن ناظم کے حکم کو صحیح نہیں سمجھتا یا وہ بعد میں غلط ثابت ہوتا ہے تو وہ اس کی شکایت نظمِ جماعت کو کرے لیکن ڈسپلن کا توڑنا درست نہیں ہے، ناظم اور کارکنِ کا باہم ویسا ہی تعلق ہے جیسا امام اور نمازی کا ہوتا ہے، نمازی سمجھتا ہے کہ امام سے سہو ہو گیا ہے لیکن امام نہیں سمجھتا کہ اس سے سہو ہوا ہے۔ اس حالت میں ایسا نہیں ہوتا کہ نمازی جماعت چھوڑ کر الگ ہو گیا ہو اور نہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ امام کی غلطی پر الگ ہو جاؤ۔ جماعت سے وابستہ رہنے اور ڈسپلن کی پابندی کا ہر حال میں حکم ہے۔”

☆☆☆

ادارہ تعلیم و تحقیق، پنجاب یونیورسٹی لاہور کا ایک وفد ملاقات کے لئے حاضر ہوا --- ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء

س: ہمارے دل اسلام سے دور کیوں ہوئے جا رہے ہیں؟ بحیثیت مجموعی ہمیں اسلام کے راستے پر آنے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

ج: یہ سوال کہ اسلام سے ہمارے دل کیوں دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ایک شخص کا دل کیوں دور ہوا جا رہا ہے اور دوسرا پہلو یہ کہ بحیثیت قوم اور بحیثیت جماعت یہ حالت کیوں ہو رہی ہے۔

ایک ایک شخص کے اعتبار سے تو ہر شخص کو خود اپنے دل کو ٹٹولنا چاہئے کہ کیا چیز اس کو خدا اور اس کے دین سے دور لے جا رہی ہے، درآں حالیکہ وہ اس پر ایمان کا دعویٰ رکھتا ہے۔ جو شخص اس بات کا جائزہ لے گا، اس کو محسوس ہوگا کہ پیدائشی مسلمانوں کے اندر ایک پیدائشی کمزوری موجود ہوتی ہے اور وہ یہ کہ شعوری ایمان کا احساس ان میں بڑی دیر سے اور بہت مشکل سے پیدا ہوتا ہے ورنہ عموماً اس بات پر مطمئن ہوتے ہیں کہ ہم چونکہ مسلمان گھر میں پیدا ہوئے ہیں، ہمارا نام مسلمانوں کا سا رکھا گیا ہے۔ بچپن میں ختنہ بھی کرا دیئے گئے ہیں تو تمام ضروریاتِ دین پوری ہو چکیں، لہٰذا اب ہمارے مسلمان ہونے میں کیا کسر ہے، جس کو پورا کرنے کی کوشش کریں، اسی طرح ہمارے افراد کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، حج کرنے بھی جاتے ہیں، زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔ ان کا بھی یہ حال ہے کہ وہ اسلام کی رُوح سے یا اس کے مقاصد سے آگاہ نہیں ہوتے۔ ایک فیصدی لوگوں میں بھی یہ کیفیت نہیں

پائی جاتی کہ وہ سوچ سمجھ کر ایمان لائے ہوں۔

جب ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا تھا، تو میں نے خود اس موقع پر اس بات کا اظہار کیا تھا کہ پہلے میں بھی پیدائشی مسلمان تھا۔ اب نو مسلم ہوں۔ اس لئے کہ اب سوچ سمجھ کر خدا اور اس کے رسول پر ایمان لایا ہوں...... اگر کوئی آدمی اپنی اس کمزوری کو محسوس کرے تو اس کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ شعوری طور پر ایمان لائے۔ اگر شعوری طور پر ایمان لانے اور مسلمان بننے کی کوشش کی جائے تو افراد میں سے یہ کمزوری خود بخود دور ہو جائے گی۔

باقی رہا یہ سوال کہ مسلمان بحیثیت قوم اور ملت کے کیوں اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں تو یہ تنزل صدیوں سے جاری ہے۔ اس تنزل کے بے شمار اسباب ہیں جن کے لئے اس لمحے نہ وقت ہے اور نہ میری طاقت اتنی ہے کہ پوری تفصیل میں جا سکوں۔ مختصر یہ ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم بہت بڑی حد تک اس بُعد کا ذمہ دار ہے جو ہمارے عوام و خواص اور ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے اندر دین سے پیدا ہوا ہے۔ بجائے اس کے کہ دین سے قرب پیدا ہوتا۔ ہماری دینی تعلیم کے اندر بھی کچھ نقائص ہیں جن کی وجہ سے لوگ دین کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتے۔ اس لئے کہ جہاں دین کی تعلیم کتاب الطہارت سے شروع ہو وہاں ظاہر بات ہے۔ آدمی سمجھے گا دین اوّلین مسئلہ یہ ہے کہ پانی پاک اور ناپاک کیسے ہوتا ہے حالانکہ پہلے بنیادی مسائل تو ایمانیات ہیں جن کی گفتگو کبھی آئی بھی تو تفصیل اور گہرائی میں جا کر نہیں آئی۔ اس دینی تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کی کثیر تعداد فروع میں الجھی ہوئی ہے۔ اصول کی طرف ان کی توجہ بہت کم ہے۔

جہاں تک دینوی تعلیم کا تعلق ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ وہ دین سے دور لے جانے والی ہے۔ خدا سے غافل بلکہ خدا کا منکر بنانے والی ہے۔ بڑے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس تعلیم کو پا کر بھی مسلمان رہ گئے، ورنہ حقیقت میں یہ تعلیم گاہیں مسلمانوں کی قتل گاہیں ہیں۔ اس خامی کو رفع کرنے کے لئے جو کوششیں ہم کر رہے ہیں آپ کو معلوم ہیں، اسی مقصد کے لئے آپ کی تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ قائم ہوئی ہے۔ اگر

اخلاص سے اور بڑے پیمانے پر یہ کوششیں جاری رہیں تو انشاء اللہ یہ بیماری دور ہو جائے گی۔

س: یونیورسٹی اور کالجوں میں جہاں گمراہ نظریات کے حامل اساتذہ کھل کر اپنے مکتبِ فکر کی تبلیغ کرتے ہیں تحریکِ اسلامی کے اساتذہ کھل کر حق کی حمایت کیوں نہیں کرتے؟

ج: یہ تو ان کی اپنی کمزوری ہے جس کا سوال انہیں خود اپنے آپ سے کرنا چاہئے کہ ملحد میں تو یہ بے باکی ہو اور اتنی جرأت ہو کہ وہ کھل کر اپنے نظریات کو پیش کرے اور مومن میں یہ کمزوری ہو کہ وہ کم از کم محدود ہو کر بھی اپنے خیالات پیش کرتا ہوا ڈرے۔ یہ حقیقت میں ایمان کی کمزوری کے سوا اور کچھ نہیں، اگر یہ خیال ہو کہ ہم نے کھل کر اپنے خیالات پیش کئے، طلبہ میں اسلامی جذبات جگانے کی کوشش کی اور ملحد پروفیسروں کے پھیلائے ہوئے زہر کو دور کرنے کی کوشش کی تو ہماری نوکری چلی جائے گی۔ تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان اساتذہ کا خدا پر ایمان نہیں ہے اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ رزّاق خدا ہے۔ کوئی حکومت نہیں ہے۔ میرے علم میں بکثرت ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ کے بھروسے پر نوکریاں چھوڑیں اور خدا کی راہ میں اس طرح سے چھلانگ لگائی کہ کوئی توقع نہیں تھی کہ کہاں جا کر پاؤں ٹکے گا اور جو کچھ وہ کبھی ملازمتوں میں کماتے تھے آج وہ اس سے زیادہ کما رہے ہیں۔

آپ خدا پر ایمان پیدا کیجئے، خدا پر بھروسہ کیجئے اور ان ملحدوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیجئے، ان کے زہر کو دور کیجئے اور ان کی ایک ایک خبر کی تردید کیجئے۔ انشاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ جب ایک مسلمان طالب علم کو معلوم ہو جائے گا کہ میں عقل اور علم رکھتے ہوئے بھی مسلمان رہ سکتا ہوں، تو پھر نامسلم بننے کی خواہش اس کے اندر کبھی پیدا نہ ہو گی۔ نامسلم وہ اس وقت بنتا ہے کہ جب اس کے سامنے دین کو غیر عقلی طور پر پیش کیا جاتا ہے، اور اس کے دماغ میں وہ راہ نہیں پاتا اور پیش کرنے والوں کے دلائل اس قدر پھسپھسے ہوتے ہیں کہ وہ اس سے مطمئن نہیں ہوتا، نتیجے کے طور پر مجبوراً وہ ملحد بن جاتا

ہے لیکن اگر مضبوط اور معقول دلائل کے ساتھ اس کو معلوم ہو کہ میں دلیل اور معقولیت کے ساتھ مسلمان رہ سکتا ہوں تو پھر وہ کبھی ملحد نہیں رہ سکتا۔ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ پہلے وہ کمیونسٹ ہو گئے تھے لیکن جس وقت ان کو دلیل سے معقول طریقے سے سمجھایا گیا کہ حق کیا ہے تو انہوں نے اسے قبول کیا اور وہ کمیونسٹوں کے مقابلے میں کام کرنے کے لئے پورے جوش و جذبہ سے کھڑے ہو گئے۔

س: موجودہ دور میں اساتذہ طلبہ کے ذہن اسلامی خطوط پر کیسے ڈھال سکتے ہیں جب کہ نظامِ تعلیم اسلام سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

ج: اس معاملے میں میری رائے یہ ہے کہ اگر اساتذہ صحیح معنوں میں مسلمان ہوں اور ان کے اندر اسلام کا علم بھی ہو اور اسلام پر ایمان بھی موجود ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی کیریکٹر بھی ان کے اندر پایا جاتا ہو تو ان کو پڑھانے کے لئے اگر بالکل ملحدانہ لٹریچر روس سے درآمد کر کے ہی کیوں نہ دے دیا جائے۔ وہ انشاءاللہ اپنے طلبہ کو مسلمان بنالیں گے ...... لیکن اگر اساتذہ کرام اسلام کے علم سے خالی، اسلام پر ایمان سے عاری اور اسلام پر عمل سے کورے ہوں اور ان کا کیریکٹر طلبہ پر برے اثرات ڈالنے والا ہو تو نصابِ تعلیم میں خالص قرآن و حدیث ہی کیوں نہ داخل کر دیئے جائیں۔ ایسے اساتذہ طلبہ کو بگاڑ کر چھوڑیں گے۔ کیونکہ ان کا کیریکٹر اس علم کے خلاف ہوگا جو وہ پیش کریں گے۔

آپ اگر مضبوط ایمان و کردار کے اساتذہ پیدا کر لیں۔ ایسے اساتذہ جو فیصلہ کر لیں کہ ہمیں اپنے طالب علموں کو مسلمان بنانا ہے، جن کے اندر اسلام کا فہم ہو اور ایک مسلمان کی سی حکمت موجود ہو اور ایک سچے مسلمان کا سا ایمان موجود ہو اور ان کا کیریکٹر اتنا بلند ہو کہ طلبہ ان کے کیریکٹر کی وجہ سے ان کی عزت کریں اور ان پر اعتماد کریں تو پھر آپ نصابِ تعلیم کی فکر نہ کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ سوشلسٹ اور ملحد پروفیسر کتابوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ اپنے لیکچر کتابوں سے الگ دیتے ہیں۔ تعلیم کا تمام وقت وہ طلبہ کو ملحد اور بداخلاق بنانے میں صرف کر دیتے ہیں اور اپنے کیریکٹر سے بھی ان کے اندر

بداخلاقی کے بیج بونے کی کوشش کرتے ہیں، تو آپ مقابلہ میں کیوں نہ اسلامی سیرت کو طلبہ تک منتقل کریں۔ آپ نصاب تعلیم کے اسلام سے ہم آہنگ نہ ہونے کی پروا چھوڑ دیں۔ اللہ نے چاہا تو مستقبل میں آپ سے تعلیم پا کر جو لوگ ابھریں گے وہ مسلمان بن کر ہی ابھریں گے۔

س: علی گڑھ تحریک سرکاری سرپرستی کی وجہ سے کامیاب ہوئی۔ مذہبی تحریک سرکاری مخالفت اور کچھ جدید و قدیم تعلیم یافتہ طبقے کی وجہ سے ناکام رہی۔ لیکن "تحریک دیوبند" کے مقاصد بھی وہی تھے اور وہ سرکاری سرپرستی کے بغیر اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کی مخالفت کے باوجود کامیاب ہوئی...... کیا اب سرکاری سرپرستی کے بغیر کسی جامع تعلیمی تحریک کا کوئی امکان ہے؟

ج: اصل بات یہ ہے کہ جس چیز کی بازار میں مانگ ہوتی ہے اور کھپت ہوتی ہے پیداوار (Production) اسی چیز کی کی جاتی ہے۔ اگر آپ ایسا مال Produce کرنے لگیں جس کی بازار میں کوئی کھپت نہ ہو اور جس کی قیمت بھی نہ اٹھتی ہو تو ایسا مال تیار ہو کر اپنی جگہ بے کار پڑا رہتا ہے۔ علی گڑھ کی تحریک نے جو آدمی تیار کیے تھے ان کے لئے مارکیٹ موجود تھا۔ ان کی اچھی قیمت لگی اور وہ بڑے بڑے مناصب تک پہنچے اور آج تک فوائد حاصل کر رہے ہیں، دیوبند یا دوسرے دینی مدارس میں جو لوگ تیار ہوتے ہیں ان کے لئے ایک اور مارکیٹ موجود تھا۔ بہرحال مسلمانوں میں ایک بڑی تعداد مذہب کی بھی ضرورت محسوس کرتی تھی۔ فتویٰ دینے اور دوسرے اہم امور کے لئے بھی ان کی ضرورت تھی، تو ایک مارکیٹ ان کے لئے بھی موجود تھا۔ اس لئے جو مال یہ مدارس تیار کرتے تھے، ان کی بہرحال قیمت لگتی تھی، چاہے اتنی نہیں جتنی کہ دوسرے مال کی تھی۔

لیکن "ندوہ"[1] جو بیچ کی ایک راس لے کر آیا تھا، درآں حالیکہ اس نے دونوں کی خوبیاں جمع کرنے کی پوری کوشش کی لیکن حقیقت میں اس کی مانگ کسی مارکیٹ میں نہ

---

[1] دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (ہند)

تھی۔ اس لئے وہ بجھ کر رہ گیا۔ آپ بھی اگر کوئی ایسا نظامِ تعلیم بنا کر کھڑے ہو جائیں جس کے لئے اس دنیا میں کوئی مانگ نہیں ہے تو بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو اس کی طرف توجہ بھی دیں گے، بہت کم والدین اپنے بچوں کو اس میں پڑھنے کے لئے بھیجیں گے اور جن لوگوں کو آپ تیار کر کے فارغ کریں گے ان کے لئے کام کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہو گی۔ صرف ایسے لوگ آپ تیار کر سکیں گے جو خدا کی راہ میں لڑیں، اس غرض کے لئے درس گاہیں آپ تیار کریں تو وہ مفید ہو سکتی ہیں۔ لیکن خدا کی راہ میں لڑنے کے لئے وہی لوگ تیار ہو سکتے ہیں جو اس پر تیار ہوں کہ کھانے کو اگر ملے تو بہت اچھا، نہ ملے تو فاقے کریں گے، مگر خدا کی راہ میں لڑیں گے۔ اس ارادے سے جو لوگ اللہ کی راہ میں کودیں گے، اللہ ان کو ناکام بھی نہیں کرے گا، اللہ ان کو بھوکا بھی نہیں مارے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی راہ میں اترتے وقت انہیں بہر حال اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ کرنا پڑے گا۔

...... اس مقصد کے لئے آپ کو کوئی بہت بڑی درس گاہیں قائم کرنے کی ضرورت نہیں اور بہت بڑی تعداد میں ایسے آدمی تیار کرنے کی بھی ضرورت نہیں، اگر آپ صرف چند سو آدمی تیار کر لیں جو راہِ خدا کے سرفروش ہوں، علم بھی رکھتے ہوں اور ان کا کیریکٹر بھی اسلامی ہو تو یہ بہت بڑی خدمت ہو گی۔ یہ بہت بڑی تحریک ہو گی جس کے اثرات ایک زمانہ محسوس کرے گا۔

س: پاکستان میں تحریکِ اسلامی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب تک تزکیۂ نفس کا مسئلہ طے نہ ہو جائے اصلاحِ معاشرہ کا کام نہیں ہو سکتا۔ ایک دوسری جماعت کا خیال ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کے لئے نظامِ ریاست کی تطہیر ضروری ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ جب تک نظامِ تعلیم درست نہیں ہوتا ہے تزکیۂ نفس کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے، نہ نظامِ سیاست اور اصلاحِ معاشرہ کا ...... آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ان مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والے لوگوں اور ان کے کام کو آپ دیکھئے۔

آپ خود ہی جان لیں گے کہ کس کے متعلق آپ کو کیا رائے قائم کرنی چاہئے۔ میں اتنی بات عرض کروں گا کہ تزکیۂ نفس کے بارے میں لوگوں کے خیالات بہت الجھے ہوئے ہیں ...... اس کی مثال یوں سمجھئے کہ کسی ایک آدمی کو جو تیرنا نہیں جانتا آپ پیراک بنانا چاہتے ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ آپ اسے خشکی پر لٹا کر بتائیں کہ یوں ہاتھ پاؤں مارا کرو، اس طرح تمہیں تیرنا آ جائے گا۔ اس طرح سے برسوں مشق کرنے کے باوجود جب پہلی دفعہ وہ پانی میں اترے گا، ڈوب جائے گا۔ اس لئے کہ تیرنے کی مشق تو پانی ہی میں ہو سکتی ہے، پانی سے باہر نہیں ہو سکتی ...... اسی طرح سے وہ تزکیۂ نفس جو خانقاہوں اور عزلت کے گوشوں میں حاصل ہو کسی کام کا نہیں۔ اصل تزکیۂ نفس وہ ہے جو باطل کی قوتوں کے ساتھ کشمکش اور ٹکرانے کے دوران میں ہوتا ہے۔ یہی تزکیۂ نفس مکہ معظمہ میں ہوا تھا جس کی بدولت ایک چھوٹی سی مگر ایسی زبردست جماعت تیار ہوئی تھی کہ دنیا پر چھا گئی، کیونکہ اس کا جو تزکیہ ہوا تھا وہ کش مکش کے مرحلوں میں ہوا تھا۔ اس کا ایک ایک آدمی ٹھوک بجا کر دیکھ لیا گیا تھا کہ یہ خدا کی خاطر ہر تکلیف، ہر مصیبت اور ہر اذیت کو برداشت کر سکتا ہے، یہ گھر بار بھی چھوڑ سکتا ہے، یہ پٹ بھی سکتا ہے، یہ تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا بھی جا سکتا ہے، لیکن دین کو نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ ہے وہ تزکیۂ نفس جو دنیا میں غالب آنے کے لئے درکار ہوتا ہے اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔ اور وہ تزکیۂ نفس جو خانقاہوں میں ہوتا ہے وہ لوگوں کو معتقد بنانے کے کام آتا ہے۔ اس سے اچھے پیر تیار ہو سکتے ہیں، یا گنڈے تعویذ کا کام اچھا چل سکتا ہے۔ لیکن اس طرح کے تزکیۂ نفس سے آپ چاہیں کہ دین غالب آ جائے یہ ممکن نہیں، بالکل ممکن نہیں۔

* * *

اسلامی جمعیت طالبات پاکستان، کے چھٹے سالانہ اجتماع (لاہور) کی ایک نشست --- ۱۲ جنوری ۱۹۷۶ء

میری عزیز طالبات! مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ اسلامی جمعیت طالبات کو قائم ہوئے تھوڑی مدت گزری ہے لیکن اس نے اپنے نظم کو اچھی خاصی تقویت دے دی ہے اور سرگرمی سے کام کر رہی ہے۔ ۲۸ سال قبل یہ ایک بڑا مشکل کام نظر آتا تھا۔ یونیورسٹیاں اور کالج جو انسانوں کو خدا سے دور کرنے کی تعلیم دے رہے ہیں۔ انہوں نے (ان درسگاہوں کے) انسانوں کے لئے اسلام کو ایک عجوبہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ (یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ) ان میں کس طرح مومن اور صالح لوگ تیار کئے جا سکیں گے؟

۲۸ سال قبل جب (اسلامی جمعیت طلبہ کے نام سے ان تعلیمی اداروں میں) کام شروع کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس میں اتنی برکت دی کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے نوجوان کثیر تعداد میں اسلام کے شیدائی بنے، انہوں نے اسلام کو نہ صرف سمجھا بلکہ اس کو اختیار بھی کیا۔ اسلام سے محبت کی اور آج وہ اسلام کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ اس کے بعد یہ پوری امید تھی کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں زیرِ تعلیم اگر سب طالبات کو نہیں تو اکثریت کو اسلام کے سیدھے راستے پر ضرور لایا جا سکتا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ جس طرح آپ کے دلوں میں اسلام کے لئے کشش پیدا ہوئی، اسی طرح آپ دوسری طالبات کے دلوں میں بھی اسلام کی کشش پیدا کر سکیں۔ آپ بھی اسی طرح کامیابی حاصل کریں جس طرح اسلامی جمعیت طلبہ

کامیابی حاصل کر رہی ہے۔ ان مختصر باتوں کے بعد اب میں آپ کے سوالات کے جوابات دیتا ہوں۔

> سوال: ہمارے نظام میں مرد ہی ”قوام“ کی حیثیت رکھتا ہے' عورت مکمل طور پر اس کے تابع ہوتی ہے' ایسے میں عورت اپنے گھر میں کس طرح فیصلہ کن اثر ڈال سکتی ہے؟

جواب: سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ ”قوام“ کی حیثیت سے مرد کا تعین فطری تقاضا ہے۔ خواہ کسی بھی نظام کا چھوٹے سے چھوٹا یونٹ ہی کیوں نہ ہو۔ وہاں اس وقت تک نظم و ضبط قائم نہیں ہوسکتا جب تک کسی ایک فرد کو ناظم نہ بنایا جائے۔ مغربی معاشرہ میں مرد کی یہ حیثیت ختم کر دی گئی' جس کے بعد خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر گیا۔ آج وہاں اولاد، ماں باپ کی نہیں سنتی اور نہ ہی ماں باپ کو اولاد کی فکر باقی رہ گئی ہے۔ یہ وہاں کا عملی تجربہ ہے۔ رہی یہ بات کہ ”قوام“ کی حیثیت کے لئے مرد یا عورت میں سے کون موزوں ہوگا......تو جواب یہ ہے کہ مرد ہی موزوں ترین ہے نہ کہ عورت...... کیونکہ مرد کم جذباتی ہوتا ہے، ذمہ داری کا احساس رکھتا ہے اور سوچ سمجھ کر کام کرتا ہے۔ بالعموم ایک خاندان میں نظم و ضبط اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب شوہر اور خاندان کو ذرائع و وسائل فراہم کرنے والا اس ذمہ داری کو اٹھائے۔ اہلِ مغرب میں خاندانی نظام درہم برہم ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں شوہروں کا گھروں پر اختیار قائم نہیں رہا۔ آج وہاں کے مفکرین بار بار یہ تجزیہ کر رہے ہیں کہ مغرب میں خاندانی نظام اس وقت تک بحال نہیں ہوسکتا جب تک باپ کی اتھارٹی کو قائم نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اسی چیز کو قائم کیا جو فطری تھی...... یعنی مرد کو ہی ”قوام“ بنایا۔

تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورت مکمل طور پر مرد کی تابع ہے اور عورت کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں۔ ایسا سوچنا بھی غلط ہے۔ حدیث میں ہے کہ تم میں سے ہر فرد ذمہ دار ہے اور ہر فرد جواب دہ ہے۔ اس میں مرد اور عورت دونوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بیوی گھر کی ملکہ ہے“...... کوئی گھر اس وقت تک

صحیح طور پر نہیں چل سکتا جب تک عورت کو اختیار حاصل نہ ہو اور وہ اپنی طرف سے کسی کام کی ابتداء کرنے کے اختیارات سے محروم ہو...... گھر باہمی تعاون سے ہی چلتا ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ عورتوں کو بے بس کر کے مردوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ بلکہ ان عورتوں کو فوقیت حاصل ہو سکتی ہے اور وہ مردوں پہ اپنا تاثر چھوڑ سکتی ہیں جو اعلیٰ درجہ کا اخلاق رکھتی ہوں، عمدہ صلاحیتوں کی مالک ہوں، ان کے کردار اور سیرت پر حرف نہ رکھا جا سکتا ہو۔ عورتوں کو بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ معقول بات، حکمت، عقلمندی، دلیل اور موقع کی مناسبت سے کہہ سکیں۔ یہ تجربہ کی بات ہے کہ ان صلاحیتوں کی مالک عورتوں کے ہاتھوں بگڑے ہوئے شوہر درست ہو گئے۔ اپنے اندر یہ صلاحیت، یہ اوصاف پیدا کیجئے تاکہ اس کا اثر سب پر پڑے۔ بات ایسی اور معقول کہیے کہ آپ کی بات رد نہ کی جا سکے۔ یہ بات سامنے رہنی چاہئے کہ فیصلہ کن اثر وہی شخص ڈال سکتا ہے جو عقل اور دانائی کے ساتھ معقول بات، مناسب موقع پر کہہ سکے۔

تاہم خواتین کو چاہئے کہ وہ دین کا علم حاصل کریں، اسے سمجھیں تاکہ وہ دوسروں کو دلائل کے ساتھ قائل کر سکیں' کہ اس کے بغیر ان کی دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہوں گے۔ انہیں چاہئے کہ وہ اپنی ملنے جلنے والی عورتوں ...... اولاد، شوہر، خاندان کے دیگر افراد کو قائل کریں' دین کے راستہ پر لائیں۔ خود کو بلاوجہ بے بس سمجھ کر مایوس ہونا صحیح نہیں ہے۔

سوال: مغربی تہذیب، نفس کی ترغیبات کی وجہ سے اس قدر پُرکشش ہے کہ لوگ اس کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کو کس طرح پُرکشش بنا کر پیش کیا جانا چاہئے؟

جواب: سب سے پہلے مغربی تہذیب کا تجزیہ کیجئے کہ کن ترغیبات سے متاثر ہو کر لوگ اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گی کہ اس میں اعلیٰ انسانی قدریں موجود نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو مغربی معاشرہ جس اخلاقی زوال سے آج دوچار ہے وہ نہ ہوتا۔ وہاں عریاں ناچ، عورت اور مرد کا اختلاط، مخلوط سوسائٹی، تخلیہ میں مل کر

باتیں کرنا، مردوں کو راغب کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ پُرکشش بننا وغیرہ عام ہیں۔ دراصل یہی عوامل ان کی تباہی کا موجب ہیں۔ اسی بناء پر ان کا خاندانی نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ وہاں لڑکے، لڑکیاں جلد ہی گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈ بن جاتے ہیں۔ وہاں اگر کسی لڑکی کو لڑکا Dating پر نہ بلائے تو اس کی ماں کو فکر دامنگیر ہو جاتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغربی معاشرہ کس قدر خطرناک راستے پر جا رہا ہے۔ اسی بناء پر وہاں ہر پانچ شادیوں میں سے تین' طلاق پر منتج ہوتی ہیں۔ لڑکے لڑکیاں جب تک شادی نہ ہو' ایک دوسرے کو خوشنما پہلو دکھاتے ہیں۔ جذبات مشتعل ہوتے ہیں ......تو شادی ہو جاتی ہے۔ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ چودہ چودہ پندرہ پندرہ سال کے لڑکے لڑکیاں شادیاں کر رہے ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں زیادہ سے زیادہ عمر مقرر کر کے، اس سے کم عمر کی شادیوں پر پابندی عائد کی جا رہی ہے۔ بہر حال جب گھر کی ذمہ داری سر پر پڑتی ہے تو مزاج کا فرق انہیں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں میں طبعی مناسبت موجود نہیں' اور طلاق ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں مغربی معاشرے میں کس احمق کے لئے کشش ہو سکتی ہے؟ جو ان بُرے نتائج کو نظر انداز کر دے جو یہ تہذیب پیدا کر رہی ہے۔ اسی بناء پر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ یہاں کے بگڑے ہوئے لوگوں نے جب مغربی تہذیب کے تباہ کن اثرات کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تو وہ اس سے دور ہو گئے اور سُدھر گئے۔

ایسے میں آپ کا جواب یہ نہیں ہونا چاہئے کہ آپ اسلام میں ہی ایسی کشش پیدا کرنے لگیں' بلکہ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ مغربی محققین کی کتابوں کا مطالعہ کریں' جو یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر موجودہ حالات پر قابو نہ پایا گیا تو ہم بڑی تیزی سے یونان اور روم کی تہذیبوں کی مانند تباہ ہو جائیں گے۔ اس زہریلی تہذیب کی ابتدا بے پردگی سے ہوتی ہے' جو بظاہر معصوم حرکت نظر آتی ہے۔ جب ایک غلط کام، غلط طریقے سے شروع کر دیا جائے تو وہ آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے' کیونکہ شیطان مستعد ہوتا ہے کہ بُرے کام میں لوگوں کو مبتلا کرے۔

آپ کو چاہئے کہ ان تمام ضرر رسانیوں سے نوجوان لڑکیوں کو آگاہ کریں اور انہیں بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اسلام جیسا نظام دیا ہے جس کے ذریعہ ہم ان برائیوں سے بچ سکتے ہیں۔

سوال: مخلوط تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم کارکنوں کو دین کی دعوت دینے کے لئے کیا طریقِ کار اختیار کرنا چاہئے؟

جواب: ہمارے ملک پر مخلوط تعلیم کی لعنت مسلط کر دی گئی، اسے رائج کیا گیا اور اب اسے آگے ہی بڑھایا جا رہا ہے۔ ہم نے ہمیشہ یہ مطالبہ کیا ہے کہ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دیجئے، لیکن ان کے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں الگ بنایئے۔ مغربی ممالک میں جہاں یہ نظام رائج کیا گیا' وہاں یہ نظام اپنے بُرے نتائج ظاہر کر چکا ہے۔ جب تک آپ ایسے اداروں میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہیں' وہاں آپ یہ ثابت کریں کہ آپ باعصمت، باحیا اور باعفت ہیں اور پھر...... قرآن کا بیان کیا ہوا طرزِ عمل اپنائیں...... ''اس طریقے سے دبی زبان سے بات نہ کرو کہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ تم سے کوئی غلط امید وابستہ کرنے پائے۔''

اپنے روّیہ میں لچک پیدا نہ کریں۔ اگر آپ لڑکوں کے اقدامات کی حوصلہ افزائی نہ کریں گی اور انہیں اپنے روّیہ سے ابتدا ہی میں مایوس کر دیں گی تو پھر لوگ آپ کے ساتھ احترام کا برتاؤ کریں گے۔ اس کے بعد یہ بھی جان لیجئے کہ آپ نے لڑکوں میں نہیں لڑکیوں میں کام کرنا ہے' تاکہ ان کے دل اسی طرح کُھلیں جس طرح آپ کے دل کھل چکے ہیں۔ وہ بھی اسلام کو سمجھ سکیں۔ اس کے لئے معقول روّیہ اختیار کیجئے۔...... دلیل سے کام لیجئے۔ اگر آپ نے سو میں سے ایک کو بھی اسلام کا گرویدہ کر لیا تو آپ کی عاقبت اور نجات کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ آپ اس سے مایوس نہ ہوں' تاہم یہ کوشش جاری رکھیے کہ آپ سو میں سے سو افراد کو ہی اسلام کا گرویدہ بنالیں۔

سوال: مخلوط تعلیمی اداروں میں طالبات اپنے حامی امیدواروں کی کنوینگ

(انتخابی مہم) کس طرح کریں؟

جواب: آپ اپنے حامی امیدواروں کی حمایت صرف لڑکیوں میں ہی کیا کریں یا ان لڑکوں میں جو آپ کے بھائی ہیں، رشتہ دار ہیں، گھروں میں ان پر اثر ڈالیں اور انہیں قائل کریں۔

سوال: آج نوجوانوں میں فکری انقلاب تو نظر آتا ہے، لیکن عملی انقلاب بہت قریبی لوگوں میں بھی کم دکھائی دیتا ہے۔ اس کے لئے کن ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے؟

جواب: اس وقت ہمارے معاشرہ کی جو حالت ہے، وہ بگاڑ پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ حکومت کے تمام ذرائع ابلاغ اس کام پر لگے ہوئے ہیں کہ وہ لوگوں کو اسلامی اقدار و اخلاق سے دور لے جائیں۔ انہیں اخلاقی برائیوں اور فواحش میں مبتلا کر دیں، بے دین بنائیں۔ ان حالات میں اگر آپ محسوس کرتی ہیں کہ لوگوں میں ذہنی انقلاب پیدا ہوا ہے اور وہ اسلام کو ہی حق سمجھنے لگے ہیں، تو یہ سمجھ لیجئے کہ آپ نے آدھی جنگ جیت لی۔ جب بگاڑ پیدا کرنے والی طاقتیں زور آور ہوں تو ذہنی انقلاب ...... عملی انقلاب میں آہستہ آہستہ تبدیل ہوا کرتا ہے۔ اس لئے آپ مایوس نہ ہوں۔ وہ لوگ جن کے ذہنوں میں انقلاب آیا ہے وہ انشاء اللہ جلد یا بدیر عملی انقلاب کی طرف مائل ہوں گے اور محسوس کریں گے کہ آخر کب تک وہ اس منافقت پر عمل پیرا رہیں گے کہ ایک بات کو حق تو سمجھتے رہیں، لیکن اس پر عمل نہ کریں۔

سوال: والدین بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دلاتے ہیں لیکن انہیں اپنی تعلیم کو استعمال کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ کیا اس سے تعلیم بے مقصد نہیں جاتی؟

جواب: وہ والدین جن میں اسلامی اخلاق کے احساسات موجود ہیں، وہ انہیں تعلیم دلانے کے بعد ملازمت کی شکل میں اپنی بچیوں کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کی شادی اچھی جگہ ہو جائے ...... ایسے میں ان کے لئے کام کرنے کا

بہترین مقام ان کے شوہر کا خاندان ہوگا۔ یہ بھی تعلیم کو بامقصد بنانا ہی ہے۔

...... البتہ جہاں والدین مناسب سمجھیں؛ انہیں ملازمت کی اجازت دے سکتے ہیں۔ وہ طالبات جو طبی تعلیم حاصل کریں۔ انہیں چاہئے کہ وہ زنانہ شفاخانوں میں جائیں۔ بصورتِ دیگر وہ گھروں میں کلینک قائم کر کے عورتوں کا علاج کر سکتی ہیں۔

سوال: اسلام میں جائیداد کی حد مقرر نہیں ہے۔ جماعت نے یہ حد مقرر کر دی ہے۔ کیا یہ شریعت میں ترمیم نہیں ہے؟

جواب: جس ملک میں مدت دراز سے غلط نظام رائج رہا ہو، ملکیتی نظام درہم برہم ہو چکا ہو، وہاں ایسے اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔ اسلام میں یقیناً جائز ملکیت چھیننا جائز نہیں ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہاں مغلوں کے دور میں غلط بخشیاں ہوئیں۔ جائز حقوق چھین کر غیر مستحق لوگوں کو نوازا گیا...... سکھوں کے دور میں جو کچھ ہوا وہ بھی آپ جانتی ہیں۔ انگریزوں کے دور میں ان تمام لوگوں کو جو ملک و قوم کے حامی اور وفادار تھے...... انہیں غداری کے الزامات میں سزائیں دی گئیں۔ ان کی جائیدادیں ضبط کی گئیں اور ملک و ملت سے غداریاں کرنے والوں کو زمینیں دی گئیں۔ یہ بہت ہی بگڑا ہوا نظام ہے؛ جہاں بے جا اونچ نیچ ظلم و ستم کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔

اس نظام کو درست کرنے کے لئے ...... بہت غور کرنے کے بعد عارضی طور پر یہ طریقہ تجویز کیا گیا ہے کہ انگریزوں اور سکھوں کی جانب سے مسلم قوم سے غداری کے عوض بخشی جانے والی تمام جاگیروں کو ضبط کر لیا جائے گا اور نظامِ حق قائم ہونے کے بعد صحیح طریقے سے ملکیت حاصل کرنے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔ بگڑے ہوئے حالات میں ایسی ترمیمات کرنی پڑیں گی جن سے ظلم کا خاتمہ ہو۔

سوال: کیا حج کے موقع پر پردہ ضروری نہیں ہے؟

جواب: دراصل احرام کی حالت میں چہرے کو اس طرح نہیں ڈھانپنا چاہئے کہ

کپڑا جلد کو چھوتا رہے۔ بہت سی خواتین نے اس کا یہ حل نکالا ہے کہ وہ چہرے کے آگے پنکھا رکھ لیتی ہیں کہ چہرہ چھپ جاتا ہے۔ بعض گھونگھٹ اس طرح نکال لیتی ہیں کہ چہرہ چھپ جائے اور کپڑا منہ سے نہ لگے۔ خود ازواجِ مطہراتؓ جب حج کو جاتی تھیں تو جہاں مرد نہیں ہوتے تھے وہ چہرہ کھول لیتی تھیں، جہاں مرد ہوتے وہاں چہرہ ڈھانپ لیتیں۔ مزید برآں بعض موقعے ایسے بھی ہوتے ہیں جب یہ اہتمام نہیں کیا جاتا، مثلاً طواف کے دوران اگر منہ کھلا رہے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ وہاں مہلت نہیں ملتی کہ لوگ عورتوں کو دیکھتے رہیں۔

سوال: عموماً جماعت کے ارکان اپنے گھروں میں وہ ماحول پیدا نہیں کرتے جس کے لئے وہ گھروں سے باہر کوشش کرتے ہیں، خاص طور پر اپنے بچوں کے معاملہ میں ان کا یہ روّیہ ہوتا ہے کہ گویا بادلِ نخواستہ شریعت کا کام کرنے کی اجازت دے رہے ہیں؟

جواب: یہ بات بارہا جماعت کے اجتماعات میں کہی گئی ہے کہ ارکان اپنے بچوں کی اصلاح کی طرف توجہ کریں۔ بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں، نہ کرنے میں ارکان کی کوتاہی بھی ہوسکتی ہے اور مجبوری بھی، کیونکہ کوئی شخص اس پر قادر نہیں ہوسکتا کہ وہ سب کو درست کردے۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنے بیٹے کو اور حضرت لوط علیہ السلام اپنی بیوی کو درست نہ کرسکے، بہرحال اللہ تعالیٰ ہماری مجبوریوں کو معاف کرے اور کوتاہیوں کو دور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سوال: اسلام میں تصویر کھنچوانا منع ہے؟ آپ کی تصویر اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہے؟

جواب: اس سے آپ یہ سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی مجھے گولی مار دے تو میں اسے منع کرنے کے باوجود اسے باز نہیں رکھ سکتا۔ آج تصویر کھنچوانا بھی شوٹنگ ہے، جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں تصویر کو ناجائز سمجھتا ہوں۔ باوجود روکنے کے اگر کوئی

تصویر کھینچ لے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

سوال: رات کو یہاں فلم دکھائی گئی تھی...... کیا یہ ناجائز نہیں تھی؟

جواب: آپ کو جو فلم دکھائی گئی وہ سعودی عرب کی حج کے موقع پر دستاویزی فلم تھی، جس میں حج کے مناظر تھے۔ اس میں کوئی حرج نہیں، نیز جو فلم فواحش اور گانوں سے خالی ہو اسے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔

سوال: کیا بھنویں تراشنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اگر تو یہ صورت ہو کہ بال ضرورت سے زیادہ ہی ہوں تو انہیں اکھاڑنا جائز ہے لیکن اگر اپنے آپ کو جاذبِ نظر بنانے کے لئے یہ حرکت کی جائے تو جائز نہیں ہوگا یہ تو چہرے کا مُثلہ ہے۔

آخر میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنا جائزہ لے کر دیکھتی رہیے کہ اپنا فرض کس حد تک ادا کر رہی ہیں۔ کوتاہی کو رفع کریں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ کوتاہی دور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس کے علاوہ سورۂ بقرہ کا غور سے مطالعہ کریں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ یورپ نے تمام تر ڈھول پیٹنے کے باوجود عورت کو وہ حقوق نہیں دیئے جو اسلام نے اسے دیئے ہیں۔ بلکہ مغرب نے عورت پر ظلم کیا ہے کہ اسے مرد کے برابر لاکھڑا کیا ہے، جس سے عورت مرد تو نہ بن سکی اور نہ مردوں کے سے حقوق و اختیارات حاصل کر سکی، البتہ اپنی نسوانیت کھو کر عورت کے قابلِ احترام مقام سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ اس سارے المیے کا آپ مطالعہ کریں تا کہ آپ دوسری عورتوں کو قائل کر سکیں۔

☆☆☆

شریعت کالج، محمد بن سعود یونیورسٹی (سعودی عرب) کے ۵۵ طلبہ
کا وفد اپنے دورہ پاکستان کے دوران سیدیؒ کے ہاں حاضر ہوا۔
بیشتر سوالات کے جوابات سید مودودیؒ نے عربی میں دیئے
یہاں پر عربی سے ترجمہ پیش ہے۔ ۷------فروری ۱۹۷۶ء

سوال: تعلیم کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟

جواب: ہم تعلیم کو اس نہج پر استوار کرنا چاہتے ہیں جس سے طلبہ میں ایسی صلاحیت پیدا ہو سکے، جس کی مدد سے وہ اعلائے کلمۃ الحق کی کٹھن ذمہ داریاں اٹھا سکیں۔

سوال: موجودہ دور کو دورِ جاہلیت عمومی اعتبار سے کہا جائے یا خصوصی اعتبار سے؟

جواب: اس دور کی جاہلیت، جاہلیت عمد کے درجہ میں آتی ہے۔ جان بوجھ کر نہ ماننے والے لوگ آج کے جاہلی طبقہ میں شمار کئے جا سکتے ہیں، عام لوگوں کے برعکس جاہلیت کے عمومی شکار وہ لوگ ہیں جو مغربی افکار سے متاثر ہیں یا پھر وہ مترفین جن کے نزدیک دنیا ہی سب کچھ ہے۔

سوال: مگر بعض ملکوں میں حرام کو جان بوجھ کر حلال قرار دے دیا گیا ہے۔ اسے جاہلیت کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔

جواب: بہت کم لوگ دنیا میں ایسے ہوں گے جو برائی کو اچھائی سمجھ کر اختیار کرتے ہیں، مثلاً ہمارے ہاں شراب استعمال ہوتی ہے لیکن کوئی بھی اسے حلال نہیں سمجھتا اگر کوئی سمجھتا ہے تو علانیہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہی حال دوسری ممنوعات کا ہے۔ اس لئے

میرے خیال میں اس پورے دور کو عمومی جاہلیت کے بجائے خصوصی جاہلیت کا دور کہنا ہی مناسب ہوگا۔ اس لئے کہ مسلمان معاشرے کے لوگ فاسق و فاجر تو کثرت سے ہیں لیکن کافر نہیں۔

سوال: ہمارے لئے اپنی عربی کتب تجویز فرمائیں، جن کا مطالعہ ہمارے لئے زیادہ مفید ہو؟

جواب: میری بہت سی کتب ابھی عربی میں ترجمہ نہیں ہوسکیں۔ جن کتب کا ترجمہ ہوچکا ہے، ان میں سے بہتر ہوگا اگر آپ:۔

(۱) ''دینیات''

(۲) ''خطبات''

(۳) ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں''

کا مطالعہ کریں (اس موقع پر ایک اردنی طالب علم نے بتایا کہ ''دینیات'' اردن کے سکولوں کے نصاب میں باقاعدہ پڑھائی جاتی ہے۔)

سوال: آپ نے اپنی تحریروں میں ترکی کے آخری خلیفہ عبدالحمید کی موافقت میں لکھا ہے؟

جواب: اس لئے کہ اس دور میں ان کا وجود مسلمانوں کے لئے غنیمت تھا۔

سوال: آپ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سیّد جمال الدّین کے کام کی تحسین فرماتے ہیں، جب کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کا تعلّق فری میسن سے تھا؟

مولانا نے فرمایا: جمال الدّین افغانی کے بارے میں جو کچھ میں نے لکھا ہے۔ وہ تیس سال قبل کی میری رائے تھی۔ البتہ ان کے فری میسن سے تعلّق کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔

سوال: مولانا، لوگ آپ کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟

جواب: میں مخالفت کرنے والوں کی طرف سے کیا بتا سکتا ہوں کہ وہ مخالفت کیوں کرتے ہیں۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ تحریکِ اسلامی کے مخالفین تو اقتدار حاصل کرتے رہے لیکن تحریکِ اسلامی کو کما حقہ کامیابی نہ مل سکی۔

جواب: اس لئے کہ دوسروں کے لئے اسبابِ موافقت زیادہ ہیں لیکن مسلمانوں کی امداد کرنے کے لئے کوئی حکومت تیار نہیں۔

سوال: مگر مولانا کسی حکومت کی امداد کی احتیاج کیوں ہے؟

جواب: حضور علیہ السلام نے خود ایسی مدد چاہی۔

رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۔

پروردگار! مجھ کو جہاں بھی تو لے جا، سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔

سوال: ہمیں کس طرح امداد حاصل کرنی چاہئے؟

جواب: ہمیں سائنس و ٹیکنالوجی میں تعاون کی ضرورت ہے، لیکن ہمیں اس طرح کا تعاون حاصل کرنا چاہئے جس سے ہم خود کفالت کی راہ پر گامزن ہوں۔

(پروفیسر اویس صاحب نے فرمایا، کم از کم ہم یہ تعاون تو حاصل کر سکتے ہیں کہ دنیا کی حکومتیں مل کر ہمارے لئے ایسی فضا پیدا کر دیں جس طرح اسرائیلی ریاست کے قیام کے لئے استعماریوں نے کی تھی۔)

اویس صاحب کے سوال کے ساتھ ہی ایک صاحب بولے، مگر یہودی تو خود اتنی قوت میں ہیں کہ وہ پوری طرح امریکہ پر حاوی و قابض ہیں۔

جواب: اتحادِ باہمی اور مسلم اخوت کے ذریعے ہم بھی وہی نتائج حاصل کر سکتے ہیں جو یہودیوں نے اپنے قومی مقاصد کے لئے متحد ہو کر حاصل کئے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ آپ کے اتحاد میں وہ قوت موجود ہے کہ آپ کے دشمن اس کے مقابلے میں بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جائیں۔ کیونکہ آپ کے اتحاد پر خدا کا ہاتھ ہے۔

سوال: ہم اسلام کے نفاذ کا کس قرن میں انتظار کریں؟

(مولانا اور میاں صاحب دونوں نے بیک وقت جواب دیا۔ میاں صاحب نے اردو میں اور مولانا نے عربی میں)

مولانا محترم نے فرمایا: جس قرن میں آپ نے اس کام کے لئے جدوجہد کی۔

میاں صاحب: یا جس قرن کے لوگ مطلوبہ جدوجہد کریں گے۔

سوال: جس وقت ۱۹۴۱ء میں آپ نے جماعت اسلامی قائم کی، کیا اس وقت آپ کا حسن البناء شہید یا ان کی تحریک سے کوئی تعارف تھا؟

جواب: ہمیں ان کے بارے میں کوئی معلومات نہیں تھیں البتہ اس وقت ان کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔

سوال: آپ کے اور ان کے مقاصد و طریقِ کار میں کیا فرق ہے؟

جواب: ہم دونوں کی منزل اور نصب العین ایک ہے' البتہ طریقِ کار اور اسلوب میں فرق ہو سکتا ہے۔

سوال: اخوان میں اب پہلی سی یکجہتی نہیں رہی ہے۔ کیا اس سلسلے میں ان کی کوئی مدد کی جا سکتی ہے؟

جواب: مختلف بلادِ اسلامیہ میں بلاشبہ اخوان کی کوششیں متحد نہیں ہیں اور ان کے درمیان یکجہتی بہت ضروری ہے۔ جب میں صحت مند تھا تو اپنی مقدور بھر کوشش کرتا رہا کہ وہ متحد ہو جائیں' لیکن اب کمزوری صحت کی وجہ سے میں زیادہ مدد نہیں کرسکتا۔

سوال: مختلف بلادِ اسلامیہ میں اسلامی تحریکوں کی ناکامی کا کیا سبب ہے؟

جواب: مختلف مقامات پر احوال وظروف مختلف ہیں لیکن ایک بات مشترک ہے کہ شیاطینِ انس وجن ہر جگہ مزاحم ہیں۔ اور کئی سال پہلے مجھ سے یہ سوال پوچھا گیا تھا تو میں نے جواب دیا تھا کہ ہمارے ہاں کا شیطان آپ کے شیاطین سے چھوٹا ہے۔ (اس پر پوری مجلس کشتِ زعفران بن گئی)

سوال: جماعت اسلامی کے ممبران کی تعداد کتنی ہے؟

جواب: مولانا نے میاں صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ''یہ سوال بہتر ہوگا کہ آپ امیرِ جماعت سے پوچھیں۔''

میاں صاحب نے فرمایا: جماعت کے رفقاء کئی درجوں میں منقسم ہیں۔ باقاعدہ ارکان، متفقین، مؤیدین ومتاثرین۔ باقاعدہ ارکان کی تعداد ۳۳۰۰ کے لگ بھگ ہے جبکہ متفقین کی درج شدہ تعداد ۱۳۰۰۰۰ کے قریب ہے۔ مؤیدین اس کے علاوہ ہیں۔[1]

مولانا نے فرمایا: مؤیدین ومتاثرین کی صحیح تعداد خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

سوال: اتنی تھوڑی تعداد کی کیا وجہ ہے؟

جواب: قلیل جماعت بھی اگر منظم ہو تو ملک کے لاکھوں کروڑوں عوام کو اپنا ہم نوا بنا سکتی ہے، لیکن بہت بڑی غیر منظم اور منتشر جماعت بھی بے کار ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ چین کی کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ ارکان اور ملک کی آبادی میں ایک فی لاکھ کا تناسب بھی موجود نہیں۔

سوال: روس اور امریکہ کے بارے میں کچھ بتایئے؟

جواب: ویت نام میں امریکہ کی ناکامی کے بعد روس اور امریکہ میں مفادات کے سلسلے میں ایک خاموش معاہدہ طے پا گیا ہے، اب انہوں نے اپنے زیر دست ممالک کی تقسیم کر لی ہے۔

---

[1] یہ فروری ۱۹۷۶ء کی بات ہے، جب کہ ۱۹۹۱ء میں ارکان جماعت کی تعداد ۶۷۰۰ ہے۔

سوال: عیسائی اور دیگر مذاہب کے ثقافتی اور تہذیبی حملوں نے اسلام اور مسلمانوں پر کیا اثرات مرتب کیے؟

جواب: انگریزی سامراج نے اپنے پیچھے ہمارے ممالک میں اپنی معنوی اولاد کو چھوڑ دیا۔ یہ لوگ اسلام کے بارے میں احساس کمتری بلکہ مرعوبیت کا شکار ہیں۔ چنانچہ عیسائی تو اپنے مذہبی رہنما کو Father جیسے القاب سے یاد کرتا ہے۔ لیکن ہم مذہبی پیشواؤں کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔

سوال: جن وجوہات و اسباب کی بناء پر اخوان ناکام ہوئے کیا آپ ان کی نشاندہی فرمائیں گے؟

جواب: میں اسلامی تحریکات پر تنقید و تنقیص سے اجتناب کرتا ہوں۔

سوال: حضور علیہ السلام نے احوال و ظروف کی بناء پر مختلف انداز سے کام کیا۔ مکی زندگی میں مخالفتوں کے مقابلے میں صبر سے کام لیا، لیکن مدنی دور میں کفار سے رزم آزما ہوئے اور بھرپور مقابلہ کیا، آپ کی دعوت اور تحریک کس دور میں ہے مکی میں یا مدنی میں؟

جواب: ہم نہ مکی دور میں ہیں نہ مدنی دور میں، دعا کریں کہ ہم بھی اسی نقشۂ کار کو اپنا سکیں۔

سوال: آپ کی تصنیفی سرگرمیوں کا کیا حال ہے؟

جواب: امکانی حد تک جاری ہیں۔ آج کل سیرت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ترتیب و تدوین کا کام کر رہا ہوں۔

سوال: تربیت فرد کی ہونی چاہئے یا جماعت کی؟

جواب: دونوں کی، اس لئے کہ فرد کی تربیت کے بغیر تنظیم کا قیام ہی نہیں ہو سکتا اور

تنظیم کی تربیت کے بغیر اجتماعی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

سوال: جماعت کے قیام کو آپ کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟

جواب: اس لئے کہ قیامِ جماعت کے بغیر اقامتِ دین ممکن نہیں۔

سوال: جماعت اسلامی علیحدگی پسند تحریکوں کے بارے میں کیا خیال رکھتی ہے؟

جواب: ہم علیحدگی پسندوں کے ہر حال میں مخالف ہیں اور ایسی عصبیتوں اور تحریکوں کی حتیٰ الامکان مزاحمت کر رہے ہیں۔

سوال: مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد بھی کیا پاکستان میں علیحدگی پسندی کے رجحانات موجود ہیں؟

جواب: جی ہاں، سندھی، بلوچی، پٹھان اور پنجابی کے عنوان سے عصبیتوں کو جگانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

آخر میں طلبہ کی جانب سے نصیحت کے کلمات کی درخواست کی گئی۔

مولانا نے فرمایا:

مجھے نہایت مسرّت ہوئی کہ آپ لوگ پاکستان آئے۔ اس طرح کے وفود کے باہمی تبادلے تعلقات کی مضبوطی کا موجب بنتے ہیں۔ مجھے اس بات سے بھی خوشی ہوئی کہ آپ نے میری عربی کتب کا مطالعہ کیا ہے۔

میری دلی تمنا ہے کہ بلادِ اسلامیہ عموماً اور مملکت سعودیہ خصوصاً نہ صرف خارجی فکری نفوذ سے محفوظ رہے بلکہ جدید جاہلی ثقافتی رجحانات سے بھی محفوظ رہے۔ اس لئے کہ آپ کا ملک اسلام کا مرکز ہے۔ اگر وہاں یہ ثقافتی اور فکری انتشار پہنچ جاتا ہے تو اس کے اثرات پورے عالمِ اسلام میں پہنچیں گے۔ حج کے موقع پر ساری دنیا سے مسلمان آتے ہیں۔ ایسا اجتماع دنیا میں کہیں نہیں ہوتا۔ اگر خدانخواستہ دین سے عاری فکر و ثقافت

یہاں نفوذ کرتی ہے تو پوری دنیا کے مسلمان اسے دیکھیں گے اور اس سے اثر لیں گے یا سوءِ ظن میں مبتلا ہوں گے اور یہ دونوں باتیں اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ہرگز مفید نہیں ہیں۔ اس لئے آپ لوگ جو علومِ دینیہ حاصل کر رہے ہیں، کوشش کیجئے کہ آپ کی مملکت ایک صحیح دینی مملکت کی حیثیت سے باقی رہے...... آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو صحیح علم حاصل کرنے، اسے سمجھنے اور دوسروں تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

ریاض یونیورسٹی (سعودی عرب) کے طلبہ کا ایک ۲۴ رکنی وفد
سید مودودیؒ کی رہائش گاہ پر ملاقات کی غرض سے آیا، وہاں پر
سوال و جواب کی یہ محفل ہوئی ---- ۲۹ فروری ۱۹۷۶ء

سوال: کیا جماعت اسلامی صرف پاکستان میں قائم ہے یا دیگر ممالک میں بھی جماعت اسلامی کی سرگرمیاں ہیں؟

جواب: جماعت اسلامی کا زیادہ تر کام تو پاکستان ہی میں ہے لیکن ہندوستان، کشمیر، بنگلہ دیش اور سیلون میں بھی جماعت اسلامی کے نام سے جماعتیں قائم ہیں، ان کا ہمارے ساتھ کوئی تنظیمی تعلق نہیں، لیکن ان کے افکار و نظریات بھی وہی ہیں جو پاکستان میں جماعت اسلامی کے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کے کئی دوسرے ملکوں میں ہماری دعوت، ہماری کتابوں اور لٹریچر کی صورت میں پہنچ رہی ہے اور ہمارے کارکن بھی موجود ہیں لیکن وہاں جماعت اسلامی قائم نہیں ہے۔

سوال: اس وقت اسلام کو فکری اور عسکری اعتبار سے جو زبردست چیلنج درپیش ہے، آپ کے خیال میں اس کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو مستقبل میں کیا لائحۂ عمل اختیار کرنا چاہئے؟

جواب: اگر مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہوں تو وہ نہ صرف بیرونی طاقتوں کے

فکری تسلط سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتے ہیں بلکہ اپنے افکار سے دنیا کو متاثر بھی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر مسلمان واقعی مسلمان بن جائیں تو اپنے سے دس گنا بڑی طاقت سے لڑ کر اسے شکست بھی دے سکتے ہیں۔

سوال: اس وقت دنیا طاقت کے مختلف کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے۔ مذہب کے خلاف زبردست سیلاب ہے، مسلمان باہمی کشمکش اور انتشار سے دوچار ہیں اور افکار و نظریات کا فساد ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے، اس صورتِ حال میں مسلمان ممالک ایسی خارجہ پالیسی کس طرح مرتب کر سکتے ہیں جس پر اسلامی رنگ غالب ہو؟

جواب: میرے نزدیک سب سے مقدم یہ ہے کہ جتنے مسلمان ممالک ہیں ان کا نظامِ حکومت اسلامی ہو۔ اگر دنیا کے چالیس مسلمان ملک صحیح معنوں میں اسلامی ملک بن جائیں تو وہ بجائے خود ایک عظیم بلاک اور عظیم طاقت بن سکتے ہیں۔

آپ کے پاس دولت کی کمی نہیں، آپ کے پاس وسائل کی کمی نہیں، آپ کے پاس دماغوں کی کمی بھی نہیں، آپ ایک ناقابلِ تسخیر قوت بن سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ اسلام کے سچے پیروکار بن جائیں۔

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرآنِ کریم اور سائنسی نظریات میں تعارض ہے۔ لیکن تعارض کے اس نظریے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود غلطیوں پر مشتمل ہے، آپ کا اِس ضمن میں کیا خیال ہے؟

جواب: جس حد تک میں نے مطالعہ کیا ہے، میرے علم میں آج تک کوئی مثال ایسی نہیں آئی ہے کہ جس سے مجھے قرآنِ کریم اور سائنس کے مابین تعارض محسوس ہوا ہو۔ اگر تعارض ہے تو وہ سائنس کے نظریات سے ہو سکتا ہے۔ حقائق Facts کا اسلام سے کوئی تعارض نہیں ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ سائنس کے نام پر جو نظریہ قائم کیا

گیا ہو وہ واقعی حقیقت بھی ہو اس لئے کہ میرے علم میں ایسے سائنسی نظریات آئے ہیں کہ جو پہلے درست سمجھے جا رہے تھے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ غلط تھے، اور یہ عین ممکن ہے کہ جو سائنسی نظریات آج حرف آخر سمجھے جا رہے ہیں وہ کل غلط ثابت ہو جائیں۔

آج کل کے زمانے میں بعض مفسرین کا یہ خیال ہے کہ قرآنِ پاک کی تعبیر وتفسیر سائنسی نظریات کے مطابق ہو اور سائنسی نظریات کا یہ حال ہے کہ وہ ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ آج ایک نظریہ ہے تو کل دوسرا، چنانچہ اس طرح قرآن کی تعبیر وتفسیر میں غلط چیزیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس لئے میں ایسے تمام لوگوں کو غلطی پر سمجھتا ہوں جو قرآن مجید کو آج کل کے یا کسی زمانے کے نظریات پر ڈھالتے ہیں۔ قرآن جس چیز کو جس انداز سے بیان کرتا ہے اسے اسی طرح بیان کرنا چاہئے۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ قیامت تک قرآن کی پیش کردہ کسی حقیقت کی کسی سائنسی نظریے سے تردید نہیں کی جا سکے گی۔

سوال: معلوم ہوا ہے کہ آپ سیرتِ نبویؐ پر کتاب لکھ رہے ہیں اور اس کی دو جلدیں شائع بھی ہو چکی ہیں، کیا آپ بتائیں گے کہ سیرت نگاری میں آپ کا اسلوب کیا ہے؟

جواب: دراصل معاملہ یہ ہے کہ آج تک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو مقالہ یا مضمون لکھا، میرے دو رفقاء[1] نے ان سب کو یک جا مرتب کر دیا ہے۔ میں نے جب اس کو دیکھا تو مجھے افسوس ہوا کہ اس کے اندر ربط نہیں ہے۔ اس لئے کہ مختلف مضامین، مختلف اوقات اور مختلف حالات میں لکھے گئے تھے۔ چنانچہ میں ان میں ربط پیدا کرنے اور مختلف حصوں کے درمیان خلا کو بھر کر اسے ایک مسلسل کتاب بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اس کتاب کی تالیف سے میرا مقصد یہ ہے کہ جس طرح میں نے قرآن کی تفسیر

---

[1] مراد ہیں شیخ الحدیث عبدالوکیل علوی صاحب اور نعیم صدیقی صاحب

میں یہ دکھایا ہے کہ یہ ایک تحریکی کتاب ہے، اسی طرح اب میں سیرت میں دکھانا چاہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک تحریک کے قائد کی ہے اور ان کی سیرت ایک تحریک کے قائد کی سیرت ہے۔

سوال: آپ نے اب تک کس قدر کتابیں لکھی ہیں؟

جواب: میں نے کیا لکھا، کتنا لکھا، یہ آپ کو اس لئے نہیں بتا سکتا کہ میں نے کبھی اس کا حساب نہیں رکھا۔

☆☆☆

زرعی یونیورسٹی، فیصل آباد کے طلبہ کی سیّد مودودیؒ سے ایک ملاقات---۴ مارچ ۱۹۷۶ء

ایک طالب علم نے اپنے ساتھیوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا:

''یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج ہمیں مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا ہے۔ اس نادر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ مولانا ہمیں اپنے قیمتی خیالات سے نوازیں گے اور ہمیں کچھ نصیحتیں فرمائیں گے۔''

مولانا نے فرمایا:

''مجھے خوشی ہے کہ آپ یہاں تشریف لائے ہیں۔ میں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے آپ کے اندر اسلامی جذبہ پیدا کیا...... میں اس وقت کوئی تقریر تو نہیں کرسکوں گا۔ میری حالت بھی ایسی نہیں کہ میں زیادہ بول سکوں۔ ہاں آپ اگر کچھ پوچھنا چاہیں تو بلا تکلف پوچھیں، جو چاہیں۔''

طلباء کا پہلا سوال تھا:

''مولانا! ہمیں بتایئے کہ ہم اسلام کی خدمت کے لئے کیا کرسکتے ہیں؟''

مولانا نے فرمایا:

''آپ اپنی زندگیوں کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں...... اگر آپ اسلام کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں تو یہ سب سے پہلا کام ہے جو آپ کو کرنا چاہئے۔ آپ اپنی زندگیوں کو جتنا بھی اسلام کے قریب لاسکتے ہیں، لائیں...... دوسرے

یہ کہ یہاں اسلام کے خلاف جو کچھ پھیل رہا ہے اس سے بچیں، اسلام کے خلاف ہر چیز سے پرہیز کریں...... اور آخری چیز یہ ہے کہ اپنے اندر کردار اور ایمان کی اتنی قوت پیدا کریں کہ خلقِ خدا کی اصلاح کر سکیں، اور اگر کبھی اسلام اور غیر اسلام کا معرکہ برپا ہو تو اس میں آپ اپنی جان، مال، سب کچھ قربان کر سکیں۔ یہ کام ہر ایک کے بس کا نہیں ہوتا، صرف وہی کر سکتا ہے جسے خدا توفیق دے...... آپ اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگیں اور اپنے آپ کو اس کے لئے تیار بھی کریں۔''

ایک طالب علم کا سوال تھا:

''ہمارے ملک میں بہت انتشار ہے۔ ملک میں بہت سی تنظیمیں ہیں جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آ گئی ہیں۔ ان کے درمیان تمیز کرنا بہت مشکل ہے کہ کون سی مخلص ہے اور کون سی غیر مخلص...... ہمیں کوئی گُر بتائیں جس کے ذریعے ہم جان سکیں کہ کون سی تنظیم ٹھیک ہے۔ اب تو خود حکمران بھی اسلام کا نام لینے لگے ہیں؟''

مولانا نے فرمایا:

''اسے سمجھنے کی صورت یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو ان کے طرزِ عمل کے لحاظ سے جانچا جائے، جو اپنے آپ کو اسلام کا دلدادہ اور اس کا علمبردار کہتے ہیں اور خود کو اسلام کا خادم بنا کر پیش کرتے ہیں۔ آپ ان کے طرزِ عمل کو دیکھئے۔ اگر ان کا طرزِ عمل اسلام کے مطابق ہے تو ٹھیک ہے۔ اور اگر خلاف ہے تو پھر آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اسلام صرف گفتار کا مذہب نہیں بلکہ کردار اور عمل کا دین ہے۔ آپ صرف آدمی کے الفاظ پر نہ جائیں، بلکہ یہ دیکھیں کہ اس کا عمل کیا ہے۔ اگر آپ افراد اور جماعتوں کو اس نظر سے دیکھیں گے تو پہچاننے میں دقت نہ ہو گی۔''

اسی سے منسلک ایک سوال یہ کیا گیا:

''طلبہ کی بہت سی تنظیمیں ہیں اور وہ سب اسلام کا نام لیتی ہیں...... سوال یہ ہے کہ طلبہ کس کا ساتھ دیں؟''

مولانا نے فرمایا:

’’طلبہ کے میدان میں تو اس چیز کو سمجھنا اور بھی زیادہ آسان ہے۔ سب سے پہلے آپ یہ دیکھیں کہ طلبہ کی کون سی تنظیم ہے جس نے برسوں پہلے، جبکہ ملک کا نظامِ تعلیم خالصاً انگریزوں کے دیئے ہوئے سسٹم کے مطابق چلایا جا رہا تھا، طلبہ میں اسلامی اخلاق پیدا کرنے کی فکری اور عملاً طلباء میں .... اسلام کے لئے ایک لگن پیدا کرکے دکھا دی اور ثابت کر دیا کہ اس ملک کے طلبا کا وزن کسی سیکولرازم یا کسی سوشلزم کے پلڑے میں نہیں بلکہ اسلام کے پلڑے میں پڑے گا۔ اس کے بعد آپ یہ دیکھیں کہ جب طلباء میں ان خطوط پر ایک مؤثر تنظیم کام کر رہی تھی تو بعد میں نئی نئی الگ تنظیمیں بنانے کی آخر کیا ضرورت تھی ...... ساتھ ہی آپ یہ دیکھیں کہ جنھوں نے اس طرح الگ تنظیمیں بنائی ہیں اور اسلام کا نام لے کر بنائی ہیں، کیا وہ سب بھی کسی ایک جماعت میں جمع ہیں یا کئی جماعتیں بنائے ہوئے ہیں ...... اور آخری بات یہ دیکھنی چاہئے کہ جب معرکہ بپا ہوتا ہے تو یہ تنظیمیں کس کا ساتھ دیتی ہیں، اسلام کے لئے کام کرنے والوں کا، یا دوسرے نظریات کے لئے کام کرنے والوں کا ...... بس اسی سے آپ فیصلہ کر سکتے ہیں۔‘‘

اس کے بعد کچھ اور سوال پوچھے گئے جن میں سے ایک سوال تھا: ’’کیا ہاتھ کے اشارہ کے ذریعے سلام کرنا جائز ہے؟‘‘

مولانا نے فرمایا:

’’جی ہاں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بعض اوقات آدمی دور ہو تو اسے سلام کی آواز نہیں پہنچتی، وہ صرف اشارہ ہی سمجھ سکتا ہے .... یہ ہمارے ہاں کا قدیم طریقہ ہے۔ بعض مسلمان ممالک میں تہذیب کا طریقہ یہ بھی ہے کہ سینے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا جائے .... اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔‘‘

ایک سوال جماعت اسلامی کی جدوجہد کے بارے میں تھا۔ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا:

''جماعت اسلامی کا مقصد اس ملک میں اور پوری دنیا میں اسلام کا غلبہ ہے۔ ہم اس ملک میں اسلامی نظام کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں تاکہ یہ چیز پوری دنیا میں اسلام کی سربلندی کا ذریعہ بنے۔ جو طاقت اللہ تعالیٰ ہمیں دے رہا ہے' اس سے کام لے کر ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔''

اس موقع پر طلبہ نے مولانا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اجازت چاہی اور مولانا سے دعا کی درخواست کی۔

مولانا نے طلبہ کو دعا دیتے ہوئے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ آپ کو دین و دنیا کی برکتیں عطا فرمائے۔''

(بشکریہ ''۵-اے ذیلدار پارک''، مرتبہ مظفر بیگ)

☆☆☆

اسلامی جمعیت طلبہ، صوبہ پنجاب کے ارکان و منتخب کارکنان کا چھ روزہ تربیتی کیمپ (جامع مسجد، نیو کیمپس پنجاب یونیورسٹی) میں منعقد ہوا۔ اجتماع کے آخری روز کارکنان ملاقات کے لئے سیّد مودودیؒ کے ہاں گئے ---- ۱۴ جولائی ۱۹۷۶ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ ۔

عزیزو! میرے لئے بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ لوگ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی تربیت کے لئے وقتاً فوقتاً تربیت گاہوں کا اہتمام کرتے رہتے ہیں، اور ان میں پوری کوشش کرتے ہیں کہ شریک ہونے والوں کے اندر اسلامی روح پیدا کی جائے، اور اسلام سے واقفیت کا زیادہ سے زیادہ انتظام کیا جائے۔ میں نے آپ کی اس تربیت گاہ کا پروگرام دیکھا ہے، اور مجھے بڑا اطمینان ہوا ہے کہ بہت سوچ سمجھ کر صحیح پروگرام بنایا گیا ہے۔ مجھ سے یہ چاہا گیا تھا کہ آخری روز میں آپ کے سامنے تقریر کروں، مگر میں نے اس کو زیادہ پسند کیا کہ جو اہم سوالات آپ لوگوں کے ذہن میں ہیں وہ آپ بتائیں تاکہ میں ان پر کچھ روشنی ڈال سکوں۔ بعض اوقات تقریر کرنے والے کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ سننے والوں کے لئے اصل اہمیت کن سوالات کی ہے۔ جب آپ اپنے سوالات بتاتے ہیں۔ تب آپ کی اصل ضرورت کا علم ہوتا ہے۔ بہرحال آپ کے ہر ایک سوال کا جواب ان شاء اللہ تفصیل کے ساتھ دوں گا۔

سوال: .... ”ہمارا احساس ہے کہ تنظیم کو جب تک محدود حلقے کی حمایت حاصل ہوتی ہے اس وقت تک تو مقصد کا شعور اور اس کے لئے کام

کی تڑپ زیادہ ہوتی ہے، لیکن جوں جوں دعوت کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے، کمزوریاں اور خامیاں بھی زیادہ پیدا ہوتی ہیں اور نتیجۃً رفتارِ کار میں کمی آ جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کا کیا علاج ہے؟''

جواب: اصل بات یہ ہے کہ کوئی تحریک بھی جب شروع ہوتی ہے تو وہ مخلص ترین لوگوں کے ذریعے شروع ہوتی ہے، وہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں سے شروع ہوتی ہے جو ماحول کے اندر اصلاح کا بہت گہرا جذبہ رکھتے ہیں، اور جن میں اس کی ہمت ہوتی ہے کہ موجودہ خرابیوں کے مقابلے میں اٹھ سکیں۔ اس طرح کے لوگ جب کسی تحریک کو لے کر چلتے ہیں، اس وقت فی الواقع یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک جاندار، مستحکم اور مضبوط طاقت فراہم ہوگئی ہے لیکن جب اس تحریک کو رفتہ رفتہ کامیابی حاصل ہوتی جاتی ہے ...... کامیابی اس معنیٰ میں کہ لوگوں کی توجہ اس طرف زیادہ ہوتی ہے، اس کی طرف لوگوں کا رجوع بڑھتا ہے اور اس کے حامیوں کی تعداد بڑھتی ہے تو اس مرحلے پر ایک مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے۔

اس مسئلے کو آپ یوں سمجھیں کہ تحریکوں میں ایک چیز ہوتی ہے۔ Extension اور دوسری چیز Consolidation اگر ان دونوں چیزوں کے درمیان توازن باقی نہ رہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ توسیع زیادہ تیز رفتار سے ہوتی جاتی ہے جبکہ اسے مستحکم بنانے کے کام میں کمی آتی جاتی ہے۔ اس معاملے میں یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ ایک فطری بات ہے، جتنا آپ کا کام بڑھے گا آپ کی استحکامی قوت کی نسبت توسیع کا کام زیادہ ہوگا۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ابتدائی تیرہ سال میں چند سو آدمی آپ کے ساتھ آئے۔ اس کے بعد چار پانچ سال کی مدّت میں زیادہ سے زیادہ چند ہزار آدمی دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، لیکن جس وقت مکہ فتح ہوا اور حنین میں کفر و شرک کی زبردست قوت کو شکست دے دی گئی تو جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۔ لوگ فوج در فوج آ کر اللہ کے دین میں داخل ہوتے چلے گئے۔ اب یہ لوگ جو فوج در فوج آئے تھے تو سارے کے ......

سارے دین کو اُس طرح پوری طرح سمجھ کر اور دینی اخلاق کو اچھی طرح جذب کر کے نہیں آئے تھے جس طرح ان سے پہلے کے لوگ آئے تھے بلکہ ایک اُبھرتی ہوئی طاقت کے تحت دیکھتے ہی دیکھتے جو اتنی عظیم الشان کامیابی ہوئی تھی اس سے سارا عرب متاثر ہو گیا تھا کہ اب اس طاقت کے مقابلے میں ہمارا ٹھہرنا ممکن نہیں ہے، اور اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیں ...... تو ایک بڑی کثیر تعداد ان میں ایسی تھی جو دین کو پوری طرح سمجھ کر نہیں آئی تھی اور نہ دینی اخلاق کو اپنے اندر جذب کر سکی تھی۔ دین کی روح ان کے اندر اچھی طرح پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یک لخت ارتداد کا دور شروع ہو گیا......

اب دیکھئے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اس ارتداد کے طوفان کو پھیر دیا اور عرب کو پھر اسلام پر مضبوطی کے ساتھ جما دیا۔ وہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو Nucleus چھوڑ گئے تھے وہ اتنا زبردست تھا کہ اس نے اتنے بڑے ارتداد کو کچل کے رکھ دیا۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر Extension (توسیع) زیادہ بڑے پیمانے پر ہو جائے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ Consolidation (استحکام) اگر پوری طرح سے نہ ہو سکے تو اس سے بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ تحریک کا نیوکلیس اتنا مضبوط ہو کہ وہ اپنے گرد ایک بڑا ہالہ جمع کر لے اور یہ ہالہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے، اور اگر وہ اس سے ہٹے تو وہ نیوکلیس اور طاقتوں کو کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لے۔ آپ اس نیوکلیس کو مضبوط بنانے کی فکر کرتے رہیں۔ یہ آپ کی جو تنظیمی کوششیں ہیں جو تربیت گاہیں آپ منعقد کر رہے ہیں، یہ سب نیوکلیس کو مضبوط بنانے والی چیزیں ہیں۔ ان تربیت گاہوں کو جاری رکھیں اور کوشش کریں کہ نئے آنے والے لوگ دین کو سمجھیں اور ان کے اندر اتنا عزم پیدا ہو جائے کہ جس چیز کو وہ حق سمجھتے ہیں اسے سربلند کرنے کے لئے آگے بڑھیں۔ نیوکلیس کو آپ جتنا مضبوط کریں گے اتنی ہی آپ کے لئے Extension سے پیدا ہونے والی پیچیدگی کم ہوگی۔ توسیع کتنی بھی ہوتی چلی جائے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ توسیع کو روکنے کی بھی ضرورت نہیں۔ توسیع ہونے دیجئے

لیکن نیوکلیس مضبوط بناتے چلے جایئے۔ یہ چیز انشاء اللہ آپ کو اس پریشانی سے نکال دے گی کہ رفتار کار سست ہوتی جا رہی ہے یا کمزوریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ آپ کی تربیت گاہیں جتنی اعلیٰ پیمانے پر ہوں گی، جتنے اچھے آدمی تربیت دینے والے ہوں گے، اتنا ہی زیادہ آپ کے لئے مفید ہوگا اور اللہ نے چاہا تو آپ یہ محسوس نہیں کریں گے کہ توسیع کی وجہ سے کمزوری پیدا ہو رہی ہے۔ بلکہ آپ کو احساس ہوگا کہ توسیع کی وجہ سے آپ کی طاقت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

> سوال: دوسرا سوال یہ ہے کہ ''نوجوان نسل میں ذہنی وفکری انقلاب برپا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی سے نفاق کے خاتمے اور عملی انقلاب پیدا کرنے کے ذرائع کیا ہیں؟''

جواب: یہ ایک بڑا نازک سوال ہے اور اس سوال کی ایک بڑی گہری تاریخ ہے۔ دور تک اس تاریخ کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ ایک مدت دراز سے مسلمانوں کا یہ حال رہا ہے کہ وہ ایمان اور عمل کے تعلق کو ایک دوسرے سے منقطع کرتے رہے ہیں۔ عام طور پر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ایک آدمی ایمان رکھتا ہے، لیکن نماز نہیں پڑھتا تو کیا حرج ہے؟ اور اگر ایمان رکھتا ہے، روزہ نہیں رکھتا تو کیا ہوا؟ پھر آگے چل کر یہ حالت بھی آ گئی کہ ایمان تو دل میں ہے ہی، پھر شراب پی لیں تو کیا حرج ہے؟...... اس طرح ماننے کی حد تک تو اسلام کو مانتے رہے، لیکن ماننے کے بعد ہر کام کرنے کے لئے اپنے آپ کو آزاد سمجھتے رہے، حتیٰ کہ رشوت کو خدا کا فضل کہنے لگے۔ شادی وغیرہ کے سلسلے میں پوچھا جاتا کہ لڑکے کی تنخواہ کیا ہے؟ جواب ملتا اڑھائی سو روپے، پوچھتے ''اللہ کا فضل کتنا ہوتا ہے'' ...... تو اس طرح ہمارے ہاں ایک مدت دراز سے یہ تخیل پیدا ہونا شروع ہو گیا کہ مان لینا کافی ہے۔ اللہ کو مان لیا، رسول کو مان لیا۔ قرآن کو نہ صرف مانا بلکہ سر پر عزت کے ساتھ رکھا اور پھر گھر میں سب سے اونچی جگہ پر رکھ دیا۔ اس کے بعد جب کبھی ضرورت پیش آئی تو مرنے کے وقت ''یٰسین'' پڑھ کر سنا دی۔ مرگیا تو ''ختم'' کرا دیا۔ اس نوعیت کے چند کام کرکے باقی تمام معاملات میں اپنے آپ کو آزاد سمجھتے تھے۔ یہ

Traditions رہی ہیں، جنہوں نے ہمارے ہاں قول اور عمل کے تضاد کو جنم دیا ہے۔

...... اب آپ کا سابقہ اس صورتِ حال سے ہے۔ اس لئے اس کا مقابلہ آپ کو بڑے صبر کے ساتھ کرنا ہوگا اور اس کی صورت یہ ہے کہ پڑھ لکھ کے اور سوچ سمجھ کر جو لوگ آپ کی اس دعوت میں شریک ہوں، اس کو میں نیوکلیس کہتا ہوں، پہلے تو وہ انتہائی کوشش کریں کہ ان کی اپنی زندگی میں نفاق باقی نہ رہے۔ پوری طرح سے جائزہ لے کر دیکھیں کہ نفاق کہاں ہماری زندگی میں پایا جاتا ہے اور کس جگہ ہمارا فعل ہمارے قول کے خلاف ہے، وہ پہلے اس تضاد کو ختم کریں۔ اس لئے کہ اگر خود آپ کی زندگی میں تضاد موجود ہو۔ آپ کا اپنا قول وفعل ایک دوسرے کے مطابق نہ ہو تو دوسرے لوگ آپ سے متاثر نہیں ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر سب سے زیادہ جس چیز کی وجہ سے لوگوں پر ہوا تھا وہ یہ تھا کہ وہ دیکھتے تھے کہ جو قول ہے وہی عمل ہے۔ اس چیز نے دل جیت لئے۔ ہمیں اپنے سامنے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہی رکھنا ہے۔ آپ سب سے پہلے اپنے اندر وہی کریکٹر پیدا کرنے کی کوشش کریں جو کریکٹر اس کام کے لئے مقصود ہے۔ آپ ہر تضاد کو اپنے اندر سے نکال باہر کریں۔ پھر جب آپ لوگوں کو توجہ دلائیں گے کہ بھائی، مسلمان ہونے کے تقاضے یہ ہیں، آیئے! ہم ان چیزوں کو دور کریں جو ان تقاضوں کے خلاف ہیں۔ آپ ان کو بتایئے کہ ساری دنیا اس بات کو مانتی ہے کہ Hypocrisy بدترین جرم ہے، دنیا کے تمام اخلاقیات نے اس جرم کو تسلیم کیا ہے۔ نفاق سے بڑھ کر کوئی ذلت کی بات ہو بھی نہیں سکتی، پھر آپ اپنے اندر نفاق کو کیوں پرورش کر رہے ہیں ...... آپ علانیہ یہ بات لوگوں کو سمجھایئے لیکن اس طرح سے نہیں کہ کسی کا دل دکھے، یا کسی کو محسوس ہو کہ آپ اس کو ذلیل کر رہے ہیں بلکہ اس طرح سے کہ اس کو محسوس ہو کہ آپ اس کے خیر خواہ ہیں۔ اُس کی زندگی میں تضاد دیکھ کر آپ کا دل دکھتا ہے۔ اس لئے آپ محض اس کی بھلائی کی خاطر اور اسے برائی سے روکنے کی خاطر سمجھا رہے ہیں۔ آپ یہ کام فرداً فرداً کیجئے۔ ایک ایک فرد سے مل کر اسے سمجھایئے بالکل اس انداز میں، جیسے نجی گفتگو ہوتی ہے۔ اجتماعی طور پر اگر آپ کھڑے ہو کر نفاق کی

برائیاں بیان کریں گے تو لوگ یہ محسوس کریں گے کہ دیکھئے، یہ بات تو کر رہے ہیں عام الفاظ میں، لیکن چوٹیں ہم پر کر رہے ہیں...... اس سے بجائے فائدہ ہونے کے فتنہ پیدا ہوگا۔ اس لئے ایک ایک فرد کو چاہئے کہ وہ ایک ایک دوست کو، ایک ایک ہم مکتب کو، ایک ایک ہم جماعت کو اور ایک ایک ساتھی کو یہ بات سمجھاتا جائے۔ اس کے ذہن میں اس بات کو واضح کرے کہ منافقت کتنی بری چیز ہے۔ یہ بات جب ذہن نشین ہوگی تو انشاء اللہ کچھ نہ کچھ لوگوں کی اصلاح ضرور ہوگی۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ جتنے لوگوں کو سمجھائیں وہ سارے کے سارے مان لیں، لیکن یقین ہے کہ اگر یہ کام جاری رکھا جائے اور انفرادی طور پر نصیحت اور خیر خواہی کے انداز میں کیا جائے، تو ذہن اس کو قبول کرتے چلے جائیں گے۔ کیونکہ منافقت میں مبتلا رہنا کسی کے لئے بھی کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہو سکتی۔ جس وقت بھی آپ کسی کے اندر یہ احساس پیدا کریں گے کہ وہ اخلاقی حیثیت سے کہاں کھڑا ہے، اور کہیں وہ منافقت کا طرزِ عمل اختیار کرکے خدا اور رسولؐ سے بے وفائی کا ارتکاب تو نہیں کر رہا ہے، تو اس میں خود بخود اصلاح کے لئے ایک طلب پیدا ہونی شروع ہو جائے گی۔

> سوال: تیسرا سوال یہ ہے کہ ”مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات، جس کے عملی مظاہر بے حیائی، فحاشی اور عریانی کی صورت میں ہمارے معاشرے کو گھیرے ہوئے ہیں، ان سے بچنے اور خاص طور پر نوجوانوں کو بچانے کے لئے ہم کیا اقدامات کر سکتے ہیں؟“

جواب: دراصل جب گندے پانی کا ایک سیلاب چڑھا آرہا ہو اور ایک پوری کی پوری قوم کو بہائے لئے چلا جا رہا ہو تو اس کے اندر بھی آپ تلاش کریں گے تو ایسے لوگ بہت سے مل جائیں گے جو پاکیزگی چاہتے ہوں گے۔ وہ اس عفونت سے، اس تعفن سے اور اس گندگی سے جس کے اندر وہ پڑے بہہ رہے ہیں، متنفر ہیں مگر اس سے نکل بھی نہیں سکتے کہ سیلاب کی لپیٹ میں ہیں، جو انہیں بہائے چلا جا رہا ہے۔ لیکن اس معاملے کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس طرح کی برائی میں ایک لذت بھی ہوتی ہے۔ اس

گندگی میں ایک چیز ہوتی ہے۔ جس کو نفس چاہتا ہے کہ وہ ملے۔ وہ خود محسوس کرتا ہے کہ یہ ہے گندی چیز مگر لذیذ ہے۔ تو اس طرح کی گندگی جب پھیل رہی ہو' جو لوگوں کو لذیذ محسوس ہوتی ہو (باوجود اس کے کہ وہ اس کو گندگی سمجھتے ہوں) تو اس حالت میں ایک آدھ مرتبہ عریانی اور فحاشی کے خلاف ایک ہفتے کا پروگرام منانے سے کام نہیں بنتا۔ اس حالت میں مسلسل کام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ چند روز کے کرنے کی بات نہیں ہے۔ سالہا سال سے ایک برائی ہمارے ہاں پھیلتی رہی ہے۔ پچھلی صدی کے وسط تک حالت یہ تھی کہ بڑے بڑے رؤسا اپنے بیٹوں کو رنڈیوں کے گھروں میں بٹھاتے تھے کہ وہاں وہ ''تہذیب'' اور ''آداب'' سیکھیں۔ ذرا غور کیجئے کہ شرفاء، معززین اور رؤسا اپنے بیٹوں کو رنڈیوں سے تہذیب سیکھنے کے لئے بھیجتے تھے۔ اسی زمانے سے یہ گندگی چلی آرہی ہے۔ پھر انگریزوں کے زمانے میں یہ برابر بڑھتی چلی گئی۔ پھر ہمارے حکمرانوں کے مختلف دور آئے۔ ان میں بھی اس کے اندر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پہلے ریڈیو آیا اس نے گندگی پھیلائی۔ اس کے بعد ٹرانزسٹر آیا تو وہ اس سب کچھ کو ایک ایک گاؤں تک لے گیا۔ اسی طرح ٹیلی ویژن آیا' اس نے اور زیادہ لوگوں کو گہرائی میں اتار دیا اور اب مسلسل انہیں دلدل میں اتار رہا ہے...... یہ وہ بلائے عام ہے جس میں لوگ مبتلا ہیں اور آپ کا کام اس بلائے عام کو روکنا ہے۔

حقیقت میں یہ بلائے عام اس وقت تک نہیں رکے گی جب تک کہ اقتدار صحیح ہاتھوں میں اور اسلام کے مخلص ماننے والوں کے ہاتھ میں نہیں آئے گا۔ جب تک زمامِ کار غلط ہاتھوں میں رہے گی اس وقت تک یہ سیلاب بند نہیں ہوگا۔ اس لئے آپ کو جو کچھ بھی کوشش کرنی ہے وہ یہ سمجھتے ہوئے کیجئے کہ ہم کو آخرکار نظام بدلنا ہے۔ ایک غلط نظام کی جگہ صحیح نظام آئے گا تو یہ خرابیاں خود بخود رک جائیں گی۔ نظامِ حکومت میں جب تک کوئی ٹھوس اور حقیقی تبدیلی نہیں آتی اس وقت تک یہ سیلاب رک نہیں سکتا۔

جہاں تک آپ کا تعلق ہے آپ اپنا فرض ادا کرتے رہیے۔ مسلسل جدوجہد کیجئے اور ایک ایک نوجوان کے دل میں اس بات کو بٹھائیے کہ یہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو' کیا ای

الواقع اسے پسند بھی کرتے ہو؟ کیا اس بات کو پسند کرو گے کہ یہ منظر تمہاری ماؤں بہنوں کے اندر آئیں؟ کیا یہ پسند کرتے ہو کہ یہ بداخلاقیاں تمہارے اپنے گھر کے اندر گھس آئیں۔ جس چیز کو تم باہر دیکھ رہے ہو، اور بظاہر بڑی خوشنما معلوم ہو رہی ہے۔ اپنے گھر میں دیکھو گے تو تڑپ اٹھو گے۔ تن بدن میں آگ لگ جائے گی۔ دل کٹ جائے گا ...... لیکن یاد رکھو اگر ان چیزوں کی اسی طرح ہمت افزائی ہوتی رہی تو تمہارے گھر اس کے سیلاب سے بچ نہیں سکیں گے۔ اس کے بعد چاہے تم توبہ کرو، چاہے تم ماتم کرو' لیکن جو بلا آرہی ہے وہ نہیں رک سکے گی۔ اس لئے ہمت کرکے اپنے آپ کو بھی اس سے بچاؤ اور اپنی قوم کو بھی اس سے بچانے کی فکر کرو...... یہ ہے وہ بات جو آپ کو اس ملک کے ایک ایک نوجوان کو سمجھانی ہے۔

عریانی اور فحاشی کے خلاف جتنا بڑا مظاہرہ[1] پچھلی مرتبہ آپ نے کیا ہے۔ اس سے دس گنا زبردست مظاہرہ آئندہ ہونا چاہئے' اور اس سے پچاس گنا بڑا مظاہرہ اور ہونا چاہئے۔ یہاں تک کہ آپ آہستہ آہستہ نوجوانوں کے اندر یہ احساس پیدا کردیں کہ فحاشی اور عریانی کے اس سیلاب کی صورت میں 'یہ ان کی اور ان کی آئندہ نسلوں کی تباہی کا سامان ہو رہا ہے، یہ کوئی لذت کا سامان نہیں' تباہی کے اسباب ہیں جو ہمارے لئے فراہم کئے جارہے ہیں۔ اب رنگین ٹیلی ویژن آنے والا ہے۔ جس پر اور زیادہ لوگ ٹوٹیں گے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ جتنی برائی اس ملک میں پھیلتی جائے گی اتنا ہی اس ملک کے اخلاق کی جڑیں کھوکھلی ہوتی چلی جائیں گی۔ اور اخلاق کی جڑیں جب کسی قوم کی کھوکھلی ہو جاتی ہیں تو وہ کبھی آزاد اور خود مختار نہیں رہ سکتی۔

ان حالات میں ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ ہم ہر برائی کو جو طوفان کی طرح اٹھ رہی ہے، سینہ سپر ہو کر روکیں' پھر بھی وہ نہ رکے تو اس پر ہماری کوئی ذمہ داری نہیں۔ ہماری ذمہ داری روکنے کی کوشش کرنا ہے۔ روکنے کی کوشش میں آپ لاٹھیاں کھائیے۔ آنسو گیس کے حملے برداشت کیجئے، ہر طرح کی تکلیفیں اٹھائیے۔ کوئی پرواہ نہ کیجئے' جو کچھ

---

[1] اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان نے ۲۱ تا ۲۸ مئی ۱۹۷۶ء کو عریانی و فحاشی کے خلاف ہفتہ منایا تھا، اس جانب اشارہ ہے۔

بھی پیش آئے اس کو برداشت کیجئے۔ آپ ہمت کے ساتھ کھڑے ہوں گے تو آپ دیکھیں گے کہ ایک مرتبہ اگر آپ کے ساتھ دس ہزار آدمی کھڑے ہوتے ہیں تو دوسری مرتبہ ایک لاکھ کھڑے ہوں گے۔ برائی کو روکنے کے لئے بھلائی کی آواز اٹھائی جائے تو بکثرت بندگانِ خدا ایسے ہیں جو آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں گے، انشاء اللہ۔

عزیزو!

آپ کے تینوں سوالات کا جواب میں نے دے دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ میں تقریباً آدھ گھنٹہ بول چکا ہوں۔ اب تھک گیا ہوں۔ اس لئے دعا پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

یا اللہ! ہماری اس قوم میں صالح نوجوانوں کی تعداد بڑھا، اور ان کو اخلاص کے ساتھ اپنے دین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ان کے اندر دین کا صحیح علم اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا کر۔ ان کے لئے بندگانِ خدا کے دل کھول دے۔ لوگوں کو ان کی طرف رجوع کرنے کی توفیق عطا فرما، اور ان کو اتنی کامیابی عطا فرما کہ آئندہ اس ملک میں نظامِ حکومت کی باگ نیک اور صالح لوگوں کے ہاتھ میں آجائے۔ یا اللہ! اس ملک کا مستقبل خراب نہ ہو۔ اس ملک کی آئندہ نسلیں خراب ہوئیں تو لامحالہ اس کا مستقبل خراب ہوگا۔ یا اللہ! اس کو خرابی سے بچانے کے لئے یہاں صالح لوگوں کو اتنا طاقت ور بنا کہ وہ صحیح نظام کو قائم کریں۔ •

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ
وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ○

☆☆☆

ادارہ تعلیم و تحقیق، پنجاب یونیورسٹی کے ایک طالب علم کی نظامِ تعلیم کے حوالے سے ملاقات ---- ۱۹۷۶ء

سوال: ہر قوم اور ہر مملکت کی بنیاد کسی نہ کسی نظریے پر قائم ہوتی ہے۔ ورنہ وہ قوم برقرار نہیں رہ سکتی۔ ہم پاکستانی قوم ہیں، اس لحاظ سے نظریۂ پاکستان بھی اہم ہے۔ ہم اس کی تفہیم چاہتے ہیں اور نظریۂ پاکستان کیا ہے؟ ہم اس کی تشریح چاہتے ہیں۔

جواب: یہ بات ہم میں سے ہر شخص کو معلوم ہے کہ مملکتِ پاکستان دُنیا کی واحد ایسی ریاست ہے، جو اسلام کے نام پر اور اسلام ہی کی برکت سے وجود میں آئی ہے۔ اس لئے نظریۂ پاکستان کی حقیقت اور ماہیت' اسلام اور نظریۂ اسلام کے ماسوا یا اس سے کم و بیش کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ اسلام ان تعلیمات کے مجموعے کا نام ہے جو اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید اور اللہ تعالیٰ کے آخری نبی سیّدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور اسوۂ حسنہ کی شکل میں ہمارے درمیان موجود ہے۔ اسی تعلیم کا دوسرا نام نظریۂ پاکستان ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس میں کوئی ابہام نہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں نظریۂ پاکستان اور اسلامک آئیڈیالوجی کے مطابق تعمیرِ نو ضروری تھی، اسی طرح ہمارے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ ہم تعلیمی و تدریسی میدان میں لارڈ میکالے کے تجویز کردہ بے مقصد، ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نظامِ تعلیم کو یکسر بدل کر اسلام کی روشنی میں اپنے لئے آزادانہ تعلیمی مقاصد متعین کرتے۔

سوال: آج کل تعلیمی درس گاہوں اور عام جمہوری اداروں میں آزادیٔ فکر کا بڑا چرچا ہے۔ آخر یہ آزادیٔ فکر کیا ہے؟ کیا نظریاتی مملکت میں اس کی اجازت دی جا سکتی ہے، اور کیا نظریاتی تعلیم دیتے ہوئے ہم آزادیٔ فکر سے دور ہو جاتے ہیں؟

جواب: آزادیٔ فکر بلاشبہ انسان کے بنیادی حقوق میں سے ایک ہے لیکن ہر انسانی معاشرہ اپنے اپنے تہذیبی و تمدنی تصورات کے مطابق افرادِ معاشرہ پر فکر و عمل کے اعتبار سے کچھ نہ کچھ پابندیاں ضرور عائد کرتا ہے۔ یہ ہماری اسلامی ریاست ہی میں نرالا دستور ہے کہ یہاں ایسی درسی کتابیں پائی جاتی ہیں اور ایسے پڑھانے والے پائے جاتے ہیں، جو اللہ، رسولؐ، آخرت اور اسلامی اقدار کی تضحیک کرتے ہیں، مگر نہ تو ان کا ضمیر خود خلش محسوس کرتا ہے اور نہ کوئی دوسرا ان سے باز پرس کرتا ہے۔

سوال: یقیناً نظریۂ پاکستان کی تعلیم و ترویج کا جو طریقہ ہمارے درسی کتب ساز اداروں نے اپنا رکھا ہے وہ خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کر رہا۔ اس سلسلے میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟ یعنی ان قومی مقاصد کے حصول میں ہم بحیثیت فرد اور قوم کیا کر سکتے ہیں؟ حکومت کا اس ضمن میں کیا کردار ہونا چاہئے، اور اساتذہ کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

جواب: اس افسوسناک صورتِ حال کی اور ان مفاسد کی روک تھام اصل میں تو حکومت کے کرنے کا کام ہے۔ لیکن وہ اگر غفلت برتے تو پھر جو بھی صاحبِ احساس مسلمان کسی لحاظ سے تعلیمی شعبوں اور تعلیم گاہوں سے منسلک ہے، اس کا یہ فرض ہے کہ وہ علم کو اور علم کے سیکھنے اور سکھانے والوں کو اسلامی مقاصد و نظریات سے ہم آہنگ کرنے کی برابر کوشش کرتا رہے۔

☆☆☆

اسلامی جمعیت طالبات، پاکستان کے ساتویں سالانہ اجتماع میں مختصر خطاب کے بعد --- ۲۷ دسمبر ۱۹۷۶ء

سوال: اگر والدین کی کمائی کے مکمل حلال ہونے میں شک ہو تو ایک برسرِ روزگار لڑکی کے لئے والدین کی ناپسندیدگی سے علاوہ کھانا پینا بہتر ہے یا والدین کی پسند کے ساتھ رہنا بہتر ہے؟

مولانا مودودی: مکمل حلال ہونے میں شک ہو تو آپ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس زمانے میں مکمل حلال رزق تقریباً ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ البتہ اگر آپ کو معلوم ہو کہ آپ کے والدین کی آمدنی بالکل ہی ناجائز ہے اور وہ کسی حرام طریقے سے روٹی کما رہے ہیں اور اللہ نے آپ کو ایسا روزگار دے دیا ہے جس سے آپ اپنی ضروریات پوری کر سکتی ہیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے کھانے کے مصارف اپنے والدین کو ادا کریں اور ان سے کہیں کہ یہ آپ کو ہم سے قبول کرنا چاہئے ورنہ ہمیں مجبوراً اپنے کھانے پینے کا الگ انتظام کرنا پڑے گا۔ یقیناً آپ ڈانٹ کھائیں گی۔ والدین ہر طرح سے آپ کو ملامت کریں گے اور مجبور کریں گے کہ نہیں تم ایسا نہ کرو۔ لیکن آپ واضح طور پر بتائیں کہ اگر ہم برسرِ روزگار نہ ہوتیں تو آپ پر ذمہ داری تھی، ہم آپ کا آپ کے گھر میں کھانا کھاتی تھیں، ہمیں اطمینان تھا کہ ہم خود کوئی حرام خوری نہیں کر رہی ہیں' جو ہمارا نفقہ ہمارے والدین کے ذمے ہے وہ ہم استعمال کر رہی ہیں اور اس میں ہماری حرام خوری کی نیت نہیں ہے۔ لیکن اب جیسا کہ ہمارے اپنے حلال ذرائع موجود ہیں تو آپ ہمارے کھانے کے مصارف قبول کریں یا ہمیں اجازت دیں کہ ہم اپنے کھانے پینے کا الگ

انتظام کریں۔

یہ سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی لڑکا یا لڑکی برسرِ روزگار نہ ہو اور اسے اپنے والدین کے ساتھ ہی رہنا پڑے اور والدین کی کمائی پر ہی گزر بسر کرنا پڑے تو اس کی ماں اور اس کے باپ کی آمدنی انہی کے لئے حرام ہوگی' وہ اس لڑکے یا لڑکی کے حرام نہیں ہے جوان کے ساتھ رہے۔ کیونکہ وہ اپنا نفقہ جو شرعاً اس کے حق کے طور پر اُس کے والدین پر ہی ہوتا ہے اور وہ اس کو لیتا ہے۔ حُرمت ہمیشہ ذرائع پر ہوتی ہے' چیز میں نہیں ہوتی۔ یعنی وہ روٹی جو آپ کھاتی ہیں اس میں حرمت نہیں ہے بلکہ وہ ذریعہ جس سے روٹی آتی ہے اس میں حرمت ہے۔ باپ اگر ناجائز کما رہا ہے تو ناجائز اسی کے لئے ہے جو ناجائز روزی کمانے کا ذریعہ استعمال کر رہا ہے۔ لیکن لڑکی یا لڑکا اپنا حقِ نفقہ جو اس کے والدین پر واجب ہوتا ہے، وہ اسے اپنے حق کے طور پر لے رہا ہے تو اس کے لئے وہ روٹی حرام نہیں ہے۔ البتہ اگر خود آپ کے اپنے ذرائع پیدا ہو جائیں جس سے آپ اپنی زندگی بسر کرسکیں تو پھر ٹھیک ہے آپ کو حلال کھانا چاہئے، خواہ اپنے کھانے پینے کے مصارف اپنے والدین کو دیں اور خواہ اپنا الگ انتظام کریں۔

سوال: اگر بعض طالبات میں ذہنی طور پر دین کو سمجھنے کی مکمل طور پر صلاحیت ہو مگر وہ عملی طور پر کسی تحریک سے وابستہ نہ ہونا چاہیں تو ایسوں کے ساتھ ہمیں کیا برتاؤ کرنا چاہئے؟

مولانا مودودی: ایسوں کے ساتھ آپ کو بہت اچھا برتاؤ کرنا چاہئے۔ اگر وہ دین کو سمجھتی بھی ہیں اور دین کے مطابق عمل بھی کرتی ہیں اور کسی تحریک کے ساتھ وابستہ نہ ہونا چاہتی ہوں تو آپ کو انہیں ملامت نہیں کرنا چاہئے، نہ مجبور کرنا چاہئے کہ ہمارے ساتھ ہماری تحریک میں وہ ضرور شامل ہوں۔ آپ کا اپنا طرزِ عمل ایسا ہونا چاہئے' جس کی وجہ سے ان کے دلوں میں خود بخود یہ خواہش پیدا ہو کہ جو لوگ نیک کام کر رہے ہیں اس کے اندر وہ ان کا ہاتھ بٹائیں۔ لیکن نیکی کرنے اور ساتھ نہ دینے والے لوگوں پر آپ کوئی ملامت نہ کیجئے، ان پر دباؤ نہ ڈالیے، کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی

آپ سے جتنا دور ہے' آپ کے دباؤ ڈالنے یا سختی کرنے سے یا ملامت کرنے سے وہ اور زیادہ دور ہو جاتا ہے ...... جو آپ سے جتنا بھی قریب ہے اسے اور زیادہ قریب لانے کی کوشش کریں' اسے دور پھینکنے کی کوشش نہ کریں۔ بعض اوقات اس طرح کے رویئے سے ایک خلا سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر ایک فرد کو آپ یہ کہیں کہ تم نماز پڑھو اور وہ نہ پڑھے تو اس کے اوپر آپ زیادہ دباؤ نہ ڈالیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نکل پڑے کہ ''میں نہیں پڑھنا چاہتا'' اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جتنا وہ نماز نہ پڑھنے سے، گنہگار تھا اب اس سے زیادہ گنہگار ہو گیا کہ تو کسی کو ایسے مقام پر نہ لا کھڑا کریں کہ وہ کھلم کھلا خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا باغی ہو جائے۔

سوال: مولانا اگر آپ تحریک سے علیحدہ ہو کر موجودہ امارتِ جماعت سے مطمئن ہیں تو کس حد تک؟ اگر نہیں تو اس کا ازالہ کریں۔

مولانا مودودی: میں تحریکِ اسلامی سے علیحدہ کہاں ہوں، میں تو تحریکِ اسلامی میں شامل ہوں۔ امارت سے الگ ہونے کی وجہ میری بیماری تھی، جس کی وجہ سے کام نہیں چلا سکتا تھا۔ لیکن امارت کو چھوڑ دینے کے معنیٰ تحریک کو چھوڑ دینے کے نہیں ہیں۔ میں آج بھی تحریک میں ہوں، اسی طرح جس طرح پہلے روز سے تھا۔ یہی تحریک میری زندگی ہے، میرا سب کچھ ہے' اس کو چھوڑنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا' اور موجودہ امارت سے مطمئن نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ جماعت کی اکثریت نے جس شخص کو امیر چنا ہے اور وہ شخص (میاں طفیل محمد صاحب) جماعت کی تاسیس سے میرے ساتھ رہا ہے، میرے ساتھ کام کیا ہے، میرے معتمد ترین اور نہایت قابل اعتماد رفیقوں میں سے ہے، تو آخر میرے مطمئن نہ ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اگر کسی چیز پر میں غیر مطمئن ہوا تو صاف صاف کہوں گا کہ اس چیز کی اصلاح کیجئے' اور اسی طرح سے مجلسِ شوریٰ کو بھی مشورہ دوں گا' اگر امیرِ جماعت سے متعلق کوئی چیز مجلسِ شوریٰ میں کہنے کی ہوئی۔

☆☆☆

کراچی یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے سالانہ مجلّہ ''الجامعہ'' کی مجلسِ ادارت کا سیّد مودودیؒ سے انٹرویو---جنوری ۱۹۷۷ء

الجامعہ: مولانا! چونکہ آپ بنیادی طور پر دینی رہنما ہیں، اس لئے پہلا سوال یہی پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ آپ کا ذہن مذہب کی طرف کیسے راغب ہوا؟

مولانا: جب مجھ میں کچھ شعور پیدا ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ میں اس لئے مسلمان ہوں کہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا ہوں' لیکن یہ بات کسی دین کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ اگر میں عیسائی گھرانے میں پیدا ہوتا تو عیسائی ہوتا۔ اس وجہ سے میں نے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کا مطالعہ بھی کیا۔ جب میرا پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ دراصل دینِ حق اسلام ہی ہے تو میں نے پورے شعور کے ساتھ اسلام قبول کیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو میں صرف دینِ آبائی کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ اپنی تحقیق کی وجہ سے بھی مسلمان ہوں۔ اسی لئے میں نے خود کو نومسلم بھی لکھا ہے۔

سوال: پوری دنیا میں ایک انقلابی تبدیلی آ رہی ہے اور نوجوان بوڑھی اور پرانی قیادت سے بغاوت کر رہے ہیں، لیکن ہمارے یہاں معاملہ مختلف ہے، نوجوان اپنے بزرگوں ہی کی قیادت کو پسند کرتے ہیں۔ کیوں؟

جواب: اصل میں دنیا میں جہاں نوجوان اس طرح بغاوت کر رہے ہیں۔ ان کی رفتار، گفتار اور کردار ہر چیز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بھی بگاڑ پیدا کر رہے ہیں اور آئندہ بھی بگاڑ پیدا کریں گے۔ صرف یہ بات کہ نوجوان ایسا چاہتے ہیں، اس امر کی

دلیل نہیں ہے کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں، وہ صحیح بھی ہے۔ جو نوجوان صحیح العقل ہوں گے وہ اس بات کو مدنظر رکھیں گے کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کے لئے صرف اچھے مقاصد ہی کافی نہیں ہوتے بلکہ تجربہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ جو قومیں ترقی کر رہی ہیں، ان کے معاملات کی باگیں سن رسیدہ اور تجربہ کار لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ جہاں نوعمر لوگ کسی سازش یا کسی بغاوت کے ذریعے سے اپنے ملک کے معاملات پر قابض ہو گئے ہیں۔ وہاں ان کی ناتجربہ کاری اور ناپختگی اپنے برے اثرات دکھا رہی ہے۔

سوال: مولانا! ایک طبقے کا خیال ہے کہ چونکہ ہمارا ملک پس ماندہ ہے اس لئے اس کے نوجوانوں کو اپنی تعلیم پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینی چاہئے۔ جبکہ سیاستدان نوجوانوں کو اپنی قوت بنانے کے لئے کوشاں ہیں۔ آپ کے نزدیک دونوں میں سے کون سا نقطۂ نظر درست ہے؟

جواب: یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ طلبہ کو اپنی تعلیم پر توجہ دینے، علم حاصل کرنے اور اپنی قابلیت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کہ جن نوجوانوں کو آگے چل کر خود ملک کا انتظام سنبھالنا اور چلانا ہے، وہ اس بات سے آنکھیں بند کر لیں کہ ان کے حق میں کانٹے بوئے جا رہے ہیں، جنہیں آخر کار انہیں ہی چننا ہوگا۔ اگر وہ دیکھ رہے ہوں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں موجودہ نظام ہے وہ ان کے حق میں کانٹے بونے کا سامان کر رہے ہیں تو بڑے بے حس اور بے عقل ہوں گے اگر وہ اس طرح کے لوگوں کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہ کریں۔ اس معاملے میں دو چیزیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ کسی سیاسی پارٹی کا طلبہ کو اپنا آلۂ کار بنانا اور طلبہ کا ان کے ہاتھ میں آلۂ کار بننا' یہ سراسر غلط ہوگا۔ آخر نوجوان طلبہ جو اپنے علم کی تکمیل کا ایک حد تک راستہ طے کر چکے ہیں اور جن میں معاملات کو سمجھنے کے لئے شعور پیدا ہو چکا ہے، وہ کسی کا آلۂ کار بننے سے پہلے اس بات کو ضرور دیکھیں گے اور نہیں دیکھیں گے تو غلطی کریں گے کہ وہ جس جماعت کا ساتھ دے رہے ہیں اس کا

پروگرام کیا ہے؟ اس کا کردار کیا ہے؟ وہ ملک کی فی الواقع بھلائی کے لئے کام کر رہی ہے یا اس کو بگاڑنے کے لئے سرگرم ہے۔

سوال: اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ تمام تعلیمی اداروں میں قیادت کی باگ ڈور اسلامی ذہن رکھنے والے نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے باوجود وہاں مذہبی نقطۂ نگاہ سے کوئی مثبت تبدیلی نہیں آتی۔ کیوں؟

جواب: بات یہ ہے کہ لوگوں کے اخلاق کو بگاڑنے کا کام جتنے وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے اس کے اثرات لامحالہ کچھ نہ کچھ تو عام نوجوانوں پر بھی پڑتے ہیں اور یہ سلسلہ ایک مدّت دراز سے چل رہا ہے۔ صرف یہ بات کہ ان تعلیمی اداروں کے انتخابات میں اسلامی ذہن رکھنے والے طلبہ کو کامیابی حاصل ہو جانا، بجائے خود کافی نہیں۔ بلکہ ان کی قیادت کو سنبھالنے والوں کو بڑے پیمانے پر طلبہ کے اصلاحِ حال کی کوشش بھی کرنی چاہئے۔

الجامعہ: ایک مسئلہ یہ ہے کہ جمعیت کا کام کرتے ہوئے ایسے افراد سے بھی واسطہ پڑتا ہے جو اسلام سے محض عقیدتاً اور جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں اور عملاً شعائرِ اسلام کی پابندی نہیں کرتے؟ جبکہ حقوق العباد کے معاملات ان کے بہتر ہوتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اس کی دو وجوہ ہیں یا تو یہ کہ وہ علم کے بغیر اسلام کا ساتھ دے رہے ہیں، جذباتی وابستگی ایسے ہی لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ یا اس لئے کہ وہ مسلم گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس قسم کی وابستگی اسلام کے لئے اتنا عشق پیدا کر سکتی ہے کہ اس کی خاطر انسان جان دے دے، لیکن اسلام کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے ساری زندگی گزار دینا، یہ ممکن نہیں ہوتا۔ یا پھر دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی کو شعور بھی ہے، اسلام کو سمجھتا بھی ہے، لیکن اس کی سیرت میں ایسی کمزوری موجود ہوتی ہے کہ ایک چیز کو فرض جاننے کے باوجود اسے ادا نہیں کر پاتا۔ ایک چیز کو حرام جاننے اور ماننے کے

باوجود اس کا ارتکاب کرتا ہے، ان دونوں میں سے جو صورت بھی ہو اس میں یہ ناممکن نہیں ہے کہ آدمی حقوق العباد ادا کرنے میں پوری طرح راست باز ہو۔ اس لئے کہ مضبوط سیرت و کردار کا پیدا ہونا صرف خدا اور آخرت پر یقین ہی کے نتیجے میں ممکن ہے۔ جو شخص خدا اور آخرت پر یقین نہیں رکھتا وہ بعض چیزوں میں حقوق العباد ادا کرے گا اور بعض چیزوں میں حقوق العباد کو پامال کرے گا۔ جہاں کہیں بھی وہ محسوس کرے گا کہ حقوق العباد ادا کرنے میں اسے نقصان سے سابقہ پیش آئے گا، وہاں اس کی اخلاقی قوت جواب دے جائے گی۔ ایسی حالت میں حقوق العباد وہی ادا کر سکتا ہے جو اپنے آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہو اور یقین رکھتا ہو کہ یہاں کسی کا حق مار کر میں دنیا کی گرفت سے بچ جاؤں گا، تب بھی یہ عقیدہ اسے ایسا کرنے سے باز رکھے گا کہ مرنے کے بعد اسے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ بعض لوگ اس معاملے میں بعض مغربی قوموں کی مثال پیش کرتے ہیں کہ ان کے ہاں معاملات میں بڑی ایمانداری پائی جاتی ہے، لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر واقعی وہ ایسے لوگ ہیں تو وہ قومی حیثیت سے دنیا کی دوسری قوموں کے حقوق کیوں مارتے ہیں ...... اور ستم کیوں ڈھاتے ہیں؟ فرداً فرداً جس قوم کے لوگ ایماندار ہوں، مجموعی طور پر وہ ایک قوم بننے کے بعد بے ایمان کیوں ہو جاتے ہیں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کیریکٹر کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

سوال: تعلیمی اداروں میں بے شمار طلبہ اسلام کا کام کرتے ہیں مگر آگے چل کر جب عملی زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو ان مقاصد کے لئے کام نہیں کرتے جن کے لئے وہ تحریک اسلامی میں شامل ہوئے تھے؟

جواب: یہ بات نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ طلبہ کی بہت بڑی تعداد ایسی ہوتی ہے جو طالب علمی کے زمانے میں بڑے بلند مقاصد رکھتی ہے اور اچھے ارادے اپنے دلوں میں پرورش کرتی ہے۔ لیکن جب ان کو تعلیم سے فارغ ہو کر اس سوال سے سابقہ پیش آتا ہے کہ انہیں عملی دنیا میں قدم رکھنا ہے اور اپنے مستقبل کو خود ہی تعمیر کرنا ہے تو اس وقت وہ اپنی اس خیالی دنیا سے نکلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جس کے اندر وہ اپنے زمانۂ طالب علمی

میں زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ ممکن نہیں کہ جتنے طلبہ اسلامی ذہن رکھتے ہیں، وہ سارے کے سارے آگے چل کر تحریکِ اسلامی کے کارکن بن جائیں' ان میں سے ایک قلیل تعداد ہی ایسا کر پاتی ہے۔ لیکن یہ سمجھ لینا صحیح نہیں ہے کہ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد ملازمت یا تجارت یا کسی اور کام میں جو لوگ لگ گئے ہیں' ان کے دماغ سے وہ خیالات بھی نکل گئے ہیں جو زمانۂ طالب علمی میں وہ رکھتے تھے۔ مجھے بکثرت ایسے لوگوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جو پہلے طلبہ کی جمعیت میں تھے اور بعد میں کسی شعبۂ زندگی سے وابستہ ہو گئے۔ میں نے کم ہی ایسے اشخاص کو پایا ہے کہ جن کے خیالات بالکل بدل گئے ہوں۔ چونکہ ان کے ساتھ رابطہ رکھنے کی کوششیں نہیں کی جا رہی ہیں۔ اس لئے یہی گمان پیدا ہو گیا ہے کہ وہ سب لوگ دنیا میں کھو گئے اور اب ان کے خیالات میں ان کے سابق عقائد و افکار کی جھلک باقی نہیں رہی۔ اگر اپنے سابق رفقاء کے ساتھ آپ لوگ اپنے روابط رکھنے کی کوشش کریں تو معلوم ہو گا کہ اُن کی عظیم اکثریت آپ ہی کے خیالات سے مطابقت رکھتی ہے' اور اپنے دائرۂ کار میں ان ہی خیالات کے مطابق کام کر رہی ہیں۔

> سوال: مولانا! نوجوانوں کا فکری مستقبل آخر کیا ہو گا؟ ہم اسلام کے لئے کام کرنے والے نوجوانوں کو کون سی اقتصادی ضمانت دیں؟ کیا آپ کے ذہن میں ایسا کوئی نقشہ موجود ہے؟

جواب: اقتصادی ضمانت کوئی بھی ایسی حالت میں نہیں دے سکتا، جب تک اسے اقتصادی نظام پر گرفت حاصل نہ ہو۔ بلکہ جنہیں گرفت حاصل ہے وہ بھی تمام نوجوانوں کو کوئی اقتصادی ضمانت نہیں دے سکتے۔ حقیقت میں صحیح عقیدہ وہی ہے جو کسی اقتصادی نظام کا محتاج نہ ہو اور جو اس یقین پر مبنی ہو کہ ہم جس چیز کو حق سمجھتے ہیں وہی حق ہے اور ہمیں اسی کی پیروی کرنی چاہئے' خواہ وہ ہمارے لئے تابناک مستقبل کی ضمانت دیتا ہو یا نہ دیتا ہو۔ جو شخص بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو وہ تحریکِ اسلامی کے لئے کام نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے یقین شرطِ اوّل ہے۔

سوال: اسلام اپنی مکمل حالت میں عملاً صرف پندرہ برس کے عرصے تک کی خلافتِ راشدہؓ تک نافذ العمل رہا۔ اکثر ذہنوں میں یہ سوال گونجتا ہے کہ کیا ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی آمد، کائنات کی تخلیق سے لے کر اب تک کے سارے کام، صرف اسی پندرہ سال کے مختصر عرصے کی خلافت راشدہؓ کے لئے سرانجام دیئے گئے تھے اور جس کے آئندہ بھی نافذ ہونے کی کوئی ضمانت نہیں۔

جواب: اصل میں یہ انتہائی محدود نقطۂ نظر ہے۔ اس معاملے پر غور کرنے اور دیکھنے کی بات یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ اخلاقی حسن و قبح کے تصورات پائے جاتے ہیں اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے جو صالح اصول نوعِ انسانی کو ملے ہیں، وہ آخر کہاں سے آئے ہیں؟ ان سب کا پہنچنے کا ذریعہ محض انبیاء ہیں۔ یہ تو بہت بڑی بات ہے کہ کسی نبی کی تعلیم باہتمام کسی معاشرے میں روبہ عمل لائی جائے اور ایک مثالی معاشرہ وجود میں آئے۔ لیکن جہاں ایسا نہ ہو وہاں یہ سمجھنا کہ انبیاء کی کوششیں بیکار گئیں، غلط ہے۔ دنیا میں جتنا فساد پایا جاتا ہے، وہ انبیاء کی تعلیمات سے انحراف کی وجہ سے ہے۔ اور دنیا میں جتنی تعلیم و تہذیب بھی پائی جاتی ہے وہ ہم تک انبیاء ہی کے ذریعے پہنچی ہے۔

سوال: بعض مفکرین کا خیال ہے کہ آنے والا زمانہ عقائد و نظریات کا زمانہ نہیں ہے، بلکہ انسان کے تنظیمی مسائل اتنے بڑھ جائیں گے اور معاشرتی اداروں کی اہمیت اتنی بڑھ جائے گی کہ مختلف نظریات رکھنے والے لوگ ٹھوس حقائق کی بنیاد پر ایک حل پر متفق ہو جائیں گے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: یہ خیالی دعویٰ ہے۔ اس کے لئے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ (مولانا نے بہت ہی اطمینان سے کہا) جن لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ ان کا یہ ذاتی نقطۂ نظر ہے۔

ضروری نہیں کہ حقیقت بھی اس کے مطابق ہو۔ اس میں سب سے پہلی بات تو یہی غلط ہے کہ عقائد و افکار کا دور گزر گیا ہے۔ جب تک انسان کے سر میں دماغ ہے اور دماغ میں سوچنے کی قوت موجود ہے، اس وقت تک یہ ممکن ہی نہیں۔ اور پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ حل کیا ہوگا؟ جس پر سب متفق ہو جائیں گے۔ آیا یہ ان کا نظریہ ہے یا وہ کوئی واقعہ بیان کر رہے ہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ انسان، جب تک انسان ہے، اس وقت تک یہ ممکن نہیں کہ خیالات و افکار میں کامل یکسانی پیدا ہو جائے اور لوگوں میں اختلافِ خیال باقی نہ رہے۔ جس وقت ایسی صورت پیدا ہوگی اس وقت انسان کے بجائے کوئی اور مخلوق کام کرنا شروع کر دے گی۔

سوال: آپ نے اپنی کتاب ”تجدید و احیائے دین“ میں ابتداء سے لے کر شاہ اسمٰعیلؒ تک کی اسلامی تحریکوں کا جائزہ لیا ہے اور ان کی ناکامی کے اسباب بیان کئے ہیں۔ اگر آپ کے نزدیک کامیابی کا معیار رضائے الہی کا حصول ہے، تو آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے رضائے الہی نہیں حاصل کی؟

جواب: کامیابی اور ناکامی کا لفظ ہم مختلف معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی گروہ جس مقصد کے لئے کام کر رہا ہے وہ اس میں کامیاب ہو جائے۔ کامیابی کا یہ ایک مفہوم ہے۔ کامیابی کے دوسرے معنٰی یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے جو ذمہ داری سونپی گئی ہو، اس کو پوری کرنے میں ہم کوتاہی نہ برتیں۔ اس طرح سے جو گروہ بھی رضائے الہی کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے معاشرے اور ماحول کو اسلام کے مطابق تبدیل کرنے کے لئے اٹھتا ہے، اس کی یہ خواہش ضرور ہوتی ہے اور فطرتاً ہونی چاہئے کہ جس اصلاح کے لئے وہ کوشش کر رہا ہے وہ عملاً رونما ہو جائے۔ اس غرض کے لئے یہ ضرور دیکھنا ہوتا ہے کہ جو تدابیر اختیار کی گئی ہیں ان میں کوئی ایسی خامی تو نہیں جو اصلاح کے مقصد کو پورا کرنے میں مانع ہے۔ اس لئے ہم تاریخ کا مطالعہ کر کے یہ کوشش کرتے ہیں کہ پہلی تحریکوں میں اگر تدابیر کے لحاظ سے کوئی خامی نظر آئے تو اس سے بچیں۔

الجامعہ: کیا اسلامی انقلاب صرف جمہوری راستوں سے ہی لانا چاہئے؟ جبکہ دوسری ایسی نظریاتی تحریکیں ایسی موجود ہیں جنہوں نے قوت اور ہتھیار کو بھی انقلاب لانے کا ذریعہ بنایا؟

مولانا: جو بات ہم یقین سے سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی مصنوعی ذریعے سے اگر کوئی ایسا انقلاب برپا کر دیا جائے جس کے لئے معاشرہ ذہنی واخلاقی حیثیت سے تیار نہ ہو، تو وہ انقلاب کبھی پائیدار نہیں ہوسکتا، اور معاشرے کو تیار کرنا ایک محنت طلب کام ہے۔ ایک اچھی خاصی مدت لوگوں کو اس حق کا قائل کرنے پر صرف کرنی پڑتی ہے جس حق کو ہم قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جب معاشرے کو ایک حد تک تیار کرلیا جائے اس کے بعد انقلاب برپا کرنے کے لئے ہر وہ تدبیر کی جاسکتی ہے جو جائز بھی ہو اور ان حالات میں کارگر بھی ہو، جن میں ہم کام کر رہے ہیں۔ اپنے وقت اور اپنے ملک کے حالات کو نظر انداز کر کے کوئی سکیم نہیں بنائی جاسکتی، اور اگر بنائی جائے تو یہ ناکامی پر منتج ہوگی۔

---

[1] (یہ انٹرویو محمود احمد فاروقی اور طاہر مسعود نے لیا تھا)

☆☆☆

پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین نے سالانہ میگزین ''محور'' کا تعلیم نمبر شائع کیا۔
مدیر اعلیٰ نے سیّد محترمؒ کو تحریری سوالات پیش کئے ---- ۱۹۷۷ء

محور: اسلامی نظامِ تعلیم سے کیا مراد ہے؟

مولانا: ''اسلامی نظامِ تعلیم سے مراد ایسا نظامِ تعلیم ہے جس میں تعلیمی نصاب کے جملہ اجزاء کو اسلامی اصول و نظریات کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہو معلّمین و متعلّمین دونوں کی دینی و اخلاقی تربیت کا خاص خیال رکھا گیا ہو اور عربی زبان اور کتاب و سنّت کی ضروری و اساسی تعلیمات کو نظامِ تعلیم کا جزو لازم قرار دیا گیا ہو۔''

محور: آپ کی نگاہ میں پاکستان کی بقاء و استحکام کے لئے اسلامی نظامِ تعلیم کی ضرورت و اہمیت کس قدر ہے؟

مولانا: ''پاکستان کے بقاء و استحکام کے لئے اسلامی نظامِ تعلیم کی ضرورت و اہمیت کا اندازہ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینے سے ہو سکتا ہے کہ ملک و قوم کی قیادت ہمیشہ تعلیم یافتہ طبقے ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اور ان پڑھ یا نیم خواندہ طبقے اپنے قائدین ہی کے پیچھے چلتے ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقے کے بناؤ اور بگاڑ میں نظامِ تعلیم کو جو مقام حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔''

محور: اسلامی نظامِ تعلیم کی طرف بڑھنے کی کوششوں کے راستے میں کون سی طاقتیں مزاحمت کر رہی ہیں؟

مولانا: ''اسلامی نظامِ تعلیم کی طرف پیش قدمی کے راستے میں سب سے بڑی

رکاوٹ وہ حکومت ہی ہے جو ایسے نظام سے واقف بھی نہیں ہے اور خائف و گریزاں بھی ہے۔ "

محور: آپ کے خیال میں گزشتہ ۳۰ برس میں پاکستان اسلامی نظامِ تعلیم کے قریب آیا یا اُس سے دور ہٹا؟

مولانا: گزشتہ ۳۰ برس میں پاکستان اسلامی نظامِ تعلیم کی طرف ایک قدم آگے بڑھا ہے تو دو قدم پیچھے ہٹا ہے۔

محور: آپ کے نزدیک اسلامی نظامِ تعلیم کو بروئے کار لانے کے لئے کون سے اقدامات ضروری ہیں؟ تعلیمی، تہذیبی اور ملی زندگی پر اس نظریے کے کیا اثرات مرتب ہونے چاہئیں؟

مولانا: "اسلامی نظامِ تعلیم کو بروئے کار لانے کے لئے دو طرح کے اقدامات ضروری ہیں۔ ایک وہ جو تعلیم گاہوں کے اندر سے شروع ہوں، دوسرے وہ جن کا آغاز باہر کی رائے عامہ کے دباؤ سے ہو۔ دونوں محاذوں پر پُر امن، منظم اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس لئے سیاسی، معاشی، معاشرتی میدان میں جب تک اسلامی انقلاب رونما نہ ہوگا، تعلیمی میدان میں تبدیلی آسان اور دیرپا نہ ہوگی۔ "

☆☆☆

اسلامی جمعیت طلبہ لاہور کی طرف سے سیّد مودودیؒ کی رہائش گاہ پر ایک افطار پارٹی کا اہتمام کیا گیا۔ جہاں طلبہ نے سیّد محترمؒ سے سوالات دریافت کئے ---- ۷ ستمبر ۱۹۷۷ء

سوال: اسلام میں ووٹ کا معیار کیا ہے؟

جواب: (مولانا محترم نے فرمایا) میں اس سوال کو سمجھ نہیں سکا کہ ووٹ کے معیار سے کیا مطلب ہے؟

ایک مطلب اس کا یہ ہو سکتا ہے کہ ووٹ دینے والے کا معیار کیا ہے اور ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ووٹ جس کو دیا جائے، اس کی اہلیت کا معیار کیا ہے؟

سوال کا مطلب اگر یہ ہے کہ ووٹ دینے والے کا معیار کیا ہے تو اس کا معیار صرف یہ ہے کہ وہ عاقل بالغ ہو اور اس کو یہ احساس ہو کہ میں کس کام کے لئے ووٹ دے رہا ہوں۔ عام آبادی میں بہت کم لوگوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ووٹ دینے کے معنیٰ کیا ہیں اور ووٹ دینے کے لئے کیا چیز دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جو لوگ الیکشن کی مہم چلاتے ہیں ان کا یہ فرض ہے کہ لوگوں کو ان چیزوں کی تعلیم دیں، ان کو سمجھائیں کہ ووٹ کیا چیز ہے اور اس کی ذمہ داری تمہارے اوپر کیا ہے۔ اگر ووٹر اس بات کو نہیں جانتا اور اس کو کوئی احساس نہیں ہے کہ ووٹ دینے کا کیا مطلب ہے اور اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں، اور اس میں کن چیزوں کو ملحوظ رکھنا چاہئے، تو اس کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔

بالغ رائے دہندگی کا جو طریقہ دنیا میں اختیار کیا گیا ہے اور بار بار ہر کچھ مدت کے بعد انتخابات کرنے کا جو طریقہ مقرر کیا گیا ہے، وہ اسی لئے ہے کہ مختلف جماعتیں

جب عوام میں آ کر اپنے پروگرام ان کے سامنے پیش کریں گی اور ان کو سمجھائیں گی تو عام لوگوں کا یہ شعور بڑھے گا کہ اس ملک کی بھلائی اور برائی کے ذمہ دار ہم ہی ہیں۔ ہم اگر ووٹ کا غلط استعمال کریں گے تو اس کا نقصان بھی ہمیں پہنچے گا اور اگر اس کا صحیح استعمال کریں گے تو اس کا فائدہ بھی ہمیں حاصل ہوگا۔ تو ان لوگوں کو باشعور بنانے کا یہ اعلیٰ درجے کا ذریعہ ہے۔ اگر ایک ووٹر بے شعور ہے تو اس کے پاس ووٹ کی جو طاقت ہے وہ بالکل بے کار ہے اور وہ اس کو ضائع کر دے گا۔

اگر سوال کا مقصد یہ ہے کہ ووٹ جس کو دیا جائے، اس کی اہلیت کا معیار کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ووٹر کو یہ دیکھنا چاہئے کہ میں جس کو ووٹ دے رہا ہوں، دراصل میں اسے اپنا حاکم بنا رہا ہوں، یہ حاکم اگر انصاف کرنے والا ہو، ایماندار ہو، خدا سے ڈرنے والا ہو، خودغرض نہ ہو، نفسانیت کا بندہ نہ ہو، تو یہ کام کا آدمی ہے اور مجھے اس کو ووٹ دینا چاہئے۔ اور اگر وہ بے ایمان ہو اور اس کی ساری زندگی بے ایمانی کی ہو، رشوت خوری کی ہو، حرام خوری کی ہو، تو اس کو ووٹ نہیں دینا چاہئے۔ یہ غلطی ہوگی اگر اس آدمی کو ووٹ دیا جائے۔

سوال: پاکستان کے موجودہ معاشرے میں ووٹ کا شرعی معیار کیا ہوسکتا ہے؟

جواب: ووٹ کا شرعی معیار یہی ہوسکتا ہے کہ آپ کو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ جس آدمی کو میں ووٹ دے رہا ہوں، وہ آدمی اسلام کو جانتا ہے، یا نہیں۔ دوسرا یہ کہ اس کی اپنی زندگی اسلام پر قائم ہے یا نہیں۔ اور تیسرا یہ کہ کیا اس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اسلامی نظام چلا سکے گا؟ یہ تین چیزیں دیکھی جانی چاہئیں یہی اسلامی معیار ہے۔

سوال: کیا بالغ رائے دہی کا تصور اسلامی ہے؟

جواب: بالغ رائے دہی کا تصور اسلامی اس معنی میں ہے کہ اسلام میں تمام مسلمانوں کے حقوق برابر رکھے گئے ہیں اور سٹیٹ (ریاست) کا نظام ایسا ہے کہ وہ ہر آدمی کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ خواہ وہ عالم ہو خواہ جاہل۔ تو جب ہر آدمی کی زندگی

پر نظامِ حکومت کا اثر پڑتا ہے تو ہر آدمی کو یہ حق ملنا چاہئے کہ وہ اپنی رائے دے کہ کس آدمی کے ہاتھ میں ملک کا نظام سونپا جائے۔ اس لئے بالغ رائے دہی اسلام کی رو سے ناجائز نہیں۔

قدیم زمانے میں یہ طریقہ اس لئے رائج نہیں تھا کہ اس زمانے میں اگر اس اصول کو اختیار کیا جاتا تو عملاً اس کو چلانے میں دقت ہوتی۔ مثلاً میں آپ کو بتاتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فوراً ہی یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ کون خلیفہ ہو؟ اگر بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر انتخاب ہوتا تو عرب کے سارے حصوں میں یہ خبر پہنچنے میں تین مہینے لگتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کے بعد انتخاب ہوتا اور انتخابات کے نتائج دارالحکومت میں پہنچنے تک تین چار مہینے اور لگ جاتے۔ یہ چھ سات مہینے ملک کا نظام کون چلاتا؟ ان حالات میں جب کہ عرب کے جہلاء مرتد ہونے پر بالکل تیار ہو گئے تھے۔

عوام الناس کو یہ جو بالغ رائے دہی کا حق دیا گیا ہے تو بجائے اس کے کہ اس سے فائدہ اٹھا کر عوام الناس کے ذہن کی تربیت کی جاتی اور ان کو ووٹ کا صحیح استعمال کرنے کے قابل بنایا جاتا، ہمارے ملک میں ایسی سیاسی پارٹیاں اٹھتی ہیں کہ جو یہ تلاش کرتی ہیں کہ کیا کیا کمزوری ہماری قوم میں پائی جاتی ہے، یہ قوم کن کن ذرائع سے خریدی جا سکتی ہے، کن کن ذرائع سے اس کو اپنے مطلب کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اس کی ساری کمزوریاں بھانپ کر، ان کو جانچ کر، ان کو استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، تاکہ اس قوم کو اور زیادہ خراب کیا جا سکے۔ یہ اس بالغ رائے دہی کے نظام میں نقصان کا پہلو ہے۔

اور فائدے کا پہلو یہ ہے کہ اگر ملک کے اندر ایماندار لوگوں پر مشتمل کوئی جماعت موجود ہو تو ہر انتخاب کے موقع پر وہ ملک کے باشندوں کی ذہنی تربیت کرے گی، ان کو سیاسی تعلیم دے گی، ان کے اندر دین کو سمجھنے کی قابلیت پیدا کرے گی اور ان کو یہ بتائے گی کہ دینی نظام قائم کرنے کے لئے کس قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ تو اس طرح

سے شیطان اور خدا کے بندوں کا مقابلہ مسلسل جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ آخر کار قوم ایماندار لوگوں کو پسند کرنے لگے گی، اور دھوکے باز لوگوں کو چھوڑتی چلی جائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ پاکستان بننے کے بعد اگر ہر چار پانچ سال بعد انتخابات ہوتے رہتے تو اب تک ہمارے لوگوں کا شعور کہیں سے کہیں پہنچ جاتا، لیکن انتہائی ظلم کیا گیا ہے اس قوم پر، کہ انتخاب ہوتے ہیں تو پوری بے ایمانیوں اور دھاندلیوں سے ہوتے ہیں یا پھر سرے سے ہوتے ہی نہیں۔

سوال: طلباء کن حالات میں، کس حیثیت سے اور کس حد تک سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں؟

جواب: طلبہ کو بالعموم تو Practical Politics (عملی سیاست) میں دخل نہیں دینا چاہیے، لیکن ایک موقع ایسا ہوتا ہے کہ جس میں طلباء کو اپنی طاقت پوری طرح اس غرض کے لئے استعمال کرنی ہوتی ہے کہ اس ملک کا مستقبل بُرے ہاتھوں میں نہ جانے پائے، بلکہ بھلے ہاتھوں میں جائے۔ کیونکہ اس ملک کے مستقبل میں جو کانٹے بوئے جائیں گے، ان کو چننا طلباء ہی کو پڑے گا۔ اور اس ملک کی بھلائی کے لئے اگر کسی اچھے کام کی بنا پڑے گی، تو اس کا فائدہ بھی طلبا ہی اٹھائیں گے۔ ایسی حالت میں طالب علموں پر لازماً یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح سے عوام الناس کو باخبر کرنے کی کوشش کریں اور ان کو دھوکہ دینے والوں سے بچائیں، ان کی رائے کو حق کے لئے تیار کریں۔ وہ حق کام کے لئے اپنا ووٹ استعمال کریں، اس کی انہیں تربیت دیں۔

سوال: اگر اس ملک میں الیکشن نہ ہوئے تو پھر پاکستان کی سیاست کیا رخ اختیار کرے گی؟

جواب: یہ ایسا سوال ہے کہ اس کو اللہ علیم وخبیر ہی جانتا ہے۔ انتخابات منعقد کرانے کے لئے ہی فوجی انقلاب برپا ہوا ہے۔ فوج اس لئے آئی ہے کہ منصفانہ انتخابات کرائے، اور اسی بناء پر اس کے آنے کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ اور اسی بناء پر

پارٹیوں نے جو ملک کی بھلائی چاہتی ہیں۔ ان کے ساتھ تعاون کا فیصلہ کیا۔ اب ایک شکل (الیکشن نہ ہونے کی) تو یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی آفت زمینی یا آسمانی برپا ہو جائے کہ جس کی وجہ سے انتخابات ہونے ہی نہ پائیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدانخواستہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ملک کا انتظام ہے، ان کو ہٹا کر کوئی اور گروہ آئے اور وہ انتخابات کے پروگرام کو ختم کر دے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے' لیکن میں موجودہ حکمرانوں سے یہ توقع نہیں رکھتا کہ وہ خود ہی انتخاب نہ کرائیں۔ بہرحال اُن سب صورتوں میں آدمی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ان کا نتیجہ کیا ہوگا؟ بس یہ اصولی بات سمجھ لیجئے کہ غلط کام کا نتیجہ غلط ہی نکلتا ہے، بہت سے لوگ جئے بھٹو، جئے بھٹو کرتے رہے' لیکن پانچ سات برس کے اندر ہی معلوم ہو گیا کہ جئے بھٹو کے معنی کیا ہیں' اور آخر کار بھٹو صاحب کے لئے بھی جئے بھٹو کا نعرہ مصیبت بن گیا۔ تو غلط کام کبھی صحیح نتیجہ پیدا نہیں کرتا، یہ ضروری نہیں ہے کہ جس وقت غلطی کی جائے اسی وقت بُرا نتیجہ سامنے آ جائے۔ لیکن غلط کام آج کیا جائے گا تو ہو سکتا ہے کہ دس سال بعد اس کا نتیجہ برا ہو سکتا ہے کہ غلط کام آج کیا جائے' اور اس کا بُرا نتیجہ دس سال بعد یا بیس سال بعد ظاہر ہو۔

سوال: کیا صرف اسلامی سزائیں نافذ کرنا ہی اسلامی نظام کو کامیاب بنا سکتا ہے، یا اس کے لئے عوام کو ذہنی طور پر بھی تیار کرنا پہلی ضرورت ہے؟

جواب: اصل بات یہ ہے کہ اسلام پوری زندگی کے نظام سے بحث کرتا ہے، صرف ایک قانون تعزیرات آپ کو نہیں دے دیتا۔ وہ سب سے پہلے آدمی کے اندر ایمان پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ ایمان نہ ہو تو آگے کوئی کام بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ ایمان پیدا کرنے کے بعد پھر وہ کچھ اخلاقی اصول دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرامین پہنچاتا ہے، کہ یہ ناجائز ہے اور یہ جائز ہے۔ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ اس چیز کا نتیجہ جہنم ہے اور اس چیز کا نتیجہ جنت ہے۔ یہ چیزیں جب لوگوں کے ذہن نشین کی جاتی ہیں تو اس کے بعد پھر تعلیم کا ایسا نظام قائم کیا جاتا ہے کہ لوگ تفصیل کے ساتھ قرآن سے، حدیث سے، اسلامی قانون سے واقف ہوں۔ اس کے ساتھ پھر اس بات کی ضرورت

بھی ہوتی ہے کہ معاشرے میں جو بُرے اور غلط طریقے رائج ہیں ان کی اصلاح کی جائے۔ معاشرتی نظام کو درست کیا جائے، لوگوں کے رہن سہن کے طریقوں کو درست کیا جائے۔ لوگوں کے اندر انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا جائے اور ان کو نفسانیت کے پھندے سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔ پھر ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ اسلامی قانونِ تعزیرات آتا ہے، اگر اتنے انتظامات کے باوجود' کہ آپ کو خدا سے بھی ڈرایا گیا، آپ کو خدا کے احکام بھی پہنچائے گئے' آپ ایمان بھی لے آئے، آپ کو دینی تعلیم بھی دی گئی، آپ کی روٹی کا بندوبست بھی کر دیا گیا' آپ کو بھوکا مرنے کے لئے چھوڑا بھی نہیں گیا۔ یہ سارے انتظامات کرنے کے باوجود آپ چوری کرتے ہیں تو آپ اس قابل نہیں کہ آپ اس صالح سوسائٹی میں سالم رہیں۔ آپ کا ہاتھ واقعی کٹنا چاہئے اور ایسے ہی دوسری تعزیرات ہیں۔

پھر یہ جو تعزیرات ہیں، یہ ایک پورے نظام کا ایک حصہ ہیں۔ صرف خود اپنی جگہ قائم بالذات کوئی چیز نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ مثلاً امریکہ میں ہاتھ کاٹنے کا قانون جاری کر دیا جائے تو کہا جائے کہ وہاں اتنا اسلام جاری ہو گیا ہے۔ حالانکہ بالکل کوئی اسلام جاری نہیں ہوا، کیونکہ جڑ تو وہاں لگی ہی نہیں۔

سوال: اسلامی نظامِ حکومت میں سیاسی جماعتوں کی کس حد تک اجازت ہے؟

جواب: اسلامی نظامِ حکومت میں سیاسی جماعتیں پیدا ہو سکتی ہیں' کیونکہ لوگوں کے فہم میں اور ان کی عقل میں تفاوت ہوتا ہے، سب انسان یکساں طور پر نہیں سوچتے۔ اس لئے قرآن و حدیث اور سنت، ہر چیز کا مطالعہ کرنے کے باوجود' آپ دیکھتے ہیں کہ فقہاء کے درمیان اختلافات ہوئے، مختلف مذاہب بنے، مذہبِ حنفی بنا، مذہبِ شافعی بنا، مذہبِ مالکی بنا۔ تو اس طرح سے سیاسی معاملات کے متعلق بھی سب لوگوں کی رائے یکساں نہیں ہو سکتی۔ جماعتیں ہو سکتی ہیں۔ حضرت علیؓ کے زمانۂ حکومت میں باقاعدہ جماعت وجود میں آئی تھی' تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہارا حصہ بیت المال میں سے تمہیں ادا کریں گے۔ تم مسجدوں میں آؤ' ہمارے ساتھ نماز پڑھو، ہر چیز کی تمہیں اجازت ہے' لیکن

اگر مسلح انقلاب برپا کر کے حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرو گے تو ہم تم سے لڑیں گے۔

یعنی اگر کوئی پُرامن جماعت کوئی سیاسی رائے رکھتی ہے اور اس کے متعلق وہ لوگوں کی رائے ہموار کرنے کی کوشش کرتی ہے تو اس پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ لیکن مسلح انقلاب برپا کر کے حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنے کا حق کسی کو نہیں۔

سوال: اسلامی نظامِ حکومت میں حزبِ اختلاف یا حزبِ اقتدار کا کوئی تصور موجود ہے؟

جواب: جی نہیں' ایسا کوئی تصور موجود نہیں۔ ہاں یہ ہے کہ لوگوں کے نمائندے مجلسِ شوریٰ میں آئیں گے۔ کوئی تجویز اگر آتی ہے تو ہوسکتا ہے کہ وہ اس کی مخالفت کریں یا ہو سکتا ہے کہ اس کی تائید کریں۔ لیکن اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ جس نے تائید کی وہ ہمیشہ کے لئے مؤید بن گیا اور جس نے مخالفت کی وہ ہمیشہ کے لئے مخالف بن گیا۔ کسی دوسرے مسئلے میں جو کل مؤید تھا آج مخالف ہو جائے گا اور جو آج مؤید ہے کل مخالف ہو جائے گا۔ لیکن مخالفت کے معنیٰ دشمنی کے نہیں ہیں، عداوت کے نہیں ہیں۔ بلکہ مخالفت کے معنیٰ اختلاف کے ہیں۔ جو لوگ اختلاف کریں گے۔ ان کو اس بات کا حق ہے۔

یہ جو موجودہ زمانے کا پارٹی سسٹم ہے' اس میں یہ عجیب بات دیکھنے میں آئی ہے، ایک پارٹی کی طرف سے کوئی قرارداد آتی ہے' یا وہ کسی پالیسی کو اختیار کرتی ہے' تو اس پارٹی کے بعض افراد اٹھ کر اس سے اختلاف کرتے ہیں اور اس کے خلاف دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں' مگر جب ووٹ دینے کا وقت آتا ہے تو اُسی پارٹی کے حق میں جا کر ووٹ دیتے ہیں' کیونکہ اس پارٹی کے وہ ممبر ہیں۔ یہ بے ایمانی ہے اور یہ بے ایمانی اسلام نہیں سکھاتا۔ اگر تم کسی بات کو صحیح نہیں سمجھتے، تو اس کے حق میں رائے کیسے دیتے ہو؟ یہ گروہ بندی ناجائز ہے!

☆☆☆

ریڈیو پاکستان نے اپنے قومی پروگرام میں سیّد مودودیؒ کا یہ انٹرویو نشر کیا۔
اسلامی جمعیت طلبہ اور اسلامی جمعیت طالبات، اسلام کی دعوت کے لئے
جو کام کر رہے ہیں، اس مکالمے میں اُس کام کے بنیادی نکات اجاگر ہوتے ہیں
اس لئے قندِ مکرّر کے طور پر پیش ہے---- ۹-۱۰ مارچ ۱۹۷۸ء

نمائندہ ریڈیو: جناب قائدِ تحریکِ اسلامی مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ!

ریڈیو پاکستان کے لئے یہ لمحہ بہت مبارک ہے کہ ریڈیو کا یہ نمائندہ جنابِ والا کی خدمت میں حاضر ہے۔ استدعا یہ ہے کہ خداداد مملکتِ پاکستان کے مسلمان تیس سال کی بے راہ روی کے بعد اللہ کی رسی کو پکڑنا چاہتے ہیں' اور اللہ کے فضل سے آج اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں رہا ہے۔ مولانا محترم! رہنما تو اور بھی ہیں لیکن ہماری پریشان خیالی کا عالم یہ ہے کہ ع

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

آج صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کے لئے ہم ہادئ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے طالب ہیں' تاکہ ہماری دنیا اور دین دونوں سنور سکیں۔ مولانا محترم! پہلی گزارش تو یہ ہے کہ آپ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ حکومت کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آج کے دور میں ہم اس طریقِ حکومت کو کس طرح اپنا سکتے ہیں۔ آج کے دور میں ایک ترقی یافتہ مملکت کے حسن و قبح کو پرکھنے کے لئے حسبِ ذیل چار پہلوؤں سے جائزہ لیا جاتا ہے:

۱- اقتدارِ اعلیٰ کس کو حاصل ہے؟

۲- مقننہ کی نوعیت و اختیارات و حدود کیا ہیں؟

۳- عدلیہ کس حد تک آزاد اور بے لاگ ہے؟

۴- انتظامیہ کی حدود، اختیارات اور خصوصیات کیا ہیں؟

اس نقطۂ نگاہ سے آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک پر روشنی ڈالیں۔ ہمیں آج کے لئے، آنے والے کل کے لئے، بلکہ ہمیشہ کے لئے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور ارشادات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے ایک خزینے کی تلاش ہے۔ جناب والا! میری پہلی گزارش تمام ہوتی ہے۔

جواب: مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے مجھ کو یہ موقع دیا کہ میں ملک کے مسلمانوں کو عموماً اور ملک کے حکمرانوں کو خصوصاً یہ بتاؤں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظامِ حکومت قائم فرمایا تھا اس کی بنیاد اور اس کی شکل کیا تھی۔

بنیادی طور پر جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی وہ یہ تھی کہ اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نہیں ہے، زمین خدا کی ہے، ہوا اور پانی اور روشنی اور ہر وہ چیز جس پر ہم زندگی بسر کرتے ہیں، سب کچھ خدا کا ہے۔ یہ جسم جو ہمیں حاصل ہے اور اس کے اندر جو طاقتیں ہیں اور اس کے جو اعضا ہیں، سب خدا کے بخشے ہوئے ہیں۔ ہمیں یہ حق پہنچتا ہی نہیں کہ ہم خود اقتدارِ اعلیٰ کا دعویٰ کریں، یا کسی ایسے شخص یا گروہ، یا ادارے کا دعویٰ قبول کریں جو اقتدارِ اعلیٰ کا مدعی ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اوّلین بات جو انسان کے ذہن نشین کرانے کی کوشش فرمائی اور جس پر ایمان لانے کی لوگوں کو دعوت دی، وہ یہی تھی کہ ملک بھی اللہ تعالیٰ کا ہے، حکم بھی اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس کے سوا کسی کو انسان کے لئے قانون بنانے کا حق نہیں ہے۔

دوسری بات جو اسی طرح بنیادی اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو براہِ راست قانون نہیں دیتا' بلکہ اپنے رسولوں کے ذریعے سے دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے منتخب کئے ہوئے حکمران

نہیں تھے۔ نہ خود بنے ہوئے حکمران تھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس منصب پر مقرر فرمایا تھا کہ آپ لوگوں کو تعلیم بھی دیں، ان کی تربیت بھی کریں، ان کے ذہن و فکر اور اخلاق کو بھی ٹھیک کریں۔ ان کو اللہ تعالیٰ کے احکام بھی پہنچائیں اور جو لوگ ان احکام کو قبول کر کے ان کے برحق ہونے پر ایمان لائے ہوں ان کے ذریعہ سے احکامِ الٰہی کو نافذ بھی فرمائیں۔

تیسری اہم چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو بتائی اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دی، وہ آخرت کا تصور ہے۔ اگر انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ نہ سمجھے اور اس کو یہ یقین نہ ہو کہ ایک دن اسے مر کر اپنے خدا کے سامنے جانا ہے، اور اپنے تمام اعمال کا جواب دینا ہے۔ تو وہ نہ اسلام کے راستے پر چل سکتا ہے، نہ حقیقت میں صحیح انسان بن سکتا ہے۔

ان عقائد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے تیرہ سال مکہ معظمہ میں دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے لوگوں کے سامنے پیش کیا، اور جن لوگوں نے ان کو مان لیا، ان کو آپ نے ایک جماعت، ایک اُمت کی شکل میں منظم کیا۔

حضورؐ کے زمانۂ قیامِ مکہ کے آخری تین سال ایسے تھے جن میں مدینۂ منورہ کے باشندوں کی ایک چھوٹی سی جماعت ایمان لے آئی اور اس نے آپ کو دعوت دی کہ آپ ان کے شہر میں سب مسلمانوں کے ساتھ تشریف لے آئیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بہت صحیح بات فرمائی ہے کہ ”مدینے کو قرآن نے فتح کیا ہے۔“ یعنی کوئی تلوار نہیں تھی، کوئی جابرانہ طاقت نہیں تھی جس سے مدینے کے لوگ اسلام کے پیرو بنے ہوں، بلکہ قرآن مجید جب ان کو پہنچا، اور مکہ معظمہ میں قرآن کی جو سورتیں نازل ہوئی تھیں وہ ان کے علم میں آئیں، تو وہ نہ صرف یہ کہ سچے دل سے ایمان لے آئے، بلکہ انہوں نے اپنی چھوٹی سی بستی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی اہلِ ایمانؓ کو تشریف لے آنے کی دعوت دیدی۔ یہ دعوت اس بات کی نہ تھی کہ آپ اور مکے کے مسلمان ان کے ہاں پناہ گزیں ہوں۔ بلکہ اس بات کی دعوت تھی کہ حضورؐ ان کے معلم، مربی اور

فرمانروا ہوں، مہاجرین و انصار ایک اُمتِ مسلمہ بن جائیں اور مدینے میں وہ نظامِ زندگی قائم ہو جس پر یہ اُمت ایمان لائی ہے۔ اس طرح جس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے پہنچے، اسی روز اسلامی حکومت کی بنا پڑ گئی۔

اس حکومت کا اوّلین کام یہ تھا کہ لوگوں میں اسلام کا علم پھیلایا جائے۔ کیونکہ اسلام جہالت کا نام نہیں، علم کا نام ہے۔ حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں نے اپنی پوری قوت اس بات پر صرف کر دی کہ لوگ دین کو سمجھیں اور سمجھ کر ایمان لائیں۔ جوں جوں یہ علم پھیلتا گیا اور لوگ اس کو جان کر مانتے گئے، اسلام کی طاقت بڑھتی چلی گئی اور اس کی بنیاد بھی مضبوط ہوتی چلی گئی۔

دوسرا عظیم کام جو آپ نے کیا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے اخلاق درست کئے، اور ایک ایسا اسلامی معاشرہ پیدا کیا، جس کی ہر چیز اخلاقِ صالحہ پر مبنی تھی۔ کوئی نظامِ حکومت خواہ کیسا ہی اعلیٰ مرتبے کا ہو، اور اس کے قوانین خواہ کتنے ہی بہتر ہوں، اگر اس کی عمارت عمدہ اخلاق کی مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو، اگر اس کے چلانے والے بلند سیرت و کردار کے مالک نہ ہوں، اور اگر وہ معاشرہ جس میں اسے قائم کیا گیا ہو ایمان دار اور خدا ترس نہ ہو، تو وہ کبھی کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اس لئے حضورؐ نے ایمان کی دعوت اور علمِ دین کی اشاعت کے بعد سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا، وہ تزکیۂ اخلاق تھا۔ آپ کے قائم کئے ہوئے نظامِ حکومت کی فطرت ہی یہ تقاضا کرتی تھی کہ لوگوں کے اخلاق ٹھیک اس نظام کے مزاج کے مطابق ہوں۔ اس صورت میں احکام کو نافذ کرنے کے لئے قوت استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جبر و قہر کے ساتھ زبردستی اطاعت کرانے اور لوگوں کو دبا کر فرمانبردار بنانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بس یہ کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ فلاں چیز کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور فلاں چیز سے منع فرمایا ہے۔ اس کے بعد لوگ خود بخود ان فرامین کی تعمیل کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت میں کوئی پولیس نہ تھی۔ کوئی جیل خانہ نہیں تھا۔ کوئی جاسوسی نظام نہیں تھا۔ اس بات کا تصور تک نہ کیا جا سکتا تھا کہ آپ کی زبانِ مبارک سے کوئی حکم لوگوں کو پہنچے اور وہ

اس کی خلاف ورزی کریں۔

اس کے لئے امتناعِ شراب ہی کے معاملے کو بطورِ مثال لے لیجئے۔ جس وقت مدینے کی بستی میں یہ اعلان ہوا کہ شراب حرام کر دی گئی ہے، اسی وقت شراب کے مٹکے توڑ دیئے گئے، اور پینے والوں میں سے جس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ اس طرح کی پابندیٔ قانون کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کے برعکس امریکہ میں اربوں روپیہ اس کام پر صرف کیا گیا کہ لوگوں کو شراب کی برائی اور اس کے نقصانات کا قائل کیا جائے۔ بہت بڑے پیمانے پر اس کے خلاف پروپیگنڈا کیا گیا۔ اور رائے عامہ کی تائید سے امریکہ کے دستور میں ترمیم کر کے امتناعِ شراب کا قانون پاس کیا گیا۔ لیکن جس روز یہ قانون پاس ہوا اس کے دوسرے ہی روز سے پورے ملک میں اس کی خلاف ورزی شروع ہو گئی۔ طرح طرح کی زہریلی شرابیں پی جانے لگیں، اور یہ وبا اس قدر خطرناک صورت اختیار کر گئی کہ آخر کار اس قانون کو منسوخ کرنا پڑا۔ اب ذرا مقابلہ کر کے دیکھ لیجئے۔ ایک جگہ بس ایک حکم سنا دیا جاتا ہے اور فوراً اس کی تعمیل کی جاتی ہے۔ دوسری جگہ بڑی تیاری کے بعد لوگوں کی مرضی سے قانون بنایا جاتا ہے اور لوگ اس کو توڑ ڈالتے ہیں۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ ایک صالح نظامِ حکومت کی بنیاد ایمان اور اخلاق پر قائم ہوتی ہے۔ جہاں یہ دونوں چیزیں موجود نہ ہوں وہاں آپ کاغذ پر خواہ کتنا ہی اچھا دستور اور قانون بنا لیجئے، زمین پر وہ کبھی نافذ نہیں ہو سکتا۔

سوال: موجودہ زمانے کی مغربی جمہوریت کی جو چار خصوصیات ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ خصوصیات کس شکل میں تھیں؟

جواب: جہاں تک اقتدارِ اعلیٰ کا تعلق ہے، میں بتا چکا ہوں کہ حضورؐ کی تعلیم کے مطابق یہ اقتدار صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ رہی نظامِ حکومت کی تین شعبوں میں تقسیم، یعنی منتظمہ، مقننہ اور عدلیہ تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت میں نہ تھی۔ حضورؐ قانون دینے والے بھی تھے، جج بھی تھے اور حاکم بھی۔ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نبی کی حیثیت سے یہ تمام اختیارات آپ کی ایک ہی ذات میں جمع تھے۔

لیکن حضورؐ کا قاعدہ یہ تھا کہ جو حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ملتا تھا اس میں تو آپ لوگوں سے بے چون وچرا اطاعت کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس میں کسی کے لئے کلام کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی، لیکن جس معاملہ میں اوپر سے کوئی حکم آیا ہوا نہ ہوتا تھا اس میں آپ صحابہؓ سے خود بھی مشورہ فرماتے تھے۔ صحابہؓ کو بھی یہ حق دیتے تھے کہ وہ آپ کی رائے سے اختلاف کریں اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ آپؐ نے اپنی رائے چھوڑ کر ان کی رائے قبول فرمائی ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ جنگِ بدر کے موقع پر آپؐ نے ابتداء میں جس جگہ پڑاؤ کیا تھا اس کے متعلق ایک صحابی نے اٹھ کر پوچھا کہ یہ جگہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اختیار فرمائی ہے یا یہ آپؐ کی اپنی رائے ہے؟ آپؐ نے فرمایا ''نہیں، میں نے خود یہ جگہ تجویز کی ہے۔'' اس پر انہوں نے عرض کیا کہ ''اس کے بجائے فلاں مقام جنگی حیثیت سے زیادہ موزوں ہے۔'' اور آپؐ نے ان کی رائے قبول فرمالی۔

اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو دو طرح کی تربیت دے رہے تھے۔ ایک اس بات کی تربیت کہ جب خدا کی طرف سے کوئی حکم آئے تو اس کی بے چون وچرا اطاعت کرو۔ دوسری تربیت اس بات کی کہ جس معاملے میں خدا کا حکم نہ ہو اس میں اہل الرائے سے مشورہ بھی کیا جائے، لوگوں کو بحث کا کھلا حق بھی دیا جائے، حضورؐ کی اپنی رائے تک سے اختلاف کرتے ہوئے دوسری رائے بھی پیش کی جاسکے اور مشورے کے بعد جو بات طے ہو اس پر عمل کیا جائے۔

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔ جنگِ احزاب کے موقع پر جب حالات بہت نازک ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ دشمنوں کے چند قبائل، جن کی بڑی طاقت وہاں جمع تھی، ان کو مدینے کی پیداوار کا ایک حصہ پیش کر کے مخالفین کی جتھہ بندی سے انہیں الگ کر دیا جائے۔ انصار کے سرداروں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ ''یہ معاملہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے حکم سے طے فرما رہے ہیں یا یہ آپ کا اپنا خیال ہے؟'' حضورؐ نے فرمایا ''یہ میرا اپنا خیال ہے، میں تمہیں اس خطرے سے نکالنا چاہتا ہوں جس میں تم پڑ گئے ہو۔'' انہوں نے کہا، ''یا رسول اللہ، جب ہم کافر تھے اس زمانے میں بھی یہ

قائل ہم سے ایک حبہ تک نہ لے سکے تھے اور اب تو ہم مسلمان ہیں۔ اب ہم سے کوئی چیز کیسے لے سکتے ہیں۔" چنانچہ اسی وقت ان کے کہنے کے مطابق یہ معاملہ ختم کر دیا گیا۔ اس مثال سے بھی آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ حکومت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ جن معاملات میں اللہ کا حکم ہوتا تھا وہاں کوئی جمہوریت نہ تھی اور جن معاملات میں اوپر کا حکم نہ ہوتا تھا ان میں پوری جمہوریت تھی۔

اب عدلیہ کے مسئلے کو لیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قاضی تھے۔ اس لئے عدلیہ بھی پوری طرح آپ ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اس معاملے میں آپ کا طریقہ یہ تھا کہ نہ صرف انصاف کیا جائے بلکہ لوگ بھی یہ دیکھ لیں کہ انصاف کیا جا رہا ہے۔ تمام مقدمات کی سماعت کھلی عدالت میں ہوتی تھی۔ خفیہ سماعت کی کوئی نظیر آپ کے طریقِ عدل میں نہیں ملتی۔ بڑا مشہور واقعہ ہے کہ فتحِ مکہ سے پہلے ایک صحابی نے مشرکینِ مکہ کے نام ایک خط لکھ دیا جس میں ان کو مطلع کیا گیا تھا کہ تم پر حملہ ہونے والا ہے۔ وہ خط پکڑا گیا۔ اب یہ صریح جاسوسی کا معاملہ تھا۔ اس زمانے کے لوگ کہیں گے کہ ایسا خطرناک معاملہ تو بند کمرے میں پیش ہونا چاہئے تھا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبویؐ میں اس کی کھلی سماعت فرمائی۔ دوسرا اہم قاعدہ آپ کی عدالت کا یہ تھا کہ کسی مقدمے کا فیصلہ فریقین کی بات سنے بغیر نہ کیا جائے، اور کسی شخص کو صفائی کا پورا موقع دیئے بغیر ایک لمحے کے لئے بھی اس کے کسی بنیادی حق سے محروم نہ کیا جائے۔ حضورؐ نے مدینہ کے باہر جو قاضی مقرر فرمائے تھے ان کو بھی آپؐ کی ہدایت یہ تھی کہ فریقین کی بات سنے بغیر کسی معاملے کا فیصلہ نہ کریں۔ عدالت کے کام میں سفارش کا دروازہ آپؐ نے بڑی سختی کے ساتھ بند کر دیا تھا۔ فتحِ مکہ کے بعد قریش کے ایک معزز خاندان کی عورت نے چوری کا ارتکاب کیا۔ اس کے خاندان نے کوشش کی کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ حضرت اسامہؓ بن زیدؓ سے، جو حضورؐ کو نہایت عزیز تھے، سفارش کرائی گئی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم حدود اللہ کے معاملے میں سفارش کرتے ہو؟ تم سے پہلے جو قومیں گزر چکی ہیں وہ اسی لئے تباہ ہوئیں کہ ان کے عام آدمی جب کوئی جرم کرتے تھے تو

ان کو قانون کے مطابق سزا دی جاتی تھی، اور بڑے لوگ جب وہی جرم کرتے تھے تو ان کے ساتھ رعایت برتی جاتی تھی۔ خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔'' اس طرح آپؐ نے سفارش کا دروازہ ہی بند نہ کیا بلکہ یہ اصول بھی قائم فرما دیا کہ قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ یہ اصول بھی آپ نے قائم فرما دیا کہ............ اگر کوئی شخص عدالت کو دھوکا دے کر اپنے حق میں غلط فیصلہ حاصل کر لے تو اس کا فائدہ وہ دنیا ہی میں اٹھا سکے گا۔ آخرت میں خدا کی پکڑ سے کوئی چیز اسے نہ بچا سکے گی۔

اس کے بعد مقننہ کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ جو دین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے اس میں چونکہ بنیادی طور پر قانون اللہ تعالیٰ کا تھا اور وہی قانون بنانے کا حق رکھتا تھا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت قانون ساز کی نہ تھی بلکہ قانون کو نافذ کرنے والے، اس کی تشریح کرنے والے اور لوگوں کو اس کے مطابق عدل وانصاف کا نظام چلانے کی تربیت دینے والے کی تھی۔ آپؐ نے مسلمانوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ کا قانون کیا ہے اور پھر اس کی وہ تشریح فرمائی جو سنت میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں چوری کی سزا کا حکم بڑے مختصر الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ اس سے زائد کوئی تفصیل قرآن میں نہیں ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے جس نے ہمیں بتایا کہ اس حکم پر عمل کن حالات میں ہوگا اور کن حالات میں نہ ہوگا۔ چوری کسے کہتے ہیں اور کسے نہیں کہتے۔ کس قسم کے اور کتنے مال کی چوری کے لئے یہ سزا ہے اور اس پر عمل کس طرح ہوگا۔ اگر سنت کے ذریعے سے قرآن کے حکم کی یہ تشریح ہمیں نہ ملی ہوتی تو ہم اس حکم کی کبھی صحیح تعمیل نہ کر سکتے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضورؐ خود قانون ساز نہیں تھے بلکہ اصل قانون ساز اللہ تعالیٰ تھا اور آپ اس کے مقرر کردہ سرکاری شارح تھے۔ اس طرح جس چیز کو ہم اسلامی قانون کہتے ہیں وہ قرآن اور سنتِ رسولؐ کے مجموعے کا نام ہے۔

قانون نافذ کرنے کے معاملے میں جو نظام آپ نے قائم فرمایا تھا اس کے بڑے

بڑے اصول یہ تھے کہ لوگوں کو جہاں تک ممکن ہو سزا سے بچاؤ۔ قاضی کا کسی قصور وار کو چھوڑ دینے کی غلطی کرنا اس سے بہتر ہے کہ وہ بے قصور کو سزا دینے میں غلطی کرے۔ آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ لوگ خود کرلیں، یا کسی کے قصور کو معاف کرنا ہو تو معاف کر دیں، یا کسی کے جرم و گناہ پر پردہ ڈالنا ہو تو ڈال دیں۔ یہ سب کچھ عدالت میں معاملہ پہنچنے سے پہلے تک ہوسکتا ہے، لیکن جب عدالت تک معاملہ پہنچ جائے تو کوئی معافی اور پردہ پوشی نہیں ہوسکتی۔ اس کے بعد تو پھر عدالت ہی قانون کے مطابق فیصلہ کرے گی۔ عدالت کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کی ہر کوشش کو آپ نے سختی کے ساتھ منع فرما دیا۔ اور قاضی کو قرآن وسنت اور خود اپنی سمجھ سوجھ کے مطابق بے لاگ فیصلہ دینے کے لئے آزاد قرار دیا۔ آپؐ نے لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ علم کے بغیر فیصلہ کرنا، یا علم رکھتے ہوئے غلط فیصلہ کرنا سخت گناہ ہے۔ صحیح قاضی وہ ہے جو قانون کا علم رکھتا ہو اور اپنے علم کے مطابق بے رو و رعایت فیصلہ کرے۔

اس سلسلے میں چند باتیں اور سمجھ لینی چاہئیں۔ موجودہ زمانے کے سیاسی نظریات کو بنیاد بنا کر عہدِ رسالتؐ کے معاملات کو اچھی طرح نہیں سمجھا جاسکتا۔ مثلاً اس زمانے میں ریاست کے تین شعبے ہوتے ہیں۔ انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ۔ پھر آئینی طریقے سے یہ طے کیا جاتا ہے کہ ان شعبوں کے حدود کیا ہیں۔ مگر اس زمانے میں صورتِ معاملہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینے تشریف لے جانے سے پہلے وہاں کے بڑے بڑے گھرانوں کے الگ الگ احاطے ہوتے تھے جن کے اندر ان کی زمینیں، ان کے باغات، ان کے رہنے سہنے کے گھر اور ان کے سقیفے (یعنی چوپالیں اور پنچایت خانے) .... ہوتے تھے۔ وہاں قبائلی نظام رائج تھا اور ہر قبیلے کے لوگ اپنے معاملات کو خود چلاتے تھے۔ مکہ معظمہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر اہلِ مدینہ کے ایک بڑے گروہ نے بیعت کی، تو آپؐ نے خود ان کی درخواست پر بارہ نقیب مقرر فرما دیئے جو اپنے اپنے قبیلوں میں زیادہ قابل، زیادہ بااثر اور زیادہ بااعتماد تھے۔ اور یہ ہر نقیب کی ذمہ داری تھی کہ اس کے قبیلے کے مختلف گھرانوں میں جو صالح اور معتبر

سردار ہوں ان کی مدد سے اخلاق اور معاملات کو درست رکھیں۔ قبیلوں اور گھرانوں میں جو لوگ فطری طریقے سے سردار پائے جاتے تھے انہی میں سے ایمان لانے والوں کو آپؐ نے سربراہ بنا دیا تھا۔ پھر جب حضورؐ خود مدینہ تشریف لے گئے تو اس نظام کو آپ نے برقرار رکھا۔ فرق جو کچھ واقع ہوا وہ یہ تھا کہ شہر کے مشرک سرداروں کی جگہ ایمان لانے والوں کو سرداری کا مقام حاصل ہو گیا۔ یہ تغیر ووٹوں کے ذریعے نہیں ہوا بلکہ یہ اسلامی انقلاب کا فطری تقاضا تھا کہ مشرک پیچھے ہٹتے چلے گئے اور مسلمان سردار آگے آتے گئے۔ شہر کے معاملات کو چلانے کے لئے حضورؐ مہاجرین کے اہل الرائے اور انصار کے سرداروں سے مشورہ فرماتے تھے۔ یہ مجلسِ مشاورت موجودہ زمانے کی مقننہ یا پارلیمنٹ سے کوئی مشابہت نہ رکھتی تھی۔ مسلمانوں میں جو لوگ بھی بااثر اور قابل تھے، خواہ وہ مہاجرین میں سے ہوں یا انصار میں سے ہر اہم موقع پر، ہر اہم معاملے میں۔ جب بھی ضرورت ہوتی تھی مشورے کے لئے ان کو بلا لیا جاتا تھا۔ وہ عوام کے منتخب کئے ہوئے نہیں تھے۔ ان کا کوئی باقاعدہ الیکشن نہیں ہوا تھا' لیکن وہ ایسے بااثر، ذی علم اور سمجھدار لوگ تھے کہ اگر موجودہ زمانے کے طریقے پر الیکشن بھی ہوتے تو انہی کو منتخب کیا جاتا۔ ہر معاملے میں ان سب کا بلایا جانا ضروری نہ تھا۔ جس وقت کسی مسئلے میں مشورے کی حاجت پیش آتی تو اس وقت جو لوگ بھی موجود ہوتے ان سے رائے لے لی جاتی' اور بڑے اہم مسائل میں بس یہ اعلان کرا دیا جاتا کہ مسجد نبوی میں لوگ حاضر ہو جائیں۔

مدینے سے باہر جب اسلامی مملکت پھیلنی شروع ہوئی تو مختلف علاقوں میں گورنر مقرر کر دیئے گئے' وہی اپنے علاقے کے منتظم بھی تھے اور سپہ سالار بھی۔ اس زمانے میں کوئی مستقل فوج نہیں تھی۔ جس وقت بھی ضرورت ہوتی رضاکارانہ طور پر لوگ جہاد کے لئے آ جاتے تھے۔ حضورؐ نے مختلف علاقوں میں قاضی بھی مقرر فرما دیئے تھے جن کے عدالتی کام میں کوئی گورنر دخل نہ دے سکتا تھا۔ آپؐ نے ہر علاقے میں ایسے لوگ بھی مقرر کئے تھے جو باشندوں کو اسلام کی تعلیم دیں۔ تعلیم سے مراد یہ نہیں تھی کہ لوگوں کو لکھنا

پڑھنا سکھائیں' بلکہ اس سے مراد یہ تھی کہ وہ عوام کو قرآن سنائیں، اس کے معانی و مطالب سمجھائیں' اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت سے ان کو آگاہ کریں۔ یہ کام زیادہ زبانی تلقین کے ذریعے سے کیا جاتا تھا اور معلمین لوگوں کی اخلاقی اور ذہنی تربیت اسی طریقے پر کرتے تھے۔ جس طریقے پر حضورؐ نے خود ان کی تربیت فرمائی تھی۔ مثال کے طور پر جب مکہ معظمہ فتح ہوا تو حضورؐ نے حضرت عتابؓ بن اسید کو گورنر اور حضرت معاذؓ بن جبل کو معلم مقرر فرمایا تھا۔

زکوٰۃ کے نظام کی صورت یہ تھی کہ کہیں آپ نے باقاعدہ تحصیل دار مقرر کئے تھے اور بعض علاقوں میں قبیلوں کے سرداروں کو اس کی تحصیل کا کام سپرد فرما دیا تھا۔ جہاں غیر مسلم آبادی نے اطاعت قبول کر کے خراج ادا کرنے کا معاہدہ کیا تھا وہاں بھی خراج کی تحصیل کے لئے کوئی مستقل تحصیلدار مقرر نہ تھا۔ جب خیبر فتح ہوا اور وہاں کے باشندوں نے نصف پیداوار ادا کرنا قبول کر کے صلح کر لی تو فصل کی کٹائی کے وقت حضورؐ کسی صحابیؓ کو بھیج دیتے تھے اور وہ پیداوار کا نصف نصف الگ کر کے یہودیوں کو اختیار دے دیتے تھے کہ دونوں ڈھیروں میں سے جو ڈھیر چاہیں' اٹھا لیں۔ تاریخ میں یہ واقعہ موجود ہے کہ جب اس طریقے پر خراج لیا گیا تو یہودی پکار اٹھے کہ اسی انصاف پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ یہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نظامِ حکومت کا ایک مختصر خاکہ۔

سوال: مولانا اس ساری تفصیل کے بعد جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نظامِ حکومت کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے۔ آدمی کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج نہ تو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جیسی جامع شخصیت موجود ہو سکتی ہے' نہ آج ایسا کوئی تربیت یافتہ گروہ موجود ہے جیسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفائے راشدین اور صحابۂ کرامؓ کی صورت میں تیار فرمایا تھا' اور نہ وہ اخلاقی تربیت اور وہ معاشرہ موجود ہے جس معاشرے کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیار فرمایا تھا۔ اب اگر آج اس بگڑے ہوئے معاشرے میں ہم اسلام کے نظام کو نافذ کرنے کی تیاری

کریں تو اس میں اوّل تو ان چاروں خصوصیات کو جو آج کے دورِ جدید کی ریاست کی خصوصیات تصوّر کی جاتی ہیں، کس طرح سے اسلامی نظام کے سانچے میں ڈھالا جائے گا؟ دوسرے یہ کہ آج اس بگڑے ہوئے معاشرے کو اس معیاری معاشرے میں کس ترتیب و تدریج کے ساتھ تبدیل کیا جائے؟ اس پر آپ کچھ اظہارِ خیال فرمائیں گے؟

جواب: اس معاملے میں سب سے پہلی بات جو سمجھ لینی چاہئے وہ یہ ہے کہ جس چیز کا نام اسلامی نظام ہے وہ کسی بے ایمان اور بدکردار حکومت کے ہاتھوں سے نہیں چل سکتا۔ کوئی خدا سے بے خوف بیوروکریسی اسے نہیں چلا سکتی۔ کسی ایسی آبادی میں وہ ٹھیک طور سے نہیں چل سکتا جس کی اخلاقی حالت بالعموم خراب ہو اور خراب کی جاتی رہی ہو۔ ہم نے ایک مدّت تک بادشاہی نظام کے تحت زندگی بسر کی ہے جو پوری طرح اسلامی نظام نہیں تھا مگر پھر بھی اس میں اسلامی قانون رائج تھا اور عام لوگوں کی تعلیم و تربیت کا کام علماء اور صوفیاء انجام دیتے تھے۔ اس وجہ سے اگرچہ وہ معاشرہ اس درجہ کا نہیں تھا جس درجے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں تھا، لیکن اس کے باوجود نہ لوگوں کی عام اخلاقی حالت اتنی بگڑی تھی جتنی بعد میں بگڑی اور نہ لوگ اسلام کے علم سے اس قدر بے بہرہ تھے جس قدر بعد میں ہوئے۔ شراب نوشی مسلمانوں میں تقریباً ناپید تھی۔ لوگ گناہ کرتے تھے، مگر علانیہ بے باکی کے ساتھ نہ کرتے تھے .... اٹھارھویں صدی کے وسط میں، جب انگریزی حکومت اوّل اوّل بنگال میں قائم ہوئی، اس زمانے کے بعض انگریز مصنفین لکھتے ہیں کہ چوری وہاں ناپید تھی اور چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں سے جھوٹ کی کوئی توقع نہیں کرتا تھا۔ کوئی شخص یہ خیال نہیں کرسکتا تھا کہ عدالت میں جا کر کوئی مسلمان جھوٹی گواہی دے گا۔ مسلمانوں کی عام آبادی لکھی پڑھی تھی بلکہ سو فیصد مسلمان خواندہ تھے۔

یہ اٹھارھویں صدی کے آخر تک ہماری حالت تھی۔ بعد میں جب انگریزی دور آیا تو اس نے ہمارے قوانین کو بدلا۔ ہمارے معاشی نظام کو بدلا۔ ہمارے معاشرتی نظام پر

بدترین اثرات ڈالے۔ اسلامی تعلیم بالکل اس بات پر منحصر ہوگئی کہ کھاتے پیتے لوگ مدد کریں تو اسلامی مدارس چل سکیں۔ حکومت نے ان مدارس کے تعلیم یافتہ لوگوں پر رزق کے دروازے بند کر دیئے۔ اس کے برعکس جو نظامِ تعلیم انگریزوں نے رائج کیا وہ مسلمانوں کے ذہن سے خدا اور رسول اور آخرت کے تصورات کو بالکل مٹا دینے والا تھا اور رزق کے دروازے اسی کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ ہم نے انگریزی دور سے میراث میں پایا۔ افسوس ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد اس صورتِ حال کو بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ انگریزی دور میں ہم جتنے بگڑے ہوئے تھے اس سے زیادہ اس تیس سال کے زمانے میں بگڑ گئے۔ اب اگر کوئی اسلامی حکومت قائم ہو تو یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ چھوٹتے ہی مثالی نظام کی طرف پلٹ جائے گی۔ آغازِ کار میں اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو ملک کے تمام ذرائع و وسائل، ملک کے تمام ذرائع ابلاغ، ملک کے سارے نظامِ تعلیم اور حکومت کی پوری انتظامی پالیسی کو اس غرض کے لئے استعمال کریں کہ مسلمانوں میں اسلام کا علم وسیع پیمانے پر پھیلایا جائے اور ان کی عام اخلاقی حالت کو درست کیا جائے۔ جس قدر اسلام کا علم پھیلے گا اور عام اخلاقی حالت درست ہوتی جائے گی اتنی ہی زمین اسلامی نظام کے لئے تیار ہوتی چلی جائے گی۔

یہی چیز تھی جس کی ہم توقع رکھتے تھے کہ انگریزی حکومت کے خاتمے کے بعد جب پاکستان کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے گی تو وہ اس طریقِ کار کو اختیار کرے گی۔ ذرائع ابلاغ کی پوری طاقت عام مسلمانوں میں ایمان اور صحیح اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لئے استعمال کرے گی۔ نظامِ تعلیم کو ایک اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرے کے کارکن اور شہری تیار کرنے کے قابل بنایا جائے گا۔ الحاد پیدا کرنے والی تعلیم کو بدلا جائے گا اور اس کی جگہ خدا پرستی کی تعلیم کو رائج کیا جائے گا۔ عام لوگوں کے اندر حلال و حرام کی تمیز پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مگر یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ان میں سے کوئی توقع بھی ہماری پوری نہیں ہوئی۔ اگر اس وقت حکومت اپنے تمام ذرائع و

وسائل کو اس کام کے لئے استعمال کرتی تو آج حالت بالکل مختلف ہوتی۔

اب ہمیں گویا بالکل نئے سرے سے کام کرنا ہے۔ بے شک اسلامی قوانین کو نافذ کرنے کی کوشش کیجئے۔ قوانینِ اسلامی کو مدوّن بھی کیجئے تاکہ ہماری عدالتیں ان کے مطابق فیصلے کر سکیں مگر بس یہی ایک کام ایسا نہیں ہے جس سے اسلامی نظام قائم ہو جائے۔ سب سے زیادہ زور جس بات پر صرف کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ ہمارے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں اور ہمارے تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامی تعلیم دی جائے۔ ذرائع ابلاغ کو فحش، بے حیائی، بداخلاقی اور جرائم پھیلانے کے بجائے، مسلمانوں کو ایمان اور اسلامی عقائد سمجھانے اور ان کے ذہن نشین کرنے پر صرف کیا جائے۔ عام لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ اسلامی اخلاق کیا ہیں اور کافرانہ اخلاق کیا، اور دونوں قسم کے اخلاقوں میں فرق کیا ہے؟ پہلے میں بیان کر چکا ہوں کہ اسلامی نظام تو قائم ہی اس معاشرے میں ہوا تھا جس کے اندر سب سے پہلے ایمان کو مستحکم کیا گیا تھا، پھر اسی ایمان کی مضبوط بنیاد پر پورے اخلاقی نظام کی، پورے معاشرتی نظام کی، پورے معاشی نظام کی، پورے سیاسی نظام کی اور پورے قانونی نظام کی عمارت اٹھائی گئی تھی۔ اب اگر ہم اس مثالی دور کی طرف پلٹنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اسی ترتیب سے پلٹنا چاہئے۔ عام مسلمانوں کے دلوں میں اگر خدا پر ایمان، رسولؐ پر ایمان، قرآن پر ایمان اور آخرت پر ایمان مضبوطی کے ساتھ نہ بٹھایا گیا تو محض قوانین کو بدلنے سے کام نہ چلے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں جھوٹے مقدمات بنانے میں پولیس اتنی مہارت رکھتی ہے کہ وہ ساری دنیا کو چیلنج دے سکتی ہے کہ ہمارے مقابلے میں کوئی جھوٹا مقدمہ بنا کر دکھائے۔ گواہوں کا حال یہ ہے کہ عدالت میں جا کر صحیح گواہی دینا گویا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ عدالت تو ہے ہی جھوٹی شہادت دینے کی جگہ۔ پولیس خود بھی جھوٹے گواہوں کا ایک پورا گروہ تیار رکھتی ہے۔ یہی دو چیزیں اگر نگاہ میں رکھی جائیں تو آپ اندازہ کر لیجئے کہ ہمارے ہاں اسلامی قانون صحیح طور پر کیسے نافذ ہوگا، جب کہ اس کو نافذ کرنے والی مشینری ہی بگڑی ہوئی ہے۔ قوانین اسلامی

کے نفاذ کی تدبیریں کرنے کے ساتھ موجودہ حکومت کے لئے بھی اور آئندہ آنے والے حکمرانوں کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ملک کی انتظامیہ کو بھی درست کریں، تعلیم کے نظام کی بھی اصلاح کریں اور ملک کے تمام ذرائع و وسائل کو اس بات پر صرف کر دیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں ایمان بٹھایا جائے، ان کے اخلاق درست کئے جائیں اور ان کے اندر خدا کا خوف پیدا کیا جائے۔

سوال: جنابِ والا! کہا یہ جاتا ہے کہ یہ قوم ڈنڈے کی غلام ہے۔ یہ ایک عام ضرب المثل ہے جو لوگوں کی زبانوں پر چڑھی ہوئی ہے۔ لیکن کیا اسلامی نظام بھی ڈنڈے کے زور سے قائم کیا جا سکے گا؟

جواب: اسلامی قانون میں ڈنڈے کا بھی ایک مقام ہے مگر وہ سب سے آخر میں آتا ہے۔ اسلام میں ترتیبِ کار یہ ہے کہ پہلے ذہنوں کی اصلاح کا کام تعلیم و تلقین کے ذریعے سے کیا جائے تاکہ لوگوں کے خیالات تبدیل ہوں۔ پھر لوگوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر کام کیا جائے۔ یہاں تک کہ محلے محلے، بستی بستی اور کوچے کوچے میں ایسے لوگ تیار ہو جائیں جو بدکرداریوں کو عوام کی مدد سے دبائیں، اور اپنے اپنے علاقوں کے باشندوں میں دین داری اور دیانت داری پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح ملک کے اندر ایک ایسی رائے عامہ پیدا ہو جائے گی جو برائیوں کو سر نہ اٹھانے دے گی۔ کوئی شخص ایسی عام رائے کی موجودگی میں بگڑنا چاہے گا تو اس کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی، اور جو شخص صحیح طرزِ زندگی اختیار کرے گا اس کو پورا معاشرہ مدد دینے والا ہوگا۔ اس کے ساتھ اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ معاشرہ ایسا ہو، جس کے لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار ہوں۔ ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آنے والے ہوں۔ ہر شخص انصاف کا حامی اور بے انصافی کا مخالف ہو۔ ہر شخص اپنے اوپر پیٹ بھرنا حرام سمجھے، اگر اس کو معلوم ہو کہ اس کا ہمسایہ بھوکا سو رہا ہے۔ پھر اسلام ایک ایسا معاشی نظام بھی قائم کرتا ہے جس میں سود حرام ہو، زکوٰۃ فرض ہو، حرام خوری کے دروازے بند کر دیئے جائیں، رزقِ حلال

کمانے کے لئے تمام مواقع لوگوں کے لئے کھول دیئے جائیں اور کوئی آدمی اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ ہونے پائے۔ ان تدابیر کے بعد ڈنڈے کا مقام آتا ہے۔ ایمان، اخلاق، تعلیم، انصاف، اصلاحِ معیشت اور ایک پاکیزہ رائے عام کے دباؤ سے بھی جو آدمی درست نہ ہو تو وہ ڈنڈے ہی کا مستحق ہے اور ڈنڈا پھر اس پر ایسی بے رحمی کے ساتھ علی الاعلان چلایا جائے کہ ان تمام لوگوں کے دماغ کا آپریشن ہو جائے جو جرائم کے رجحانات رکھتے ہوں۔

لوگ بڑا غضب کرتے ہیں کہ اسلام کے پروگرام کی ساری تفصیل چھوڑ کر صرف اس کی سخت سزاؤں پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ اسلام پہلے عام لوگوں میں ایمان پیدا کرتا ہے۔ پھر عوام کے اخلاق کو پاکیزہ بناتا ہے۔ پھر تمام تدابیر سے ایک ایسی مضبوط رائے عام تیار کرتا ہے جس میں بھلائیاں پھلیں پھولیں اور برائیاں پنپ نہ سکیں۔ پھر وہ معاشرتی اور معاشی اور سیاسی نظام ایسا قائم کرتا ہے جس میں بدی کرنا مشکل اور نیکی کرنا آسان ہو جائے۔ وہ ان تمام دروازوں کو بند کرتا ہے جن سے فواحش و جرائم نشوونما پاتے ہیں۔ اس کے بعد ڈنڈا وہ آخری چیز ہے جس سے ایک پاک معاشرے میں سر اٹھانے والی ناپاکی کا قلع قمع کیا جاتا ہے۔ اب اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے کہ ایسے برحق نظام کو بدنام کرنے کے لئے آخری چیز کو پہلی چیز قرار دیتا ہے اور بیچ کی سب چیزوں کو نگل جاتا ہے۔

سوال: حکومت کے سلسلے میں آپ نے یہ جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، بخدا بڑی صحیح بات ہے۔ جب تک ایسا نظام وجود میں نہ آ جائے، ایسے لوگوں پر وہ نظام مشتمل نہ ہو جو ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ نہ صرف یہ کہ اسلام کو نافذ کرنا چاہتے ہوں بلکہ اخلاق اور علمی اعتبار سے بھی وہ اس منصب اور اس معیار کے لوگ ہوں کہ وہ اس کام کو انجام دے سکیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں حکومت کی تبدیلی کے لئے انتخابات ہی کو ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کو

سامنے رکھتے ہوئے کیا آپ اس بات پر روشنی ڈالیں گے کہ اس مغربی اندازِ انتخابات کو کس حد تک اسلام کے شورائی نظام سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ اور کس طرح؟

جواب: یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ ہم اس وقت جس مقام پر کھڑے ہیں اسی مقام سے ہمیں آگے چلنا ہو گا۔ اور جس منزل تک ہم جانا چاہتے ہیں اس کو واضح طور پر نگاہ کے سامنے رکھنا ہو گا تا کہ ہمارا ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھے۔ خواہ ہم پسند کریں یا نہ کریں، نقطۂ آغاز تو لامحالہ یہی انتخابات ہوں گے کیونکہ ہمارے ہاں اسی طریقے سے نظامِ حکومت تبدیل ہو سکتا ہے اور حکمران کو بھی بدلا جا سکتا ہے۔ کوئی دوسرا ذریعہ اس وقت ایسا موجود نہیں ہے جس سے ہم پُرامن طریقے سے نظامِ حکومت بدل سکیں اور حکومت چلانے والوں کا انتخاب کر سکیں۔ اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ہمارے ہاں انتخابات میں دھونس، دھوکے، دھاندلی، علاقائی یا مذہبی یا برادری کے تعصبات، جھوٹے پروپیگنڈے، گندگی اچھالنے، ضمیر خریدنے، جعلی ووٹ بھگتانے اور بے ایمانی سے انتخابی نتائج بدلنے کے غلط طریقے استعمال نہ ہو سکیں۔ انتخابات دیانتدارانہ ہوں۔ لوگوں کو اپنی آزاد مرضی سے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا موقع دیا جائے۔ پارٹیاں اور اشخاص جو بھی انتخابات میں کھڑے ہوں وہ معقول طریقے سے لوگوں کے سامنے اپنے اصول، مقاصد اور پروگرام پیش کریں اور یہ بات ان کی اپنی رائے پر چھوڑ دیں کہ وہ کسے پسند کرتے ہیں اور کسے پسند نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے انتخابات میں ہم عوام کے طرزِ فکر اور معیارِ انتخاب کو بدلنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکیں۔ لیکن اگر انتخابی نظام درست رکھا جائے تو ایک وقت ایسا آئے گا جب نظامِ حکومت پورے کا پورا ایماندار لوگوں کے ہاتھ میں آ جائے گا۔ اس کے بعد پھر ہم نظامِ انتخاب پر نظر ثانی کر سکتے ہیں اور اس مثالی نظامِ انتخاب کو از سرِ نو قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو اسلامی طریقے کے عین مطابق ہو۔ بہر حال آپ یک لخت جست لگا کر اپنی انتہائی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔

سوال: مولانا! یہاں کچھ سوال اگرچہ اور بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے اور آپ سے کسی اور نشست میں کوئی سوال کرنے کا موقع میسّر آئے۔ ایک بات میں آپ سے آخر میں ضرور معلوم کرنا چاہوں گا کہ آپ نے جس مشن کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا، اور جس طرح آپ نے اس کے لئے پوری عمر جدوجہد کی، اور آج الحمد للہ ایک ایسے مقام پر ہم پہنچ چکے ہیں کہ جہاں وہ نصب العین اب اپنی منزل کے قریب پہنچتا نظر آتا ہے۔ میں آپ سے یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ اس ساری صورتِ حال کو اپنی اس جدوجہد کی روشنی میں کس طرح سے محسوس کرتے ہیں، اور کیا آپ کی نظر میں اب آپ کی یہ جدوجہد فی الواقع اپنے منطقی نتیجے تک پہنچ رہی ہے، اور کیا فی الواقع آپ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے؟

جواب: یہ میرے لئے ایک بڑا مشکل سوال ہے۔ میں نہ غلط دعوے کر سکتا ہوں اور نہ خودستائی کرنا چاہتا ہوں۔ البتہ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ پچھلے تیس چالیس سال کے دوران میں اسلامی خیالات کی اشاعت کا کام جتنے بڑے پیمانے پر ہوا ہے، اور وہ صرف میں نے ہی نہیں کیا ہے، دوسرے لوگوں نے بھی کیا ہے، اس کے نتیجے میں ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت اب اسلام کی خواہاں ہو گئی ہے۔ اگرچہ اس کے اخلاق پوری طرح اسلامی تعلیم کے مطابق نہیں ہو سکے، لیکن اس میں اسلام کی سمجھ اور اسلامی نظام قائم کرنے کی تڑپ ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ ہماری جو درسگاہیں میکالے کے نظامِ تعلیم پر قائم تھیں، خدا کے فضل سے انہی میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ایسی پیدا ہو گئی ہے جو اسلام سے گہری قلبی عقیدت بھی رکھتی ہے اور اسلام کا فہم بھی بڑی حد تک اس کو حاصل ہو چکا ہے۔ اب ہمارے سامنے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری عام آبادی جو اَن پڑھ ہے، اس کے اندر کس طرح اسلام کے علم و فہم کو پھیلایا جائے۔ چونکہ رائے دہندوں کی اکثریت اَن پڑھ ہے،

اس لئے تعلیم یافتہ لوگوں کی سو فیصد تعداد بھی اگر ایک صحیح انتخاب کرنا چاہے تو وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اس مرحلے پر میرے نزدیک یہ ضروری ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان اور علماء کرام شہروں، قصبوں اور دیہات کی اَن پڑھ آبادیوں میں دینِ اسلام کی واقفیت پیدا کرنے میں لگ جائیں۔ اس کے لئے لوگوں کا خواندہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کتابوں کے ذریعے سے دین نہیں پھیلا تھا، زبانی تلقین سے پھیلا تھا۔ اب بھی یہ ضروری نہیں کہ ہم ان سب کو پہلے پڑھا لکھا بنائیں پھر انہیں دین سمجھائیں۔ عہدِ رسالتؐ کی طرح آج بھی عام لوگوں کو زبانی تعلیم سے دین سمجھایا جا سکتا ہے۔ بڑے بڑے گناہوں کا خوف ان کے دلوں میں بٹھایا جا سکتا ہے...... فرائض اور ارکان دین کی اہمیت ان کے ذہن نشین کی جا سکتی ہے۔ حرام و حلال کی تمیز اِن میں پیدا کی جا سکتی ہے۔ نیکیوں کے اجر کی رغبت انہیں دلائی جا سکتی ہے۔ قرآن کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، جنہوں نے عرب کی دنیا بدل ڈالی تھی، آج بھی اپنا معجز نما اثر دکھا سکتی ہیں۔ بشرطیکہ ہم ان سے اصلاحِ معاشرہ کا کام لینا چاہیں۔

بڑی اہمیت اس بات کی ہے کہ قرآن اور حدیث کی صاف صاف تعلیمات پیش کر کے ہم لوگوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کریں کہ تم سب کی نگاہوں سے چھپ سکتے ہو مگر خدا سے نہیں چھپ سکتے۔ سب کی سزا سے بچ سکتے ہو مگر خدا کی سزا سے نہیں بچ سکتے۔ تمہارا پورا اعمال نامہ تیار ہو رہا ہے۔ ایک دن تمہیں یقیناً مرنا ہے اور قیامت کے روز خدا کی عدالت میں پیش ہونا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ تم نماز ترک کرو، رمضان میں علانیہ کھا پی کر خدا کے دین کی توہین کرتے رہو، بے باکی کے ساتھ گناہوں کی گندگی میں لت پت ہو جاؤ، لوگوں کے حقوق مار کر خدا کے سامنے جاؤ، لوگوں کی عزت و آبرو لوٹ کر اپنے رب کے حضور پیش ہو، لوگوں کی جانیں لے کر وہاں جاؤ، پھر اللہ کی عدالت سے چھوٹ جاؤ۔ اس دنیا میں تم چالبازیاں کر کے بچ سکتے ہو، خدا

کی عدالت سے کیسے بچو گے؟ یہ چیزیں آپ عام لوگوں کے دماغ میں بٹھائیں تو رفتہ رفتہ آپ دیکھیں گے کہ ہماری عام آبادی کے اندر صحیح سمجھ بوجھ اور اخلاقی حس پیدا ہو جائے گی۔

اس کے بعد جب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اب ہمیں اپنے ملک میں اسلامی نظام قائم کرنا ہے تو انتخابات کے موقع پر وہ خود ہی سوچیں گے کہ اس کام کے لئے ہم کیسے لوگوں کو آگے لائیں۔ عام لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ وہ بیمار ہوں تو کس ڈاکٹر کے پاس جائیں۔ اس بات کو جانتے ہیں کہ کوئی مقدمہ پیش آ جائے تو کس وکیل کے پاس جائیں۔ اسی طرح جب آپ لوگوں میں اسلام کا شعور اور سمجھ پیدا کر دیں گے تو وہ خود ہی دیکھ لیں گے کہ اسلامی نظام چلانے کے لئے وہ کن لوگوں کو منتخب کریں۔ پہلی بار اگر وہ کچھ غلطی کر بھی جائیں تو انشاء اللہ دوسری مرتبہ نہ کریں گے، بشرطیکہ تعلیم عوام کا عمل برابر جاری رہے اور حکمران اسلام سے ہٹ کر جو کام بھی کریں اس پر معقول و مدلل تنقید کی جاتی رہے۔ بالفرض اگر غلط آدمیوں کی اکثریت منتخب ہو جائے اور وہ دوسرا انتخاب ناجائز ذریعوں سے جیتنے کی کوشش کریں تو انہیں ویسی ہی تحریک کا سامنا کرنا ہوگا جس نے بھٹو جیسے جابر کے قدم اکھاڑ دیئے۔

تعلیم عوام کی بعض صورتیں خاص بھی ہیں جن کی خصوصیات کو نگاہ میں رکھنا ہوگا۔ مثلاً مزدوروں کی یونینیں ہیں۔ مزدوروں میں عام طور پر اس خیال کو پھیلایا جائے کہ تمہارے لئے منصفانہ معاشی نظام سوشلزم نہیں ہے، اسلام ہے، تمہاری مشکلات اسی کی پیروی سے رفع ہوں گی۔ کوئی انصاف سوشلزم نے مزدوروں کے ساتھ نہ کبھی کیا ہے، نہ آج کر رہا ہے اور نہ آئندہ کرے گا۔ سوشلزم، کمیونزم اور اشتراکی ملکوں کے حالات کا مطالعہ جن نوجوانوں نے کیا ہے وہ ناقابل انکار دلائل و شواہد کے ساتھ مزدوروں کو یہ بات سمجھا سکتے ہیں۔ اس طریقے سے مزدور تحریکوں کو رفتہ رفتہ اسلامی تحریکوں میں تبدیل کر دیا جائے اور مزدوروں میں یہ شعور پیدا کر دیا جائے کہ وہ جانچ پرکھ کر دیکھ لیں کہ ان کے لیڈر مارکس اور لینن کے ماننے والے ہیں یا اللہ اور رسول کے ماننے والے۔ پھر یہ

فیصلہ انہی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ حشر کے روز مارکس اور لینن کے ساتھ اٹھنا چاہتے ہیں یا رسول رب العالمینؐ کے ساتھ۔

اسی طرح سے مثلاً کسان اپنے کچھ الگ مسائل رکھتے ہیں، ان کا اسلامی حل بھی انہیں سمجھائیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے تشریف لے گئے تھے تو وہاں کے انصار زراعت پیشہ لوگ تھے۔ اسلام سے قبل ان کے ہاں زمیندار اور کسان اور مزارع کے جھگڑے برپا تھے، اور دیہات سے غلہ لانے والوں کو شہری تاجر اور دلال بری طرح لوٹتے تھے۔ حضورؐ وہاں پہنچے تو آپ نے انصاف کے ساتھ ان سب خرابیوں کی اصلاح کی، اور اس اصلاح کی تفصیلات احادیث میں موجود ہیں۔ انہیں آج بھی کسانوں کو بتا کر آپ مطمئن کر سکتے ہیں کہ ان کے مسائل کا عادلانہ حل اسلام ہی نے کیا ہے اور وہی کر سکتا ہے۔

یہ کام جتنا جتنا ہوتا جائے گا آپ دیکھیں گے کہ رفتہ رفتہ انتخابات کے نتائج صحیح ہوتے چلے جائیں گے، اور جتنے جتنے دین کو جاننے والے ایماندار آدمی اکثریت سے منتخب ہوں گے اتنے ہی ہم خلافت راشدہؓ کے مثالی نظام کی طرف قدم بڑھاتے چلے جائیں گے۔

سوال: جنابِ والا یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، آپ نے فرمایا ہے کہ اسلامی نظام بتدریج قائم کیا جانا چاہئے اور قائم کیا جائے گا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تدریجی تغیر کے دوران میں ہمارے موجودہ قوانین اور مغربی طرز کی جمہوریت کے تحت بنائے گئے قوانین چلتے رہیں گے؟ کیا یہ دو متضاد چیزیں ساتھ ساتھ چل سکتی ہیں؟

جواب: مدتوں کے بگڑے ہوئے پورے نظام زندگی کو ہمیں بتدریج ہی بدلنا ہو گا۔ انگریزی دور کے نظامِ تعلیم کو یکا یک بدل کر ایک ہی دن میں اسلامی نظامِ تعلیم رائج نہیں کیا جا سکتا۔ عام لوگوں کی اخلاقی حالت بھی جو سالہا سال سے سینما بینی، فحش تصاویر، شب و روز کے گانوں، زن و مرد کی مخلوط سوسائٹی، شراب، جوئے اور دوسرے

حرام افعال کی بدولت بگڑتی رہی ہے، اسے بھی ایک دن میں نہیں بدلا جا سکتا۔ لیکن ہمیں آج ہی سے ان کو بدلنے کی کوشش شروع کرنی ہوگی۔ اور جن جن برائیوں کو جس قدر جلدی مٹانا ممکن ہوگا' انہیں مٹانے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی جائز نہ ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح ہمیں قوانین کے معاملے میں بھی کرنا ہوگا۔ کافرانہ دور کے جن قوانین کو اسلامی قوانین سے بدلنا آج ممکن ہو' انہیں آج ہی بدل ڈالیے۔ اور جتنا جتنا اسلامی قانون کو نافذ کرنا ممکن ہوتا نظر آئے اس کے نافذ کرنے میں قطعاً دیر نہ لگائیے۔ کیونکہ ایک حکومت جو حقیقت میں مسلمان ہو اور جس کے پیشِ نظر یہ ہو کہ اسلام عملاً قائم کرنا ہے، اسے سارے شعبوں میں ایک ساتھ تبدیلی لانی ہوگی۔ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ جب تک ساری اصلاحات مکمل نہ ہو جائیں، اسلامی قانون نافذ نہ کیا جائے۔ اگر ہمارے جج غیر اسلامی قوانین کی جگہ اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرنے شروع کر دیں گے تو اس سے خود بخود عام لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ اب یہاں کافرانہ نظام نہیں چلے گا اور اسلامی قانون ہی رائج ہوگا۔ یہ منجملہ ان چیزوں کے ہے جن سے آپ کو عوام کے خیالات تبدیل کرنے میں مدد ملے گی۔

آپ اس کا اندازہ یوں کر سکتے ہیں کہ انگریزوں نے جب ہمارے قوانین کو متروک کر کے اپنے قوانین رائج کئے' اور ان کے مجسٹریٹوں اور ججوں نے ان قوانین کے مطابق فیصلے کرنے شروع کر دیئے تو رفتہ رفتہ ہمارے معیار بدلتے چلے گئے۔ حرام حلال ہو گیا اور حلال حرام۔ جو چیزیں انگریزی قانون نے اخلاق، معیشت، معاشرت اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں جائز کی تھیں وہی ہمارے نظامِ زندگی میں رائج ہو گئیں' خواہ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ کتنی ہی غلط بلکہ قابل نفرت ہوں۔ ہم خود اپنے قانون کو فرسودہ سمجھنے لگے۔ ہمارے دماغ میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ اسلام کا قانون تو صرف نکاح و طلاق اور وراثت وغیرہ کے لئے ہے۔ باقی دنیا کے معاملات چلانے کے قابل نہیں ہے۔ اب جونہی کہ لوگ اسلامی قانون کو عدالتوں میں چلتے دیکھیں گے، تاریخ اپنے آپ کو دہرانے لگی گی اور دماغوں پر سے انگریزی قانون کا تسلط ٹوٹنا شروع ہو

جائے گا۔ اس لئے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ زندگی کے صرف ایک شعبے یا بعض شعبوں میں اصلاح کا کام کیا جائے اور دوسرے شعبوں میں پرانے طریقوں کو رائج رکھا جائے۔

انتخابات ہی کے معاملے کو لے لیجئے۔ بظاہر یہ صرف ایک شعبۂ زندگی ہے مگر اس کی اصلاح پورے نظامِ حیات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں انتخابات کا جو طریقہ رائج رہا ہے وہ یہ ہے کہ جھوٹے وعدے کرو، لوگوں کو بے وقوف بناؤ، ان کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاؤ، لوگوں کے ووٹ خریدو، مختلف طریقوں سے دباؤ ڈال کر ووٹ حاصل کرو، مخالفین پر خوب کیچڑ اچھالو، برادریوں اور علاقوں کے تعصبات پھیلاؤ، مذہبی جھگڑے برپا کرو، غرض جس طریقے سے بھی ممکن ہو قوم کی گردن پر سوار ہو جاؤ۔ اس ساری صورتِ حال کو آپ تبدیل کیجئے، ان ناجائز ہتھکنڈوں کو بند کر دیجئے اور عام لوگوں کو آزادانہ اور منصفانہ انتخاب کرنے کا موقع دیجئے۔ آپ یقین رکھیے کہ بہت بڑی اصلاح تو اسی سے ہو جائے گی۔ بُرے آدمیوں کا اوپر آنا مشکل ہو جائے گا اور اچھے آدمیوں کا آنا ممکن ہو جائے گا۔’

سوال: جنابِ والا، اسلام کی تشہیر و تبلیغ کے لئے کچھ تو موجودہ ذرائع ہیں۔ مزید کیا طریقِ کار اختیار کئے جانے چاہئیں؟ آپ کچھ نصیحت فرمائیں گے؟

جواب: یہ ساری چیزیں تو ایک حد تک میں اپنی کتابوں میں لکھ چکا ہوں اور میرے لئے یہ بڑا مشکل ہے کہ جو کچھ پہلے لکھ چکا ہوں اسے اب زبان سے بیان کروں۔

سوال: مولانا محترم! میں یہ گزارش کروں گا کہ ہمیں تلقین فرمائیں کہ ہم اس سلسلے میں ریڈیو کو کیونکر استعمال کر سکتے ہیں؟

جواب: ریڈیو کو استعمال کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کو تلاش کیا

جائے جو ایک ایک موضوع پر تیاری کر کے ریڈیو پر آ کر تقریر کریں۔ مثلاً کچھ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جن کا سوچ سمجھ کر آپ اس کام کے لئے انتخاب کریں کہ وہ اسلام کے ایمانیات کی تشریح کریں اور طرح طرح سے ان کے ہر پہلو کو لوگوں کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کریں۔ ایک ہی آدمی یہ کام کرے گا تو لوگ اکتا جائیں گے .... مختلف قابلیتوں کے لوگ اپنے اپنے طریقے پر بات سمجھائیں گے تو سننے والے دلچسپی کے ساتھ ان کی باتیں سنیں گے۔ اسلامی اعتقادات کو دماغوں میں اتار دینا سب سے پہلا اور سب سے بڑا بنیادی کام ہے جس سے مسلمانوں کی ذہنی حالت بدلی جا سکتی ہے اور انہیں اسلام کے دوسرے حقائق کو سمجھنے کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کچھ دوسرے لوگ ایسے منتخب کرنے چاہئیں جو اسلامی عبادات کی اہمیت، ان کے بے شمار دینی و دنیاوی فوائد، اور ان کو چھوڑ دینے کے نقصانات دل نشیں انداز میں طریقے طریقے سے سمجھائیں۔ کچھ اور مقررین اسلام کے اخلاقی اصول، اس کے احکام اور اس کی ہدایات بیان کرنے کے لئے انتخاب کئے جائیں۔ کچھ دوسرے لوگ معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں پر ایسے مؤثر انداز میں تنقید کریں جس سے عام لوگوں میں یہ احساس بیدار ہو کہ وہ کیسی گندگیوں میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ کچھ اور لوگ خصوصیت کے ساتھ کبائر میں سے ایک ایک بڑے گناہ پر پے در پے تقریریں کریں جن سے لوگوں میں یہ احساس ہو کہ یہ لوگوں کی دنیا اور آخرت کو برباد کر دینے والے کیسے سخت گناہ ہیں اور خدا کے ہاں ان کا کیسا دردناک عذاب انہیں بھگتنا پڑے گا۔ مثلاً قتل ہی کو لے کر اس کے نتائج ایک ایک کر کے بتائے جائیں۔ ایک آدمی اگر دس آدمیوں کو قتل کر دیتا ہے تو دنیا میں اس کو ایک ہی سزائے موت ملے گی۔ باقی ۹ کا عذاب تو دنیا کی عدالت نہیں بلکہ خدا کی عدالت ہی دے گی۔ ایک آدمی کے قتل پر بھی دنیا کی عدالت بس ایک ہی بار سزائے موت دے گی، لیکن مقتول کے خاندان اور اس کی آئندہ نسلوں کو اس کا جو نقصان اٹھانا ہو گا اور جب تک اٹھانا ہو گا اس کا حساب تو دنیا کی عدالت کسی طرح لگا ہی نہیں سکتی۔ یہ حساب تو خدا لگائے گا اور جہنم میں قاتل کو اس کا پورا پورا بدلہ

دے گا۔

ریڈیو پر اس طرح کی تقریروں کا سلسلہ اگر جاری ہو جائے اور موزوں آدمی اپنے اپنے موضوعات پر پوری اثر آفرینی کے ساتھ کلام کریں تو آپ دیکھیں گے کہ چھ مہینے میں فرقِ عظیم واقع ہو جائے گا۔ ریڈیو تو عوام کو تعلیم دینے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ آج کسان کھیت میں ہل تک نہیں چلاتا جب تک ٹرانسسٹر اس کے پاس نہ ہو۔ اب تک یہ لوگ ان ٹرانسسٹروں سے بیگمات کے گانے اور ان سے بھی کچھ زیادہ ہی فحش فلمی اور فرمائشی گانے سنتے ہیں۔ آئندہ اگر یہی لوگ دلچسپ اور عام فہم زبان میں کچھ اپنے دین کی باتیں بھی سننے لگیں تو امید نہیں ہے کہ خدا کا نام سنتے ہی ٹرانسسٹر بند کر دیں گے۔ یہ لوگ آخر خدا اور رسول اور آخرت کے منکر تو نہیں ہیں۔ آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ ان کے اندر دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اس پروگرام کا آغاز کچھ عہد رسالتؐ، عہدِ خلافت اور عہدِ صحابہؓ کے واقعات اور صالحین کی حکایات سے کریں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ انہیں اسلامی تعلیمات سننے اور سمجھنے کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔ ان سادہ لوح دیہاتیوں میں شاید ایک بھی ایسا نہ ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جان نثار نہ ہو۔ آپ انہیں بتا سکتے ہیں کہ جن رسولِ پاک پر تم جان نثار کر دینے کے لئے تیار ہو ان کے احکام کی پیروی بھی تو کرو۔ ان میں کون ہے جو یہ نہ مانتا ہو کہ مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے؟ آپ انہیں بتائیے کہ مرنے کے بعد کیا ہو گا۔ اس کی تفصیلات قرآن اور احادیث سے ان کو سنائیے۔ بعید نہیں کہ ان کو سن کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ صرف عذابِ قبر ہی کا ذکر سن کر وہ لرز جائیں گے۔

سوال: جناب والا ہم ریڈیو سے کسانوں کے لئے، کاشتکاروں کے لئے خصوصی پروگرام بھی کرتے ہیں۔ مزدوروں کے لئے بھی پروگرام کرتے ہیں، محنت کشوں کے لئے بھی، خواتین کے لئے بھی، بچوں کے لئے بھی پروگرام کرتے ہیں۔ تو ہم صرف گانے ہی کے پروگرام تو نہیں کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان پروگراموں کی بھی نوعیت ایسی نہ ہو جیسی کہ مطلوب

ہے؟

جواب: میرا کہنا یہ ہے کہ آپ کے ہاں ریڈیو میں زیادہ عنصر گانے بجانے کا ہوتا ہے، اور کم عنصر دین و اخلاق کی تعلیم کا۔ پہلے عنصر کو آپ یک لخت ختم کر دیں گے تو وہ دوسرے ملکوں سے گانے سننے لگیں گے۔ اس کے بجائے آپ پہلے عنصر کو کم کرتے جائیں اور دوسرے عنصر کو بڑھاتے چلے جائیں۔ جب عوام کو صحیح طریقے سے دین سمجھایا جائے گا اور انہیں دلچسپ اور دل نشین طریقے سے بتایا جائے گا تو وہ گانے کے رسیا نہ رہیں گے اور انہیں باہر کے ریڈیو سے بھی گانا سنتے وقت یہ یاد آ جائے گا کہ قیامت کے روز ان کے کان گواہی دیں گے کہ یہ لوگ ان سے کیا چیزیں سننے کا کام لیتے رہے ہیں۔

☆☆☆

پنجاب یونیورسٹی سینٹ ہال، میں تعلیمی کانفرنس کے اختتام پر
اساتذہ اور طلبہ کا ایک وفد سیّد مودودیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا
سیّد محترم کی گفتگو کی جھلکیاں ---- ۱۲ مئی ۱۹۷۸ء

وفد سے جب گفتگو کا سلسلہ چلا تو مولانا نے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا کہ:

"اساتذہ میں سے ایک ایک فرد کو اپنی ذاتی زندگی کے ذریعے طلبہ کے لئے نمونہ بننا چاہیے۔ اگر وہ نئی نسل میں اسلامی سیرت و کردار کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو اپنی ذاتی زندگیوں میں اس کردار کی مثال بنیں۔"

مولانا نے فرمایا:

"ہماری نوجوان نسل اسلام پر ایمان رکھتی ہے، اسے دینِ حق سے گہرا لگاؤ ہے، لیکن اخلاق و تہذیب اور شرافت و انسانیت کو تباہ کر دینے والا ایک سیلاب ہے جو ہمارے معاشرے کو بہائے لئے جا رہا ہے اور ہماری نئی نسل کو بھی بگاڑ کے راستے پر بہا لے جانا چاہتا ہے۔ اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے اصولِ زندگی اور اس کے نظامِ حیات سے اور اسلاف کے شاندار کارناموں سے نئی نسل کو آگاہ کریں، ان کے اندر فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس پیدا کریں اور ان کی سیرت و کردار پر خود اپنے قول و عمل سے اچھے اثرات ڈالنے کی کوشش کریں۔"

مولانا نے مزید فرمایا:

''آپ طلبہ کے اندر حق اور ناحق کی تمیز اور حلال و حرام کا صحیح شعور و احساس پیدا کریں اور اپنے عمل سے حق کو اختیار کرنے اور حرام سے بچتے رہنے کا نمونہ پیش کریں۔''

مولانا مودودیؒ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

''مسلم ملّت اپنے کردار کی کمزوری کے باعث پستی کی طرف لڑھک رہی ہے۔ آج برما اور فلپائن میں مسلمانوں پر بدترین قسم کا ظلم ہو رہا ہے، لیکن دنیا بھر میں مسلمان اتنی بڑی تعداد اور اہم جغرافیائی حیثیت رکھنے کے باوجود ظالم کا ہاتھ نہیں روک سکتے۔ پھر اسی کروڑ مسلمانوں کے مقابلے میں پچیس لاکھ آبادی رکھنے والا اسرائیل جارحیت کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے اور مسلمان اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔''

''یہ ذلّت و مسکنت ہمارے ہاں کچھ یوں ہی پیدا نہیں ہو گئی۔ یہ اس کا نتیجہ ہے کہ ہمارے اخلاق کو گھن لگ گیا ہے اور ہماری سیرت و کردار کی جڑیں گل سڑ گئی ہیں .... جو قوم فرض کو فرض جانتے ہوئے اسے ادا نہ کرے، حرام کو حرام جانتے ہوئے اس کا ارتکاب کرے، حق کو حق جانتے ہوئے اس سے انحراف کرے اور باطل کو باطل جانتے ہوئے اس کی پیروی کرے، اس میں کبھی یہ طاقت پیدا نہیں ہو سکتی کہ مردانگی کا کوئی کارنامہ اس کے ہاتھوں انجام پائے اور اپنے گھر کو فتح کرنے کے سوا وہ ایک انچ زمین بھی فتح کر سکے۔''

وفد نے تعلیمی اداروں میں بڑھتے ہوئے علاقائی تعصبات کا ذکر کیا تو مولانا نے فرمایا:

''جو بات خاص طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی ہے وہ یہ ہے کہ نسلی اور علاقائی قومیتیں، قوم کو تقسیم در تقسیم کر دیا کرتی ہیں۔ اس کے برعکس ملّت اسلامیہ کا تصور ایک ملک ہی نہیں، دنیا بھر کے مسلمانوں کو متحد کر سکتا ہے۔ یہی وحدت ہمارے اندر مضبوطی

پیدا کرنے والی ہے۔ حتیٰ کہ اس کی بدولت ہم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن سکتے ہیں۔ اس لیے آپ اپنی اپنی جگہ تعصب کے رجحانات کو حکمت کے ساتھ طلبہ کے ذہنوں سے نکالیں اور اس کی جگہ ان کے اندر مسلمان ہونے کا شعور بیدار کریں۔ تاکہ آئندہ نسل جاہلیت کے ان تعصبات سے محفوظ رہے جو پہلے ہی ہمارے ملک کے ٹکڑے کر چکے ہیں۔”

☆☆☆

جمعیت طلبہ عربیہ پاکستان کی تربیت گاہ کے اختتام پر سیّد مودودیؒ کا مختصر خطاب اور جوابات ---۱۸ جنوری ۱۹۷۹ء

میرے عزیز نوجوانو!

مجھے یہ جان کر نہایت خوشی ہوئی ہے کہ آپ حضرات نے دینی درس گاہوں میں زیرِ تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی مقاصد اور اسلامی تعلیم و تربیت کے لئے ایک تنظیم قائم کی ہے اور اس طرح اللہ کے دین کی اقامت کے لئے جدوجہد کا باقاعدہ آغاز کیا ہے۔ بڑا اچھا ہو کہ اسلامی جمعیت طلبہ اور آپ کی تنظیم دونوں مل کر اسلامی انقلاب کو برپا کرنے کا کام کریں۔ یہ صورت پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ آگے چل کر یہ دو الگ الگ عنصر نہ رہیں بلکہ ایک تنظیم کی شکل اختیار کر لیں۔ ایک مقصد کے لئے زیادہ پلیٹ فارموں پر اپنی قوت تقسیم کرنا اچھی صورت نہیں، لیکن اس سلسلہ میں جلد بازی بھی نہ کی جائے، تمام پہلوؤں کا مکمل تجزیہ کر لیا جائے۔

طلبہ: مولانا! دینی مدارس کے طلبہ اور کالجز کے طلبہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ اس مشکل کو کیسے حل کیا جائے؟

مولانا: یہ عجیب بات ہے جو آپ کے ذریعے میرے علم میں آئی ہے۔ جہاں تک کالجوں کے دوسرے طلبہ کا تعلق ہے۔ ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکن جن کی تمام تر عددی قوت سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ پر مشتمل ہے، وہ تو چاہتے ہیں کہ آپ ان کے اور زیادہ قریب آئیں، ان کے قریب آنے سے آپ کو بھی فائدہ ہوگا اور ان کو بھی۔

کچھ توقف کے بعد........... پھر فرمایا:

اسلامی جمعیت طلبہ میں آپ جو بھی اور جس پہلو سے بھی کوئی کمی یا کمزوری پائیں اس سلسلے میں ان کے رہنماؤں سے بات کریں۔ وہ انشاء اللہ اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ اصلاح کی غرض سے تنقید کرنا تو بہت مفید ہو. ہے۔

ایک طالب علم: مولانا! اسلامی جمعیت طلبہ اور ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی موجود نہیں ہے، وہ ہمارے ساتھ بہت گرمجوشی سے تعاون کرتے ہیں۔

مولانا: برسوں سے ہماری بھی یہی کوشش رہی ہے کہ دینی مدارس کی تعلیم اور جدید زمانے کی تعلیم ان دونوں سے فائدہ اٹھانے والے یکجا ہوں۔ بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کے مخالف بنیں، یا آپس میں بٹے رہیں۔ وہ یکجا ہوں اور متحد ہو کر اللہ کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کریں...... آگے چل کر تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ دینی اور دنیاوی تعلیم الگ الگ نہ رہے بلکہ ایک ہی نظامِ تعلیم رائج ہو جس میں دینی تعلیم بھی شامل ہو اور دنیاوی تعلیم بھی۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا' آپ لوگوں کو باہم تعاون کرنا چاہئے...... یہ ''مسٹر'' اور ''مولوی'' کی کشمکش جو موجود ہے، اسے ہم ختم کرنا چاہتے ہیں، مسلمانوں کے مجموعی نقصان کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے۔

طلبہ: مولانا! آپ نے تعلیم یافتہ طبقے کی جس تقسیم کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس تقسیم اور بُعد کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟

مولانا: میں نے ابھی کہا ہے اور پھر اس بات پر زور دیتا ہوں کہ آپ خود ایک دوسرے سے قریب آئیں۔ آپ ایک دوسرے سے قریب آئیں گے، ملیں گے اور ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہوں گے تو غلط فہمیاں یقیناً رفع ہوں گی۔ جدید تعلیم سے آراستہ طلبہ کی معلومات سے کچھ آپ فائدہ اٹھائیں گے، آپ کی دینی معلومات سے کچھ وہ فائدہ اٹھائیں گے........... ان میں کچھ نقائص ہوں تو آپ ان کی نشاندہی

کریں، آپ میں کچھ نقائص ہوں تو وہ ان کی نشاندہی کریں۔ اس طرح آپ باہم تعاون کر سکتے ہیں، تعلیم یافتہ طبقہ کی تقسیم وتفریق ختم کر سکتے ہیں اور اللہ کی راہ میں ایک دوسرے کے مددگار بن سکتے ہیں۔

طلبہ: سید صاحب! ہم مدارسِ عربیہ میں کام کیسے کریں؟ جبکہ ہر جگہ مدارس کی انتظامیہ اپنی تنظیمیں قائم کر کے ہمارے کارکنوں پر جبر کرتی ہے، پھر اکثر مدارس سے ہمارے ساتھیوں کو یہ کام کرنے کے جرم میں خارج بھی کر دیا جاتا ہے!

مولانا: لیکن اس کے باوجود آپ کی تنظیم قائم ہے اور کام بھی کر رہی ہے، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آدمی خدا کا کام کرے اور اس کی راہ میں مشکلات پیدا نہ ہوں، مشکلات تو لازماً ہوں گی۔ البتہ مشکلات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں بلکہ ان کو برداشت کرنا چاہئے۔ کسی غلط فہمی کی بناء پر اگر کچھ مشکلات آپ کے راستے میں آ ہی جاتی ہیں تو وہ غلط فہمیاں آپ کی باتوں سے بھی اور آپ کے طرزِ عمل سے بھی رفع ہونی چاہئیں۔

طلبہ: مولانا! توسیع دعوت کے سلسلے میں کوئی خصوصی ہدایات؟

مولانا: انسان کے لئے ہدایت کے سرچشمے دو ہی ہیں، ایک کتاب اللہ دوسرے اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، ان ذریعوں سے جس نے ہدایت نہ پائی، اس کے لئے پھر کوئی تیسرا ذریعۂ ہدایت نہیں ہے۔ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَالَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔ (جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لئے پھر کوئی نور نہیں) یہ ہماری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب بھی اپنے اصل الفاظ میں ہر تحریف سے محفوظ موجود ہے۔ اور اللہ کے رسول کی حیاتِ پاک کے بھی ہر پہلو سے متعلق مفصل اور مستند معلومات موجود ہیں۔ ضرورت صرف توجہ اور جستجو کی ہے۔ دل میں سچی طلب ہو تو ہر شخص تھوڑی سی کوشش سے یہ معلوم کر سکتا ہے کہ خدا کی کتاب کیا تعلیم دیتی ہے اور خدا کے رسولؐ نے

کس راستے کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔ کیا آدمی کی اس سے بھی بڑھ کر کوئی بدقسمتی ہو سکتی ہے کہ وہ یہ سب کچھ موجود ہوتے ہوئے بھی جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتا رہے۔ مبارک ہے ہر وہ کوشش جو بندگانِ خدا تک قرآن کی تعلیم یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک کا نور پہنچانے کے لئے کی جائے!

طلبہ: دینی مدارس کے طلبہ ہماری تنظیم سے منسلک ہونے کو سیاست بازی قرار دیتے ہیں اور اسی سبب تعاون سے گریز کرتے ہیں؟

مولانا مودودی: جی ہاں! مشکل ساری یہ ہے کہ سیاست میں حصہ لینا ایک گالی بن کے رہ گیا ہے حالانکہ اصل صورتِ حال یہ ہے کہ اسلام میں سیاست کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ آپ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام بھیجے ہیں وہ جاری کرنے کے لئے بھیجے ہیں یا صرف پڑھنے کے لئے بھیجے ہیں؟...... یقیناً وہ احکام وقوانین جاری کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں شیطان کے جو قوانین جاری ہیں ہم ان کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سیاست جو شیطان کے قوانین کو جاری کرتی ہو ہم اس پر خدا کی لعنت بھیجتے ہیں اور اسے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں وہ سیاست مطلوب ہے جو دنیا میں خدا کے قانون کو جاری کرے اور اسی کو ہم اختیار کیے ہوئے ہیں اور اس کو اختیار کرنے کی پوری اُمتِ مسلمہ کو دعوت دیتے ہیں، کیونکہ اس میں ہماری بھی نجات ہے اور تمام بنی نوعِ انسان کی بھی...... اب اس سیاست پر اگر کوئی بگڑتا ہے تو یہ اس کی ناسمجھی کی بات ہے۔

دعا:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ .

یا اللہ.... ان نوجوانوں کو علمِ نافع دے اور عملِ صالح کی توفیق عطا فرما۔

یا اللہ...... انہیں اس قابل بنا کہ یہ مسلمان قوم کو دینی رہنمائی دے سکیں۔

یا اللہ...... مسلمان قوم کو دنیا کی دینی رہنمائی کرنے کی توفیق عطا فرما۔

یا اللہ...... ان میں خلوص پیدا کر
ان میں سچا ایمان پیدا کر
ان کے اخلاق کو بلند کر
ان میں ایسی جاذبیت پیدا کر
......کہ تیرے بندے ان کی طرف کھنچے آئیں۔

صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۝ ؕ

☆☆☆

اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کا وفد مسئلہ افغانستان پر گفتگو کے لئے سیّدی کے ہاں پہنچا، جمعیت کی ان سے یہ آخری ملاقات تھی جسے مرتب ''تصریحات'' نے ملاقات کے دوران قلمبند کیا

---- ۲ مئی ۱۹۷۹ء

کتنے برس گزر چکے ہیں۔

جب افغانستان کے لوگوں نے یہ نہ دیکھا کہ آنے والے دشمن اور اس کے ساتھیوں کے پاس کس قدر بھیانک اسلحہ اور اجتماعی موت مسلّط کرنے کے کیسے کیسے سازوسامان ہیں۔ انہوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ دریائے آمو کو پار کرنے والا یہ سامراج دوسرے ہر سامراج کی طرح، اخلاقی قدروں سے کتنا محروم اور سفاکی و درندگی کے خصائل سے کیسا مالا مال ہے...... انہوں نے دیکھا تو صرف یہ کہ حق کیا ہے...... کیا حق اس حملہ آور کے ساتھ ہے جو بلا جواز ان کی سرزمین میں گھس آیا ہے یا اُس کے خلاف؟

انہوں نے صرف یہ دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

گزرے ہوئے سال یہ گواہی دینے کے لئے موجود ہیں کہ افغان مجاہدینِ حق پر تھے۔ اسی روشن شہادت کے جلو میں، میں اپنی یادوں کا ایک ورق الٹ رہا ہوں، مفصّل لکھے ہوئے نوٹس پیش کر رہا ہوں...... یہ انہی دنوں کی روداد ہے۔ جب صرف تین ہفتے بعد سیّد مودودیؒ آخری بار پاکستان سے باہر جا رہے تھے۔

آج یکم مئی ۱۹۷۹ء ہے۔

افغانستان کے نیم استعماری حکمرانوں ...... ظاہر شاہ (معزول ۱۹۷۳ء) اور صدر سردار داؤد (قتل ۱۹۷۸ء) کی حکومتی روایت کو ختم ہوئے ایک سال اور چار دن گزر چکے ہیں ...... کمیونسٹ دانشور اور دہشت گرد مسٹر نور محمد ترہ کئی افغانستان پر بظاہر کمیونزم کی ''برکات'' اور عملی طور پر روسی استعمار کی بالادستی مسلط کرنے میں لگا ہوا ہے۔ افغانستان کے مسلمان ان حالات میں غلامی کی زندگی پر ایمان، ہجرت اور جہاد کے راستے کا انتخاب کر رہے ہیں۔ ایک سال کے دوران میں دس لاکھ بے خانماں افغان بچے، عورتیں اور بوڑھے صوبہ سرحد میں پہنچ چکے ہیں۔ وہ بے در و دیوار زمین، کھلے آسمان، منجمد کر دینے والی سردی اور جھلسا دینے والی گرمی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لٹے پٹے انسانوں کے قافلے آ رہے ہیں۔ معصوم بچے دودھ کو بڑے نانِ جویں کو اور زخمی و بیمار ادویات کو ترس رہے ہیں۔ وہ اپنے راستے کا انتخاب کر چکے ہیں۔

سینکڑوں میل دور، لاہور میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس ہو رہا ہے۔

ناظمِ اسلامی جمعیت طلبہ، صوبہ سرحد جناب شبیر احمد خان کہہ رہے ہیں:

''سرحد سے جمعیت کے کارکن افغان مجاہدین کے ہمراہ محاذ پر جانے کی اجازت طلب کر رہے ہیں، ہمیں اس ضمن میں آخری فیصلہ کرنا ہے۔''

ناظمِ اعلیٰ لیاقت بلوچ کہتے ہیں ''ایجنڈے میں اس معاملے پر کل گفتگو ہوگی، فیصلہ بھی ان شاء اللہ کل ہو جائے گا۔''

ہم سب محسوس کر رہے ہیں کہ یہ موضوع ہم سب سے متعلق ہے۔ ہم اپنے ان ساتھیوں سے الگ نہیں رہ سکتے جو آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور اس کا جواز رکھتے ہیں۔ وہ مظلوموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور ظلم سے براہِ راست آگاہ ہیں۔

کھانے کے وقفے میں بھی یہی موضوع سب کے ذہنوں میں اور بعض کی زبانوں پر ہے۔ وہ صوبہ سرحد سے آنے والے ساتھیوں سے مصروف گفتگو ہیں جو کہہ رہے ہیں ''کارکن بے چین ہیں۔ ان کے جذبات اپنی بنیاد رکھتے ہیں۔ ان کی نظریں جمعیت

کے اجلاس پر لگی ہوئی ہیں۔"

مسئلہ اپنی تمام تر سنگینی کے ساتھ سامنے آچکا ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آرہا کہ فیصلہ کیا کریں؟ اس وقت ہم اس پر تبادلۂ خیال نہیں کر رہے کیونکہ ایجنڈے کی دوسری مصروفیات پیشِ نظر ہیں۔ لیکن ہم بہت کچھ سوچ رہے ہیں۔

معاً میرے ذہن میں روشنی کا ایک ہالہ ابھرتا ہے ...... سید مودودی ...... ہاں! صاحب تفہیم القرآن ...... ہم کیوں نہ ان سے رہنمائی لیں۔ کیوں نہ اپنا دکھ ان کے سامنے رکھیں۔ ہم بارہا ان کے پاس گئے ہیں، کیونکہ نہ ہم ایک بار پھر جائیں اور ان سے کہیں کہ ہم اس لئے آئے ہیں ہمیں تو آخر اپنے درد و کرب کے مداوا اور راہِ عمل کے انتخاب کی خاطر آپ کے پاس ہی آنا تھا۔

عصر کی نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ میں ناظمِ اعلیٰ سے اپنے خیال کا اظہار کر رہا ہوں۔ وہ کہتے ہیں "نہیں مولانا کی صحت بڑی خستہ ہے۔ وہ کیسے مرکزی شوریٰ کو وقت دے سکتے ہیں"۔

مگر میں اپنی دھن میں ۵-اے ذیلدار پارک جا پہنچتا ہوں۔ سید محمد فاروق مودودی ملتے ہیں۔ عرض کرتا ہوں: "مولانا اگر اجازت دیں تو ہم کل ان کی خدمت میں حاضر ہو جائیں" ...... وہ اندر جاتے ہیں۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔ چند ثانیے بعد دروازہ کھلتا ہے۔ محمد فاروق باہر آ کر کہتے ہیں۔ "ابا جان نے کہا ہے کل دس بجے آ جائیے۔" تشکر آمیز نظر سے انہیں دیکھتا ہوں، ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور پھر تیزی سے واپس پلٹتا ہوں۔ ایک احساس ذہن پر غالب ہے:

"مولانا نے ہمیں مایوس نہیں کیا، اتنی خستہ حالت میں بھی مایوس نہیں کیا۔"

یونیورسٹی نیو کیمپس میں پہنچ کر ناظمِ اعلیٰ کو اطلاع دیتا ہوں۔ "کل ان شاء اللہ مولانا سے اس سلسلہ میں بات ہوگی، مسئلہ افغانستان پر۔"

آج ۲ مئی ۱۹۷۹ء ہے۔

ہم بائیس افراد مولانا کی مطالعہ گاہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ کرسیاں افراد کی تعداد کے لحاظ سے کم ہیں۔ مولانا دائیں جانب کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ میں ان کے قریب نیچے بیٹھ جاتا ہوں لیکن مولانا اپنا دایاں ہاتھ دو مرتبہ میرے کندھے پر رکھ کر فرماتے ہیں۔ ''کرسی پر بیٹھ جایئے۔''

میں سپاس گزار نگاہوں سے انہیں دیکھتا ہوں اور جیسے آنکھیں کہہ رہی ہوں ان قدموں میں ہی بیٹھنے دیجئے۔ یہ سعادت ایک بار پھر نصیب ہونے دیجئے۔

ساتھی چاروں طرف کھڑے ہیں، کچھ موجود کرسیوں پر بیٹھ چکے ہیں۔

لیاقت بلوچ صاحب، شوریٰ کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں ''مولانا! افغانستان پر جن مظالم اور عقائد کی بیخ کنی کے جس عمل کا آغاز ہو چکا ہے، اس کے نتیجے میں ہزاروں انسان کٹ رہے ہیں۔ لاکھوں ہجرت کر کے آ رہے ہیں۔ مسجدیں تباہ ہو رہی ہیں۔ بچے تک قتل کئے جا رہے ہیں۔ افغان مسلمان اس درندگی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، انہوں نے جہاد کا آغاز کر دیا ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اس کیفیت کو دیکھ کر سرحد سے جمعیت کے کارکنان جہاد پر جانے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔ .... ہماری رہنمائی فرمایئے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے کیونکہ اس وقفے کے بعد شوریٰ کے اجلاس میں ہمیں اس موضوع پر بحث.......... اور فیصلہ کرنا ہے۔

ہم سب سیّد محترم کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ نکات کو محفوظ کرنے کے لئے قلم اور کاغذ میرے ہاتھ میں ہے...... مولانا پر نقاہت اس قدر غالب ہے کہ اس روز وہ کم سے کم الفاظ میں اپنی بات مکمل فرما رہے ہیں۔

''افغانستان کے سابقہ حکمرانوں نے جس نادانی...... اور موجودہ نام نہاد حکمرانوں نے جس درندگی کا مظاہرہ کیا ہے وہ عالمِ اسلام کے لئے مقامِ عبرت ہے...... کوئی شک نہیں کہ ہمارے افغان بھائی اس وقت نہ صرف صدی کے بہت بڑے جہاد میں مصروف

ہیں بلکہ جن مشکلات کا انہیں سامنا ہے، دوسروں کو ان کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔

وہ ایک لمحے کے لئے رکتے ہیں اور ہم سب ہمہ تن گوش ہیں۔

"لیکن جب تک .... کابل حکومت ریاستِ پاکستان کے خلاف جنگ کا اعلان نہیں کرتی یا حکومتِ پاکستان اس سے تمام تعلقات توڑ کر اعلان جنگ نہیں کرتی، آپ پاکستانی شہریوں کو سرحد پار کر کے میدانِ جنگ میں نہیں اترنا چاہئے۔ یہ نہ صرف اسلامی قانون بین الاقوام کی نگاہ میں مناسب نہیں ہو گا بلکہ پاکستان کے لئے بھی مشکلات کا باعث بنے گا[1] .... البتہ قبائلی علاقے سے تعلق رکھنے والے آپ کے کارکنان جا سکتے ہیں۔ مگر زیادہ بہتر یہ ہو گا کہ وہ بھی اسی پالیسی کو اختیار کریں، جسے حکومت پاکستان اور آپ کا نظم طے کرے۔

مولانا نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

اگر حالات بہت ہی زیادہ خراب ہو جائیں اور وہاں پر جہاد میں مصروف مجاہدین کی قیادت یہ چاہے کہ دوسرے مسلم ممالک سے انہیں افرادی قوت بھی درکار ہو۔ تب ایسے مسائل کا مرکزی سطح پر حل تلاش کیجئے۔ مگر یہ چیز انفرادی یا مقامات کی سطح پر نہیں ہونی چاہئے۔

سیّدی ایک بار پھر رکتے ہیں اور ایک بار پھر ہم ان کی آواز سنتے ہیں:

---

[1] یاد رہے کہ یہ گفتگو اس وقت ہوئی تھی جب حکومت پاکستان نے نور محمد ترہ کئی کی حکومت کو ایک معاند حکومت کے طور پر تسلیم کر رکھا تھا۔ ۱۷ ستمبر ۷۹ء کو اس کے قتل کے بعد حفیظ اللہ امین صدر بنا، تب بھی حالات اسی طرح خراب تھے۔ لیکن ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء کو صورت حال یکسر بدل گئی۔ جب کیمونسٹ حکومتِ روس نے پورے افغانستان پر اپنی ڈیڑھ لاکھ مسلح افواج سے حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور اپنے ایک کارندے ببرک کارمل کو کٹھ پتلی صدر بنا کر کابل میں بٹھا دیا۔ حکومتِ پاکستان نے ببرک اور پھر اس کے بعد نجیب حکومت کو تسلیم نہیں کیا۔ اسی دوران میں روسی اور کیمونسٹ افغان فوجوں نے اپنی اطاعت نہ کرنے والے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ ۱۴ لاکھ بے گناہ افغان عورتوں، بچوں اور مردوں کو شہید کر دیا۔ ساٹھ لاکھ افراد کو پاکستان ہجرت پر مجبور کر دیا اور دوسری طرف پاکستان میں سینکڑوں تخریبی کارروائیاں کیں، سرحدی علاقوں پر فضائی حملے کئے اور بیسیوں اسکڈ میزائل پھینکے۔

ایک بات اچھی طرح سمجھنے کی یہ ہے کہ جنگ کے دوران میں جہاد کا تصور صرف تلوار اور بندوق سے وابستہ نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جہاد کے عمل کو تیز اور مؤثر بنانے کے اور میدان بھی ہیں۔ جس طرح ایک فوج محاذ پر لڑ رہی ہوتی ہے لیکن اس کے لئے رائے عامہ کو ہموار کرنے والے، اس کی سپلائی لائن کو برقرار رکھنے والے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے والے بھی درحقیقت اسی طرح محاذ پر مصروفِ کار ہوتے ہیں جس طرح براہِ راست محاذِ جنگ پر دست بدست لڑنے والے افراد ہوتے ہیں...... بالکل اسی طرح اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنوں پر موجودہ صورتحال میں بڑی کٹھن ذمہ داری آ پڑی ہے جسے بہر حال آپ ہی کو ادا کرنا ہے۔

وہ آواز جو نقاہت کے باعث ایک گز کے فاصلے سے زیادہ دور نہیں جا رہی تھی عملاً پورے پاکستان اور فی الحقیقت سارے عالمِ اسلام کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔

”آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ آپ پاکستان میں ان مظلوم افغان مہاجرین کی مالی واخلاقی اعانت کریں تاکہ مجاہدین زیادہ یکسوئی سے میدانِ کارزار میں اپنی ذمہ داری ادا کر سکیں...... آپ ان کے لئے عالمی ضمیر کو مخاطب کریں تاکہ ہمارے مہاجر بھائی زیادہ باوقار طریقے سے مصیبت کے ان دنوں کو گزار سکیں...... یاد رکھئے جس استعماری طاقت نے ان پر حملہ کیا ہے وہ پاکستان کے ففتھ کالمسٹوں کے ذریعے ان بے گھر مہاجروں اور بے سروسامان مجاہدوں کو زک پہنچانے کے لئے ہمارے ذرائع ابلاغ سے بھی حملہ کرے گی اور خصوصاً ابلاغِ عامہ کے اس War Fare میں آپ کے سوا کوئی بھی یہاں سے ان کی معاونت نہ کرے گا۔

شفقت، رہنمائی اور تاکید سب چیزیں یکجا ہو گئی تھیں۔ جب مولانا نے آخر میں فرمایا: ”یہ کام کٹھن ہے، صبر آزما ہے اور نہایت بنیادی بھی ہے۔ جمعیت کے کارکن پوری دینی ذمہ داری سے اسے انجام دیں۔ ان شاء اللہ وہ کسی طرح بھی میدانِ جنگ میں لڑنے والے افغان مجاہدین سے کم اجر و ثواب کے مستحق نہیں ہوں گے۔ شرط صرف یہ

ہے کہ اس چیز کو پورے شعور کے ساتھ سمجھ لیا جائے۔

ہم واپس یونیورسٹی آ رہے ہیں۔

خلجان سے پاک ذہن کے ساتھ۔ یکسو کر دینے والی رہنمائی کے ساتھ------

ایک واضح لائین آف ایکشن کے ساتھ۔

ہم صاحب تفہیم القرآن سے مل کر آ رہے ہیں۔

(بشکریہ آئین)

* * *

مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (M.S.A) شمالی امریکہ وکینیڈا کے ۱۷ ویں سالانہ اجتماع کے لئے ایک سوال کے جواب میں یہ پیغام

ڈاکٹر انیس احمد صاحب نے قلم بند کیا ----مئی ۱۹۷۹ء

سوال: محترم مولانا! قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی الی اللہ قرار دیتا ہے۔ آپ قرآن اور سیرتِ پاک کی روشنی میں ایک داعی حق کی کون کون سی اہم خصوصیات بیان فرمائیں گے؟

جواب: امریکہ اور کینیڈا میں جو اللہ کے بندے تحریکِ اسلامی کے لئے کام کر رہے ہیں ان سب کو میری طرف سے سلام پہنچا دیجئے۔ میں زیادہ دیر تک بات نہیں کر سکتا۔ اس لئے مختصر طور پر آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں۔

قرآن کریم میں ایک آیت ہے جس میں ایک داعی کی اہم خصوصیات کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۔

"یعنی اس شخص سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔"

اس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کے لئے یہ چیز نگاہ میں رکھنی ضروری ہے کہ یہ بات مکہ معظمہ کے حالات میں کہی گئی۔ یہ وہ دور تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروؤں پر شدید مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ ایسے عالم میں یہ بات کہنا اور اس

بات کا اعلان کرنا کوئی آسان کام نہ تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ ایسی بات کہنا گویا اپنے اوپر درندوں کو حملہ آور ہونے کی دعوت دینا تھا۔ ان حالات میں پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ بہترین قول اس شخص کا ہے جو اللہ کی طرف بلائے۔ دوسرے الفاظ میں ایک داعیٔ حق کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی دعوت اللہ کی طرف ہو، کوئی دنیاوی غرض اس کے سامنے نہ ہو، نہ وطنی، نہ قومی، نہ خاندانی اور نہ مادی۔ کوئی دوسرا مقصد اس کے پیشِ نظر نہ ہونا چاہئے۔ کوئی شخص خالص اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہو تو قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق ایسے داعی کی اوّلین خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسے اللہ کی توحید کی طرف دعوت دینی چاہئے، اسے اس بات کی دعوت دینی چاہئے کہ خدا کے سوا کسی کی بندگی، کسی کی عبادت اور کسی کی پرستش نہ کی جائے۔ خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہو، خدا کے سوا کسی سے کوئی طمع نہ ہو، صرف خدا ہی کے احکام اور اس کے فرامین کی اطاعت اس کے پیشِ نظر ہو! اسی کے قانون کی پیروی مطلوب ہو۔ آدمی دنیا میں جو کام بھی کرے یہ سمجھتے ہوئے کرے کہ میں کس کا بندہ ہوں اور کس کے سامنے جا کر مجھے جوابدہی کرنی ہے۔ انسان کی تمام کوششیں اور ساری جدوجہد کا مرکز ومحور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر اور اس کے ذریعے رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہئے۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی:...... کہ داعیٔ حق عَمِلَ صَالِحًا کی خوبی سے آراستہ ہو یعنی نیک عمل کرے۔ اس فرمان پر ذرا بھی غور کیا جائے تو پورا مفہوم واضح ہو جائے گا۔ کہ دعوت دینے والے کا اگر اپنا عمل درست نہ ہو تو پھر اس کی دعوت کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ایک انسان جس چیز کی طرف دعوت دے اسے اس کا عملی مجسمہ ہونا چاہئے۔ اس کی اپنی زندگی میں خدا کی نافرمانی کا کوئی شائبہ تک نہ پایا جائے، اس کے اخلاق ایسے ہونے چاہئیں کہ کوئی شخص اس کے دامن پر ایک دھبہ تک نہ دکھا سکے۔ اس کے گردوپیش کا ماحول، اس کا معاشرہ، اس کے عزیز واقارب، سب یہ جانتے ہوں کہ ہمارے درمیان یہ ایک نہایت بلند اور پاکیزہ کردار آدمی ہے۔

یہ تعلیم ہمیں قرآن پاک کے ساتھ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی قدم قدم پر ملتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی حیاتِ طیبہ شہادت دیتی ہے کہ جب وہ خدا کی طرف سے دعوتِ حق دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو وہ معاشرہ جس میں آپؐ چالیس سال سے موجود تھے آپؐ کے عظیم الشان کردار کا شاہد تھا۔ اس معاشرے میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جو آپ کی بلندی اخلاق کا قائل نہ ہو اور آپؐ کے ظاہر و باطن کی زندگی اور اس زندگی کی پاکیزگی کا معترف نہ ہو۔ جو آپؐ کے جس قدر قریب تھا وہ اتنا ہی آپ کا زیادہ معتقد تھا۔ جن افراد سے آپؐ کی زندگی کا کوئی پہلو چھپ نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے آپؐ کی نبوّت کا اقرار کیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پندرہ سال سے آپؐ کی زوجیت میں تھیں اور وہ کوئی کمسن عورت نہیں تھیں بلکہ عمر میں ان سے بڑی تھیں۔ جس وقت آپؐ نے نبوّت کا دعویٰ کیا اس وقت ان کی عمر پچپن سال تھی۔ ایک ایسی پختہ، سن رسیدہ اور دانشمند خاتون سے جس نے پندرہ سال سے اپنے شوہر کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہو، شوہر کا کوئی عیب اس سے چھپ نہیں سکتا۔ دنیاوی اغراض کے لئے ایک بیوی اپنے شوہر کے ناجائز کاموں میں بھی شریک ہو سکتی ہے لیکن اس پر ایمان کسی صورت میں نہیں لا سکتی۔ عقیدۃً بھی وہ یہ ماننے کے لئے کبھی تیار نہیں ہو سکتی کہ یہ شخص خدا کا رسول ہو سکتا ہے یا اسے ہونا چاہئے۔ لیکن حضرت خدیجہؓ آپؐ کی اس حد تک معتقد تھیں کہ جب آپؐ نے نبوّت کی بشارت کا ماجرا بیان کیا تو انہوں نے ایک لمحے کا تامل کئے بغیر اسے تسلیم کر لیا۔

قریب سے دیکھنے والے دوسرے شخص زیدؓ بن حارث تھے جو غلام کی حیثیت سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے میں آئے تھے تو پندرہ برس عمر تھی اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا آغاز ہوا تو حضرت زید رضی اللہ عنہٗ کی عمر تیس سال تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پورے پندرہ سال انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں رہ کر ہر طرح سے اور ہر پہلو سے آپؐ کی زندگی کو دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ ان کی شہادت ایک خاص صورت میں سامنے آتی ہے۔ (واقعہ یہ تھا کہ وہ بچپن میں والدین

سے بچھڑ گئے تھے اور خدا کی قدرت نے انہیں آنحضور تک پہنچا دیا)۔ جب ان کے والدین اور ان کے چچا کو معلوم ہوا کہ ہمارا بیٹا فلاں جگہ غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے تو وہ مکہ معظمہ آئے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ انہوں نے آ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ:

”آپ کا بڑا احسان ہوگا، اگر آپ ہمارے اس بیٹے کو آزاد فرما دیں۔“

آپؐ نے فرمایا کہ:

”میں لڑکے (زید) کو بلا لیتا ہوں، وہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو میں آپ کے ساتھ روانہ کر دوں گا اور اگر وہ میرے ساتھ رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جو میرے ساتھ رہنا چاہے تو اسے زبردستی اپنے سے علیحدہ کر دوں۔“

آپؐ کی اس بات کے جواب میں انہوں نے کہا کہ آپؐ نے بہت انصاف کی بات کی ہے۔ آپ زید کو طلب فرمائیے۔ جب حضرت زیدؓ ان کے سامنے آئے تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

”ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟“

حضرت زیدؓ نے کہا:

”جی ہاں! یہ میرے والد اور چچا ہیں۔“

آپؐ نے فرمایا کہ:

”یہ تمہیں واپس گھر لے جانے کے لئے آئے ہیں، تم جانا چاہو تو بڑی خوشی سے ان کے ساتھ جا سکتے ہو۔“

انؓ کے والد اور چچا نے بھی یہی کہا کہ ”ہم تمہیں لے جانا چاہتے ہیں۔“

حضرت زیدؓ بن حارث نے کہا کہ:

”میں نے انؐ میں (حضورؐ کی طرف اشارہ) ایسی خوبیاں دیکھی ہیں کہ جن کے بعد انہیں چھوڑ کر میں اپنے باپ اور چچا اور رشتہ داروں کے پاس جانا نہیں چاہتا۔“

یہ تھی آپؐ کے اخلاق کے بارے آپؐ کے خادم کی گواہی۔ ایک خادم احسان مند ہوسکتا ہے لیکن اتنا متاثر اور گرویدہ نہیں ہوسکتا کہ اپنے مخدوم پر ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں کردار کی ایسی بلندی اور اخلاق کی ایسی پاکیزگی دیکھی ہو کہ جس کے بعد اسے یہ ماننے میں ذرا تامل نہ ہو کہ میرا مخدوم نبی ہے۔ یہ بات بھی پیشِ نظر رکھیے کہ حضرت زیدؓ بن حارث کسی معمولی قابلیت کے آدمی نہیں تھے۔ مدینہ طیبہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت قائم ہوئی تو انہیں بکثرت فوجی مہمات میں لشکرِ مجاہدین پر سالار بنایا گیا۔ یہ گواہی ایسی قابلیت کے انسان کی گواہی تھی۔

پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جنہیں نبوّت سے پہلے بیس سال تک ایک گہرے دوست کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کا موقع ملا، ان کی نشست و برخاست آپؐ کے ساتھ تھی اور مکہ معظمہ میں سب سے زیادہ جن دو، آدمیوں کی دوستی تھی ان میں سے ایک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور دوسرے حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ ایک دوست اپنے دوست کو پسند کرسکتا ہے، اس سے اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہے، لیکن کبھی اتنا معتقد نہیں ہوسکتا کہ اس کو نبی مان لے۔ حضرت صدیقؓ کا بلاتامل آپ کو نبی مان لینا ظاہر کرتا ہے کہ بیس سال کی اس طویل مدّت کے دوران میں انہوں نے آپ کو اخلاق کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی کا مجسم نمونہ پایا۔ جب ہی تو انہوں نے یہ تسلیم کیا اور اس بات کا اعلان کیا کہ اتنے بلند کردار کا آدمی یقیناً نبی ہوسکتا ہے اور اس کو نبی ہونا چاہئے۔

حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کا نام میں نے پہلے اس لئے نہیں لیا کہ اس وقت وہ دس سال کے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر ہی میں پرورش پائی تھی۔ لیکن دس سال کا بچہ بھی جس کے گھر میں ہو، جس کے پاس رہتا ہو، اس کے ہر پہلو سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ خصوصاً اتنا ذہین انسان، جیسا کہ حضرت علیؓ اپنی خصوصیات کی بنا پر آگے چل کر ثابت ہوئے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بچپن میں بھی یقیناً اتنی ذہانت رکھتے تھے کہ جس کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک ذہین بچے کا اس بات کو مان

لہٰذا اس کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ آپؐ کی شفقت، آپؐ کے انتہائی پاکیزہ اور بلند اخلاق و کردار سے واقف تھا۔

اس لئے ''عمل صالحا'' کے سلسلہ میں ان اعلیٰ مثالوں سے معلوم ہوا کہ انسان جس چیز کو پیش کر رہا ہو، اس کی زندگی ٹھیک اس دعوت کے مطابق بسر ہو رہی ہو۔ وہ اتنے پاکیزہ اخلاق اور بلند کردار کا مالک ہو کہ جب وہ اللہ کے راستے کی طرف بلانے کے لئے اٹھے تو اس کی بات میں وزن ہو اور اس کے قول میں اثر ہو۔ اس کا عمل شہادت دے اور لوگ تسلیم کریں کہ یہ واقعی اپنے قول میں سچا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ لوگ اسی چیز کو مانیں یا نہ مانیں ...... لیکن یہ تو ان کو ماننا پڑے گا کہ یہ آدمی اپنے قول میں سچا ہے، جو کچھ کہہ رہا ہے وہ اس بناء پر کہہ رہا ہے کہ وہ اس نظریے، اس اصول اور اس دعوت کا قائل ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن ابوجہل نے ایک مرتبہ خود کہا ''کہ اے محمد! ہم تم کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ اس پیغام کو جو تم لائے ہو جھوٹا کہتے ہیں۔'' یعنی آپؐ کا بدترین دشمن بھی آپؐ کی صداقت کا قائل تھا۔ پس ایک داعی کی دوسری بڑی خصوصیت اس کے قول و عمل کی یہ صداقت ہے، یہ بلندیٔ کردار ہے اور یہ پاکیزگیٔ اخلاق ہے۔

تیسری خصوصیت یہ بیان فرمائی گئی: وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (یعنی وہ کہتا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں)۔ اسے سمجھنے کے لئے مکہ معظمہ کا وہ ماحول پیشِ نظر رکھنا چاہئے جس کو میں شروع میں بیان کر چکا ہوں۔ یہ وہ دور تھا کہ جب کسی فرد کا اٹھ کر یہ اعلان کرنا کہ میں مسلمان ہوں، کوئی معمولی بات نہیں تھی، بلکہ درندوں کو اپنے اوپر حملہ آور ہونے کی دعوت دینا تھا۔ تو داعیٔ حق کی یہ خصوصیت سامنے آتی ہے کہ وہ نہ صرف اللہ کی طرف دعوت دینے والا ہو، نہ صرف پاکیزہ عمل رکھنے والا ہو، بلکہ وہ بدترین دشمنوں اور انتہائی ناسازگار حالات میں بھی اپنے مسلمان ہونے سے انکار نہ کرے۔ اپنے مسلمان ہونے کو چھپائے نہیں۔ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان اور اقرار کرنے میں وہ نہ شرمائے، نہ جھجکے اور نہ ڈرے۔ بلکہ کھلم کھلا یہ کہے کہ ''ہاں میں مسلمان ہوں۔ جو

کچھ، جس کا جی چاہے کر لے" دوسرے الفاظ میں داعی حق کی تیسری بڑی اور اہم خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ نہایت جری آدمی ہو، نہایت بہادر آدمی ہو...... کسی بزدل آدمی کا کام نہیں ہے کہ وہ خدا کے راستے کی طرف دعوت دے۔ جو ذرا سی چوٹ لگنے پر بلبلے کی طرح بیٹھ جانے والا ہو۔ ایسا انسان کبھی خدا کے راستے کی طرف نہیں بلا سکتا۔ خدا کے راستے کی طرف دعوت جو شخص دے سکتا ہے وہ، وہ ہے جو سخت سے سخت دشمنی کے ماحول میں، مخالفت کے ماحول میں، خطرات کے ماحول میں اسلام کا علم لے کر اٹھ کھڑا ہو اور اس بات کی پروا نہ کرے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ذات، اس شجاعت کا ایک مکمل اور عملی نمونہ تھی۔ مکہ معظمہ میں کھلم کھلا آپؐ نے دعوتِ اسلام پیش کی، شہادتِ حق کا فریضہ انجام دیا اور ان لوگوں کے درمیان یہ کام جاری رکھا جو آپؐ کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے اور جنہوں نے آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ آپؐ مسلسل تیرہ سال تک اس ماحول کی تمام تر تاریکیوں، سختیوں اور مصیبتوں کے درمیان اپنی دعوت پیش کرتے چلے گئے۔ پھر مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد جو حالات پیش آئے جن خطرناک اور بڑی بڑی لڑائیوں سے سابقہ پیش آیا ان میں بھی آپؐ کا قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔ غزوۂ حنین کے موقع پر جب کہ مسلمانوں کو تقریباً شکست ہو چکی تھی، رسول اللہ نہ صرف اپنے مقام پر موجود رہے بلکہ میدانِ جنگ میں برابر آگے، دشمن کی صفوں کی طرف بڑھتے چلے گئے اور اس بات کو چھپایا بھی نہیں کہ "میں کون ہوں؟" آپ فرما رہے تھے۔

"اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ
اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ"

"میں نبی ہوں، جھوٹا نہیں ہوں...... میں ابن عبدالمطلب ہوں۔" یہ اعلان آپؐ اس جنگ میں ایسے حالات کے دوران میں کر رہے تھے، جب آپؐ دشمنوں کے نرغے میں تھے اور ساتھ صرف دو تین ساتھی رہ گئے تھے۔ اس وقت بھی یہ کہا کہ "ہاں! میں نبی ہوں" اس سے ظاہر ہوا کہ ایک داعی حق کو اتنا شجاع اور اتنا بہادر ہونا چاہئے جو اللہ کی

راہ کی دعوت دینے کے لئے کھڑا ہو۔ اگر داعی میں ہمت، شجاعت، استقامت اور بہادری کا جوہر نہ ہو تو وہ اس راہ میں کھڑا ہو نہیں سکتا، اور اگر کھڑا ہو بھی جائے تو اپنی بزدلی کی وجہ سے الٹا اس مشن کو نقصان پہنچانے کا سبب بن جاتا ہے۔

یہ وہ چند باتیں تھیں جو میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہیں۔ اگر ان پر غور کیا جائے تو یہ بجائے خود دعوت الی اللہ کا مکمل پروگرام ہے جس کے مطابق ہر جگہ، ہر ماحول میں کام لیا جا سکتا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔

☆☆☆

کراچی کے ہفت روزہ ''پیمان'' نے داعیٔ تحریکِ اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
کی پُر عزم جدوجہد کے ان مرحلوں کو قلم بند کیا جو قید و بند سے عبارت ہیں۔
انٹرویو نگار امیر حسین ہیں۔ بعد میں یہ انٹرویو ماہ نامہ ''آئین'' لاہور
کی خصوصی اشاعت میں بھی شائع ہوا---- ۱۹۷۳ء

ان دنوں میں بطورِ خاص مولانا مودودی کے انٹرویو کی غرض سے لاہور آیا ہوا تھا۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ انہوں نے میرے ایک کرم فرما کے کہنے پر اس ملاقات کے لئے وقت مقرر کیا۔ انٹرویو کے پہلے روز وقتِ مقررہ سے کچھ دیر بعد جب میں مولانا کے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے تاخیر سے حاضر ہونے کی معذرت چاہی اور عرض کیا کہ لاہور میں اجنبی ہونے کے باعث دقت ہوئی۔ مولانا نے خندہ پیشانی سے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا کوئی حرج نہیں میں کام ہی میں مصروف تھا۔ آپ کا انتظار اگرچہ رہا لیکن اس وقفے میں تفہیم کی ابتدائی جلدوں پر نظر ثانی کا کام کرتا رہا...... مولانا کی بے پناہ صلاحیتوں اور لازوال علم کی تصویر یعنی تفہیم القرآن کی وہ تفسیر حال ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے۔

(1)

میں مولانا کے ایامِ اسارت کی داستان سننا چاہتا تھا۔ لیکن رودادِ زندان سے زیادہ المناک وہ پس منظر ہے جس کی وجہ سے انہیں ہر مرتبہ اس لئے قید ہونا پڑا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے ان کا مطالبہ بہت سی طبیعتوں پر ناگوار گزر رہا تھا۔ (اس ضمن میں مولانا نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بتایا کہ ''اسلامی نظام کے اس مطالبے کو دبانے کی

غرض سے میری کردار کشی کی گئی۔ مجھ پر سیاسی بہتان لگائے گئے اور قید و بند تو کیا سزائے موت سنانے سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود خدا کے فضل سے کوئی مجھے میرے موقف سے نہیں ہٹا سکا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی کامیابی قراردادِ مقاصد کی منظوری تھی۔ اگر ہم اس وقت جدوجہد کر کے وہ باتیں نہ منوا لیتے جن پر قرارداد مشتمل ہے تو مستقل طور پر یہ سوال زیر بحث رہتا کہ پاکستان کو نظریاتی طور پر کیا ہونا چاہئے اور کیا نہیں؟

میں نے مولانا سے ان تجاویز کے بارے میں پوچھا جو اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے انہوں نے پیش کی تھیں تو انہوں نے اپنے عقب میں رکھی ہوئی ایک شیلف میں سے وہ تجاویز پڑھ کر سنائیں جو جنوری، فروری ۱۹۴۸ء لاء کالج لاہور کی تقاریر میں انہوں نے پیش کی تھیں۔ اور جو قراردادِ مقاصد پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی نے ۱۹۴۹ء میں اس وقت منظور کی جب مولانا سیفٹی ایکٹ کے تحت جماعت کے دیگر رہنماؤں کے ساتھ ملتان جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔ لیکن مولانا کے مطالبے کی راستی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ نہ صرف مفہوم و معنیٰ کے اعتبار سے بلکہ اپنے الفاظ اور عبارت کے لحاظ سے بھی قراردادِ مقاصد ان کی مہینوں پہلے پیش کی ہوئی تجاویز سے ہم آہنگ ہے۔

مولانا نے بتایا ’’قراردادِ مقاصد کا متن مجھے ملتان جیل میں حکومت کی طرف سے دکھایا گیا تاکہ یہ معلوم کر لیا جائے کہ میں اس سے مطمئن ہوں یا نہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ میرے مطالبات کو من و عن تسلیم کر لینے کے باوجود حکومت میری نظر بندی میں برابر چھ چھ ماہ کا اضافہ کرتی رہی۔‘‘

اگر کوئی سننے والا ہوتا تو ایک عام سوجھ بوجھ کا انسان بھی اس دور میں یہ پوچھنے پر مجبور تھا کہ اگر ملک کی تعمیر فی الواقع انہی بنیادوں پر مقصود ہے تو ان لوگوں کو قید میں رکھنے کا کیا جواز ہے جنہوں نے انہی مقاصد کے لئے جدوجہد کی ہے؟ لیکن مولانا کی نظر بندی جو قائداعظم کی وفات کے ٹھیک تین ہفتے بعد شروع ہوئی تھی قراردادِ مقاصد کی

منظوری کے باوجود ۱۹۵۰ء تک جاری رہی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ انہی دنوں بائیں بازو کے ایک دانشور کا مقدمہ عدالت عالیہ میں پیش ہوا جس پر عدالت نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ تین مرتبہ سے زائد نظر بندی کے حکم میں توسیع ممکن نہیں ہے۔ اس طرح اس قانون کے باطل قرار دیئے جانے پر مولانا بیس ماہ بعد ۱۹۵۰ء میں رہا ہوئے۔

میں نے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا حکومت نے عدالت کے اس فیصلے کے بعد آپ کو کسی نئے مقدّمے میں پھانس کر مزید کچھ عرصے کے لئے قید میں رکھنے کی سعی نہیں کی؟

(مولانا مسکرا دیئے اور فرمایا) ”نہیں ایسا نہیں ہوا' اس لئے کہ حکومت کی فہم و بصیرت اس وقت تک اتنی ترقی نہ کر سکی تھی کہ ہر معتوب کے لئے کئی کئی مقدّمے تیار رکھے۔ بلکہ اربابِ اقتدار نے پولیس کو پے در پے مقدمات تیار کرنے کی غرض سے مناسب تربیت بھی اس وقت تک نہ دی تھی۔[1]

مولانا مودودی سے میں نے پوچھا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے جب آپ کی تجاویز قراردادِ مقاصد کی صورت میں منظور ہو چکی تھیں تو پھر اب تک پاکستان میں یہ نظام نافذ کیوں نہیں ہو سکا؟

(مولانا نے فرمایا) ”یہی بات میں نے ۱۹۵۰ء میں جیل سے رہا ہو کر کہی تھی کہ نہ اس کی منظوری سے پہلے اسے عمل میں لانے کا کوئی جذبہ تھا اور نہ اس کی منظوری کے بعد بیان کردہ مقاصد کے حصول کی طرف کوئی قدم اٹھایا گیا۔ گویا اس قرارداد کی مثال اس بارش کی سی ہے کہ جس کے آنے سے پہلے نہ کوئی گھٹا اٹھی اور نہ جس کے برسنے کے بعد کوئی روئیدگی ہوئی۔“[2]

میں نے عرض کیا ”آپ نے فرمایا ہے کہ آپ کی پہلی گرفتاری قائداعظم کی وفات

---

[1] ۱۹۷۳ء میں پیپلز پارٹی کا وہ دور حکومت یاد رہے گا، جب اکثر سیاسی قیدیوں کو باری باری کئی جھوٹے مقدموں میں الجھا کر جیل خانے سے نکلنے کی مہلت ہی نہ دی جاتی تھی۔

[2] سید مودودیؒ کی تقریر ۲۳ جولائی ۱۹۵۰ء باغ بیرون دہلی دروازہ، لاہور۔

کے بعد عمل میں آئی۔ اس سے یہ تو ظاہر ہے کہ بابائے ملت کی زندگی میں اسلامی نظام کا مطالبہ کرنے والوں کو کوئی جیل میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ تو پھر یہ کیا بات ہے کہ آپ نے جس کردار کشی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، اور یہاں تک کہا گیا کہ آپ نے جہادِ کشمیر حرام ہونے کا فتویٰ دیا ہے؟''

(مولانا نے فرمایا) ''میں نے اس قسم کا کوئی فتویٰ نہیں دیا۔ اس کا افسانہ اس طرح تیار کیا گیا کہ اس وقت کی حکومتِ آزاد کشمیر کا پبلسٹی سیکرٹری، ایک دن پشاور میں میرے پاس آیا اور اس نے مجھ سے تخلیہ میں کچھ بات کرنے کی اجازت چاہی۔ میں نے اسے تنہائی فراہم کی تو اس نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ آخر جہادِ کشمیر میں حصہ کیوں نہیں لے رہے؟ میں نے اس سے کہا کہ میں اس کی وجہ دانستہ بیان کرنا نہیں چاہتا، لیکن جب اس نے اصرار کیا تو میں نے کہا کہ اگر مجھے جہادِ کشمیر میں حصہ نہ لینے کی وجہ بیان کرنی ہوتی تو میں یہ کام خود کرتا۔ اس کے لئے مجھے آپ کی مدد لینے کی کیا ضرورت تھی کہ میں آپ سے بیان کروں اور آپ اسے ساری دنیا کے سامنے بیان کریں۔ وہ بولا میں یہ بات محض اپنے اطمینان کے لئے پوچھ رہا ہوں۔ میرا مقصد اس معاملے کی ترویج و اشاعت نہیں ہے...... میں نے کہا اگر آپ واقعی یہ بات صرف اپنے اطمینان کے لئے پوچھ رہے ہیں تو سنیے...... جہادِ کشمیر کے سلسلے میں میرے نزدیک یہ کوئی معقول بات نہیں ہے کہ وہاں لڑائی بھی ہو اور نہ بھی ہو۔ یعنی ایک طرف ہماری حکومت تمام دنیا کے سامنے اعلان کرے کہ ہم لڑ نہیں رہے بلکہ لڑنے والوں کو روک رہے ہیں، اور دوسری طرف وہ لڑے بھی۔ تو اس سے نہ صرف ہماری اخلاقی پوزیشن خراب ہو گی بلکہ ہم لڑ بھی نہیں سکیں گے۔ حکومت کا یہ موقف خود پاکستانی وزیر خارجہ نے اقوامِ متحدہ میں بیان کیا تھا جو آج بھی ریکارڈ پر موجود ہے۔ بہرصورت گفتگو ختم ہوئی تو اس سے اگلے روز اخبارات میں یہ خبر شائع کرا دی گئی کہ مودودی نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ کشمیر میں جہاد حرام ہے اور جو اس میں جان دے گا وہ حرام موت مارا جائے گا۔ میں نے اس خبر کی تردید بھیجی تو وہ کسی اخبار نے شائع نہیں کی۔ دوسرے دن یہ ''خبر'' پا کر ہندوستانی ریڈیو نے میرے اس

"فتویٰ" کو اچھالنا شروع کر دیا۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے میں نے ریڈیو پاکستان سے درخواست کی کہ وہ مجھے اس کی تردید کرنے کا موقع دے لیکن اس نے اس سلسلے میں میری مدد کرنے سے انکار کر دیا۔"

(مولانا نے بتایا) کہ یہی شخص جس نے اپنی نوکری کے لئے میرے بارے میں اتنا بڑا جھوٹ بول کر یہ ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ ابھی چند روز ہوئے میرے پاس جماعت کے اسی مرکز میں آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر کافی دیر بھری محفل میں زار و قطار روتا رہا۔ کہنے لگا کہ مولانا مجھے معاف کر دیجئے مجھ سے سخت غلطی ہوئی' میں نادم ہوں، پیٹ کی خاطر میں نے یہ شرمناک افترا پردازی کی اور میری اس غلط بیانی سے آپ کو اس قدر صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔

(مولانا نے فرمایا) مجھے اس وقت کی حکومت اور اس کے طور طریقوں کو دیکھ کر یقین ہو گیا کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے سے روکنا' پاکستان کے کارفرماؤں کے نزدیک اتنا اہم ہے کہ اگر اس کے بدلے کشمیر جیسے اہم Cause کو بھی نقصان پہنچے تو وہ اس میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتے۔

(سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مولانا نے کہا کہ) جہاں تک آپ کی دوسری بات کا تعلق ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ قیامِ پاکستان کے بعد ملک کا نظام قائداعظم نہیں چلا رہے تھے بلکہ حصولِ پاکستان کے عظیم مقصد کو پا لینے کے بعد وہ اسی طرح تھک گئے تھے جس طرح بھارت کی آزادی کے بعد وہاں کے لیڈر گاندھی جی تھک گئے تھے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ دونوں ملکوں کی جدوجہد آزادی میں کامیابی کے بعد یہ دونوں بانی Exhaust ہو چکے تھے۔ قائداعظم ملک کے سربراہ تھے مگر زمامِ کار ان کے ماتحتوں کے ہاتھ میں تھی' جو مطلوبہ جذبے اور فراست دونوں سے یکسر محروم تھے۔

(اس ضروری پس منظر کے بعد مولانا نے جہادِ کشمیر کے سلسلے میں اپنی گرفتاری کی روداد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ) "۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مجھے گرفتار کیا گیا۔ گرفتاری عمل میں آنے سے پہلے نواب ممدوٹ (وزیراعلیٰ پنجاب) اور خواجہ شہاب الدین اس ضمن

میں مجھ سے بات کر چکے تھے اور میں دونوں کو حقیقت بتا چکا تھا کہ جو کچھ کہا گیا یہ سب جھوٹ ہے اور اگر واقعی کسی کے پاس ایسا کوئی فتویٰ ہے تو مجھے لا کر دکھائیے! میں نے ان حضرات سے کہا کہ اگر میں نے تخلیے میں محض اس شخص کے اطمینان کے لئے بات کی تھی تو اس سے پاکستان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ لیکن اگر اس کی اشاعت سے کوئی نقصان پہنچا ہے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ جو بات میں نے کہی تھی وہ حکومت کی موافقت میں تھی۔ ان تمام حقائق کے باوجود گرفتاری عمل میں آئی۔ اس قید کی پہلی میعاد چھ ماہ تھی لیکن بعد میں مزید تین مرتبہ اس میعاد میں چھ چھ ماہ کا اور اضافہ کیا گیا۔

(زنداں کی مصروفیات کے سلسلے میں مولانا نے فرمایا کہ) میں نے وہاں لکھنے پڑھنے کا خاصا کام کیا۔ مسئلہ ملکیت زمین، تفہیم القرآن کی پہلی جلد اور دوسری جلد کو سورۂ یوسف تک نظرثانی کر کے طباعت کے لئے تیار کر لیا۔ تفہیم کا مقدمہ لکھا۔ حدیث کی کتاب ابو داؤد کا Index بھی میں نے زنداں ہی میں تیار کیا تھا۔ علاوہ ازیں کتاب سود اور اسلام اور جدید معاشی نظریات کو بھی میں نے وہیں مکمل کیا تھا، خدا کا شکر ہے کہ وہاں میرا وقت ضائع نہیں گیا۔

(میرے ایک سوال کے جواب میں مولانا نے کہا کہ) زنداں میں اب تک نہ تو کوئی میرے ساتھ سیاسی دباؤ کی بات کر سکا ہے اور نہ انشاء اللہ آئندہ کسی بھی موقع پر کر سکے گا۔ قید کے دوران میں جیل کے عملے اور پولیس نے میرے ساتھ نہایت احترام کا برتاؤ کیا۔ بلکہ تمام جیل کے عملے سے میرے تعلقات اتنے اچھے تھے کہ وہاں سے رہا ہونے کے بعد بھی وہ اب تک مجھ سے اسی احترام اور عزت سے ملتے ہیں۔

(مولانا نے فرمایا کہ) اس نظر بندی کے دوران مجھے کتابیں وغیرہ ملنے میں تقریباً ڈیڑھ مہینہ لگا۔ اجازت ملنے کے بعد مجھے اپنی ضرورت کی کتابیں اپنے بھائی (سیّد ابو الخیر مودودی) اور دیگر رفقاء کی مدد سے مل جایا کرتی تھیں۔ جیل میں مجھے اور جماعت کے دیگر چند صاحبان کو بالکل الگ تھلگ رکھا گیا تھا اور کسی کو ہمارے احاطے میں آنے

کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہم خود کہیں اور جاتے تھے۔ نظر بندی کے دوران دوسرے قیدیوں کو بھی ہم سے ملنے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔

(اسی قید کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ) زنداں میں صفائی کے لئے جو جمعدار مقرر تھا وہ یہاں کا ایک پرانا سکھ قیدی تھا۔ وہ جب بھی ہمارے ہاں صفائی وغیرہ کرنے آتا' میاں صاحب (میاں طفیل محمد صاحب) اس سے خاصی دیر باتیں کرتے اور بالآخر ایک دن میاں صاحب نے اس سکھ جمعدار کو مسلمان کر لیا۔ لیکن ادھر وہ غریب سکھ سے مسلمان ہوا اور ادھر ایک دن جیل کے وارڈن نے اسے ہمارے ساتھ نماز پڑھتا دیکھ کر اس کا تبادلہ کر دیا۔

(2)

(اپنی پہلی گرفتاری کے واقعات بتانے کے بعد دوسری نشست میں مولانا نے ۱۹۵۳ء کی قید کی تفصیل اور اس کا پس منظر بتاتے ہوئے فرمایا کہ) ''۱۹۵۳ء میں میری جو گرفتاری ہوئی اس کے متعلق لوگوں میں یہ غلط فہمی ہے کہ میری وہ گرفتاری قادیانی مسئلے کے سلسلے میں ہوئی تھی حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ یہ قید بھی اسلامی دستور کی جدوجہد ہی کی ایک سزا تھی جس کے لئے پہلا بہانہ ملتے ہی اس سے فائدہ اٹھایا گیا۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسلامی دستور کی جدوجہد کو زک پہنچانے کے لئے یہ ایک بہت بڑی سازش تھی۔ یہ سازش اس لئے کی گئی تھی کہ اس سرزمین سے اسلام اور جمہوریت دونوں کو رخصت کر دیا جائے۔''

(مولانا نے مزید فرمایا) ''یہ قصہ شروع ہوتا ہے اس طرح کہ قراردادِ مقاصد پاس کرنے کے بعد سے دستور بنانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ جو دستوری سفارشات پیش کی گئیں وہ سراسر غیر جمہوری اور غیر اسلامی تھیں۔ لہٰذا پورے ملک میں بیک آواز ان کی مخالفت ہوئی اور لیاقت علی خان مرحوم ان سفارشات کو واپس لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد دستور کے محاذ پر یکایک خاموشی طاری ہو گئی۔ آخرکار مئی ۱۹۵۲ء کے آغاز میں' میں نے اور جماعت اسلامی نے باقاعدہ طور پر حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ ۱۹۵۲ء

کے ختم ہونے سے پہلے پہلے ملک کو دستور دیا جائے اور اس دستور میں آٹھ نکات لازماً شامل ہوں۔''

(مولانا نے شیلف سے ایک کتاب اٹھائے ہوئے کہا) ''وہ آٹھ نکات یہ تھے:

۱۔ ملک کا قانون اسلامی شریعت کے مطابق ہوگا۔
۲۔ کوئی ایسی قانون سازی نہیں کی جائے گی جو قانونِ شریعت کے خلاف ہو۔
۳۔ تمام ایسے قوانین کو منسوخ کیا جائے گا جو شریعت کے احکام یا اصولوں سے متصادم ہوں۔
۴۔ حکومت کے لئے لازم ہوگا کہ وہ ان برائیوں کو مٹائے جنہیں اسلام مٹانا چاہتا ہے اور ان بھلائیوں کو فروغ دے جنہیں اسلام فروغ دینا چاہتا ہے۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ بھرپور اور مخلصانہ کوشش کرے گی۔
۵۔ لوگوں کی شہری آزادیوں کو ان کا جرم کھلی عدالتوں میں ثابت کئے بغیر اور انہیں صفائی کا موقع دیئے بغیر، سلب نہیں کیا جائے گا۔
۶۔ لوگوں کو حق ہوگا کہ انتظامیہ یا مقننہ اگر اپنے حدودِ اختیارات سے تجاوز کریں تو ملک کی عدالتوں سے قانونی چارہ جوئی کر سکیں۔
۷۔ عدلیہ انتظامیہ کی مداخلت سے آزاد ہوگی۔
۸۔ حکومت اس بات کی ضامن ہوگی کہ ملک میں کوئی شخص بنیادی ضروریات زندگی یعنی غذا، لباس، مکان اور علاج سے محروم نہ رہے۔''

(مولانا نے کتاب واپس شیلف میں رکھتے ہوئے فرمایا) ''مئی ۱۹۵۲ء کے آغاز میں ہم نے اسلامی دستور کے لئے تحریک شروع کی اور مئی ۱۹۵۲ء کے آخر میں احرار نے قادیانی مسئلہ چھیڑ دیا، جس سے اس حد تک ہنگامہ ہوا کہ جولائی ۱۹۵۲ء میں ملتان میں فائرنگ ہوگئی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر جماعت اسلامی نے جولائی میں عوام سے اپیل کی کہ اس وقت دستور سازی کا مسئلہ درپیش ہے اس لئے کوئی ایسا قضیہ نہیں کھڑا ہونا چاہئے جس کے سبب ملک دستور سے محروم رہ جائے۔ ہمیں ساری توجہ اسلامی دستور بنوانے پر

صرف کرنی چاہئے۔ آخر جب اسلامی دستور بنتا تو قادیانی مسئلہ آپ سے آپ حل ہو جاتا۔ یہ بات ہم نے اتنے بڑے پیمانے پر سمجھائی کہ اگست سے دسمبر ۱۹۵۲ء تک اس مسئلے پر ہنگامے سُست پڑ گئے اور دستوری مہم تیزی سے آگے بڑھتی رہی، یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۵۲ء میں خواجہ ناظم الدین[1] نے بیسک پرنسپل کمیٹی رپورٹ پیش کر دی جس پر ہمارے ایک ''دانشور'' طبقے میں ہیجان برپا ہو گیا اور روزنامہ ڈان کراچی میں نمایاں طور پر ایک مضمون لکھا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ ملاؤں کے آگے حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔ ''ملاؤں'' کے آگے گھٹنے ٹیک دینے پر ہیجان اس حد تک تھا کہ اسی زمانے میں خواجہ ناظم الدین نے مجھے ایک مخفی ذریعے سے پیغام بھجوایا کہ اس وقت سخت احتیاط سے کام لیجئے ساری بیورو کریسی تلملا رہی ہے اور موقع کی تلاش میں ہے کہ دستوری بساط الٹ دی جائے۔''

(سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مولانا نے کہا) ''۱۱ جنوری ۱۹۵۳ء کو انہی علماء کی ایک مجلس بھی منعقد ہوئی جنہوں نے ۱۹۵۱ء میں اسلامی دستور کے ۲۲ متفقہ اصول مرتب کئے تھے۔ اس کمیٹی نے خواجہ ناظم الدین کی رپورٹ کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس میں چند اصلاحات اور ترمیمات تجویز کیں جن میں ایک بات یہ بھی تھی کہ قادیانی مسئلہ کو آئینی طور پر حل کر دیا جائے۔ اس کی ایک صورت بھی تجویز کر دی گئی۔ اسی زمانے میں پندرہ، سترہ جنوری کو احرار اور جمعیت علماء پاکستان نے بھی علماء کا ایک کنونشن بلایا جس کا مقصد قادیانی مسئلے کے متعلق تحریک چلانا تھا۔ میں بھی اس اجلاس میں شریک تھا۔ میں نے اس کنونشن کی سبجیکٹ کمیٹی کو اس بات پر مطمئن کر دیا کہ اس وقت قادیانی مسئلے پر الگ کوئی تحریک چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خواجہ ناظم الدین کی دستوری رپورٹ آ گئی ہے۔ علماء نے اس میں اصلاحات تجویز کر دی ہیں جن میں قادیانی مسئلے کا حل بھی شامل

---

[1] لیاقت علی خان کے بعد خواجہ ناظم الدین، وزیر اعظم پاکستان مقرر ہوئے، ان کی پیش کردہ یہ رپورٹ، دستور سازی کے لئے سفارشات پر مشتمل تھی۔ (مزید دیکھئے ''قرارداد مقاصد سے اسلامی قانون تک'' از ڈاکٹر حفیظ الرحمان صدیقی، کراچی اور ''چراغ راہ'' اسلامی قانون نمبر مرتبہ، پروفیسر خورشید احمد)

ہے اب اس موقع پر الگ تحریک چلانے سے دستور سازی کا کام خطرے میں پڑ جائے گا اور اس سے ملک کو نقصان پہنچے گا۔

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ۱۷، جنوری کو جب کنونشن کا کھلا اجلاس ہوا تو اس میں اکثریت نے میری بات کو ردّ کر دیا اور اصرار کیا کہ قادیانی مسئلے پر الگ تحریک چلائی جائے گی۔ اس پر میں نے دوسری تجویز پیش کی کہ اچھا ایک مرکزی مجلس بنا دی جائے جس کی رہنمائی میں یہ تحریک چلے اور کسی شخص کو بذاتِ خود کوئی تحریک اٹھانے کا حق نہ ہو۔ میری یہ بات مان لی گئی اور مرکزی مجلسِ عمل تشکیل دے دی گئی جس کا ایک رکن میں بھی تھا۔ ۲۶ فروری تک اس مجلسِ عمل کا کوئی اجلاس نہیں ہوا لیکن اس دوران میں ۲۳ جنوری کو چند اصحاب خواجہ ناظم الدّین سے ملے اور انہیں ایک مہینے کا الٹی میٹم دے دیا کہ قادیانی مسئلے کے متعلق یا تو ہمارے مطالبات تسلیم کیے جائیں ورنہ اس سلسلے میں راست اقدام کیا جائے گا۔''

(مولانا سے ان حضرات کے بارے میں جاننا چاہا تو مولانا نے بتایا) ''یہ حضرات کسی کے نمائندے نہیں تھے کیونکہ مرکزی مجلسِ عمل نے انہیں مقرر نہیں کیا تھا بلکہ مجلس کو ان کے بارے میں یہ علم تک نہ تھا کہ ان میں سے کوئی خواجہ ناظم الدّین کے پاس جا رہا ہے۔ چنانچہ میں نے ان حضرات کی اس حرکت کا فوری نوٹس لیا اور مطالبہ کیا کہ مرکزی مجلسِ عمل کا اجلاس بلایا جائے اور وہ اس بے ضابطہ کارروائی کو روکے۔ میرے اس مطالبے پر ۱۷' فروری کا دن اجلاس کے لئے مقرر کر دیا گیا' لیکن اس تاریخ کو کوئی اجلاس نہیں کیا گیا۔ میں نے پھر مطالبہ کیا تو کراچی میں ۲۶ فروری کو مرکزی مجلسِ عمل کی میٹنگ بلانا تجویز کیا گیا لیکن میٹنگ کرنے کی بجائے اس روز مرکزی مجلسِ عمل توڑنے ہی کا اعلان کر دیا گیا اور ایک نئی ڈائریکٹ ایکشن کمیٹی بنا دی گئی۔''

(مولانا سے پوچھا) ''اس اچانک اور غیر متوقع تبدیلی کے بعد آپ نے یا جماعت اسلامی نے سب سے پہلا ضروری قدم کیا اٹھایا؟''

میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا'' جماعت اسلامی نے فوراً یہ

اعلان کر دیا کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہم اس ڈائریکٹ ایکشن میں کوئی حصہ نہیں لیں گے۔ ۲۷ فروری سے ڈائریکٹ ایکشن شروع کر دیا گیا اور ۵ مارچ تک ہنگامے اپنی پوری شدت سے ہوتے رہے۔ میں نے اس دوران دو بیانات دیئے جن میں حکومت کو توجہ دلائی کہ اس مسئلے کو حکمت سے حل کرنا چاہئے۔ طاقت سے ایسے مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔ اسی زمانے میں میں نے ''قادیانی مسئلہ'' نامی ایک پمفلٹ لکھا جو پانچ مارچ کو شائع ہوا۔ اس میں اصل مسئلے پر تفصیلی بحث کی گئی تھی۔ پانچ مارچ ہی کو جب لاہور میں ہنگامے اپنی شدت کو پہنچے ہوئے تھے، تین بجے گورنمنٹ ہاؤس میں گورنر چندریگر صاحب نے ایک کانفرنس بلائی جس میں میں بھی مدعو تھا۔ اس کانفرنس میں چندریگر صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ سب شرکاء کانفرنس عوام سے امن کی اپیل کریں۔ (واضح رہے کہ اس کانفرنس میں شہر کے تمام معززین کو بلایا گیا تھا) میں نے اس بات پر کہا کہ آپ بیوروکریٹ نہیں ہیں بلکہ عوامی آدمی ہیں۔ آپ خود عوامی تحریکیں چلاتے رہے ہیں۔ لہٰذا آپ سے زیادہ اور کون اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ جس مسئلے پر عوام میں ہیجان برپا ہو اور نوبت کشت وخون تک پہنچ جائے اس میں جب تک عوام کو یہ اطمینان نہ دلایا جائے کہ ان کے مطالبات پر واقعی بات چیت کی جائے گی، اس وقت تک محض امن کی اپیل کرنا لا حاصل ہوتا ہے۔ ابراہیم چندریگر صاحب نے میری اس بات سے اتفاق کیا اور کہا کہ آپ باقاعدہ ایک تجویز لکھ کر پیش کریں۔ چنانچہ وہیں ایک کونے میں بیٹھ کر میں نے ایک تجویز لکھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وزیراعظم صاحب عوام کو یہ اطمینان دلائیں کہ آپ کے مطالبات پر بات چیت کی جائے گی۔ آپ امن و سکون سے رہیں۔ چندریگر صاحب نے اس تجویز کو پسند کرنے کے بعد مجھ سے کہا کہ آپ ہی وہ بیان بھی لکھیں جو وزیراعظم کی طرف سے نشر ہونا چاہئے۔ چنانچہ اسی وقت میں نے ان کی طرف سے ایک بیان مرتب کیا اور اسی وقت ایک کمیٹی مقرر ہوئی تاکہ میرے مسودے پر غور وخوض کر کے اس کو آخری شکل دی جائے۔ اس کمیٹی میں میرے علاوہ خلیفہ شجاع الدین صاحب، علامہ علاؤ الدین صاحب اور خود چندریگر صاحب

شامل تھے۔ کچھ ترمیمات کے ساتھ وہ مسوّدہ آخری طور پر منظور کر لیا گیا۔ چندریگر صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں ابھی اسے وزیراعظم تک پہنچاتا ہوں اور آج ہی ان کی طرف سے ریڈیو پر اعلان ہو جائے گا۔ واپس گھر آ کر میں نے ریڈیو کھولا! تو اس بیان کے بجائے وزیراعظم کی طرف سے صرف امن کی اپیل کی گئی تھی۔ بہر حال ان واقعات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ پانچ مارچ تک حکومت پنجاب اور مرکزی حکومت دونوں اس بات پر پوری طرح مطمئن تھیں کہ میرا اور جماعت اسلامی کا ان فسادات میں کوئی ہاتھ نہیں۔''

(مولانا نے اپنی دوسری قید کے اہم ترین پس منظر کی نقاب کشائی کرتے ہوئے مزید بتایا) ''چھ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں یکا یک مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ لیکن میرا پمفلٹ قادیانی مسئلہ مارشل لاء کے زمانے میں بھی نہ صرف شائع ہوتا رہا بلکہ کھلے بندوں فروخت بھی ہوتا رہا اور اردو انگریزی دونوں میں ترویج پاتا رہا...... ۲۷ اور ۲۸ مارچ کی درمیانی شب کو یکا یک رات کے تین بجے میرے مکان پر فوج اور پولیس نے دھاوا بول دیا۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا جماعت کے تمام حسابات اور ریکارڈ پر قبضہ کر لیا گیا۔'' مجھے اپنی گرفتاری کے بعد معلوم ہوا کہ میرے ساتھ ساتھ جماعت کے دیگر بارہ ذمہ دار افراد بھی گرفتار کیے گئے ہیں۔

(آپ کو یا جماعت کے دیگر بارہ افراد کو حکومت نے کس الزام میں گرفتار کیا؟)

مولانا نے جواب دیتے ہوئے کہا ''گرفتاری کے وقت ہمیں ہمارا کوئی جرم نہیں بتایا گیا بلکہ اس گرفتاری کے بعد یہ سوچنا شروع کیا گیا کہ ہمیں کس مقدّمے میں پھانسا جائے۔ گرفتاری کے بعد مجھے اور جماعت کے دیگر اصحاب کو لاہور کے قلعے میں رکھا گیا۔ ان اصحاب میں جماعت کے ناظمِ مالیات بھی تھے۔ جماعت کے ناظمِ مالیات اور دوسرے جتنے لوگ قلعے میں رکھے گئے تھے ان سے وہاں یہ پوچھ گچھ ہوتی رہی کہ جماعت کے مالی وسائل کیا ہیں اور جماعت کی طرف سے مختلف امور پر خرچ ہونے والا روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ اس کے جواب میں ہمارے ناظمِ مالیات نے جماعت کے حسابات کے

رجسٹروں سے پوری طرح ثابت کر دیا کہ جماعت کے حسابات بالکل صاف ہیں۔ ایک ایک چیز جہاں سے آتی ہے اور جس کام پر خرچ ہوتی ہے، درج ہے۔ ان کی رسیدیں اور واؤچر بھی موجود ہیں۔ اسی بناء پر میاں انور علی صاحب کو منیر انکوائری کمیٹی کے سامنے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ہم نے جماعت کے حسابات کی پوری تحقیق کر لی ہے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس سے یہ معلوم ہو کہ جماعت کو کوئی بیرونی امداد ملتی ہے۔"

(اس قید کے دوران دیگر پوچھ گچھ کے علاوہ آپ پر مزید کیا سیاسی دباؤ ڈالا گیا؟)

مولانا نے فرمایا: "جہاں تک میرا تعلق ہے، قلعے میں کسی کو میرے سامنے یہ سوال کرنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ کیا جماعت کو کوئی بیرونی امداد ملتی ہے؟ مجھ سے وہاں صرف ڈائریکٹ ایکشن کے بارے میں سوال کیے گئے۔ میں نے جواب میں جب اس کی ابتداء سے انتہا تک پوری تاریخ بیان کر دی تو سی آئی ڈی کا وہ افسر جو مجھ سے سوال کر رہا تھا، اس نے خود میرے سامنے یہ اعتراف کیا کہ جو کچھ آپ نے بیان کیا ہے ہماری معلومات اس سے ایک حرف بھی زائد یا کم نہیں ہیں۔ اس کے بعد تقریباً ایک مہینے سے زیادہ مدت اس فکر میں صرف کی گئی کہ اب ہم پر کیا مقدمہ بنایا جائے۔ اس دوران میں ہم قلعے ہی میں رہے۔ تین مئی کو یکایک غلام محمد صاحب لاہور پہنچے اور پانچ مئی کو فوجی عدالت میں میرے خلاف دو الزامات کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ ایک یہ کہ میں نے ۲۷ فروری سے ۵ مارچ تک اخبارات میں ایسے بیان دیئے جو باغیانہ تھے اور دوسرے یہ کہ میں نے پانچ مارچ کو پمفلٹ قادیانی مسئلہ شائع کیا۔ اب قانونی پیچیدگی یہ تھی کہ مارشل لاء ۶ مارچ کو لگا اور یہ دونوں الزامات ان واقعات سے متعلق تھے جو چھ مارچ سے پہلے پیش آئے تھے۔ غلام محمد نے اس پیچیدگی کو رفع کرنے کے لئے ۹ مئی کو ایک اور آرڈیننس جاری کیا جس میں مارشل لاء کی عدالتوں کو مارشل لاء سے پہلے کے کیسوں پر بھی فیصلے کرنے کے اختیارات دیئے گئے۔"

(نمازِ عشاء کا وقت ہو چکا تھا اور جماعت کے مرکز میں احباب نماز کے لئے مولانا

کا انتظار کر رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر مولانا کچھ دیر بعد دوبارہ اپنے کتب خانے میں آ گئے۔ سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے فرمایا) ......۸ مئی کی شام کو آخر کار وہ لمحہ آ پہنچا جس کا مجھے انتظار تھا۔ مجھے جیل میں یہ اطلاع دی گئی کہ تمہارے لئے ''سزائے موت'' تجویز کی گئی ہے۔

(مولانا کی زبانی ''سزائے موت'' کا سن کر میں ایک لمحے کے لئے رکا۔ مولانا مسکرا رہے تھے۔ اسی اثناء میں چائے آ گئی۔ مولانا نے مجھے چائے پینے کے لئے کہا۔ اپنی پیالی اٹھائی۔ ہماری گفتگو ایک بار پھر شروع ہو چکی تھی۔ مولانا فرما رہے تھے)

''اس سلسلے میں دو تین چیزیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ ہماری گرفتاری کے چند روز بعد ہی خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا گیا۔ گویا بیوروکریسی نے اقتدار بالکل اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور آئین سے متعلق ''بیسک پرنسپلز کمیٹی'' رپورٹ بہت گہرے گڑھے میں دفن کر دی گئی۔ یہی وہ چیز تھی جس کا ہمیں خطرہ تھا اور جس کی وجہ سے ہم ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے کہ دستور سازی سے پہلے کوئی ہنگامہ کھڑا نہ ہو۔ یہی وہ بات تھی جس کی خواجہ ناظم الدین صاحب نے مجھے بہت پہلے اطلاع دے دی تھی کہ اس کا خطرہ درپیش ہے۔''

(اس مرحلے پر مولانا نے ایک واقعہ سناتے ہوئے فرمایا) ''چند سال بعد ایک روز جب میں باہر سے اپنے گھر آیا تو برآمدے میں سزائے موت سنانے والی اسی عدالت کے ایک ممبر کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ میں انہیں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ میں نے استفسار کیا کہ آپ یہاں کیسے؟ تو وہ بولے میں ملازمت سے محروم ہو گیا ہوں۔ آپ مجھے ملازمت دلوانے میں مدد کریں۔ چنانچہ جو کچھ مجھ سے ہو سکا میں نے کیا اور اپنی طرف سے اشارۃً بھی ایسی کوئی بات نہیں کہی کہ آپ ہی ہیں جو مجھے سزائے موت دینے والوں میں شامل تھے۔ لیکن خود انہوں نے اپنی شرمندگی رفع کرنے کی غرض سے کہا کہ مولانا خدا کی قسم وہ فیصلہ میرا نہیں تھا بلکہ ہمیں جو آرڈر دیئے گئے تھے ان کی تعمیل ہمیں کرنی تھی۔''

(مارشل لاء کے اس فیصلے کا عوام میں کیا ردِّعمل ہوا؟ میں نے ایک اور سوال

کرتے ہوئے مولانا سے تفصیل چاہی۔ مولانا نے بتایا) کہ اس پر اندرونِ ملک سمیت تمام دنیا میں مظاہرے ہوئے۔ جب اتنے بڑے پیمانے پر حکومت کے اس فیصلے کو زیادتی قرار دیا گیا تو حکومت نے سزائے موت کو ۱۴ سال قید بامشقت میں تبدیل کر دیا اور میرے لئے سی کلاس تجویز کی۔ سزا کے فیصلے میں اس تبدیلی کے بعد جب مجھے سزائے موت کی کوٹھڑی سے نکالا گیا تو جیل کے حکام نے مجھ سے کہا کہ آپ کے لئے ''سی'' کلاس تجویز کی گئی ہے۔ آپ کلاس تبدیل کرنے کے لئے درخواست دیں تو ہم فوراً اوپر بھیج دیتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا۔ ''آپ کے ہاں اگر کوئی ''ڈی'' کلاس ہو تو آپ مجھے اس میں بھیج دیں مگر ان لوگوں سے میں کوئی درخواست نہیں کروں گا۔'' بہر حال مجھے نہیں معلوم کہ بعد میں کس طرح کلاس تبدیل ہوئی...... میری قید بامشقت تھی اور مشقت میرے لئے سوت کاتنے کی تجویز کی گئی تھی مگر جب میں سوت کاتنے بیٹھا تو ہر طرف سے قیدی دوڑ پڑے کہ ہم آپ کو یہ مشقت نہیں کرنے دیں گے، آپ کے بدلے ہم مشقت کریں گے۔ چنانچہ اس کے بعد سے جب تک میں قید رہا میرے سامنے لفظ مشقت کبھی نہیں آیا...... ۲۵ مہینے گزرے تھے کہ انہی غلام محمد کی ایک دوسری ''دانش مندی'' نے میری اس عمر قید کو بھی ختم کر دیا۔ وہ دانش مندی یہ تھی کہ انہوں نے دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا۔ مولوی تمیز الدین صاحب نے اس کے خلاف عدالت سے چارہ جوئی کی اور سندھ چیف کورٹ کے فل بنچ نے تمیز الدین صاحب کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ پھر معاملہ جسٹس منیر کی عدالت میں آیا اور جسٹس منیر نے غلام محمد کو بادشاہ کا مرتبہ دیکر اس بات کا مختار بنا دیا کہ وہ اس دستور ساز اسمبلی کو توڑ سکتے ہیں جسے حکومت برطانیہ کی جانب سے اقتدار منتقل کیا گیا تھا۔ قائداعظم مرحوم کے زمانے سے یہ بات طے تھی کہ دستور ساز اسمبلی جب مجلسِ قانون ساز کی حیثیت سے کام کرے گی تو اس کے پاس کئے ہوئے قوانین پر گورنر جنرل کے دستخط ہونا ضروری ہیں۔ لیکن آئین ساز مجلس ہونے کی حیثیت سے جو قوانین بھی بنائے جائیں گے ان پر گورنر جنرل کے دستخط ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ صرف صدر مجلسِ آئین ساز کے دستخط سے وہ آئین قرار

پائے گا۔ لیکن جسٹس منیر ان تمام قوانین کو غیر قانونی قرار دے بیٹھے جو قیامِ پاکستان سے دستور ساز اسمبلی کے توڑے جانے تک اس طرح نافذ ہوئے تھے۔ انہی میں ایک وہ قانون بھی تھا جس کی رو سے مارشل لاء اٹھنے کے بعد بھی فوجی عدالتوں کے فیصلے برقرار رہتے تھے۔ چنانچہ اس طرح میری وہ قید بھی آپ سے آپ خلاف قانون قرار پا گئی جو غلام محمد صاحب ہی کی بدولت دی گئی تھی۔"

(بعض دوسری تفصیلات بتاتے ہوئے مولانا نے فرمایا) "میری اس قید کی کل مدت پچیس ماہ تھی۔ سزا ملنے کے چند روز بعد مجھے میانوالی منتقل کر دیا گیا۔ پھر منیر انکوائری کمیٹی بٹھائی گئی تو اس نے مجھے لاہور سنٹرل جیل منتقل کرا لیا۔ اس کے بعد جب کمیٹی کا کام ختم ہو گیا تو مجھے ڈسٹرکٹ جیل ملتان منتقل کر دیا گیا۔"

(میرے ایک اور سوال کے جواب میں مولانا نے بتایا کہ) "اس زمانے میں خاصی طویل مدت تک یہ جھگڑا چلتا رہا کہ مجھے قید خانے میں پڑھنے کے لئے کتابیں فراہم کی جائیں تاکہ میں اپنی تصانیف کا سلسلہ جاری رکھ سکوں۔ لیکن میری اس بات کا جواب اسمبلی میں یہ دیا گیا کہ ہم نے اس شخص کو اس لئے قید نہیں کیا کہ وہ جیل میں بیٹھ کر تحریکِ اسلامی کا لٹریچر تیار کرے۔ یہ ملک فیروز خان نون کی صوبائی وزارت کا زمانہ تھا۔ آخر کار بمشکل یہ طے ہوا کہ مجھے وہ کتابیں دی جا سکتی ہیں جو تفسیر لکھنے کے لئے درکار تھیں۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ جیل ملتان میں، میں نے تفسیر کا کام شروع کر دیا اور سورہ حج سے سورہ فرقان تک کی تفسیر وہیں مکمل کی۔"

(مولانا نے کہا) کہ لاہور کے شاہی قلعے کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مشہور ہیں۔ ظاہر ہے جس شخص کو قید کے لئے یہاں لایا جاتا ہے وہ قلعے کی سیر نہیں کر سکتا بلکہ اسے اس کے کمرے یا کوٹھڑی تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہاں قیام کے دوران میں میرے پاس پوچھ گچھ کے لئے سی آئی ڈی کے آدمی آئے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی اجازت لئے بغیر میرے پاس آیا ہو۔ میرے ساتھ ان کا رویہ نہایت احترام کا تھا۔ انٹیروگیشن کے علاوہ سی آئی ڈی والے اور انتظامیہ کے دیگر افراد میرے پاس بیٹھ کر

دوسری باتیں بھی کرتے رہتے تھے۔ انہی دنوں ایک آفیسر جن کا انتقال ہو چکا ہے، ایک روز وہ مجھ سے باتیں کرتے کرتے یکایک کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ اب میں جاتا ہوں، مجھے ڈر ہے اگر میں نے آپ سے مزید باتیں کیں تو میرے خیالات اتنے بدل جائیں گے کہ مجھے یہ نوکری چھوڑنی پڑ جائے گی۔ یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ جب تک میری ”کلاس“ تبدیل نہیں ہوئی جیل کے عملے نے مجھے ہسپتال بھیج دیا۔ قلعے میں مجھے بالائی منزل کے جنوبی حصے میں رکھا گیا تھا اور چہل قدمی کے لئے صحن میں لے جاتے تھے۔ روشنی انہوں نے میرے اختیار میں دے رکھی تھی کہ جب چاہوں جلاؤں اور جب چاہوں بند کروں۔ علاوہ ازیں میرے گھر سے جب بھی کھانا بھیجا جاتا وہ مجھے پہنچ جاتا تھا۔“

(کیا آپ یہ ارشاد فرمائیں گے کہ سزائے موت کا حکم صادر ہونے کے بعد پھانسی کی کوٹھڑی میں آپ کو کتنے دن رکھا گیا؟ وہاں آپ پر کیا بیتی؟ کوٹھڑی کس طرح تھی؟ اس کے قریب کچھ اور قیدی بھی محبوس تھے یا فقط آپ ہی کو رکھا گیا تھا؟) مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا ”میں پھانسی کی کوٹھڑی میں تقریباً تین دن رہا۔ یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ دیواریں لوہے کی طرح مضبوط تھیں۔ ایک روشندان تھا جس میں مضبوط سلاخیں تھیں۔ اس کوٹھڑی کے اطراف و جوانب لوہے کا احاطہ بھی تھا جس پر ہر وقت پہرہ ہوتا تھا۔ اس کوٹھڑی میں میں عموماً یا تو تلاوت کرتا تھا یا اصولِ فقہ کی ایک کتاب پڑھتا تھا جو میرے پاس تھی۔ یہاں رات کو ہر طرف سے دعاؤں اور ذکرِ الٰہی کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ مقید اکثر قیدی رو رو کر خدا سے دعائیں کرتے۔ آہ و زاری کی وہ کیفیت انتہائی مؤثر ہوتی تھی۔“

(اور پھر اس نشست کی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے مولانا نے کہا) ”میری قید کے یہ واقعات فقط میری ذات سے متعلق نہیں ہیں بلکہ سچ پوچھیے تو یہ واقعات پاکستان کی تاریخ میں ایک اہم ترین موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب پاکستان میں بیوروکریسی کو پروان چڑھنے کا موقع ملا اور جمہوریت اور اسلامی قدروں کو روکنے کا کام کیا گیا۔“

(3)

(تیسری گرفتاری ۶ جنوری ۱۹۶۴ء کو عمل میں آئی۔ اس گرفتاری کا پسِ منظر خاصا طویل ہے۔ مولانا نے فرمایا) "۱۹۵۸ء میں مارشل لاء لگا تو جماعت اسلامی بھی منجملہ دوسری تمام جماعتوں کے ممنوع قرار پائی۔ جماعت چونکہ ملکی قانون کی پابند ہے۔ اس لئے اس نے اپنا تمام کام سمیٹ لیا' لیکن آمریت نے خود بھی اس کے کام کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ...... اس کے رفاہی کام تک ختم کر دیئے گئے۔ حکومت نے اس کے شفاخانے بند کر ڈالے۔ دوائیں اٹھالیں۔ انفرادی طور پر البتہ وہ کام جاری رہے جو کام جماعت اپنی اجتماعی حیثیت سے تنظیم کے ساتھ کیا کرتی تھی۔ اس کے افراد اپنے طور پر الگ الگ کام کرتے رہے۔ آمریت کو یہ بھی کب گوارا ہو سکتا تھا' چنانچہ اس نے دباؤ ڈالنے کی کوشش کی ...... اس سلسلے میں سی آئی ڈی کے ایک افسر مجھ سے ملے۔ انہوں نے صاف صاف تو نہیں کہا کہ میں کس لئے آیا ہوں لیکن وہ مجھے احساس دلانے آئے تھے کہ یہ بات حکومت کے علم میں ہے کہ میں اور جماعت کے دوسرے افراد انفرادی حیثیت سے اپنے کام کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا یہ بات آپ نوٹ کر لیجئے اور اپنی اوپر کی اتھارٹیز کو بھی بتا دیجئے' کہ آپ کا قانونی طور پر کسی جماعت کو ممنوع قرار دینا دوسری جماعتوں کو تو ختم کر سکتا ہے لیکن اسلامی تحریک کو ختم نہیں کر سکتا۔ یہاں تو ہر شخص اپنے کچھ سوچے سمجھے نظریات، اصول اور مقاصد رکھتا ہے جن کی جڑیں اس کے دل و دماغ میں پیوست ہیں اور دنیا کا کوئی قانون دل و دماغ میں جمی ہوئی جڑوں کو نہیں اکھاڑ سکتا۔ ہم چونکہ قانون کے پابند ہیں اس لئے تنظیم کے ساتھ تو کام نہیں کریں گے لیکن اپنے خیالات کو ہم کہاں لے جائیں۔ وہ ہمارے اندر موجود ہیں۔ ہم جس سے بھی بات کریں گے' اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ اور جس وقت بھی آپ کا مارشل لاء اٹھے گا' چاہے دس برس بعد اٹھے اس کے فوراً بعد جماعت اسلامی اٹھ کھڑی ہوگی اور ویسی ہی فعّال ہو جائے گی جیسی مارشل لاء سے قبل تھی۔"

(مولانا نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا) "تہدید بے اثر ثابت ہوئی تو

حکومت نے ترغیب و تحریص سے کام لینا چاہا اور مجھ کو رام کرنے کی کوششیں کی گئیں۔‘‘

(میں نے پوچھا ’’وہ کیسے؟‘‘ مولانا نے فرمایا) ایوب خاں صاحب نے خواہش کر کے خود مجھے ملاقات کی دعوت بھیجی۔ اس ملاقات میں مجھ سے کہا کہ میں آپ کی قدر کرتا ہوں، آپ کی کتابوں سے میں نے بہت استفادہ کیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ پالیٹکس کے گندے کھیل کو چھوڑ کر خالص دینی خدمت میں لگ جائیں جس قدر بھی میرے بس میں ہوگا میں آپ کی خدمت کروں گا ...... یہ ساری چیز اس ملاقات میں بڑی تفصیل سے انہوں نے کہی۔ میں نے ان سے کہا یہ ٹھیک ہے پالیٹکس ہمارے ملک میں گندا کھیل بن گیا لیکن کیا آپ کا خیال ہے کہ پالیٹکس کو یہاں گندا ہی رہنا چاہیے اور اسے پاک نہیں کرنا چاہیے؟

(اس کا کوئی جواب ان سے بن پڑا؟ میں نے دریافت کیا)

(مولانا نے جواب دیا) ’’ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ کہیں کہ اس کو پاک کیا جائے۔‘‘ پھر ایوب خاں صاحب کو بتایا کہ ہم پالیٹکس کو پاک کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ’’آپ (ایوب خان) کوئی مثال نہیں دے سکتے کہ میں نے یا میری جماعت نے پالیٹکس کو گندا کیا ہو۔‘‘

(اسی پس منظر میں ایک اور واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے بتایا) کہ کچھ عرصہ بعد جب مرکزی سیکرٹریٹ کراچی سے راولپنڈی منتقل ہو رہا تھا اور وہاں عارضی عمارتوں میں کام ہو رہا تھا، عارضی دارالحکومت میں ایک کلب "I do not agree club" کے دلچسپ نام سے قائم ہوا۔ (مولانا نے اس کا ترجمہ یوں کیا: میں نہ مانوں کلب)۔ اس میں انہیں Islam Today (اسلام عصر حاضر میں) کے عنوان پر تقریر کی دعوت دی گئی اور ایوب خاں صاحب نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ تقریر سننے کو وہ بہ نفسِ نفیس تشریف لائیں گے۔ وقت آیا تو وہ خود تو نہ آ سکے البتہ ایک ٹیپ ریکارڈر اس ہدایت کے ساتھ بھجوا دیا کہ اسے ٹیپ کر لیا جائے۔‘‘)

چونکہ مجھے احساس تھا کہ ایوب خاں صاحب خود بھی یہ تقریر سنیں گے، لہٰذا میں نے

بڑی وضاحت سے سمجھانے کی کوشش کی کہ مسلمان ملک مشرق سے مغرب تک جس کمزوری میں مبتلا ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قوم جو کچھ چاہتی ہے حکمران وہ ہرگز نہیں چاہتے۔ دوسری طرف حکمران جو کچھ چاہتے ہیں قوم وہ ہرگز نہیں چاہتی۔ یہ داخلی تصادم تمام مسلمان ملکوں میں برپا ہے اور ہماری قومی طاقت کے استحکام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ترقی وہاں ہوتی ہے جہاں قوم اور حکومت کے مقاصد میں ہم آہنگی ہو اور دونوں پورے باہمی تعاون سے کام لیں۔ اس کے برعکس جہاں ہر وقت یہ تصادم چلتا رہے وہاں ترقی نہیں ہو سکتی۔ بدقسمتی سے یہ داخلی تصادم تمام مسلمان ملکوں میں عیاں ہے۔‘‘

(اب مولانا نے سلسلۂ ملاقات کا دوسرا حصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا) ’’میرے اور ایوب خاں صاحب کے درمیان تصادم کی کوئی شکل اس مرحلے تک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ تصادم کا آغاز اس وقت ہوا جب Muslim Family Laws Ordinance کے نام سے عائلی قوانین نافذ ہوئے۔ میں نے اپنے درسِ قرآن میں اس آرڈیننس پر تنقید کرتے ہوئے وضاحت سے بتایا کہ اس میں کیا کیا غلطیاں ہیں۔ یہ مغربی نظریات سے متاثر و مرعوب ہوکر اسلام کے اس قرآنی نظام کو مسخ کرنے کی کوشش ہے جسے انگریز نے اپنے زمانے میں آگ لگانے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس تنقید پر لاہور ڈویژن کے کمشنر نے مجھے بلا بھیجا اور کہا کہ یہ مارشل لاء کی خلاف ورزی ہے اور حکومت اس پر ایکشن لے سکتی ہے...... میں نے ان سے کہا کہ خدا تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ملکی قوانین کی خلاف ورزی سے زیادہ سخت چیز ہے۔ حکومت اگر کوئی ایکشن لینا چاہے تو مجھے اس کی پروانہیں۔‘‘ اس کے بعد علماء کا ایک اجتماع ہوا جس میں عائلی قوانین پر تفصیلی تنقید کی گئی۔

(آپ بھی اس اجتماع میں شامل تھے میں نے پوچھا)

انہوں نے فرمایا ’’وہ تنقید لکھی ہوئی ہی میری تھی اور علماء نے اسے Approve

کیا تھا۔ حکومت کو اس تنقید سے اتنی پریشانی ہوئی کہ اخبارات کو احکام دے دیئے گئے کہ اس قسم کی کوئی تنقید شائع نہ کی جائے۔ یہ تنقید چونکہ اخبارات میں شائع نہ ہو سکی تھی اس لئے اسے ہم نے انگریزی اور اردو پمفلٹوں کی شکل میں شائع کیا۔ یہ پمفلٹ بھی ضبط کر لئے گئے اور جماعت کے موجودہ امیر میاں طفیل محمد صاحب کو جو اِن کے ناشر تھے، گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں یہ پمفلٹ کئی سو علماء کے دستخطوں کے ساتھ دوبارہ شائع ہوا۔ جن علماء کے دستخط اس پر ثبت تھے ان میں مشرقی و مغربی پاکستان کے علماء شامل تھے۔

(تصادم کی دوسری صورت اس وقت ہوئی جب ایوب خاں صاحب نے کانسٹی ٹیوشن کمیشن مقرر کیا اور اس کا سوالنامہ لوگوں کا ردِّ عمل جاننے کے لئے شائع کیا گیا۔ اس سوالنامہ کا جواب میں نے بھی لکھا اور ملک کے سابق وزیراعظم چودھری محمد علی صاحب نے بھی، جو جواب میں نے لکھا اسے علماء کی ایک میٹنگ نے باقاعدہ منظور کیا۔ اس کی اشاعت پر فوجی ہیڈ کوارٹر نے مجھے، چودھری محمد علی صاحب، مولانا داؤد غزنوی مرحوم اور دوسرے اصحاب کو بلا کر باز پرس کی۔ ہم نے کہا یا تو یہ سوالنامہ شائع نہیں کرنا چاہئے تھا، یا اگر رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے سوالنامہ شائع کیا جاتا ہے تو یہ بات اس کی اشاعت میں ہی مضمر ہے کہ اس کا جواب دیا جائے۔ ان حالات میں جواب دینا آخر کس قانون کی خلاف ورزی ہے؟

اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور کے طلبہ کی طرف سے یونیورسٹی ہال میں ایک پبلک مذاکرہ کا اعلان ہوا۔ مقررین میں میرے علاوہ اور بھی کئی حضرات مدعو تھے لیکن جب ہم وقت مقررہ پر یونیورسٹی ہال پہنچے تو دیکھا کہ ہال پولیس کے پہرے میں ہے اور حاضرین ایک بہت بڑی تعداد میں باہر کھڑے ہیں۔ ہمیں واپس آنا پڑا اور باز پرس کی گئی کہ گئے ہی کیوں تھے۔ میں نے کہا کہ جب مذاکرے کی بندش کا اعلان ہی نہیں تھا تو پھر وہاں جانا کیسے جرم ٹھہرا؟

تیسری صورت مارشل لاء کے زمانے میں تصادم کی اس طرح پیدا ہوئی کہ خود حکومت کی طرف سے ایک مجلسِ مذاکرہ منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا جس میں خاندانی منصوبہ

بندی پر بحث تھی۔ اس میں شرکت کی دعوت مجھے اس درخواست کے ساتھ دی گئی کہ جو مقالہ پڑھنا چاہتے ہو اس کی ایک نقل پہلے بھیج دو۔ طرفہ تماشا یہ ہوا کہ جب میرا مقالہ وہاں پہنچا تو مجلسِ مذاکرہ ہی منسوخ کر دی گئی ...... یہ مقالہ بعد میں ترجمان القرآن میں بھی شائع ہوا اور الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی۔‘‘

پونے چار سال بعد جب اپنی مرضی کا آئین نافذ کر کے ایوب خاں صاحب نے مارشل لاء اٹھایا تو مولانا نے اعلان کیا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر جماعت اسلامی کے دفاتر از سرِ نو قائم کر دیئے جائیں اور جماعت من حیث الجماعت کام کرنا شروع کر دے۔ چنانچہ ٹھیک چوبیس گھنٹے کے اندر اندر دفاتر قائم ہو گئے۔ جماعت اسلامی نے اسی وقت سے فوراً کام کرنا شروع کر دیا حالانکہ دوسری جماعتیں یہ سوچ رہی تھیں اور مدّتوں سوچتی رہیں کہ اپنے کو بحال بھی کریں یا نہیں۔

مولانا نے فرمایا: ’’اس کے بعد ہم نے ۱۹۶۲ء کے آئین کا تجزیہ کیا۔ سب سے پہلے میں نے ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن لاہور کی دعوت پر وہاں ایک مفصّل تقریر اس موضوع پر کی۔ پھر دوسرے مقامات پر بھی تقریریں کیں۔‘‘

(اس دور کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مولانا نے کہا) ’’انہی ایام میں مشرقی پاکستان کے سیاسی لیڈروں نے نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ (NDF) بنا کر کہا ہم ۱۹۶۲ء کا آئین رد کرتے ہیں۔ انتخابات نئے سرے سے ہوں اور بنیادی جمہوریت کے بجائے بالغ رائے دہی کے اصول پر ہوں۔ اس کے ساتھ نیا آئین بھی بنے ...... یہ لیڈر جب یہ مطالبہ لے کر مغربی پاکستان آئے تو یہاں کے دوسرے سیاسی رہنماؤں کے ساتھ میں بھی ان مجالس میں شریک ہوا جن میں اس مسئلہ پر تبادلۂ خیال ہوا۔ میں بڑی مشکل سے ان لوگوں کو سمجھانے میں کامیاب ہوا کہ اس مرحلے پر ۱۹۶۲ء کے آئین کو رد کرنے کے بجائے اس میں ایسی ترمیمات کرنا بہتر ہے جن سے وہ جمہوری نوعیت کا ہو جائے۔ اس غرض کے لئے میں نے اس آئین میں ترمیمات کا خاکہ مرتب کر کے پیش کیا کہ یہ

ترمیمات ہو جائیں تو آپ مطمئن ہو سکتے ہیں کہ یہ جمہوری نوعیت کا ہے۔ خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے سمجھانے سے بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور پھر انہی خطوط پر ترمیم دستور کا بل اسمبلی میں پیش کیا گیا۔

اس مرحلے پر یہ حیرت زدہ کرنے والا منظر دیکھا گیا کہ ان تعمیری کوششوں پر حکومت برافروختہ ہو گئی اور سرکاری پروپیگنڈا مشینری نے اپنی توپوں کا رخ مولانا اور جماعت کی طرف کر دیا۔

مولانا نے بتایا: ''اس دوران میں جماعت اسلامی نے اپنا آل پاکستان اجتماع لاہور میں کرنے کا اعلان کیا (اکتوبر ۱۹۶۳ء) یہ اعلان گویا ایک شتابہ تھا جو حکومت کے میگزین کو لگ گیا۔ مرکزی وزیر اور دوسرے اصحاب کے بیان جماعت کے اور میرے خلاف آنے لگے۔ اجتماع کے لئے جس جس جگہ کی ہم نے درخواست کی اسے رد کیا گیا۔ بالآخر بھاٹی گیٹ اور ٹیکسالی گیٹ کے درمیان پارک کی شکل میں جو پٹی ہے وہاں اجتماع کی اجازت ملی لیکن عین وقت پر ایک لاؤڈ سپیکر آرڈیننس نافذ کر دیا گیا جس کی وجہ سے ہم لاؤڈ سپیکر کے استعمال کے حق سے محروم ہو گئے۔ باہر سے جماعت کے جو لوگ آنے والے تھے اور جنہوں نے ریل کی بوگیاں اپنے لئے ریزرو کرائی تھیں ان کی بکنگ عین وقت پر منسوخ کر دی گئی۔ ان تمام کوششوں کے باوجود اجتماع کے دن، دس ہزار نمائندے ہمارے کیمپوں میں مقیم تھے اور بغیر لاؤڈ سپیکر کے جلسہ عام میں کم سے کم اندازے کے مطابق کوئی چالیس ہزار افراد تھے۔''

ایک تو سرکلر روڈ پر ٹریفک کا شور دوسرے اس تنگ پٹی پر بیٹھے ہوئے سامعین کا دور تک پھیلے ہونا، انہی اسباب کی بنا پر آواز سب لوگوں تک پہنچانا لاؤڈ سپیکروں کے طویل سلسلے کے بغیر ناممکن نظر آتا تھا۔ ان حالات میں لاؤڈ سپیکر آرڈیننس نافذ کرنے والے سمجھے کہ جماعت کے بانی و قائد کی آواز دب جائے گی لیکن مکبر الصوت آلات کی عدم موجودگی میں انسانی مکبّر حرکت میں لائے گئے۔ مولانا نے لاؤڈ سپیکر کا بدل فوراً تلاش کر لیا۔ یہ بدل نماز با جماعت میں آخری مقتدیوں تک مکبّروں یعنی تکبیر اونچی آواز

ے کہنے والوں کے طرز پر ایک پورے سلسلے کا تقرر تھا۔ مولانا کو اس اجتماع میں جو تقریر کرنی تھی اسے انہوں نے لکھ لیا۔ اس کی متعدد نقلیں کرالی گئیں۔ پھر جلسہ گاہ میں جگہ جگہ منبروں پر جماعت کے افراد کھڑے ہو گئے۔ جیسے جیسے سربراہ جماعت اپنی تقریر پڑھتے گئے منبروں پر کھڑے لوگ باآواز بلند اسے اپنی اپنی جگہ پڑھ کر سناتے گئے ......

لاؤڈ سپیکر آرڈیننس ششدر رہ گیا۔

لیکن ابھی ظلم کا ایک اور حصہ باقی تھا۔

تقریر کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ اجتماع پر غنڈوں کے ذریعے حملہ کرادیا گیا۔ خیموں کی طنابیں کاٹی جانے لگیں۔ سالانہ اجتماع کے سٹال لوٹے جانے لگے۔ شراب پئے ہوئے غنڈوں نے پستول نکال کر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ خود سٹیج کی طرف رخ کر کے جہاں مولانا کھڑے تھے' فائر کیا گیا۔ باہر سٹالوں پر توڑ پھوڑ سے قرآن شریف کے نسخے بھی ان لوگوں کے ہاتھوں توہین سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اندر اجتماع گاہ میں جماعت کے افراد نے کمال ضبط و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ غنڈوں نے جب دیکھا کہ جلسے والے مشتعل نہیں ہوئے تو انہوں نے فائر کر کے جماعت کے ایک کارکن اللہ بخش صاحب کو' جو اپنی بیوی اور بچی سمیت گوجرے سے آئے ہوئے تھے' گولی کا نشانہ بنا کر شہید کر دیا۔ اللہ بخش شہید کی بیوی اور بچی عورتوں کے پنڈال میں بیٹھی تھیں جہاں ان غنڈوں نے بوتلیں پھینکیں کہ پھٹیں تو عورتیں بھی زخمی ہوں اور افراتفری بھی پھیلے۔ لیکن وہاں بھی صبر و تحمل کا ایک ہی مظاہرہ تھا۔ ایک چیخ بھی سنائی نہیں دی۔ اس وقت بھی نہیں جب اللہ بخش کی بیوی کو اطلاع ملی کہ ان کا شوہر قتل ہو گیا۔ نہیں، اس وقت بھی نہیں جب شہید کی میت ان کے حوالے ہوئی اور وہ اپنا بستر باندھ کر اپنے سرتاج کو لے کر واپس چلیں جس کے سہارے یہاں تک آئی تھیں۔ دوسری عورتوں نے بھی جن کا کلیجہ ماں بیٹی کی اس بے کسی پر پھٹا جا رہا تھا صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ آنکھوں سے آنسو ضرور چھلکے۔ فریاد عرش پر ضرور گئی۔ لیکن خاموش فریاد چیخوں اور آہ و بکا کے ساتھ نہیں۔

مولانا نے کہا: ''لاؤڈ سپیکر کے بغیر مجمع کو کنٹرول کرنا ممکن نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ جماعت کو برسوں سے جو تربیت دی گئی وہ کام آئی اور تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود غنڈوں کی کسی بات کا جواب نہ دیا گیا۔ آخر وہ اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔''

(ساری صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا نے کہا) ''حکومت اوّل تو یہ توقع رکھتی تھی کہ میری طرف جب فائر کیا جائے گا تو میں اور جماعت کے دوسرے کارکن سٹیج کے نیچے دبک جائیں گے لیکن اس کے کارندوں کو حیرانی ہوئی کہ میں اسی طرح کھڑا رہا اور تقریر کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ حکومت یہ بھی توقع رکھتی تھی کہ جماعت کے لوگ مشتعل ہو کر غنڈوں سے لڑ پڑیں گے۔ اس نے تیاری کر رکھی تھی کہ ادھر لڑائی چھڑے ادھر پولیس اپنے اسلحہ کے ساتھ اجتماع پر حملہ آور ہو جائے اور اسے خلاف قانون قرار دینے کا بہانہ مل جائے ...... پولیس کے مسلح دستے اس غرض کے لئے تیار تھے۔''

(اس ضمن میں مولانا نے امیر محمد خان نواب کالا باغ گورنر کا بھی ذکر کیا جن کا بھیانک انجام بعد میں دیدۂ بینا کے لئے سامانِ عبرت بنا۔ ان کی راعی سے وفاداری اور رعایا پر سخت گیری اس زمانے میں ضرب المثل بنی ہوئی تھی۔ مولانا نے کہا) ''گورنر صاحب نے کہا تھا جماعت سے ہم وہ سلوک کریں گے جو ناصر نے اخوان کے ساتھ کیا تھا۔ اپنے اسی ارشاد کے مطابق انہوں نے تمام تیاریاں کی تھیں لیکن خدا کے فضل سے جماعت کے صبر اور ڈسپلن نے ان کی ساری سکیم کو ناکام کر دیا۔''

(مولانا نے بتایا) ''مجھ سے پوچھا گیا کہ آپ اس واقعے کے متعلق کسی قانونی کارروائی یا عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کرتے ہیں، میں نے کہا ''میرا کوئی مطالبہ نہیں۔ یہ مقدمہ خدائے ذوالجلال کے ہاں دائر ہو چکا ہے۔ وہیں کارروائی ہو گی، وہیں فیصلہ ہو گا۔''

(سرکار نے اس اجتماع کو ناکام بنانے کی تدبیر کی تھی جو الٹی پڑ گئی، مولانا نے فرمایا:) ''ہمارا اجتماع تین روز کا تھا۔ لاؤڈ سپیکر کے بغیر تقریریں نہیں ہو سکتی تھیں، میں

نے کارکنوں سے کہا کہ تین تین چار چار کی ٹکڑیوں میں بٹ کر شہر میں پھیل جائیں اور تحریک کا پیغام پہنچائیں۔ یہ پروگرام بہت کامیاب رہا۔ کارکن شہر کے گوشے گوشے میں پہنچے۔ ہمارے اجتماع کو تباہ کرنے کے لئے جو کچھ کیا گیا' اس کی وجہ سے جماعت کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ عام ہو چکا تھا۔ ان حالات میں کارکنوں کی خوب پذیرائی ہوئی اور کوئی پانچ ہزار مزید متفقین بنے۔ یہ کامیابی ہم عام حالات میں ہرگز حاصل نہیں کر سکتے تھے۔''

(مولانا نے فرمایا) ''اس سکیم میں حکومت کو جو ناکامی ہوئی' اس نے اسے آتش زیرپا کر دیا اور اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا سابقہ بڑے بے ڈھب لوگوں سے پڑا ہے۔''

دوسری طرف خود مولانا اور ان کے ساتھیوں کو بھی اس کا اندازہ ہو گیا کہ حکومت اور بیوروکریسی کا غصہ اسلامی نظام کے لئے کام کرنے والوں کے خلاف کس حد تک بھڑک چکا ہے اور جلد ہی کسی شدید شکل میں سامنے آنے والا ہے۔

(''اس تاثر نے جماعت کے فکر و عمل میں کوئی تبدیلی تو پیدا نہیں کی۔'' میں نے مولانا سے پوچھا)

''ہرگز نہیں۔ ہم نے اپنا کام جاری رکھا اور سالانہ اجتماع کے بعد بلاتاخیر یہ مہم شروع کر دی کہ ایوب خاں صاحب کے دستور میں کم از کم دو ضروری ترمیمات کی جائیں۔ ایک یہ کہ بنیادی حقوق کو بلا شرط و استثنا عدالتوں کے ذریعہ قابل حصول بنایا جائے۔ دوسرے یہ کہ باشندگانِ پاکستان کو بالغ رائے دہی کے اصول پر براہِ راست اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق دیا جائے۔

ہم نے خود ریاست کے نام کا سوال بھی اٹھایا۔ ہمارا مطالبہ تھا کہ ریاست کا نام صرف جمہوریۂ پاکستان کی بجائے اسلامی جمہوریۂ پاکستان ہو۔

ریاست کے نام کے بارے میں ہم سے کہا گیا' نام میں کیا رکھا ہے؟ ہم نے کہا اگر نام میں کچھ نہیں رکھا تو ایک مسلمان بچے کا نام اسلامی کیوں رکھا جاتا ہے؟ پھر جہاں

تک اداروں (Institutions) کا تعلق ہے' نام کسی ادارے کا تعارف اس حیثیت سے کراتا ہے کہ اس کا مسلک کیا ہے۔ خود جمہوریہ کا لفظ ریاست کے نام میں اس لئے ہے کہ واضح کر دیا جائے کہ اس کا نظامِ حکومت ملوکیت پر مبنی نہیں، یہاں بادشاہی نہیں بلکہ جمہوریت ہے۔ اس ضمن میں روس کی مثال دیتے ہوئے میں نے کہا اس ملک نے اپنے مسلک کا اظہار اپنے پورے نام یونین آف سوویت سوشلسٹ ریپبلکس (U.S.S.R) کے ذریعے کیا ہے' اگر ہماری مملکت اسلامی ہے تو اس کا نام اسلامی جمہوریہ ہونا چاہئے ......ہم نے معترضین کے جواب میں مزید کہا ''خصوصیت سے یہ تبدیلی کہ پہلے اس کا نام اسلامی جمہوریہ تھا اور اب اسلامی کا لفظ نکال دیا گیا۔ دنیا میں اس امر کا اعلان کرنے کے مترادف ہے کہ اب یہ ملک اسلامی نہیں رہا۔ اس وضاحت کی روشنی میں یہ ترمیم دستور میں اور بھی ضروری ہو جاتی ہے کہ ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہو۔''

(مولانا نے فرمایا) ''ہم نے دلائل کے ساتھ اپنے مطالبات ان کے سامنے رکھے۔ مطالبات پر دستخطوں کی مہم چلائی، جن پر مشتمل نو میل لمبا ایک محضر نامہ اسمبلی کے اجلاس ڈھاکہ میں باقاعدہ پیش کر دیا گیا۔ جماعت کی مہم بالآخر کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔ سابق وزیر قانون شیخ خورشید احمد مرحوم کی مساعی بھی اس باب میں ہمیشہ قدر سے یاد رکھی جائیں گی۔

(مولانا نے سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ) اسی زمانے میں مجھے رابطہ عالمِ اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لئے مکہ جانا تھا۔ حکومت نے روکنے کی بہت کوشش کی مگر میں نے اجلاس میں شرکت کی۔ وہاں مسلم ممالک کے جتنے بھی نمائندے آئے تھے انہیں یقین تھا کہ مجھے واپس پہنچتے ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔ اکثر نے اصرار کیا کہ میں واپس نہ جاؤں لیکن میرا جواب بڑا مختصر سا تھا۔ ''کیا اپنی جماعت کو میدانِ کارزار میں چھوڑ کر یہاں رہ جاؤں؟''

رابطہ عالمِ اسلامی کے اجلاس سے واپسی تک بنیادی حقوق کا بل پاس ہو چکا تھا

لیکن صدر صاحب نے اس پر دستخط روک رکھے تھے۔ میری واپسی کے بعد چھ جنوری ۱۹۶۴ء کو مجھے اور پوری مجلسِ شوریٰ کو یکا یک گرفتار کرلیا گیا۔ ساتھ ہی جماعت اسلامی کو کریمنل لا (امنڈمنٹ) ایکٹ ۱۹۰۸ء کے تحت مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں صوبوں میں خلاف قانون قرار دیدیا گیا۔ دونوں صوبوں میں بیک وقت کارروائی ہوئی۔ جہاں تک بنیادی حقوق کا تعلق ہے، صدر نے اس کے نودن بعد پندرہ جنوری کو متعلقہ بل پر دستخط کیے تاکہ جماعت کی مساعی سے عوام کے جو بنیادی حقوق بحال ہوئے تھے ان کا کوئی ثمرہ خود جماعت کو نہ مل سکے (اس مرحلے پر سیاسی نفسیات کے ایک اہم نکتے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا) ''ڈکٹیٹروں میں جو اخلاقی بہادری پائی جاتی ہے ان کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب وہ کسی شخص کا منہ پوری طرح بند کر لیتے ہیں تب وہ اس پر الزامات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں تاکہ جواب نہ دے سکے۔ وہ پہلوانوں کی اس انوکھی قسم سے تعلق رکھتے ہیں جو مخالف کے ہاتھ پاؤں بندھوانے کے بعد کشتی لڑنے کا چیلنج دیتے ہیں۔''

(مولانا نے بتایا کہ) یہی کچھ ان کے ساتھ ہوا۔ گرفتاری کے بعد ہم ڈسٹرکٹ جیل لاہور پہنچے اور صبح کا اخبار دیکھا تو ایک لمبا چوڑا الزام نامہ جو جھوٹ کا پلندہ تھا۔ میرے اور رفقاء کے خلاف تمام اخباروں میں شائع کرایا گیا تھا (مولانا فرمانے لگے)

''اس الزام نامہ کو پڑھ کر بے اختیار میرے منہ سے نکلا شاباش۔''

(تیسری مرتبہ کی اس قید کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے مولانا نے کہا) ''اس کے کچھ مدت بعد ہمیں ازروئے قاعدہ اس بورڈ کے سامنے پیش کیا گیا جو انصاف پسندی کے مظاہرے کی خاطر نظربندوں کے معاملات پر نظرثانی کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ یہ بورڈ جن دو ارکان پر مشتمل تھا ان دو میں سے ایک شہزادہ عالمگیر ہوم سیکرٹری تھے جن کے دستخطوں سے نظربندی کے احکام صادر ہوئے تھے اور دوسرے مسٹر جسٹس محمود صاحب تھے جو ۱۹۵۲ء میں مارشل لاء عدالت کے سامنے اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل کی حیثیت سے میرے خلاف پیش ہوئے تھے اور جنہوں نے میرے لئے سزائے موت

کا مطالبہ کیا تھا۔

نظرثانی بورڈ کی ...... سماعت خفیہ کمرے میں تھی۔ مولانا اور ان کے رفقاء اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس بورڈ کے سامنے کچھ کہنا تضیع وقت ہے۔ تاہم انہوں نے چونکہ دیکھا کہ ان پر الزامات وہی ہیں جن سے اخبارات پُر تھے۔ لہٰذا انہوں نے چاہا کہ ان کا پورا پورا جواب ریکارڈ پر آ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا اور ان کے رفقاء نے ایک ایک نکتے کا جواب دیا۔ جماعت کے ہر نظر بند کو الگ الگ چارج شیٹ ملی تھی۔ اس لئے جواب بھی الگ الگ دیئے گئے۔ نتیجہ انہیں پہلے سے معلوم تھا۔ نظر بندی کی توثیق کر دی گئی۔

جماعت اسلامی کے سامنے بنیادی مسئلہ اس وقت یہ تھا کہ پہلے اسے خلاف قانون قرار دینے کے حکم کو چیلنج کیا جائے اور نظر بندی کے معاملے کو مؤخر رکھا جائے۔ چنانچہ ڈھاکہ اور مغربی پاکستان ہائی کورٹ دونوں میں جماعت کے خلاف حکم امتناعی کو چیلنج کیا گیا۔ ڈھاکہ ہائی کورٹ نے جماعت کے حق میں فیصلہ کیا اور حکمِ امتناعی کو خلافِ قانون قرار دیا۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان ہائی کورٹ نے حکومت کے حق میں فیصلہ دیا اور حکم امتناعی کو برقرار رکھا۔ چنانچہ سپریم کورٹ میں حکومت بھی اپیل لے کر گئی اور جماعت بھی۔

مولانا نے فرمایا: ''مقدمے کی پیروی سو کے قریب شہرت یافتہ وکلاء کر رہے تھے۔ اس پیشے کے ارکان نے قانون کی بالادستی کو برقرار رکھنے کے لئے اس موقع پر اپنا فرض انجام دینے میں جس عظیم جذبے کا اظہار کیا وہ پاکستان کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی ظاہر نہیں ہوا۔

(اور سپریم کورٹ؟ میں نے پوچھا) :

مولانا نے فرمایا ''سپریم کورٹ نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ انتظامیہ کی زیادتیوں سے لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرنے کا جو فرض اس پر عائد ہوتا ہے' اسے ادا کرنے میں وہ بے لاگ ہے'' کہ سپریم کورٹ کے پانچوں ججوں نے فیصلے تو الگ الگ لکھے تھے

لیکن محور یہی تھا کہ جماعت کے خلاف حکمِ امتناعی خلافِ قانون ہے۔ اس سلسلے میں ایک نکتے کی وضاحت کی ...... (انہوں نے کہا) جس جج نے قدرے مختلف فیصلہ لکھا، اس نے بھی کہہ دیا کہ عدالت اس معاملے میں دخل دے سکتی ہے۔

(مولانا نے فرمایا) ''یہ فیصلہ ہمارے قانون کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ فی الحقیقت اسے تاریخ ساز فیصلہ کہا جا سکتا ہے۔''

جماعت کی اپیل منظور ہوگئی تو اس نے اپنے نظر بند زعماء کے متعلق مغربی پاکستان ہائی کورٹ میں ہیبیس کارپس درخواست پیش کی۔ اس درخواست کی سماعت فل بنچ نے کی اور فیصلہ دیا کہ نظر بندی بھی بالکل خلافِ قانون ہے۔

(مولانا نے کہا) ''جماعت اسلامی ہماری رہائی سے قبل ہی، سپریم کورٹ کا حکم نافذ ہونے کے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ایک بار پھر کھڑی ہوگئی تھی اور اپنا کام شروع کر چکی تھی۔ اس کے چند روز بعد ہم بھی رہا ہو کر آ گئے اور ۲۴، اکتوبر کو ٹھیک اسی تاریخ کو جب ایک برس ادھر ۱۹۶۳ء میں جماعت کے جلسے پر حملہ کیا گیا تھا، میں نے موچی دروازے کے جلسے میں ایک مفصّل تقریر کی جس میں ایوب خاں صاحب اور دورِ آمریت کو پوری تفصیل کے ساتھ ایک چارج شیٹ دیا۔''

جیل کے دنوں کی مصروفیات کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ان کے رفقاء اگرچہ بیشتر مختلف جیلوں میں تھے تاہم ان میں سے بعض کچھ وقت کے لئے ان کے ساتھ لاہور جیل میں رہے۔ نعیم صدیقی صاحب اور مولانا نصر اللہ خاں عزیزؔ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اسی جیل میں مولانا کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ آخر میں جب ہیبیس کارپس درخواست دی گئی تو درخواست کے زعماء کو بھی ڈسٹرکٹ جیل لاہور منتقل کر دیا گیا...... ''جب سب لوگ یکجا ہو گئے تو ایک وقت درسِ قرآن و حدیث کا رکھا گیا۔ اس کے علاوہ ہر ایک کی اپنی مصروفیت بھی تھی۔ پروفیسر خورشید احمد صاحب نے مولانا معین الدین صاحب سے اصولِ فقہ انہی دنوں پڑھی۔ میں نے تفہیم القرآن کی

چالیس سے لے کر چھیالیس تک سورتوں کی تفسیر بھی جیل ہی میں رقم کی۔"

("سپریم کورٹ کے جس تاریخ ساز فیصلے کا ذکر آپ نے فرمایا ہے اس کے علاوہ اس اسارت سے متعلق کوئی اور بات؟" میں نے پوچھا۔)

مولانا نے کہا: "ہاں پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ان دنوں رُو پذیر ہوا۔ ابھی ہم نظر بند ہی تھے کہ کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز (کوپ) کے نام سے حزبِ اختلاف کی جماعتوں کا اتحاد عمل میں آیا، جس نے محترمہ فاطمہ جناح کو اپنی طرف سے صدارتی امیدوار نامزد کر دیا۔ اس زمانے میں کئی روز تک میں جیل میں اس مسئلے پر غور کرتا رہا کہ جماعت کو اس معاملے میں کیا روّیہ اختیار کرنا چاہئے۔ شرعی مسئلہ مجھے معلوم تھا کہ اسلامی ریاست کا سربراہ مرد ہونا چاہئے۔ لیکن جن مخصوص حالات میں محترمہ فاطمہ جناح کو امیدوار نامزد کیا گیا تھا وہ بھی پیشِ نظر تھے۔ میں غور کرتا رہا کہ ہم اس فیصلے کو قبول کریں اور COP کی متفقہ امیدوار کا ساتھ دیں یا اس سے اختلاف کریں، جس کا فائدہ لامحالہ آمریت کو پہنچے گا یا پھر بالکل خاموشی اختیار کر لیں جس کا اس حالت میں جماعت کے لئے کوئی امکان نہیں، جب کہ وہ ملک کی ایک اہم جماعت ہے اور صدارت جیسے اہم مسئلہ پر وہ خاموش رہنا چاہے بھی تو نہیں رہ سکتی۔ جیل میں اس مسئلے پر غور وخوض کرتے کرتے یکایک میرے دل میں خیال آیا کہ خدا تعالیٰ کے یہاں باز پرس ہوئی تو عورت کی سربراہی کی حمایت کرنے کی جوابدہی تو میں شاید کر سکوں گا لیکن اپنے ملک کو آمریت کے عذاب میں مبتلا رکھنے کی ذمہ داری لے کر میرے لئے خدا تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کرنے کی صورت کوئی نہ ہوگی۔ اس کے بعد میں قطعی طور پر اس نتیجے پر پہنچ گیا، اور ہیبیس کارپس درخواست کی سماعت کے موقع پر جب عدالت گیا اور جماعت کے ارکان نے مجھ سے پوچھا کہ اس سلسلے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ تو میں نے کہا کہ میں اس بات سے پوری طرح مطمئن ہوں کہ ہم محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ ہمیں ان کا ساتھ دینا چاہئے۔ اس پر جتنے اعتراضات ہوں گے جیل سے باہر آ کر ان کا جواب میں خود دے لوں گا۔ آپ لوگ بلا تامل COP کا ساتھ دیں۔"

(4)

''مولانا! اس کے بعد چوتھی اسارت کی رُوداد؟'' میں نے عرض کیا۔

(مولانا مودودیؒ نے فرمایا) کہ ان کی چوتھی نظر بندی بڑے دلچسپ حالات میں ہوئی۔ حکومت نے ایک رویتِ ہلال کمیٹی بنا رکھی تھی' اور اس بات کو ممنوع قرار دے دیا تھا کہ اس کے سوا کوئی اور رویتِ ہلال کا اعلان کرے۔ لیکن جنوری ۱۹۶۷ء میں یکا یک ایک عجیب صورتِ حال پیدا ہوئی۔ گیارہ جنوری کو مغربی اور مشرقی پاکستان اور بھارت میں کسی جگہ چاند نہ دیکھا گیا۔ اس لئے لوگ تراویح کی تیاری کر رہے تھے۔ روزنامہ جنگ کے اسی تاریخ کے شمارے میں ایک ہیئت دان اور ایم ای ایس ماڑی پور کے اسٹنٹ کمانڈر سیّد محمد رضوی صاحب نے بھی علمِ ہیئت کی رُو سے حساب لگا کر لکھا تھا کہ چاند بارہ جنوری کو جمعرات کے روز شام کے وقت نظر آئے گا اور عید تیرہ جنوری کو ہو گی۔ اس کی تائید کرتے ہوئے بعد میں نوائے وقت کے ۲۱ جنوری کے شمارے میں رصد گاہ پنجاب یونیورسٹی کے جناب حماد رضوی نے ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے پوری تفصیل سے حساب بنا کر اپنی یہ حتمی رائے ظاہر کی تھی کہ گیارہ جنوری یعنی بدھ کو چاند کا نظر آنا ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن ۱۱ جنوری کو اچانک پونے آٹھ بجے کی خبروں میں ریڈیو سے یہ اعلان سنایا گیا کہ چاند نظر آ گیا ہے اور عید جمعرات کو ہو گی۔

(اس عجیب اعلان کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے مولانا نے کہا) ''اس اعلان میں اس امر کا کوئی ذکر نہیں تھا کہ وہ بندۂ خدا کب نظر آیا اور کس تیز نظر آدمی نے اس کو دیکھا۔ کسی شہادت کا بھی اس میں ذکر نہیں تھا جس کی بناء پر یہ فیصلہ کیا گیا ہو۔ اس چیز نے سارے ملک میں کھلبلی مچا دی۔ اس لئے کہ رویتِ ہلال اور اس کے ثبوت کے بغیر رمضان کا ایک فرض روزہ چھوڑنا اور رمضان کی ایک تاریخ کو عید منانا' اور اس میں کھانا پینا کوئی سیاسی مسئلہ نہیں تھا' بلکہ بڑی نزاکت رکھنے والا شرعی معاملہ تھا۔ شریعت کا حکم یہ ہے کہ عید ہو اور اس میں روزہ رکھا جائے تو گناہ ہے۔ عید کا دن نہ ہو اور رمضان کا ہو اور اس میں روزہ چھوڑ کر عید منائی جائے تو بھی گناہ ہے۔ اتفاق یہ بھی تھا

کہ مغربی اور مشرقی پاکستان اور بھارت کے اکثر حصوں میں مطلع بالکل صاف تھا۔ شریعت کی رو سے اگر مطلع صاف ہو تو عوام کے ایک جم غفیر کو چاند دیکھنا چاہئے۔ صرف اس صورت میں ایک دو آدمیوں کی شہادت پر مانا جا سکتا ہے جب کہ مطلع صاف نہ ہو۔ اس صورت میں امکان ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے آسمان کا چاند والا حصہ کھل جائے اور چند آدمی اُسے دیکھ لیں۔''

معاملہ کی نزاکت کے پیشِ نظر رویت ہلال کے بارے میں جگہ جگہ سے لوگوں نے مولانا مودودیؒ کو فون کرنے شروع کر دیئے۔ دوسری جگہ کے علماء کو بھی انہوں نے فون کئے۔ ہر جگہ سے یہی اطلاع آ رہی تھی کہ مطلع صاف تھا اور چاند کسی نے نہیں دیکھا۔ مولانا خود نصف شب تک فون پر موجود رہے اور اطلاعات آتی رہیں۔ مرکزِ جماعت میں بھی دوسرے مقامات سے اطلاعات حاصل کی جاتی رہیں۔ آخر کار مغربی اور مشرقی پاکستان کے علماء نے جن میں شیعہ علماء بھی شامل تھے' بالاتفاق یہ فیصلہ کر دیا کہ جمعرات کو عید نہیں منائی جائے گی۔ اس فیصلے سے جماعت اسلامی کے بانی نے بھی اتفاق کیا۔

مولاناؒ نے فرمایا: ادھر علماء کا یہ متفقہ فتویٰ' ادھر حکومت کی طرف سے بعد میں یہ اطلاع کہ مالاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ نے' مردان اور پشاور کے ڈپٹی کمشنروں نے اور کوہاٹ کے تین آدمیوں نے چاند دیکھنے کی شہادت دی تھی' جس کی بنا پر رویت ہلال کا اعلان ہوا۔ ظاہر ہے یہ بات کسی کو مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ شرعی نقطۂ نگاہ سے یہ شہادتیں قابلِ قبول نہیں تھیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۷ء تک بارہ سال میں صرف دو تین مواقع ایسے آئے تھے جب کہ شمالی کوہستانی اور سرحدی علاقوں کے ساتھ باقی پورے برصغیر میں عید بشمول بھارت ایک دن ہوئی' ورنہ ہمیشہ ان کی عید ایک دن پہلے ہوتی رہی۔

(میں نے جاننا چاہا حکومت نے جمعہ کی بجائے جمعرات کو عید منانے کا فیصلہ کس بناء پر کیا؟ .... مولانا میرے اس سوال پر مسکرا دیئے۔ فرمایا) ''فیصلہ اس بنا پر کیا گیا تھا کہ صدر ایوب صاحب کو بعض حضرات نے یقین دلایا کہ ایک دن میں دو خطبے راج پر

بھاری ہوتے ہیں۔ اوّل تو یہ حیرت کی بات ہے کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص جسے اپنی روشن خیالی پر ناز ہو، ان توہمات کی پیروی کرے۔ اس پر مستزاد یہ کہ کسی میں کوئی ذرا سی دینی حس بھی موجود ہو تو یہ ذمہ داری وہ اپنے سر نہیں لے سکتا کہ پوری قوم سے رمضان کا ایک فرض روزہ چھڑوا کر رمضان کے روز عید کرا دے۔ راج پر بھاری ہونا اس کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ راج آنی جانی چیز ہے اور آخر وہ گیا۔ لیکن اس کو بچانے کے لئے جو تدبیر کی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو کی بجائے تین خطبے عید پر ہوئے ایک جمعرات کو دو جمعہ کو۔‘‘

(عرض کیا: ’’راج بچانے والوں کے سوا روزے کے دن عید کی نماز پڑھنے پڑھانے والے کون لوگ تھے؟...... مولانا نے بتایا) ’’حکومت کی انتہائی کوشش تھی کہ جمعرات کو عید کی نماز ہو۔ بعض علماء ایسے تھے جو خود روزے سے تھے مگر انہوں نے عید کی نماز ڈر کر پڑھائی۔ پڑھنے والوں میں بہت سے ایسے سرکاری افسر بھی تھے جنہوں نے محض اپنی ملازمت برقرار رکھنے کی خاطر روزے سے ہونے کے باوجود عید کی نماز پڑھی۔ کسی کو یقین ہی نہیں تھا کہ عید ہے۔‘‘

(اس سارے سلسلے میں اگرچہ ملک بھر کے علماء اور عام مسلمان شریک تھے تاہم غصہ ایک بار پھر صرف مجھ پر اتارا گیا اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات نے اپنی توپوں کے دہانے کھول دیئے۔ ان اخبارات نے مطالبہ کیا کہ بانیٔ جماعت اسلامی سزا کا مستحق ہے۔ سرکاری طور پر اخبارات میں جو باتیں کہی گئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ جب مالاکنڈ، مردان اور کوہاٹ میں ’’چاند‘‘ دیکھا گیا تو کیا وہاں کے لوگ مسلمان نہیں؟ مدعا یہ تھا کہ سرحد کے لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکا دیا جائے۔ (مولانا نے ارشاد فرمایا) جس زور شور سے میرے خلاف الزامات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اس سے میں نے سمجھ لیا کہ اب مجھے گرفتار کرنے کے لئے زمین ہموار کی جا رہی ہے۔ چنانچہ ۲۹ جنوری ۱۹۶۷ء کو رات کے تین بجے میرے دفتر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور میں فوراً سمجھ گیا کہ میرا اندازہ صحیح تھا۔ وہ اصحاب اپنے وقت پر تشریف لے آئے تھے۔ چنانچہ میں نکلا اور ان سے کہا

میں تیار ہوں۔ وہ مجھے لاہور سے بنوں لے گئے۔ تقریباً سارا دن سفر میں گزرا۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے موٹر وہاں پہنچی۔ ایک بنگلہ مجھے نظر بند رکھنے کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ چار علماء کو بھی گرفتار کیا گیا ہے اور انہیں مختلف مقامات پر رکھا گیا ہے۔ میری یہ چوتھی گرفتاری ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت ہوئی۔ گویا چاند کے نظر آنے یا نہ آنے کے مسئلے سے ملک کے دفاع کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔‘‘

(اس مرحلے پر مولانا نے یہ دلچسپ بات بتائی) ’’گرفتاری کے جو احکامات جاری کئے گئے ان میں سب کے نام کے ساتھ ’’مسٹر‘‘ کا لفظ لکھا ہوا تھا۔ میری تو خیر ہے کہ نہ علماء میں شامل ہوں، نہ اس بات کو کوئی اہمیت دیتا ہوں کہ نام کے ساتھ مسٹر لکھا جاتا یا مولانا، لیکن دوسرے جن حضرات کو اس خطاب سے نوازا گیا، وہ ظاہر کرتا تھا کہ گرفتاری کے احکام کس غصے کی حالت میں جاری ہوئے۔ ۲۶ فروری ۱۹۶۷ء کو حکومت کی طرف سے ایک ’’وضاحتی بیان‘‘ جاری ہوا جس میں الزام لگایا گیا کہ ان لوگوں نے مذہبی معاملے میں تشدّد سے کام لیا، مسجدوں کے دروازوں پر قفل ڈال دیئے اور جب لوگ عید کی نماز پڑھنے گئے تو انہیں واپس بھیج دیا۔‘‘

(مولانا نے فرمایا) ’’اس میں لطیفہ یہ ہے کہ دوسرے حضرات کے پاس مسجدیں ضرور ہوں گی لیکن میرے پاس کہاں۔ میں تو ہمیشہ جامعہ اشرفیہ جا کر عید پڑھتا ہوں اور میں نے کسی شخص کو جمعرات کی عید پڑھنے سے نہیں روکا۔‘‘

(میں نے عرض کیا) ’’یہ تشدّد کا الزام بھی جناب پر خوب تھا۔ تشدّد کا ارتکاب تو خود حکومت نے کیا جس نے زبردستی لوگوں کا روزہ تڑوانے کی کوشش کی۔‘‘ (مولانا نے کہا) بنوں مجھے غالباً اس غرض کے لئے بھیجا گیا کہ سرحد کے لوگوں کو میرے خلاف خوب تیز تیز پراپیگنڈا کر کے بھڑکایا جائے۔ اسی وجہ سے پیچھے جماعت کے لوگوں کو پریشانی بھی تھی۔ لیکن وہاں پولیس سپرنٹنڈنٹ سے لے کر نیچے کے اس عملہ تک جو مجھ پر متعین تھا۔ ہر ایک نے میرے ساتھ نہایت محبت اور احترام کا برتاؤ کیا۔ ایک نوجوان سپاہی جو میری خدمت کے لئے مقرر کیا گیا، اس نے میرا اتنا خیال رکھا کہ کوئی ذاتی ملازم نہ رکھ سکتا۔

جاڑے کے زمانے میں فجر کی نماز کے لئے وہ میرے اٹھنے سے پہلے ہی پانی گرم کر دیا کرتا اور سلفچی اور لوٹا لا کر میرے سامنے رکھ دیتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ پٹھانوں کو میرے خلاف بھڑکانے میں حکومت قطعاً ناکام ہوگئی۔ پٹھانوں نے اسی طرح مجھے اپنا بھائی سمجھا جس طرح وہ کسی پٹھان کو سمجھتے۔''

(میں نے دریافت کیا ''حکومت نے آپ کو علمی مشاغل جاری رکھنے کے لئے کتابیں منگوانے کی اجازت میں تو بخل سے کام نہیں لیا؟'' فرمایا) ''یہ جھگڑا اس نظر بندی کے دوران میں بھی پیش آیا۔ مجھے اپنا کام جاری رکھنے کے لئے کتابوں کی ضرورت تھی اور حکومت تھی کہ کتابیں دینے کو تیار نہ تھی۔ چوبیس روز تک صرف قرآن کریم پڑھا اور پنسل سے حاشیہ پر کئی نوٹ بھی لکھے۔''

(عرض کیا: ''ایک مکمل کتاب کے طور پر متعدد بار قرآن کریم کی تلاوت کا تأثر بتانا پسند فرمائیں گے؟'' ...... فرمایا) ''یوں مسلسل پڑھنے سے جو تأثر ہوتا ہے وہ روز کے تھوڑا تھوڑا پڑھنے سے مختلف ہے۔ اللہ کے پورے کلام کے مطالب یکبارگی ذہن و دماغ میں آتے ہیں۔ مختلف مقامات پر بیان کی ہوئی باتوں کا باہمی رشتہ عیاں ہو جاتا ہے اور آخری الہامی کتاب ایک مکمل حیثیت سے سامنے آتی ہے۔''

(مولانا نے بتایا) کہ چوبیس دن کے بعد کچھ کتابیں منگوانے کی اجازت ملی لیکن وہ اس غرض کے لئے کافی نہ تھیں کہ ان کی مدد سے تفسیرِ قرآن رقم ہو سکتی۔ البتہ ان کے میسر آنے پر میں نے تفہیم القرآن کی جلد سوم پر مفصّل نظر ثانی کی اور اس میں بہت کچھ اضافے کر لئے۔

(سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے مولانا فرمانے لگے) ''دوسری جلد پر نظر ثانی کا کام شروع کیا ہی تھا کہ لاہور ہائیکورٹ میں ہیبیس کارپس درخواست داخل کر دی گئی اور ہائی کورٹ نے مجھے طلب کر لیا۔ ۱۵ مارچ ۱۹۶۷ء کو شام کے وقت ہم بنوں سے لاہور کے لئے روانہ ہوئے۔ روانگی کے ساتھ ہی سخت بارش شروع ہوگئی۔ یوں لگتا تھا جیسے میاں والی اور سرگودھا کے درمیان سڑکیں نہیں بلکہ نہریں تھیں جن کے اندر گاڑی

چل رہی تھی۔ جگہ جگہ راستے میں ٹرک پھنسے ہوئے تھے۔ پولیس نے بار بار بڑی مشکل سے ہماری گاڑی کے لئے راستہ بنوایا۔ میانوالی سے خوشاب کوتوالی کو فون کر دیا گیا تھا کہ ہم لوگ آ رہے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس میں کھانے کا انتظام کر دیا جائے۔ لیکن خوشاب پہنچے تو ریسٹ ہاؤس خالی تھا اور تھانے کے دروازے بند تھے۔ ساتھ آنے والی پولیس نے تھانے کے دروازے کھٹکھٹائے مگر صدائے برنخاست۔ آخرکار سرگودھا پہنچے جہاں رات کے ایک بجے ہوٹل میں کھانا کھایا اور پھر چل پڑے۔''

(مولانا نے قید کے اس سفر کی روداد سناتے ہوئے کہا) ''۱۶ مارچ کی صبح کو ہم لاہور پہنچے۔ چونکہ مجھے لانے والی پولیس سرحد کی تھی اس لئے اسے معلوم نہ تھا کہ بورسٹل جیل کہاں ہے۔ لہٰذا میں ہی اسے رہنمائی کر کے اپنے قید خانے میں لے گیا۔ وہاں اترا ہی تھا کہ رہائی کے احکام آ گئے اور پولیس نے خود اپنی گاڑی میں مجھے وہاں پہنچا دیا جہاں سے ۲۹ جنوری کو لے کر گئی تھی۔''

ظہر کی جماعت کا وقت ہو رہا تھا۔ مولانا یہ روداد سنانے کے بعد وضو کے لئے اٹھے اور فرمایا: ''ابھی تک تو یہ چوتھی گرفتاری ہی آخری گرفتاری ہے۔''

(بہ شکریہ ہفت روزہ ''پیمان'' کراچی: ۱۹ مارچ، ۲ اپریل، ۹ اپریل، ۲۳ اپریل، ۳۰ اپریل ۱۹۷۳ء)